دو مینار (رپورتاژ)

مسعود مفتی

ہماری مسخ شدہ قومی تاریخ پر دروغ کی دبیز دھول ہے۔ لیکن یہ کتاب کہیں کہیں سے گرد صاف کر کے کچھ نقوش واضح طور پر دکھاتی ہے۔ ان نقوش میں دو حیات افروز معجزے اور اَن گِنت مفادات کے شعبدے صاف نظر آتے ہیں۔

پہلا معجزہ ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ جب شدید مخالفت کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا اور دوسرا معجزہ اگلی دہائی میں ہوتا رہا۔ جب نئے ملک میں برطانوی دور کی تربیت یافتہ بیوروکریسی قائداعظم کی نگرانی میں قانون اور قواعد کا نفاذ کرنے لگی اور پاکستان حیرت انگیز ترقی کرنے لگا۔ پھر چند خود غرض عناصر نے اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے قائداعظم کے پاکستان کو اغوا کر لیا۔ بعدازاں اگلے تیرہ برسوں میں بیوروکریسی اور حسنِ انتظام کو بتدریج سنگسار کر کے دفن کر دیا۔

یہ کتاب اسی مرحوم بیوروکریسی کے ایک رکن کے معتبر قلم سے اس قتلِ عمد کی عینی شہادت ہے۔

مصنف کے بارے میں: مسعود مفتی گزشتہ ۶۲ برسوں سے ایسا قومی ادب تخلیق کر رہے ہیں جو ہمارے ناہموار معاشرے کے عروج و زوال کی حقیقی عکاسی کرتا ہے۔ وہ نسبتاً نئی صنفِ ادب (رپورتاژ) کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ چہرے ۱۹۷۴ء (جو مشرقی پاکستان کے متعلق ہے)، ہم نفس ۱۹۹۶ء، چہرے اور مہرے ۲۰۱۱ء اور پتھر میں پھول ۲۰۱۷ء کے بعد اب یہ مسعود مفتی کا پانچواں رپورتاژ ہے۔ دیگر اصنافِ ادب میں ان کے چھ عدد افسانوی مجموعے (محدب شیشہ، رگِ سنگ، ریزے، سالگرہ، توبہ، وقت کی تاش)، ایک ناول کھلونے، ایک مزاحیہ مجموعہ سرِ راہے، چند ڈرامے تکون، ڈائری لمحے اور چند یادداشتیں جھرنوں سے کرنیں شامل ہیں۔ ان کو اپنی کئی تحریروں پر متعدد ادبی ایوارڈ مل چکے ہیں۔

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

ISBN 978-0-19-940910-5

9 780199 409105

RS 695

www.oup.com
www.oup.com.pk

دو مینار

دو مینار

(رپورتاژ)

مسعود مفتی

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔
یہ دنیا بھر میں بذریعۂ اشاعت تحقیق، علم وفضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے مقاصد کے فروغ میں
یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے۔ Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں
اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے

پاکستان میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا،
پی۔او بکس ۸۲۱۴، کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان
نے شائع کی

پہلی اشاعت ۲۰۲۰ء

ISBN 978-0-19-940910-5

نوری نستعلیق فونٹ میں کمپوز ہوئی
۵۵ گرام بک پیپر پر طبع ہوئی

ڈیلٹا ڈاٹ ٹیکنالوجیز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی میں طبع ہوئی
اظہارِ تشکر
سرورق کی تصویر: رچرڈ سیمنڈز

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا (النحل: ۹۲)

ترجمہ: اُس عورت کی طرح مت بنو، جو اپنا سُوت کات کر
پہلے تو اسے پکّا کرتی ہے اور پھر اسے نوچ نوچ کر توڑ دیتی ہے۔

انتساب

اُس مرحوم بیوروکریسی کے نام

جس نے

قائداعظم کے پاکستان کو پہلے گیارہ برس میں آسمان پر پہنچا دیا

اور جسے

انقلابی رہبروں نے اگلے ساڑھے تیرہ برس میں ہلاک کر دیا

تاریخِ پیدائش: ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء

تاریخِ وفات: ۲۱/اپریل ۱۹۷۲ء

فہرست

پیش لفظ

آج کے پاکستانی نوجوان نے قائد اعظم کا پاکستان نہ تو دیکھا ہے، نہ اس کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہے۔

قائد اعظم کے پاکستان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک۔ اُس کے بعد یہ اغوا ہو گیا۔ اور پچھلے ۶۰ برسوں سے سیاسی، غیر سیاسی اور مذہبی اقتدار پرستوں کے ذاتی مفادات اور باہمی گٹھ جوڑ کا یرغمال ہے۔

قائد اعظم کا پاکستان ایک فلاحی ریاست تھی۔ اس کے شہری باکردار تھے۔ کیونکہ وہ یوپی کے سرسید، بنگال کے اے کے فضل حق، نواب سلیم اللہ خان، پنجاب کے علامہ مشرقی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، بمبئی کے محمد علی جناح اور کئی دوسرے علاقوں کے باکردار لیڈروں کے پروردہ تھے۔ اس کی بیوروکریسی امورِ سلطنت کی ماہر تھی۔ کیونکہ وہ ایک صدی سے برطانوی سلطنت کی وسعت میں حسنِ انتظام کی مضبوط کڑی رہی تھی۔ اس کے سیاستدان ابتدائی تربیتی لڑھکنیاں کھا کر سنبھل گئے تھے اور اب اتنے بالغ نظر ہو گئے تھے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے باہمی اختلافات حل کر چکے تھے۔ اس کے بعد ملک کے دونوں حصے پوری یک جہتی سے ہم قدم تھے۔

آج کا پاکستانی نوجوان یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ اسے دانستہ لاعلم رکھا گیا ہے۔ اغوا کرنے والے نہیں چاہتے کہ اغوا ہونے والے کی پہچان ہو سکے یا اس کا ذکر بھی ہو۔

آج کا پاکستانی نوجوان صرف اس پاکستان کو جانتا ہے جس کے سیاستدان موقع پرست ہیں۔ عوام بے آواز ہیں۔ بیوروکریسی بدنام ہے اور لیڈر خود غرض ہیں۔ جس میں بدامنی ہے، بدقماشی ہے، بدعہدی ہے اور ہر بدی کے سر پر چمکدار تاج ہے۔ منافقت بھرے ماحول میں اسلام، جمہوریت، آئین، قانون، انصاف اور عوامی بہبود کے قصیدے تو دن رات گائے جاتے ہیں لیکن عملی طرزِ عمل سے ہر دم ان کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ ملک میں جا بجا دھماکے ہیں، لاشیں ہیں، خون کے فوارے ہیں، سنگ و خشت مستقل طور پر مقید ہیں اور سگ بالکل آزاد ہیں۔

آج کا پاکستانی نوجوان یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان اپنے جنم دن سے ہی ایسا ہے کیونکہ اس نے پاکستان میں صرف بدنظمی اور بدامنی کا دور دیکھا ہے۔ لیکن میں نے اس خطۂ زمین پر تین ادوار دیکھے ہیں:

۱۔ انگریز حاکم کی غلامی کا دور۔

۲۔ قائداعظم کے آزاد پاکستان کا بہتر و برتر دور۔

۳۔ یرغمال پاکستان کا ابتر دور۔

زیرِنظر رپورتاژ ان تین ادوار کی عینی گواہی ہے۔ اس لیے اس کا رُوئے سخن پاکستانی نوجوان کی طرف ہے تاکہ وہ قائداعظم کے پاکستان کو جان سکے، اس کی روح کو پہچان سکے، اغوا کی واردات کو سمجھ سکے اور مغوی کو رہا کروانے کے لیے خود کو تیار کر سکے۔

میرے بچپن (میٹرک پاس کرنے تک) نے برٹش دور کے اچھے انتظام کو دیکھا۔ میرے لڑکپن نے قائداعظم کے پاکستان کی محنتی اور مخلص بیوروکریسی دیکھی۔ اس کے انتظامی معجزوں کی وجہ سے اپنے وطن کی حیرت انگیز ترقی دیکھی، بلکہ اس کا سنہری زمانہ دیکھا۔ پھر جوانی کی دہلیز پر میں جب پاکستان کی انتظامیہ کا پرزہ بن گیا تو قدم قدم پر وہ ناقابلِ یقین مناظر دیکھتا رہا۔ جب وطن کی دائمی ریاست عارضی حکومتوں کے پاؤں تلے روندی جا رہی تھی۔ قائداعظم کی سدھائی ہوئی بیوروکریسی کو اصلاحات کے پتھروں سے سنگسار کیا جا رہا تھا اور حاکموں کے ذاتی مفادات حسنِ انتظام (Good governance) کو تباہ کر رہے تھے۔

یہ کب شروع ہوا؟... کیوں ہوا؟... کیسے ہوا؟... ان سب کی جھلک ان صفحات میں موجود ہے۔

مسعود مفتی

اسلام آباد

۱۰؍جولائی ۲۰۱۷ء

ابتدائیہ

اس دفعہ بھی جون کا مہینہ ہمیشہ کی طرح تپ رہا تھا، مگر پچھلے چند روز تو بقول پطرس ''بہت ہی جون'' تھے کہ ہر شے ہمیشہ سے زیادہ جھلس رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بجلی کی لوڈ شیڈنگ (Load Shedding) گویا دوزخ کی کھڑکیاں کھول رہی تھی۔

ایک بے کل رات کے بعد چمکتا دمکتا مغرور سا سورج نکلا تو قدرت کے اٹل قانون کی گرفت میں آ گیا کہ ہر کمالے را زوالے، ہر شدت اپنی فنا آپ ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ سورج کی اپنی شدت کے اُٹھائے ہوئے بخارات کے گہرے بادلوں نے اس کا چہرہ ایسے چھپا دیا جیسے آج کل زیرِحراست دہشت گردوں کو چادر سے ڈھانک کر لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔

پھر تپتی ترستی زمین کی پیاس زوردار رِم جھم سے بجھنے لگی اور جھلستی لُو کے گرم تھپیڑے دیکھتے ہی دیکھتے فرحت بخش ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں میں ڈھلنے لگے۔ فون کی گھنٹی بھی گویا سرشاری کے عالم میں بول اُٹھی... ترررن... ترررن۔

میں نے فون اُٹھایا تو ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کہہ رہے تھے، ''۸۰ ویں سال کی پہلی بارش مبارک!''

تب مجھے احساس ہوا کہ سرکاری ریکارڈ میں درج شدہ میری تاریخ پیدائش پروفیسر ریاض جیسے باخبر انسان سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ شکریے کے ساتھ ہی میں نے ان کے شاعرانہ مزاج کی بھی داد دی کہ انھوں نے حال کی بارانِ رحمت اور ماضی کی ۷۹ برس پرانی پیدائش کو دو مصرعوں کے انداز میں ایک شعر کی طرح جوڑ دیا تھا۔

مجھے تو اپنی سالگرہ کبھی یاد نہیں رہتی۔ بچے البتہ غل غپاڑہ کر لیتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر ریاض کے خیال میں یہ سالگرہ اسی لیے اہم تھی کہ عمر کے شمار میں ۷ کے ہندسے نے ۸ کے ہندسے کو جگہ دے دی تھی۔ اگر ایک دہائی کو ایک منزل سے تشبیہ دی جائے تو اس طرح میرا داخلہ اب زندگی کے مینار کی آٹھویں منزل میں ہو گیا تھا۔

سالانہ گنتی کا یہ دن آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ مگر مجھے سوچ کی بھول بھلیوں میں چھوڑ گیا کہ کیا

زندگی کا یہ مرحلہ واقعی اتنا قابلِ ذکر تھا جتنا ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے۔ بظاہر تو اس کی اہمیت صرف اتنی ہی ہے کہ آٹھویں منزل میں کھڑے ہو کر اگر ہاتھ اُوپر اُٹھایا جائے تو وہ صدی کی چھت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ کیا ہے؟ سرکاری ملازم جب ریٹائر ہو جائے تو زندگی کی یکساں سیدھی لکیر کا کوئی لمحہ یا دن کسی دوسرے لمحے یا دن کو یہ آنکھیں نہیں دکھا سکتا کہ میں تم سے افضل ہوں۔

میں سوچتا کہ یہ ہندسے ہماری زندگی کی پیمائش تو کر سکتے ہیں۔ مگر معینہ سانسوں کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ میری سوچ بے نتیجہ ہی رہی۔

لیکن علمِ ہندسہ (Numerology) والے صدیوں پہلے اپنا نتیجہ مرتب کر چکے تھے۔ اڑھائی ہزار برس پہلے یونان کے فلاسفر فیثا غورث (Pythagorus) نے جب ہندسہ شناسی کو علم کے قالب میں ڈھالا تو اس کی بنیاد یہ بتائی کہ ہندسوں کی اپنی روحانیت ہوتی ہے۔ ہر ہندسہ کسی ایک حرف کا ساتھی یا رفیق ہوتا ہے اور انسانی جسم اور روح کے باہمی رشتے کی طرح یہ بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ (غالباً ۲۸ حروف تہجی کو آٹھ کلمات ابجد، ہوز، حُطّی وغیرہ میں بھی ایسے ہی تقسیم کیا گیا اور شاعری میں تاریخ گوئی نمودار ہوئی)۔ چنانچہ علمِ ہندسہ کے مطابق انسان کی تاریخِ پیدائش (یا شاید نام کے حروف) کا مجموعہ سات ہو تو وہ انسان سنجیدہ سوچ اور متوازن فہم و فراست کا حامل ہوتا ہے لیکن اگر آٹھ ہو تو وہی انسان مردم آزار بن کر طاقت اور اقتدار کی دوڑ میں شامل رہتا ہے۔ اس طرح ان دونوں ہندسوں کا اپنا اپنا کردار اور اپنی اپنی علیحدہ روحانی قوت ہے۔

یہ تو خدا ہی جانے کہ روحانیت میں کس قسم کی اور کتنی قوت ہے۔ لیکن ہماری اُمتِ مسلمہ روحانیت کے نام پر صدیوں سے مسلسل بے وقوف بنائی جاتی رہی ہے۔ کبھی امت کے اندر سے روحانی کذاب اُبھرے، کبھی باہر سے لارنس آف عریبیہ (Lawrence of Arabia) آئے۔ کبھی نقلی پیر و مرشد ... کبھی مصنوعی تصوف کے شعبدہ باز اور کبھی راہِ طریقت کے خود ساختہ داعی اپنے منافع بخش کاروبار چمکاتے رہے۔ اس لیے میری نظر میں محض روحانیت پر مبنی علم مشکوک ہی رہتا ہے۔ جب تک وہ کوئی ٹھوس حقیقت بھی بے نقاب نہ کر سکے۔

چنانچہ ہندسوں کی تخیلی روحانیت سے دامن بچا کر میں نے زمان و مکان میں رچی ہوئی زمینی اور دیہاتی فراست کا سہارا لیا تو وہ بھی زندگی کی سات، آٹھ اور نو کی دہائیوں کو اس لحاظ سے قابلِ توجہ سمجھتی ہے۔ کہ ان ہندسوں تک پہنچنے والی زندگی ہم سے نئی سرگوشیاں کرنے لگتی ہے۔ یعنی وہ سرگوشیاں جو پیش روز زندگی میں کبھی محنت اور کبھی مصلحت، خودنمائی، منافقت اور خوشامد میں ڈوبی رہتی

تھیں، اب صاف سنائی دینے لگتی ہیں، کیونکہ اب زندگی کی دوڑ ساکت ہے۔ دروں بینی بیدار ہو رہی ہے اور سماعت میں طلب ہے۔

شاید اسی وجہ سے یہ عظیم اور ناقابلِ فہم خدائی نظام زندگی کو ان ہندسوں تک پہنچنے سے پیشتر ہی ختم کر دیتا ہے۔ غالباً قدرت کی منشا یہی ہے کہ جب انسان کو زندگی کی سمجھ آنے لگے تو اسے اوپر اٹھا لیا جائے تاکہ غیر معتبر انسان ابلیس جیسی کسی سرکشی کے قابل نہ ہو سکے۔ جس کی تخلیق میں ہی مضمر خرابی کا سورۂ بقرہ میں ذکر ہے کہ وہ دنیا میں فساد کرائے گا۔

ان سرگوشیوں کا دلچسپ جائزہ ایک امریکن مصنف[1] نے اس وقت لیا ہے جب وہ خود ۸۰ برس کا ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ ۹۴ برس تک زندہ رہنے والے میرے والد اکثر کہتے تھے کہ عمر کی آٹھویں دہائی اُن کی زندگی کا سب سے سبق آموز حصہ تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے (جیسا کہ اب میں خود محسوس کرنے لگا ہوں) کہ:

> میرا ذہنی تناظر اب سکڑنے کی بجائے پھیل رہا ہے۔ کیونکہ میرا تجربہ اور مشاہدہ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ اپنی زندگی کا تجربہ اور دوسروں کی زندگی کا مشاہدہ دونوں ہی فزوں تر ہیں ... میری چشم تماشا کی رسائی اب تاریخ کو اتنا بھرپور، معنی خیز اور جاندار بناتی جا رہی ہے کہ گزری عمر میں اس کا احساس بھی ممکن نہ تھا ... اب میں صرف ذہنی طور پر تصور ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی رگ و پے میں محسوس بھی کر سکتا ہوں کہ ایک صدی کیا ہوتی ہے۔ جبکہ چالیس یا ساٹھ برس کی عمر میں یہ میرے ادراک سے بھی پرے تھا ... اب میں یہ نہیں سوچتا کہ بڑھاپا ایک ایسا تلخ روگ ہے جسے کسی نہ کسی رنگ میں برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ بلکہ میں اسے جسمانی فراغت اور ذہنی آزادی کا ایسا زمانہ سمجھتا ہوں جس میں ماضی کی ہر فرضی عجلت اور غیر ضروری بے صبری سے رہائی مل جاتی ہے ... چنانچہ اب اپنے والد کے اعتراف کے بعد میں ۸۰ کی دہائی کے آنے والے انکشافات کا مسرت سے انتظار کرنے لگا ہوں۔

آلیور سیک (Oliver Sack) خود بوڑھا ہے۔ مگر ساتھ ہی ایسا نیورولوجسٹ (neurologist) ہے جو صرف بڑھاپے کی بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ وہ اپنے پیشہ ورانہ لب و لہجے میں ہمیں کچھ سمجھا رہا ہے کہ ہم بڑھاپے سے ہراساں نہ ہوں۔ بلکہ اُس کے مثبت پہلوؤں (یعنی زندگی کی سرگوشیوں) پر بھی نظر رکھیں۔ ہماری زمینی اور دیہاتی فراست بھی یہی بات ہمیں یوں سمجھاتی رہی ہے کہ زندگی ایک ایسا مینار ہے جس کے اوپر چڑھنے کی مجبوری ہے۔ مگر نیچے اُترنے کی مختاری نہیں۔ اس غیر متوازن صورتِ حال کا ازالہ یوں ہوتا ہے کہ نئی بلندی نئے مناظر بھی کھولتی جاتی ہے، جو پہلے نظر سے اوجھل رہتے تھے۔

ہر مینار کی طرح عمر کی بھی کئی منزلیں ہیں اور ہر منزل پر پہنچ کر اردگرد کا منظرنامہ نہ صرف

وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے بلکہ اس کا مجموعی تاثر بھی بدلتا جاتا ہے۔ پھر صاف سے شفاف تر فضا میں اوپر جاتے ہوئے ہماری بصارت میں نئی بصیرت بھی رچنے لگتی ہے۔ اور ہم صرف دل و دماغ سے سوچنے کی بجائے اپنی پوری شخصیت سے محسوس کرتے ہوئے چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں سفر اور سوچوں سے جسم تو نڈھال ہو جاتا ہے۔ مگر روح بالغ نظر ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کا رابطہ مزید بلندیوں پر ان دیکھے حقائق سے ہونے لگتا ہے۔ اور یہ نادیدہ مذہبی صلاحیت اُڑن کھٹولوں کے ذریعے اپنے مذہب کے اُفق میں گم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کے مطابق میں ایسے ہی مراحل طے کرتا کرتا اب آٹھویں منزل میں پہنچ گیا ہوں۔ مگر شاید انھیں علم نہیں کہ میں یہاں سے اردگرد کے مناظر نہیں دیکھ رہا۔ بلکہ صرف نیچے جھانک رہا ہوں تا کہ نیچے سے اوپر تک ان راہوں کا جائزہ لے سکوں جن سے گزر کر میں یہاں تک آ گیا ہوں اور دل ہی دل میں حیران ہو رہا ہوں۔ مینار کی بلندی پر، اپنی رسائی پر، سفر کی صعوبتوں پر اور اس مصرعے کی گہرائی پر کہ

ع   آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

ارے یہ کیا؟... کہیں میں نے آپ کو غلط تاثر تو نہیں دے دیا کہ میں اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہوں... اگر ایسا ہے تو فوری معذرت... میرا موضوع ''میں'' نہیں ہے۔ بلکہ میرا ''راستہ'' ہے۔ اس راستے پر مجھے انسانی ''مَیں'' کے ایسے ایسے روپ اور شعبدے نظر آتے رہے۔ کہ میں اب اپنے آپ سے بچ بچ کے ہی چلتا ہوں۔ (باوجود اس پیہم خطرے کے کہ ہمارے معاشرے میں اگر کوئی انکساری برتے تو لوگ اسے سچ سمجھ کر کم تر درجہ دینے لگتے ہیں)... ماضی کی تاریخ کے سارے مناظر بھی ''میں'' کے خنجر سے ہی خون آلود ہوتے رہے ہیں... کبھی مسجدوں، مندروں اور کلیساؤں میں اپنی ذات کی بخشش ڈھونڈنے والوں کی ''میں'' تقوے کے تکبر پر چڑھ کر انسانیت کے زمینی رشتوں کو اس طرح بھول جاتی ہے جیسے حقوق العباد کو ''میں'' کا گرہن لگ جائے... پھر اسی گرہن سے فرقہ واریت اور سارے مذہبی جنون جنم لیتے ہیں... اقتدار کی دوڑ میں بھی تیزی ''میں'' کی حرارت سے ہی آتی ہے... دل کے معاملات میں بھی من و تو کا توازن ''میں'' کی وجہ سے ڈول کر کبھی نفرت اور کبھی محبت بن جاتا ہے... میرے خیال میں آپ بیتی لکھنے کی خواہش بھی دورِ حیات کی اس ''میں'' کا ہی تقاضا ہوتی ہے۔ جو بعد از مرگ بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ حالانکہ یہ حق صرف اُن افراد کا ہے جنھوں نے انسان یا کائنات کی بہتری اور بھلائی کے لیے کوئی درخشاں نقشِ پا چھوڑے ہوں۔

میں چونکہ ایسے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لیے آپ بیتی لکھنے سے گریز کرتا ہوں۔ اس

کی ایک اور وجہ بھی ہے... کہ آپ بیتی لکھنے والے کی تخلیقی صلاحیتیں معطل اور فالتو ہو جاتی ہیں۔ افسانہ یا ناول نگار کے برعکس یہاں نہ تو تخیل کی پرواز مصنف کی ہے، نہ جذبے کی اُٹھان اس کی، نہ وہ اس کا پلاٹ سوچ سکا، نہ اس کے کردار ایجاد کر سکا، نہ اتفاقات تراش سکا، نہ حادثات گھڑ سکا... آپ بیتی کے مندرجات تو اس مستعار زندگی کے نقش و نگار ہوتے ہیں جسے لوحِ محفوظ کے مطابق خالق نے مصنف کو تخلیق کیا۔ پھر پھل دار درخت کے بیج کی طرح مقررہ موسم (یعنی عمر) میں نمود و افزائش کے مدارج طے کرائے اور پھر معینہ مقدار کے سانسوں کے بعد اپنے پاس واپس بلا لیا۔ ہر زندگی دراصل ایک عرشی ''کُن'' کی زمینی فرش پر ایک فدویانہ ''فیکون'' ہوتی ہے۔ یعنی ایک خدائی کارروائی کی تکمیلی رپورٹ (completion report) ہوتی ہے۔ اس میں سے اگر کوئی تحسین کا پہلو نکلتا ہے تو وہ دراصل خالق کی تخلیق کے ایک نمونے کی تحسین ہے۔ مصنف کی کارگزاری صرف اُس کی تحریر کا اسلوب ہے... یا اگر وہ مانے تو سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ کا تناسب ہے۔ مگر اس کی کوشش کا بھی المیہ یہ ہے کہ مصنف کے پورے سچ کو بھی اکثر قاری پورا سچ نہیں مانتے اور ہر ورق پر مصنف کا اعتماد داؤ پر لگا رہتا ہے۔

اور پھر سب سے بڑی وجہ... میں نے بہت سی آپ بیتیاں پڑھی ہیں۔ مگر کسی سے بھی مجھے اپنی ہمہ وقت کرید کا جواب نہیں ملا کہ ہماری زندگیوں میں تقدیر اور تدبیر کا تناسب کیا ہے؟... یا مجبوری اور مختاری کی حد بندی کیا ہے؟ ''مشیت'' کتنی اور ''میں'' کتنا؟

چنانچہ میں آپ بیتی لکھنے سے گریز کرتا ہوں... لیکن آپ کا اعتراض بھی بالکل بجا ہے کہ اگر میں آپ بیتی نہیں لکھ رہا تو پھر اپنی زندگی کے مینار کی آٹھویں منزل سے نیچے کیوں جھانک رہا ہوں۔

جی نہیں... میں نیچے جھانک کر اپنے مینار کو نہیں دیکھ رہا۔ بلکہ ایک دوسرے مینار کی بنیاد، اُٹھان اور منازل میں جھانک رہا ہوں جو بالکل متصل ہے۔ کم و بیش میرا ہم عمر ہے اور جس کا ذہنی تصور میری پیدائش کے آس پاس کے زمانے میں ہوا تھا۔ جب ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے پہلے تو خطبۂ الٰہ آباد میں ہندوستان کے کچھ حصوں میں مسلمان ریاست کا خیال پیش کیا تھا اور جب قومی قیادت علماء اور اُس وقت کی مسلم لیگ نے اس خیال کو نظر انداز کیا تو پھر دو برس بعد ۱۹۳۲ء میں کُل ہند مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے،

> بزرگ نسل کی گمراہی کا علاج نوجوانوں کے عزم و عمل میں دیکھتے ہوئے... یوتھ لیگز (Youth Leagues) کے قیام پر زور دیا اور نوجوانوں کی ان انجمنوں کے اراکین کو دور دراز قصبات اور دیہات تک پھیل کر تہذیبی اور اقتصادی شعور عام کرنے کا پروگرام دیا۔[۲]

اس طرح میں اور اقبال کا تصورِ پاکستان دونوں قریب قریب ہم عمر ہیں۔ تصور صرف اتنا بڑا کہ جب میں ہوش سنبھال رہا تھا اور میرا مینار تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھا، تو ایک نئی مملکت کے تصورات بھی اُبھرنے لگ گئے تھے۔ ایک غبار آلود مرغولے کی طرح۔ جس کا جنین (embryo) ۱۹۴۰ء میں لاہور ریزولیوشن کے بطن سے پیدا ہوا۔ دھیرے دھیرے قومی مطالبے میں ڈھلا۔ پھر قومی جدوجہد میں بدل گیا۔ پھر یہ مشیت کی طرف سے مقبولیت کا معجزہ بن گیا۔ بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور کی کرفیو زدہ رات کے بارہ بجے "ریڈیو پاکستان" کا پہلا اعلان کوہِ رحمت سے ایک ندا کی طرح اُبھرا اور سورۂ فتح کی تلاوت کے بعد مولانا ظفر علی خاں کی نعت سے نئی مملکت کے مینار کی تعمیر شروع ہوئی۔ اُس وقت مجھے یوں لگا کہ میرا نامکمل مینار کسی طلسماتی انداز میں اس نئے مینار کے اندر سما گیا ہے ۔

من تو شدم، تو من شدی
تا کس نہ گوئید بعد ازیں
من دیگرم تو دیگری!!

اس کے بعد دونوں مینار اونچے اُٹھنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ... دن بہ دن... سال بہ سال... مگر کچھ ایسے پیچیدہ انداز میں کہ بظاہر دو تھے۔ مگر دراصل ایک تھے۔ کیونکہ میرا مینار مکمل طور پر دوسرے مینار میں مدغم ہو چکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا مینار تو میری پیدائش کے بعد بننے لگا تھا۔ مگر نئی مملکت کے مینار کی زیرِ زمین پوشیدہ بنیاد بہت گہری تھی جو برِعظیم ہندوستان کی سرزمین پر باہر سے آنے والے محمد بن قاسم کے وقت سے اُٹھائی جا رہی تھی۔ جیسے کول اور دراوڑوں کی اس سرزمین پر صدیوں پہلے باہر سے آنے والے آریاؤں نے کبھی اپنے مینار کی بنیاد اُٹھائی تھی، مگر ان کی آئندہ نسلوں نے بددیانتی سے اس سرزمین کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دیا اور بے جا ضد کرتے تھے کہ کسی اور کو یہاں نیا مینار بنانے اور اُٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

میرے مینار کی تعمیر صرف چند برس پہلے شروع ہوئی تھی اور یہ بنیاد کے بغیر زیست کی سطح پر محض شجرۂ نسب کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کے برعکس نئی مملکت کے مینار کی گہری جڑیں اور بنیادیں پرانی تواریخ میں سے اُٹھائی گئی تھیں۔ اس لیے میرا مینار قدرے بڑا ہونے کے باوجود کوتاہ قد تھا۔ جسامت میں بھی، روح میں بھی اور تخلیقی تصور میں بھی۔ چنانچہ میرا مینار نئی مملکت کے مینار میں ایسے عجیب طریقے سے سما گیا کہ اب میں دونوں میناروں کو نہ صرف دیکھ سکتا تھا بلکہ بیک وقت دونوں کے اندر بھی جھانک سکتا تھا۔ دونوں کی ہر منزل پر کھلنے والے دروازے میری دسترس میں تھے۔ ان کے

جھرنوں سے گزرنے والی ہواؤں کی سرسراہٹ سن سکتا تھا اور ان کے جھونکے اپنے جسم پر محسوس کر سکتا تھا۔ میرا بدن ایک پر ہوتا تھا اور اُمنگیں دوسرے پر ہوتی تھیں۔ شعوری نظر ایک پر اور لاشعوری احساس دوسرے پر تھا۔ کسی بلند پرواز طائر کی طرح میری نظر ہر دم دونوں پر رہتی تھی اور کسی غیر مرئی روح کی طرح میری جان بھی دونوں میں پھیلی تھی۔

اس لیے اب میں آٹھویں منزل سے نیچے جھانک کر دیکھتا ہوں تو دونوں کے مشترکہ احساسات ریشم کے کوئے کے تاروں کی طرح میرے جسم، دل، دماغ بلکہ روح کے اردگرد لپیٹے جا رہے ہیں اور پوری طرح مجھے اپنی مضبوط گرفت کی گولائیوں میں لپیٹتے جا رہے ہیں۔

اس وقت مجھے اس بلندی سے دونوں میناروں کی ہر منزل میں کچھ عناصر کے ہیولے ایسے واضح دکھائی دے رہے ہیں جیسے ایکس رے (X-Ray) کی فلم پر پھیلی ہوئی تاریکی میں ہڈیوں کا اُجلا ڈھانچہ بلند چغلی کھاتا ہے کہ وہ پوشیدہ اور مستور نہیں رہا۔

میری متجسس نظریں بے تاب ہیں۔ یہ کبھی دونوں متصل میناروں کی باہمی پیوستگی کا طواف کرنے لگتی ہیں۔ کبھی نیم وا آنکھیں کسی اکیلے منظر میں دھنس جاتی ہیں اور کبھی غور کی شعاعیں کسی کونے کھدرے میں ٹکٹکی بن کر جم جاتی ہیں۔

زندگی کا سفر کٹھن اور مشکل ہے۔ کبھی چمکیلی دھوپ۔ کبھی ٹھنڈی چھاؤں۔ کبھی مخملیں فرش کی شادمانی اور کبھی نوکیلے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں کی لہولہان آبلہ پائی۔ عمر کی جبری رفتار کا مسلسل دباؤ ہمیں صرف آگے کی طرف ایسے دھکیلتا رہتا ہے کہ جو مرحلہ گزر گیا سو گزر گیا۔ اس سے آگے کوئی مشابہت تو دکھائی دے سکتی ہے۔ مگر سابقہ مرحلہ دُہرایا نہیں جا سکتا۔ صرف اس کی یاد، کسک یا پچھتاوے کسی سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہ جاتے ہیں۔ ہاتھ اس سائے کو پہلے کی طرح چھو نہیں سکتے۔ آنکھ اسے پہلے کی طرح دیکھ نہیں سکتی۔ اور وہ تناظر مرئی تجسیم سے غیر مرئی حسیات میں ایسے ڈھل جاتا ہے جیسے وقتاً فوقتاً مادّے کی ماہیت بدلتی جاتی ہے۔ کبھی ٹھوس سے مائع اور کبھی مائع سے گیس۔ ٹھوس کو ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ مائع میں اُنگلی ڈوب سکتی ہے۔ مگر گیس کے لیے اُنگلی اور ہاتھ کی مٹھی دونوں بیکار ہی ہیں۔ اس طرح مادّے کا روپ بھی بدلا، کردار بھی بدلا اور روح بھی بدلی اور آخر میں جو کچھ بنا وہ ہوا میں تحلیل ہو جانے کے قابل بن گیا۔

اسی طرح انسان کے اندر بھی زندگی بھر کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ بیرونی تناظر، اندرونی شعور اور لاشعور، لامحدود اجتماعی لاشعور، عقیدوں اور مفروضوں کی آندھیاں، تجربے، حادثے، اور رشتے کا ٹکراؤ۔ امیدوں، اُمنگوں کا عروج و زوال۔ یہ سب کسی کیمیائی عمل کی طرح ہمارے اندر جینز

(genes) کی پوشیدہ پھلکاری کے رنگ اور نمونے کو بدلتے رہتے ہیں۔ اسی عمل میں عمر کے مینار کی پہلی منزل پر جو بصارت اور بصیرت ہوتی ہے وہ ایک سیر بین (kaleidoscope) کے مناظر کی طرح بدلتی رہتی ہے اور آٹھویں اور نویں منازل پر جاتے جاتے ایسے ہی تبدیل ہو جاتی ہے، جیسے بند بوتل میں خلا پیدا کر کے بجلی گزارنے سے نامعلوم قسم کی شعاعیں نکلنے لگتی ہیں۔ جنھیں نامعلوم ہونے کی وجہ سے ایکس ریز (X-rays) کا نام دیا گیا۔ شاید اسی وجہ سے آلیور سیک اور اُس کا باپ زندگی کی آٹھویں دہائی کو سرمایۂ حیات سمجھتے تھے اور شاید آج اس بلندی سے مجھے اسی لیے وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو ان دنوں نظر نہیں آتا تھا، جب میں اس راستے سے گزر رہا تھا... اور اگر نظر آتا تھا تو فہم سے بالا تھا۔ وہ نظریں صرف رگ و پے تک سرایت کرتی تھیں۔ لیکن آج کی فراغت، بصیرت اور یکسوئی ہر ڈھانچے کے اندر تک نفوذ و سرایت کر جاتی ہے۔

میں نیچے جھانکتا ہوں۔ تو دو مدغم میناروں کے دھندلے خاکے آپس میں خلط ملط ہیں۔ میرے مینار میں چند چہرے ہیں۔ لیکن وطن کا مینار لوگوں سے چھلک رہا ہے۔ نیچے کی منزلوں میں بہت کم مگر بتدریج اوپر آتے آتے ایک انبوہِ کثیر بنتا جاتا ہے۔

میں نظر بھر کر دیکھتا ہوں تو وطن کے مینار کی پہلی منزل بڑی مختلف ہے۔ یہ شفاف اور روشن ہے۔ اس میں لوگ بھی نسبتاً کم ہیں۔ ان کے چہرے بشاش ہیں۔ پیشانیوں سے اطمینان جھلکتا ہے۔ آنکھوں میں اُمید ہے۔ زندگی سے قربت کی وجہ سے ان کے بدن آسودہ ہیں۔ چال میں خود اعتمادی ہے۔ تیور میں کچھ کر گزرنے کی تمنا ہے۔ مگر ساتھ ہی شخصیت کے اردگرد قناعت کے ہالے بھی ہیں۔ جیسے تدبیر اور تقدیر دونوں متناسب انداز میں ہم قدم ہوں۔

میری نظریں دھیرے دھیرے مینار کی بلندی کے ساتھ ساتھ اوپر اُٹھتی ہیں۔ تو منزل بہ منزل مناظر کے رنگ و ہیئت بدلتے جاتے ہیں۔ لوگ بتدریج زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی بشاشت ماند پڑتی جاتی ہے۔ چہروں کے رنگ پھیکے پڑتے جاتے ہیں۔ پیشانیوں پر فکر و تشویش کے قطرے ابھرنے لگتے ہیں۔ آنکھوں کی امید گرہن زدہ ہے۔ چال سے اعتماد غائب ہونے لگتا ہے اور تیوروں میں اضمحلال کے آثار ہیں۔ وہ گلہ نہیں کرتے مگر واضح طور پر قسمت سے شاکی نظر آ رہے ہیں۔ کیونکہ قناعت غائب ہوتی رہی ہے۔

اب میری نظروں میں مزید غور ہے۔ میں منزل بہ منزل ہجوم کا جائزہ لیتے ہوئے اُوپر کی طرف آنکھیں اُٹھاتا جاتا ہوں۔ تو یکے بعد دیگرے ہر منزل پر کچھ نہ کچھ تبدیلی ہے۔

چہروں پر کرب کے سائے بڑھ رہے ہیں

ان سایوں سے چہروں کے نقوش دھندلا رہے ہیں
اس دھندلاہٹ سے چہرے تحلیل ہونے لگتے ہیں
اور بالآخر بے چہرہ لوگوں کا ازدحام ہے
یوں لگتا ہے یہاں لوگ ہی لوگ ہیں۔ مگر فرد کوئی بھی نہیں۔ شخصی تراش خراش مفقود ہے۔
اچھی یا بری ذات کی حد بندی نہیں اور من و تو کی پہچان نہیں۔
بے شمار لوگوں کا یک رنگا ہجوم جو بے چہرہ ہی نہیں بے آواز اور بے سمت بھی ہے۔ بے تدبیر اور بے عمل بھی ہے۔

اجتماعی طور پر سب کی حسیات کسی مسیحا یا مصلح کے انتظار میں فکر و عمل کو معطل کر کے صرف دعاؤں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بالکل اسی انداز میں جیسے بھیڑوں کا سارا ریوڑ سر جھکائے صرف پیٹ بھرنے کے لیے ادھر سے اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر سفید اون کی علیحدہ علیحدہ گولائی تو ہوتی ہے۔ مگر پورے منظر پر ایک سیدھی سی سپاٹ یکسانیت سفید فرش کی طرح بچھی ہوتی ہے جس میں نہ تو کسی ایک پشت کی گولائی کا احساس ہوتا ہے نہ ہی کسی انفرادی بھیڑ کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔

ایسی ہی یک رنگی وطن کے مینار کی درمیانی اور بالائی منازل کے پورے منظر پر چھائی ہوئی ہے۔
وہی تاریک یکسانیت جو ایکس رے پلیٹ پر حاوی ہوتی ہے۔

میں پھر سوچنے لگتا ہوں۔ اس پلیٹ کی تاریک یکسانیت تو دانستہ طاری کی جاتی ہے تاکہ صرف مخفی ڈھانچہ ہی روشن ہو کر نمایاں ہو سکے۔ مگر یہاں تو ہر شے اسی تاریک یکسانیت میں گم ہے کچھ بھی روشن نہیں ہے...

شاید یہ تاریکی بھی اتنی ہی دانستہ ہے ... کچھ اُجاگر کرنے کے لیے نہیں بلکہ سب کچھ چھپانے کے لیے... مثبت کی بجائے منفی مقاصد کے لیے۔

میں پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں۔ اپنی نظریں اس تاریک یکسانیت میں گھسیڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تو مجھے یہاں بھی کسی ڈھانچے کے مدھم سے ہیولے کا گمان پڑتا ہے۔ مگر یہ ایکس رے کا روشن حصہ نہیں بلکہ اس کے تاریک حصے کا تاریک تر ہیولیٰ ہے۔ غیر واضح ہے۔ کچھ بے ڈھب سایوں کا غیر متناسب اور بے ترتیب سا پھیلاؤ ہے۔ یہ پورے مینار کی ساری جسامت میں ایسے لرز اور منڈلا رہا ہے، جیسے کسی گرد باد کے مرغولے اپنا حجم، گردش، سمت اور رفتار بدلتے رہتے ہیں۔

مزید غور ... ان ہیولوں کے اندر چند گہری اور گاڑھی تاریکیاں بھی لہرا رہی ہیں ... یہ کیا ہیں؟

... یہ کون ہیں ... مجھے پہچان تو نہیں ہے، مگر ایک احساس سا اُبھرتا ہے کہ یہ کون ... یا کیا ... ہو سکتے ہیں۔

با اثر افراد ... ؟؟؟

نامعلوم افراد ... ؟؟؟

گونگی اشرافیہ کے افراد ... ؟؟؟

ایسے افراد جو کبھی غائب اور کبھی حاضر ہیں ... ؟؟؟

میری نظریں بے اختیار اپنے مینار کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ جو کھڑا تو ضرور ہے مگر نہ معلوم کتنی دفعہ ان میں سے بعض سایوں سے ٹکراؤ کی وجہ سے اس کے کچھ حصے ٹوٹ بھی چکے ہیں۔

مگر ٹھہریے ... یہ میری آپ بیتی نہیں ہے ... یہ تو صرف میرے وطن کی بپتی کا تھوڑا سا حصہ ہے ... محدود جادہ پیمائی ... جزوی راہ بیتی ... جن راستوں سے میں گزرا ہوں ان کے کچھ حصے۔ ان میں ''میں'' نہیں بلکہ ''وہ'' ہی وہ ہیں ... جنھیں میں نے دیکھا ... برداشت کیا ... ان سب سے میرا تعلق صرف اتنا ہی ہے، جتنا ایک راوی کا اپنے موضوع سے ہوتا ہے ... یا ایک راہ گیر کا اپنے رہبروں سے ہوتا ہے۔ یا پھر اُن راہزنوں سے جو اس کے راہبر بن کے اسے لوٹتے رہتے ہیں۔

سارے زخم دکھائے بھی تو نہیں جا سکتے۔ کئی باقی رہ جاتے ہیں ... جو اندرونی کسک بن جاتے ہیں ...

خیال بتایا جا سکتا ہے ... جذبہ خوشبو کی طرح پہنچایا جا سکتا ہے ... مگر کسک اندر ہی رہ جاتی ہے جس کے اِکا دُکا بلبلے کبھی کبھار صفحۂ قرطاس سے ابھرتے ہیں۔ اور قلم کی نوک سے پھٹ کر مختلف اصنافِ ادب میں ڈھل جاتے ہیں۔

یہ رپورتاژ بھی درد کا ایسا ہی بلبلا ہے۔

حواشی

۱۔ Oliver Sacks, Professor of Neurology at N.Y U School of Medicine Author of ten books, including the latest, *Halucinations*.

۲۔ پروفیسر فتح محمد ملک، اقبال فراموشی، ص: ۴۳۔

دورِ غلامی کا حُسنِ انتظام

میرا مینار

ہر آغاز کسی پہل سے ہوتا ہے... لیکن یاد کا آغاز پہل سے نہیں ہوتا۔

بچہ زندگی کا آغاز ہے۔ اس کے سانس کا آغاز بچے کی پہلی چیخ سے ہوتا ہے۔ اس کے لمس کا آغاز ماں کی پہلی گود بھرائی سے ہوتا ہے۔ بھوک کا آغاز پہلے رونے سے ہوتا ہے... اس کے جذبے کا آغاز ماں کے بوسے پر بچے کی پہلی مسکراہٹ سے ہوتا ہے...

صرف یاد کا آغاز پہلی کی بجائے دوسری جنبش سے ہوتا ہے۔ جب سارے حواسِ خمسہ مل کر بچے کا ہاتھ دوسری دفعہ ماں کی طرف بڑھاتے ہیں اور پچھلے لمس کی یاد اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

پھر گھڑی کی سوئیاں تھرک تھرک کر یاد کے طول و عرض کو بڑھانے لگتی ہیں۔ جیسے نمدار مٹی کا گیلا رقبہ دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہو۔

اسی نمدار مٹی میں فہم و فراست کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ نہ معلوم ان کونپلوں کے جھرمٹ میں سے کون سی یاد لاشعور کے تہ خانے میں جا چھپتی ہے اور کون سی شعور کے ماتھے کا زیور بن کر دمکنے لگتی ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میرے مینار کی اٹھان کا آغاز انہی شعوری یادوں کے گنجلک سے ہوتا ہے۔

میں اسی گنجلک میں سے ایک تار کھینچ کر اپنی پہلی یادوں کو دیکھ رہا ہوں۔

نسبتاً بڑے سائز کی کتاب جس میں تصاویر ہی تصاویر تھیں۔ چند ایک عام کتابوں کی طرح سیاہ و سفید۔ مگر زیادہ تر سفید و سنہری۔ اس سجی ہوئی البم میں تمام تصاویر علامہ اقبال کی تھیں جو کچھ ہی عرصہ پہلے ۱۹۳۸ء میں فوت ہوئے تھے۔

میں اس گنجلک میں سے دوسرا تار کھینچتا ہوں... مگر وہ تار لمبا ہی لمبا ہوتا جاتا ہے۔

ایک تماشا

میں اکثر شاموں کو گھر کے صدر دروازے سے نکل کر مونڈھے پر بیٹھ جاتا، تاکہ ایک تماشا دیکھ سکوں۔ بغیر اس احساس کے کہ اس تماشے میں مجھے زندگی کے قیمتی سبق مل رہے ہیں۔ کسی نئے پھوٹنے والے بیج کی طرح میں تہہ در تہہ مٹی جیسی کم فہمی میں لپٹا ہوا تھا۔ اپنے ہی آئندہ پھیلاؤ سے لاعلم۔ گرد و پیش سے بالکل لاتعلق۔ پورا وجود چشمِ حیرت بنا ہوا۔ مجھے ادراک ہی نہ تھا کہ مجھے کوئی سبق پڑھایا جا رہا ہے جو پچیس برس بعد میرے کام آئے گا۔ کیونکہ اس کے معنی تب کھلیں گے، بلکہ یہی خوشی تھی کہ میں ہر شام ایک دلچسپ تماشا دیکھتا ہوں۔

مگر زندگی کا انداز یہی ہے۔ نہ کوئی مکتب نہ مدرس، نہ ڈسپلن، نہ نصاب۔ صرف ایک مسلسل حرکت اور تغیر و تبدل سے اس کے متحرک کھلاڑی اور خاموش تماشائی بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ کبھی فوراً کبھی دھیرے دھیرے۔ کبھی گزرے وقت کی پچھلی کھڑکی سے۔ کبھی پس نظری کے انکشاف سے اور کبھی زندگی کے مینار کی اونچائیوں سے۔ مجھے بھی اس ابتدائی تماشے میں چھپے ہوئے سبق وقتاً فوقتاً تب سمجھ آتے گئے جب میں دھیرے دھیرے اپنے مینار پر بتدریج اوپر جا رہا تھا۔ تیسری اور چوتھی منزل پر پہلی دفعہ اور پھر منزل بہ منزل اور اب اس سب سے اونچی منزل پر اس کی ساری رُوداد یوں بچھی ہوئی نظر آ رہی ہے جیسے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے بہت نیچے زمین پر پھیلے ہوئے وسیع مناظر کی تفصیل ہو۔

دھیرے دھیرے منزل بہ منزل میں سمجھتا گیا کہ علامہ اقبال کون تھے اور ان کی وفات پر سنہری تصویروں والی البم کیوں شائع ہوئی تھی۔

شیر شاہ سوری کی صدیوں پہلے بنائی ہوئی جرنیلی سڑک Grand Trunk Road کی بڑی شاخ گجرات شہر میں سے بیرون شاہ دولی دروازے کی پولیس چوکی کے سامنے سے گزر کر ہمارے گھر کے سامنے سے گزر کر کالری دروازے کی طرف مڑ جاتی تھی۔ ہمارا گھر بہت پرانی طرزِ تعمیر والا جدی مکان تھا۔ اس لیے سرخی اور چونے سے بنائی ہوئی دیواروں کو بڑے بڑے فیل پائے سہارا دیتے تھے۔ اُوپر دُہری چھتیں تھیں۔ بعض دفعہ ہماری اُچھل کود سے اوپر والی لپائی کردہ چھت میں سوراخ ہو جاتا تو ہم لوگ ہنگامی حل کے لیے نچلی چھت پر اینٹیں اور لکڑیاں کھڑی کر کے تختے ڈال

دیتے اور چند روز بعد اُس کی باقاعدہ مرمت اور لپائی ہو جاتی۔ یہ حادثہ ان دنوں ہم بچوں کے لیے میلے کا سماں پیدا کر دیتا تھا۔

ڈیوڑھی سے باہر بڑے صدر دروازے سے متصل دونوں طرف نیلی ملتانی ٹائلوں کے کام سے دو مونڈھے بنے ہوئے تھے جن پر بیٹھنے کے لیے سبقت لے جانے میں ہم سب بچے مقابلے کے نئے نئے حربے آزماتے تھے۔ ہم تو صرف سڑک پر رواں دواں زندگی دیکھنے کے لیے ان پر چڑھنے میں ایک دوسرے کی کھینچا تانی کرتے تھے۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مونڈھے آئندہ کل کے ڈھکے چھپے مکتب ہیں جن کی وساطت سے آج کے تماشوں کی معنوی پرتیں مجھ پر تازندگی کھلتی رہیں گی۔ فی الحال وہ مجھے حُسنِ انتظام (Good governance) کی ابجد سکھا رہے ہیں۔

اس زمانے تک گجرات میں بجلی نہیں آئی تھی اور سڑکوں، چوراہوں، گلیوں اور گھروں میں مٹی کے تیل کے لیمپوں سے روشنی ہوتی تھی۔ رات کو نکلنے والے احتیاطاً ٹارچ یا لالٹین لے لیتے تھے۔ مگر مجموعی طور پر رات کے دوران سارا شہر روشن رہتا تھا۔ گرمی سے بچنے کے لیے ہاتھ سے جھلنے والے پنکھے ہوتے تھے۔ مردوں کے لیے سادہ سے مگر عورتوں کے لیے رنگ برنگ جھالر۔ ربن یا گوٹا کناری والے۔ کمروں اور برآمدوں میں چھت سے لٹکے ہوئے آٹھ دس فٹ لمبے خوبصورت کپڑے کے پنکھے ہوتے تھے۔ جنھیں نیچے سے مسلسل رسّی کھینچ کر چلاتے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے گھروں میں دیگر ملازمین کے علاوہ ایک دو پنکھا قلی بھی ہوتے تھے۔ جن کے لیے عموماً چھوٹے بچوں یا بوڑھی عورتوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔

اس وقت ہم غلام تھے اور وہ انگریز حاکم کا زمانہ تھا۔ جب اسکولوں میں طلباء کو ’’انگریزی راج کی برکتیں‘‘ کے عنوان سے مضامین لکھنے کے لیے گھر کا کام دیا جاتا تھا اور شام کو ان کے والدین انگلیوں پر گنتی کر کے ان برکتوں کی مثالیں بتایا کرتے تھے۔ پاکستان کی مختصر تاریخ میں اسی زمانے کو ہمیشہ ’’نوآبادیاتی نظام‘‘ کہہ کر مہذّب سی گالی دی جاتی ہے۔ مگر برٹش ایمپائر (British Empire) کے دیگر ممالک میں ایسا نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ بھی اس وقت ہماری طرح غلام تھے اور اب ہماری طرح آزاد ہیں۔ گو یہ علیحدہ بات ہے کہ ہماری آزادی کا انداز ان کی آزادی سے مختلف ہے۔ وہ مکمل آزاد ہیں مگر ہماری ذہنی غلامی کی خوئے بد جانے کا نام نہیں لیتی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اکثر مسلم ممالک کی عوام دشمن حکومتیں اپنے خواص کے موروثی اقتدار کو دائمی بنانے کے لیے طاقتور غیروں کی غلامی رضاکارانہ طور پر قبول کر لیتی ہیں۔

سابقہ برٹش ایمپائر کے جن ممالک نے پوری دیانت داری سے اس ذہنی غلامی کو توڑ دیا

انھوں نے انگریزی دور کے ہی انتظامی ڈھانچے کو بنیاد بنا کر محنت اور خلوص سے اپنی اپنی ریاست میں ترقی کے ایوان تعمیر کر لیے۔ مثلاً ملائشیا اور سنگاپور ترقی کے نصف آسمان پر پہنچ گئے۔ سری لنکا نے پہلے اپنی ساری قوم کو پوری طرح تعلیم یافتہ کیا۔ پھر اپنے سے کئی گنا بڑے ہمسائے کی طرف سے ٹھونسی ہوئی طویل خانہ جنگی پر بڑی کامیابی سے قابو پا لیا۔ ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلانے کی عزت ملی۔ ان مثالوں کے برعکس بعض ممالک کی بددیانت حکومتوں نے اپنی لوٹ کھسوٹ کے لیے ریاست کی ظاہری شکل وصورت تو کسی حد تک قائم رکھی، مگر اس کے باطنی انتظامی ڈھانچے کی روح ایسے بدل ڈالی کہ حکومت کو ریاست پر ترجیح ملنے لگی۔ اُس لالچی مچھیرے کی طرح جو گہرے سمندر میں سے مچھلی پکڑ پکڑ کر اتنا ڈھیر لگا لیتا ہے کہ کشتی ڈولنے لگتی ہے۔ مگر وہ اپنی مچھلی کے ڈھیر کو اپنی کشتی کی سلامتی پر ترجیح دیتا ہے۔

اس بدنام نوآبادیاتی نظام میں آج کے پاکستان کی لوڈ شیڈنگ (load shedding) کا تصور بھی نہ تھا اور نہ ہی وہ گالیاں تھیں۔ جو آج کی لوڈ شیڈنگ کے اوقات میں لوگوں کے منہ سے آج کی حکومتوں کے متعلق نکلتی ہیں۔ آج کی مارکیٹ کے برعکس اس زمانے میں موم بتیاں خالص موم کی ہوتی تھیں، جلتی تھیں، وافر تھیں اور بے حد سستی تھیں۔ مٹی کا تیل، پینے کے پانی کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ دستیاب تھا۔ پیٹرومیکس (Petromax) گیس لیمپ، خوبصورت قمقمے اور سڈول لیمپ انگلستان، جاپان اور جرمنی سے درآمد ہوتے تھے۔ اُن کے علاوہ ہر شکل وصورت کے دیگر لیمپ شہر کی گلی گلی میں بنائے جاتے تھے۔ یہ سب ایک ناچیز سی دیا سلائی کے ننھے سے شعلے سے مل کر میلوں پھیلے ہوئے شہر کو ساری رات روشن رکھتے تھے۔ جس کی کشادہ سڑکوں پر بڑے بڑے کھمبے اور لیمپ، چوراہوں پر منجھلے کھمبے اور ویسے ہی لیمپ اور گلیوں میں چھوٹے لیمپ متناسب قد کے کھمبوں یا دیواروں پر نصب ہوتے تھے۔ حسبِ ضرورت باقاعدہ مرمت کی وجہ سے ہر رات قابلِ استعمال رہتے تھے اور شب بھر اپنی بساط کے مطابق روشنی دیتے رہتے تھے۔

یہ لیمپ روشن کیسے کیے جاتے تھے؟ یہی ایک دلچسپ تماشا تھا۔ جو قریباً ہر شام میرا کم سن وجود قدرے دشوار سی اُچھل کود کے بعد مونڈھے پر بیٹھ کر بڑی محویت سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ تماشا بڑی پابندی سے اُس وقت شروع ہوتا جب عصر کی دھوپ کسی شرمندہ چہرے کی طرح اپنی پیلی چمک کھونے لگتی تھی اور شام کی سیاہی نیلے آسمان کے ایک کنارے کو ڈھانکنے لگتی تھی۔

میری نظریں کشادہ پہلوؤں والی پتلی سی سڑک کے اس موڑ پر جم جاتیں جو مٹی کے خوبصورت برتن بنانے والے کالری دروازے کے سامنے سے گھوم کر ہمارے گھر کی طرف مڑتا تھا اور اُس

ریڑھی نما متحرک سی جسامت کو دلچسپی سے دیکھنے لگتیں، جو سڑک کے کنارے کنارے میری طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہوتی۔ پھر لمحہ بہ لمحہ اس کا گورکھ دھندے جیسا خاکہ واضح ہونے لگتا۔

اس زمانے میں سڑکیں بجری اور تارکول سے بنتی تھیں اور تارکول کے چار پانچ فٹ اونچے اور دو تین فٹ چوڑے گول ڈرم خالی ہونے کے بعد زندگی کی بہت سی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک ڈرم کے سامنے سائیکل کا پرانا پہیہ لگا ہوتا اور دوسری طرف دو ہینڈلوں کے درمیان ایک آدمی اس ڈرم کی ریڑھی جیسی جسامت کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوتا۔ بانس کی سیڑھی کے پہلے خانے میں بازو پرو کر وہ سیڑھی کو اپنے کندھے پر ٹکائے ہوتا اور قریباً آٹھ دس فٹ لمبی سیڑھی اس کے پیچھے پھیلی ہوتی جس کے آخری سرے کو ایسے ہی اپنے بازو کے گرد حمائل کر کے دوسرا آدمی بھی اپنے کندھے پر اُٹھائے ہوتا۔ دور سے یوں لگتا کہ ہوا میں لیٹی ہوئی معلق سیڑھی چار انسانی ٹانگوں سے چلتی چلتی ایک ڈرم کو دھکیل کر آگے لا رہی ہے۔ میرے مونڈھے کے قریب آ کر وہ سڑک کے کنارے کھڑے کھمبے تک پہنچ جاتے۔ میں کبھی بیٹھ کے دیکھتا رہتا، کبھی مونڈھے پر کھڑا ہو کر دیکھنے لگتا۔ کبھی چھلانگ لگا کر نیچے کودتا اور بھاگتا ہوا ان کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

وہ دونوں مل کر سیڑھی کو کھمبے کی اونچائی کے ساتھ مضبوطی سے کھڑا کرتے۔ ایک نیچے سے سیڑھی تھامتا، دوسرا اوپر چڑھ کر اپنی کمر کے گرد لپٹے ہوئے تھیلے میں سے جھاڑن نکالتا۔ لیمپ کے گرد شیشے کے چوکور خانے کو ایک طرف سے کھولتا۔ ہاتھ اندر ڈال کر سارے شیشے صاف کرتا۔ تھیلے میں سے قینچی نکال کر لیمپ کی بتی کی قطع برید کرتا۔ تاکہ متناسب قد اور شکل کا شعلہ ایک بلندی تک سر اُٹھائے ساری رات جلتا رہے۔ اس کے فارغ ہوتے ہی نچلا آدمی اپنی کمر کے گرد اسی قسم کے تھیلے سے لیمپ کے سائز کے مطابق ٹین کا سلنڈر نما پیمانہ نکالتا اور ڈرم کی نچلی طرف لگی ہوئی ٹونٹی کھول کر مٹی کے تیل سے پیمانے کو ایک خاص حد تک بھر کر اوپر والے آدمی کو دے دیتا۔ جو احتیاط سے پیمانے کا سارا تیل لیمپ کے پیندے میں انڈیل دیتا۔ یہ پیمانہ صرف اتنا ہی تیل مہیا کرتا تھا جتنا اس سائز کے لیمپ کے لیے صبح تک درکار ہوتا تھا۔ اوپر والا جھاڑن سے آخری صفائی وغیرہ کر کے نیچے چھلانگ لگا دیتا اور دونوں حسبِ سابق سیڑھی کو اپنے اپنے بازو میں پروئے کندھے پر ٹکائے اگلے لیمپ کی طرف چل پڑتے۔

تھوڑی دیر بعد اندھیرا گاڑھا ہونے لگتا تو ایک اکیلا آدمی ویسی ہی سیڑھی کے وسطی خانے کو سر اور گردن کے گرد پروئے ہوئے ویسی ہی چال چلتا اسی راستے سے اسی کھمبے کے پاس پہنچ جاتا۔ سیڑھی لگا کر اوپر چڑھتا۔ لیمپ کا ایک پہلو کھول کر ماچس جلاتا۔ ہاتھ اندر کر کے لیمپ جلاتا۔ بتی

سے چھیڑ چھاڑ کر کے اور قینچی سے قطع برید کر کے اس کا شعلہ درست کرتا اور سیڑھی اُٹھا کر اگلے کھمبے کی طرف چل دیتا۔

میرا دل تو بہت کرتا کہ میں ان کے ساتھ ہی چل پڑوں۔ مگر بڑی مجبوری سے بادلِ نخواستہ انتہائی دھیمے قدموں سے واپس صدر دروازے میں سے گھر آ جاتا۔ کیونکہ ہم بچوں کو شام کے جھٹ پٹے یا اُس کے بعد سڑک پر گھومنے کی کڑی سزا ملتی تھی اور ہمیں ہر دم پتا ہوتا تھا کہ خلاف ورزی کی صورت میں کوئی نہ کوئی بہن بھائی یا کزن دروازے، کھڑکی یا جھروکے سے دیکھ رہا ہوگا اور اس چغلی کے ساتھ فوراً گھر کے کسی بڑے کے پاس پہنچ جائے گا اور بڑوں کی اس زمانے میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ عام طور پر مشترکہ خاندانی نظام میں بزرگ قسم کے رشتے دار ہمیشہ موجود ہوتے تھے جو بچوں کے خلاف تادیبی کارروائی کے لیے اپنے آپ کو اتنا ہی اہل سمجھتے تھے جتنے بچوں کے والدین اہل تھے۔ آج کے ماحول میں تو بزرگ رشتے داروں کا یہ حق معدوم ہو چکا ہے۔ مگر ہمارے بچپن میں تو تمام بڑے اسے Divine Right of Kings کی طرح استعمال کرتے تھے۔ خدا معلوم ان بڑوں کے اپنے بچپن میں اُس وقت کے بڑوں کے ہاتھوں ان کا اپنا کیا حشر ہوتا ہوگا۔

اس کے باوجود ہم انھی بڑوں کے بہت گرویدہ بھی ہوتے تھے اور بوقت ضرورت ... بلکہ بلاضرورت بھی ... بھاگم بھاگ ان کے پاس پہنچتے رہتے تھے۔ کیونکہ ان کی آپس کی باتیں ہمارے لیے ہر دم زندگی کے نئے دریچے کھولتی رہتی تھیں۔ جن سے ہم ناآشنا تھے۔ ان ہی میں سے کسی بڑے نے بتایا تھا کہ رات کے دوران ہر دو تین گھنٹے کے بعد چند نگران اپنے اپنے علاقے میں گشت کر کے پڑتال کرتے رہتے تھے کہ تمام لیمپ تاحال روشن ہیں یا نہیں اور اگر روشن نہ ہوتے تو شام والے تماشا گروں کو سخت سزا دی جاتی۔ کسی اور بڑے نے یہ بھی بتایا تھا کہ جو لوگ شام کو لیمپ روشن کرتے ہیں وہ دراصل کمیٹی کے وہی ملازم ہیں جو صبح کے وقت اسی علاقے میں جھاڑو سے سڑکیں اور گلیاں صاف کرتے ہیں۔ شام کو لیمپ روشن ہونے کے تماشے کی طرح ان سڑکوں کی صفائی بھی میرا صبح کا رومانس بن چکی تھی۔ انھی رنگین شام و سحر کی وجہ سے یہ لوگ میرے لیے ایسے رومانٹک ہیرو بن چکے تھے کہ مجھے یہ جاننے کی کبھی خواہش ہی نہیں ہوئی کہ یہ لوگ باقی دن بھر کیا کرتے رہتے ہیں۔

صبح کا رومانس البتہ زیادہ دل گرفتہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ہم بچوں کو سرِشام کھانے کے بعد جلد ہی سلا دیا جاتا تھا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ریڈیو بہت ہی خال خال تھے۔ ایک چھوٹی الماری یا ڈبے جیسا یہ ریڈیو چھ سات انچ لمبی چوکور سی بیٹری سے چلتا تھا۔ ٹیلی ویژن کا تو تصور بھی نہ تھا۔ بڑے

بہن بھائیوں کو ایک گول میز کے گرد بیٹھ کر پڑھنا ہوتا تھا جس کے مرکز میں بیرونِ ملک سے درآمدہ بڑے سے خوبصورت لیمپ میں دو یا تین بتیاں جل کر زیادہ روشنی دیتی تھیں۔ ان سب کو مطالعے کی یکسوئی مہیا کرنے کے لیے ہم چھوٹے بچوں کو جلد سونے کا ویسا ہی حکم ملتا تھا جیسا فوجی پریڈ میں دیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر رات پو پھٹنے سے کافی پہلے میں بیدار ہو جاتا اور بستر میں لیٹے لیٹے ہی میری تر و تازہ حسیات بند آنکھوں سے ان آوازوں سے کھیلنے لگتیں جو بڑے مقرر کردہ پروگرام کی طرح یکے بعد دیگرے اُبھرنے لگتیں۔ اچھی سریلی اور بے سری بھدی آوازوں اور لہجوں میں دور و نزدیک سے اذانوں کی آوازیں ... چڑیوں کی باضابطہ اجتماعی چوں چوں یا دیگر پرندوں کی اکا دکا انفرادی آوازیں ... قریب کے مزار سے وقتاً فوقتاً کسی مور کی پکار ... کچھ دیر بعد مندروں کی گھنٹیاں اور ہوا کے دوش پر اونچے ہلکے سروں میں بھجن کے الاپ ... کسی گوردوارے کے ہارمونیم کے ساتھ ڈھولک کی تھاپ کی اُٹھتی گرتی اور مدھم یا تیز موسیقی ... اور پھر سڑک پر بڑی جھاڑو پھرنے کی لمبی لمبی گھسیٹ دار آواز ... شڑاپ شڑاپ ... شڑاپ شڑاپ ... کبھی دور سے قریب آتی ہوئی اور کبھی قریب سے دور جاتی ہوئی۔ میں سنتا ہی رہتا اور دل کرتا کہ سنتا ہی جاؤں۔ کیونکہ کسی سمفنی کے میوزک کی طرح میرے دل کی دھڑکن اور ذہن کی حرکت اس کے سُر کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی۔

بعض اوقات زیادہ ضبط نہ کر سکتا تو بھاگ کر کھڑکی کے شیشے پر ناک پچکاتے ہوئے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گرد کے اُٹھتے بادلوں میں جھانکنے لگتا اور جھکے جھکے موہوم سے جسموں کے سامنے مشینی انداز میں جھاڑو والا ہاتھ ہلنے کی سُریلی تکرار دیکھتا اور سُنتا رہتا اور تب تک کھڑکی سے چپکا رہتا۔ جب تک میونسپل کمیٹی کی پانی والی گاڑی سڑک کے دونوں طرف گرد بٹھانے کے لیے چھڑکاؤ کرتی گزر نہ جاتی اور گھوڑے کے سموں سے ٹپ ٹپ کی موسیقی پیدا کرنے والے اکا دکا تانگے وقفے وقفے سے گزرنے لگتے ... کبھی کوئی دوسرا بچہ بھی اُٹھ کر میرے پاس آ جاتا تو ہم دونوں کی سرگوشیوں اور دبی گھٹی ہنسی سے کسی بڑے کی آنکھ کھل جاتی اور ہم دونوں اس کی گُھرکی سن کر فوراً اپنے اپنے بستروں میں دبک جاتے اور اُس خوش الحان تلاوت کو سننے لگتے جو صبح کی نماز کے بعد اباجان اپنے کمرے میں بلند آواز سے کرتے تھے۔

تلاوت کے الفاظ یوں تو سمجھ میں نہ آتے تھے مگر ان کی نرم ترتیب اور مسلسل روانی سے پیدا ہونے والی پہاڑی چشموں اور جھرنوں جیسی موسیقیت سے آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں۔ ذہن میں ٹوٹے پھوٹے عکس یا نامکمل تصویروں کے ٹکڑے رقص کرنے لگتے۔ جیسے جھاڑو کی گرد میں لپٹے ہوئے گھوڑے کا موہوم خاکہ ... آسمان کے ایک طرف سے طلوع کا اُجالا ... کسی بکل زدہ راہگیر کی

کھانسی... اور بار بار نظر آنے والا عکس کہ سامنے والے کھمبے پر لیپ کا نحیف سا شعلہ بے ترتیبی سے ناچتا۔ پھر پتلے دھوئیں کی لمبی لکیر اوپر کو اُٹھتی اور اس کے چاروں شیشوں کا حفاظت خانہ ایک دم بے جان سا ہو جاتا وغیرہ وغیرہ...

میں سمجھتا میں جاگ رہا ہوں... مگر اچانک ہی ہڑبڑا کر اُٹھتا تو کسی نہ کسی روزن سے گھسنے والی دھوپ کی کرنیں کمرے میں ناچ رہی ہوتیں...

گجرات کا یہ تماشا اگر میرے بچپن کی رونق تھا تو ان دنوں کی ہموار اور پُرسکون زندگی کی علامت بھی تھا۔ ان دنوں بھی بارش اور آندھی والی راتیں ہوتی تھیں۔ مگر نہ معلوم کیسے وہ لیپ اکثر و بیشتر روشن ہی رہتے تھے اور کبھی خراب ہوئے بغیر ہر وقت مستعد تھے۔ جیسے روشنی کا پہرہ دار عین اس وقت نمودار ہو جاتا جب روشنی کی ضرورت ہوتی اور چپکے سے غائب ہو جاتا۔ جب اس کی ضرورت نہ ہوتی اور میری ناسمجھی اس آنکھ مچولی کا مزہ لیتی رہتی۔ صرف اس مزے کی یکساں تکرار میری زندگی تھی اور بڑی ہی سہانی زندگی تھی۔

مگر ایک دن پتا چلا کہ ہم گجرات چھوڑ رہے ہیں۔ والد صاحب راولپنڈی میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تعینات ہو گئے تھے۔ اس طرح یہ تماشا تو اچانک ختم ہو گیا۔ مگر زندگی زیادہ سہانی ہو گئی۔ کیونکہ راولپنڈی میں نہ معلوم کب سے بجلی آ چکی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب بچے دیواروں سے چپکے ہوئے سوئچ دبا دبا کر بجلیاں جلا بجھا رہے تھے۔ بڑوں کی گھرکیاں اور ڈانٹ بے اثر تھیں اور نہ معلوم کب تک بے اثر رہتیں مگر اباجان نے خاموشی سے کنٹرول کرنے والا بڑا سوئچ بند کر دیا۔ ہم لوگ بڑی بے صبری سے رات کا انتظار کرنے لگے اس کے بعد پہلی شام آئی، اس کے بعد پہلی رات آئی۔ اسی طرح پہلی صبح آئی اور پھر وہاں کے صبح و شام مجھے بالکل ہی نئی دنیا میں لے گئے۔

فوجی چھاؤنی ہونے کے علاوہ راولپنڈی مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کا بڑا متحرک اور بارونق شہر تھا۔ اکثر گھروں میں سے ریڈیو کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں زندگی کا محور بھی گھر ہی ہوتا تھا۔ شادی بیاہ، پارٹیاں، مہمان نوازی سبھی کچھ گھر کی چار دیواری کے اندر یا گھر کے لان میں یا پاس والے گراؤنڈ میں شامیانوں اور روشن بلبوں کی بھرپور رونق میں ہوتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر اس کے علاوہ تھے۔ سہگل، پنکھج ملک، خورشید، کانن بالا، اختری بائی اور بے بی نور جہاں کے گانے پوری فضا پر چھا جاتے تھے۔ انگریز حاکم کی نقالی صرف لباس اور ڈائننگ روم تک پہنچی تھی، باقی گھر میں ہر قوم کی اپنی سماجی رہائش کا فخر۔

دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور جنوبی ہندوستان میں رنگون اور اس سے نیچے سنگاپور کی

طرح شمالی ہندوستان میں راولپنڈی اتحادی فوجوں کے اکٹھے ہونے کا مرکز تھا۔ اس لیے کئی ممالک کی فوجیں اپنے ساز و سامان کے ساتھ وقتاً فوقتاً مری روڈ پر مارچ کرتی نظر آتیں۔ کبھی نیپال کی گورکھا پلٹن، کبھی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے گورے اور کبھی افریقہ کے حبشی۔ سڑک کے دونوں طرف تماشائیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ ان دنوں شہر کی آبادی اس جگہ ختم ہو جاتی تھی جہاں آج کل اصغر مال روڈ ہے۔ اس سے آگے زراعتی فارم سے ملحق کھیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں دو پروں والے ہوائی جہازوں سے پیراشوٹ گرانے کی مشقیں ہوتی رہتی تھیں۔ جنھیں دیکھنے کے لیے سارا شہر اُمڈ پڑتا تھا۔ جنگ تو یورپ، افریقہ اور مشرقِ بعید میں لڑی جا رہی تھی مگر اس کی تیاری راولپنڈی، کلکتہ، سنگاپور اور نہ معلوم کہاں کہاں جاری رہتی تھی۔ اے آر پی (Air Raid Precautions) کا نیا محکمہ شہر کے ہر بڑے گراؤنڈ میں لوگوں کی تربیت کے لیے چھوٹے چھوٹے بم گراتا، آگ لگاتا۔ انھیں بجھانے اور رسوں کے ذریعے گھروں سے لوگوں کو نکال کر بچانے کے طریقے بتاتا۔ راتوں کو بلیک آؤٹ کی مشقیں کراتا۔ اسی طرح دوسرا محکمہ ہر گھر کی نفری کے مطابق راشن کارڈ جاری کرتا، تاکہ مارکیٹ میں خوراک اور روزانہ استعمال کی دوسری چیزوں کی قلت کی وجہ سے ہر کسی کو راشن ڈپو سے تھوڑا تھوڑا مل سکے۔ آٹا، دال، چینی، کپڑا، لکڑی، دھاتیں غرض ہر چیز دنیا بھر میں لڑنے والی فوجوں کو ترجیحاً بھیج دی جاتی تھی اور شہری آبادی کو سخت کفایت شعاری پر مجبور کیا جاتا تھا۔ کلکتہ پر جاپانی بم گرنے لگے تو راولپنڈی میں خندقیں کھودنے کی تربیت شروع ہو گئی اور سنگاپور پر جاپانی قبضے کے بعد راولپنڈی میں بھی زندگی کی طنابیں کس دی گئیں۔ رات نو بجے کی خبریں سننے کے لیے ریڈیو والی چند دکانوں پر لوگوں کے اژدحام سے کمیٹی چوک کے علاوہ کئی دیگر مقامات پر بھی سڑکیں بند ہو جاتیں اور ختم ہوتے ہی یہ بھیڑ ایسے چھٹ جاتی جیسے پانی کی بالٹی میں برف کا چھوٹا سا ٹکڑا چشم زدن میں گھل جاتا ہے۔ میرے لیے یہ سب نئے تماشے تھے لیکن اصل نیا پن تب طلوع ہونے لگا جب میں اسکول جانے لگا اور نئی زندگی شروع ہو گئی۔

گجرات میں ہم اوپر تلے کے دو بھائیوں کو والدہ خود گھر پہ ہی پڑھایا کرتی تھیں۔ نئے شہر پہنچے تو والد صاحب کا چپراسی ہم دونوں بھائیوں کو پرائمری اسکول لے گیا جہاں دو تین استادوں نے ہم سے اُردو کی کتاب پڑھوائی۔ سلیٹ پر ریاضی کے سوالات حل کروائے۔ تختی لکھوائی اور قابلیت کے مطابق بڑے بھائی کو چوتھی جماعت اور مجھے تیسری جماعت میں داخلہ مل گیا۔ ایک بڑے سے کمرے کی پوری لمبائی میں طلباء کی تین قطاریں بیٹھی تھیں۔ مجھے درمیانی قطار کے آخر میں بٹھا دیا گیا۔

اسی دم مجھے یوں لگا جیسے گجرات میں دیکھے ہوئے تمام تماشے میرے ذہن اور یادداشت

سے غائب ہو گئے۔ کیونکہ وہاں حال ہی حال تھا۔ ماضی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ مگر وقت نے بتایا کہ وہ غائب نہیں ہوئے تھے بلکہ میرے لاشعور میں کنڈلی مار کر چھپ گئے تھے اور میرے ہی ساتھ ساتھ میرے مینار کی بلندیاں طے کر رہے تھے۔ ہائی اسکول، کالج، یونیورسٹی اور پھر پاکستان سول سروس کی دہلیز۔ جہاں ریاستی نظم ونسق اور انتظامیہ کی ابتدائی تربیت شروع ہوگئی۔ چھے ماہ کا پہلا حصہ مغربی پاکستان میں اور چار ماہ کا دوسرا حصہ مشرقی پاکستان میں مکمل کرنے کے بعد میں تیسرے حصے کے لیے انگلستان روانہ ہوگیا۔

آج جب میں دونوں میناروں کی انتہائی بلندیوں سے جھانک رہا ہوں تو ماضی کا سارا منظرنامہ بیک وقت دیکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ ہر منزل کا ہر لمحہ اور واقعہ بادلوں کی بجلی کے شراروں کی طرح چمک چمک کر غائب ہو رہا ہے۔ ذہن کی زقند کے مطابق وہ بوقتِ ضرورت چمک اٹھتا ہے۔ دوسرے لمحات سے اس کی کڑیاں چمک اُٹھتی ہیں اور خواب کے منظرنامے کی طرح جزو اور کل بیک وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس وقت پاکستان قائم ہوئے صرف بارہ برس گزرے تھے، لیکن عجب بے سرو سامانی کا آغاز اب ماضی کی داستان بن چکا تھا۔ مشرقی پنجاب سے قتل عام کے بعد کٹی، کچلی اور جلی ہوئی لاشوں بھری ٹرینوں کی آمد اور پناہ گزین کیمپوں کی داستانیں تو گھروں میں اب بھی سنائی دیتی تھیں۔ مگر آبادکاری کے اکثر مسائل سلجھائے جا چکے تھے اور مشرقی پنجاب والے اپنی اغوا شدہ عورتوں کے علاوہ مکمل خاندانوں کی شکل میں نقل مکانی کر چکے تھے۔ مگر مہاجر کہلوانے کے بجائے اپنے آپ کو پاکستانی شہریت میں پوری طرح مدغم کر چکے تھے۔ صرف کراچی اور سندھ کے بعض شہروں میں حسب پسند مواقع ملنے پر یوپی اور بہار سے وقتاً فوقتاً آنے والوں کا سلسلہ لگاتار جاری تھا۔ جن کے خاندانوں کا کچھ حصہ ہندوستان میں رہا اور کچھ حصہ پاکستان میں آ گیا۔ اب پورے پاکستان کا اپنا پراعتماد وجود دونوں پاؤں پر سیدھا کھڑا ہو چکا تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں تیزی سے ترقی کرنے والا پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نمایاں ملک کی طرح قابلِ توجہ بن چکا تھا۔

اسکولوں کی آبادی، حاضریاں اور رونقیں بڑھ رہی تھیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیمی اور ہم نصابی سرگرمیوں سے لبریز زندگی ہمک رہی تھی۔ ہونہار طالب علم اپنی کامرانیوں سے حاصل کردہ وظائف کے سہارے دھڑا دھڑ بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے جا رہے تھے۔ سیکڑوں نوجوانوں کو سائنسی مضامین میں ایم ایس سی کرنے کے بعد پاکستان اٹامک انرجی کمیشن دنیا بھر کے نمایاں تعلیمی مراکز میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے بھیج رہا تھا، تاکہ وہ نئے ایٹمی علوم کے اسرار و رموز میں

دسترس حاصل کر سکیں (پاکستان کے دیہاتوں اور شہروں کے پرائمری اسکولوں میں ٹاٹ پر بیٹھنے والے انھی لڑکوں نے بعدازاں ہمارا ایٹم بم بنایا)۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کئی شہروں کا کردار صنعت وحرفت کی نئی سرگرمیوں کی وجہ سے بدل رہا تھا، پاکستان ریلوے نقل وحمل کا مثالی ذریعہ بن چکی تھی۔[۲] تین ڈکوٹا طیاروں سے قائم ہونے والا پی آئی اے (PIA) اب ساری دنیا کی فضاؤں میں نہ صرف خود باوقار اُڑانیں کر رہا تھا۔ بلکہ ان کا عملہ مشرقِ وسطیٰ سمیت دیگر ممالک کو بھی اپنی اپنی ایئر کمپنیاں قائم کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ اسی طرح صرف ایک مسلمان بینک[۳] کے سہارے اپنی زندگی شروع کرنے والے پاکستان کے کئی قابل فخر بینکوں کے عملے کی طلب بیرونی ممالک میں دن بدن بڑھ رہی تھی۔ عالمی بینک (World Bank) واپڈا کو قابلِ فخر ادارہ سمجھ کر حکومتی گارنٹی کے بغیر قرضہ دینے کو آمادہ رہتا تھا۔ کرکٹ اور ہاکی میں ہمارے کھلاڑی بین الاقوامی اُفق پر روشن ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ کئی شہروں میں امپروومنٹ ٹرسٹ (Improvement Trust) اور اس سے ملتے جلتے اداروں نے نئی نئی آبادیاں کھڑی کر دی تھیں۔ جیسے لاہور میں جلے ہوئے تباہ شدہ شاہ عالمی دروازے اور بازار کی جگہ بالکل نئی آبادی، شادباغ، سمن آباد اور گلبرگ وغیرہ۔

اس پس منظر میں ہم نے بڑی خوداعتمادی اور روشن اُمیدوں سے انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھے اور بڑے خلوص اور بیدار مغزی سے ریاستی انتظامات کی ابتدائی تربیت میں کھو گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر برٹش ایمپائر تیزی سے تحلیل ہونے لگی تھی۔ اس لیے سابقہ نوآبادیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے انگلستان نے کولمبو پلان کے تحت ہر سابقہ نوآبادی کی مخصوص ضروریات کے مطابق تربیتی پروگرام وضع کیے تھے۔ جن کے تمام اخراجات برٹش کامن ویلتھ آفس (Commonwealth Office) برداشت کرتا تھا۔ پاکستان کے لیے جو پروگرام وضع کیا گیا اس میں مختلف محکموں کے افسران کو ابتدائی، درمیانی یا اعلیٰ مراحل کی تربیت انگلستان میں دی جاتی تھی۔ اس کے تحت قیامِ پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد سول سروس (Civil Service) میں داخل ہونے والوں کو ابتدائی تربیت کے لیے وہاں بھیجا جا رہا تھا اور فارن سروس والوں کو Fletcher School of Diplomacy میں۔ دیگر محکموں کے افراد چونکہ بہت زیادہ ہوتے تھے اس لیے ان کی مختلف سطحوں سے منتخب افسران کو اُن اداروں اور یونیورسٹیوں میں بھیجا جاتا تھا، جو متعلقہ پیشے میں نامور تھیں۔

اس دفعہ ہمارے گروپ میں مشرقی پاکستان کے بارہ اور مغربی پاکستان کے گیارہ افسران شامل تھے۔ ہمیں اوکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں پبلک ایڈمنسٹریشن کی تعلیم کے لیے اس طرح

بھیجا گیا کہ وہاں ہر ایک کالج میں صرف ایک لڑکے کو داخل کر دیا جاتا تھا جو یونیورسٹی کے ڈسپلن اور قواعد کی پوری بندش میں دیگر عام طلباء کے ساتھ پڑھتا تھا، لیکن جب موسم گرما، موسم سرما اور ایسٹر (Easter) وغیرہ کی چھٹیوں میں یونیورسٹی بند ہوتی تو ہمارا سارا گروپ مشترکہ طور پر برٹش گورنمنٹ کے دفاتر میں جا کر انتظامی امور کی عملی تربیت لیتا۔ چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھلنے پر ہم سب دوبارہ طالب علم بن کر اپنے اپنے کالجوں میں بکھر جاتے تھے۔ دورانِ تعلیم ہم میں سے ہر ایک کو ریسرچ کر کے ایک تھیسس (thesis) لکھنا پڑتا تھا جس کے لیے ایک لمبی لسٹ میں سے کسی موضوع کا خود انتخاب کرنا ہوتا تھا۔

وہ لسٹ دیکھی تو میرا دل بے اختیار ایک موضوع پر اٹک گیا اور مجھے وہ دن یاد آ گئے جب میں اپنے اسکول کے زمانے میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران طیاروں سے کی جانے والی ہولناک بمباری کی خبریں سنا کرتا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو میری نویں جماعت ابھی شروع ہو رہی تھی اور اخبار کی لت کی وجہ سے میں جان چکا تھا کہ جنگ کے بعد انگلستان میں عموماً مگر لندن میں خصوصاً کوئی عمارت صحیح و سلامت نہ رہ سکی تھی۔ تقریباً ہر گھر جزوی یا مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا لیکن صرف چودہ برس بعد ستمبر ۱۹۵۹ء میں جب وہاں پہنچا تو اس تباہی و بربادی کے آثار بھی نہ تھے اور ہر علاقہ جو میں نے دیکھا اس میں مضبوط عمارتیں سینہ تانے کھڑی تھیں۔

چنانچہ میں نے فوراً اس موضوع کا انتخاب کر لیا کہ دوسری جنگ عظیم کی بمباری میں عمارتوں کی تباہی کے بعد حکومت نے رہائشی گھروں کی کمی کا مسئلہ کیسے حل کیا؟ میرے ٹیوٹر tutor نے سر پکڑ لیا، ''یہ موضوع بہت پیچیدہ ہے۔ تم لوگوں کو اپنے تربیتی پروگرام میں اتنا مصروف رکھا جاتا ہے کہ اس کے لیے وقت نہیں نکال سکو گے۔ بہتر ہے کوئی اور موضوع چن لو۔''

میں نے موضوع میں دلچسپی کا اظہار کیا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا، ''پھر بات کریں گے۔ تم دوپہر کے ایک بجے آ جانا ہم قریب کے ریستوران میں کھانا اکٹھے کھائیں گے۔''

کھانے کے دوران اس نے بتایا کہ دوسری جنگ کے دوران وہ لندن کی کسی یونیورسٹی کا طالب علم تھا... پھر وہ سناتا گیا اور میں سنتا گیا۔

درجنوں طیارے اکٹھے حملہ کر کے کتنی کتنی دیر تک مسلسل بمباری کرتے رہتے تھے۔ وہ خندقوں میں دبکے ہوئے آسمان پر برطانوی (RAF) اور جرمن فضائیہ (Luftwaffe) کے جہازوں کا جھپٹنا، پلٹنا اور پلٹ کر لڑنا اور تباہ ہو کر گرنا دیکھتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی زمین سے طیارہ شکن طیاروں (Anti Aircraft) توپوں کے شور سے کان بہرے ہو جاتے تھے۔ وہ رک گیا۔

''ایک ایسے ہی حملے میں بم اس خندق کے پاس گرا جس میں ہم ہوائی حملے کے وقت چھپے ہوئے تھے۔ اس کے ٹکڑے اڑ کر میری والدہ کے سر، گردن اور کندھوں پر لگے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ خاموشی بوجھل ہونے لگی تو میں نے دھیرے سے پوچھا، ''وہ خیریت سے تو ہیں؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بہت دکھ ہوا یہ سن کر!'' میں نے بے اختیار کہا۔

پھر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ''ہمارے خاندان کے کئی لوگ مارے گئے تھے... میرے جاننے والے اکثر خاندانوں کا یہی حال تھا۔''

ایک دفعہ پھر سکوت ... ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر سنانے لگا۔

حملے کے بعد ہم لوگ رضاکارانہ طور پر آگ وغیرہ بجھانے میں مدد کرتے تھے۔ گری ہوئی عمارتوں کے ملبے ہٹا کر زخمیوں کو تلاش کرتے تھے۔ بمباری کی تباہی سے بے آسرا اور بے گھر عمارتوں کے ملبے ہٹا کر زخمیوں کو تلاش کرتے تھے۔ اس طرح رہائشی گھر دن بدن کم ہوتے گئے اور سخت سردی میں لوگ عارضی پناہ گاہوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ ہم خود ایک برس تک ایسی ہی پناہ گاہ میں رہے۔ وہ سناتا رہا... میں سنتا رہا۔

''چھ برس...'' وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ ''جنگ چھ برس تک چلتی رہی... نئے نئے ہتھیار ایجاد ہو رہے تھے۔ نئی نئی قسم کے بم بن رہے تھے۔ جہازوں سے بارش کی طرح برسنے والے اور پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑنے والے ... تباہی کے نئے نئے انداز سے ہر جگہ کھنڈر بن رہے تھے...''

وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا، ''تم دو دن تک صرف لائبریریوں میں گھومو اور کتابوں رسالوں میں تلاش کر کے اس بربادی کی تصاویر دیکھ لو تاکہ تباہی کے انداز، رہائشی مسئلے کی شدت اور موضوع کے پھیلاؤ کا احساس ہو سکے۔''

ہم باہر نکل کر سڑک پر چل رہے تھے تو وہ ایک سادہ سی بلڈنگ کے سامنے رُک گیا۔

''یہ لیبارٹری ہے... Cavendish Laboratory... جہاں پہلی دفعہ ایٹم کو توڑا گیا... لیکن جرمنی ہم سے آگے نکل گیا۔ امریکہ نے جرمن سائنسدان اُڑا لیے اور پھر ہیروشیما اور ناگاساکی''...

وہ کھڑے ہو کر تاسف سے اپنا سر ہلانے لگا، ''ہم یہ سب تباہیاں خود لاتے ہیں۔''

دو دن بعد میں اسے ملا تو غالباً دل کا غبار نکالنے کے بعد اب وہ پُرسکون تھا۔ میری

استقامت دیکھ کر وہ لسٹ بنانے لگا کہ لائبریریوں کے علاوہ اس موضوع پر ریسرچ کے لیے مجھے کون سے سرکاری محکموں سے رابطہ کرنا ہوگا۔ میرا کام واقعی مشکل اور محنت طلب نکلا اور جیسے تیسے مکمل بھی ہو گیا۔ مگر میرے لیے یہ ریسرچ اس لیے سبق آموز تھی کہ برٹش قوم نے بڑی آسانی اور انتہائی برق رفتاری سے تھوڑے ہی عرصے میں وسیع کھنڈرات کو فلک بوس عمارتوں اور رہائشی کالونیوں میں بدل دیا اور اس عظیم مہم کی داستان بھی انتہائی سادہ اور مختصر تھی۔

پارلیمنٹ نے طویل بحث کے بعد قومی پالیسی مرتب کی کہ قوم و ملک کے ہر پرزے سے یہ کام ترجیحی انداز میں لیا جائے گا۔ نہ صرف حکومت سب کے لیے گھر بنائے گی، بلکہ تمام ادارے بھی اپنے اپنے ملازموں کے لیے گھر بنائیں گے۔ عوام خود قرضے لے کر گھر بنائیں گے۔ نجی شعبے کی اختراع پسندی گھر بنائے گی اور حکومت اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کی بجائے اس کی معاون بنے گی۔ اگر کوئی فرد، ادارہ یا انجمن کسی نئے آئیڈیے کے ساتھ آگے آئے گی تو حکومت اس کی حوصلہ افزائی کرے گی۔

اس پالیسی کے بعد پارلیمنٹ نے قوانین بنائے۔ ان کے تحت حکومت نے قواعد بنائے۔ پھر ان کے ماتحت اداروں نے اپنے اپنے ذیلی قواعد بنائے۔ مالی قرضوں کے متعلق، عمارتی سامان کی فیکٹریوں کے متعلق، عام زندگی میں رکاوٹیں روکنے کے لیے معماروں کی کارروائی کے متعلق وغیرہ۔ ان سب کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے ڈسپلن اور سزا کے متعلق۔ علیٰ ہذا القیاس۔

پھر تمام متعلقہ ادارے اور افراد پورے خلوص سے قومی پالیسی پر کاربند ہو گئے۔ ان کی کارکردگی کی نگرانی حکومت کرتی رہی۔ حکومت کی نگرانی پارلیمنٹ میں ہوتی رہی اور پارلیمنٹ کے اراکین کے گریبان ان کے حلقوں کے ووٹرز کھینچتے رہے۔ اس احتساب کی دوطرفہ ٹریفک تھی۔ مقننہ کے لیے نیچے سے اوپر کی طرف کیونکہ ووٹر اگلے الیکشن پر پارلیمنٹ کے ممبر کو برطرف کر سکتا تھا اور انتظامیہ کے لیے اوپر سے نیچے کی طرف۔ جب اس کی ہر سطح اپنے سے نچلی سطح کی بروقت نگرانی کرتی رہتی تھی۔ یہ سب کچھ تو جمہوریت کی روح کے عین مطابق تھا اور ہمارا کتابی علم اس کی روح سے واقف تھا۔ مگر میرے لیے نیا انکشاف یہ تھا کہ عملی طور پر یہ روح انتظامی جسم و قالب میں کیسے ڈھالی جاتی تھی۔

چند نتھی شدہ اوراق ... یا حقیر سا پمفلٹ ... یا چھوٹا سا کتابچہ ... یا مناسب سائز کی پتلی سی کتاب ... یا پھر اس سے موٹی کتاب ... اس تعمیری جہاد میں ہر ادارے یا ذیلی ادارے کے حصے کے مطابق ان اوراق یا کتابچوں کا متناسب حجم ہوتا تھا۔ میں جس دفتر میں بھی گیا ان کے ریکارڈ میں ایسا ہی لٹریچر دیکھنے کو ملا جس میں قانون اور قواعد کے حوالے، طریق کار کی تفصیلات اور نااہلی کی سزاؤں

کا اندراج ہوتا تھا۔ یہی مختصر سا لٹریچر اصل راز تھا اس تبدیلی کا۔ گورننس کی روح کے انتظامی جسم میں نفوذ کا اور کھنڈرات کی کوکھ سے فلک بوس عمارتوں کے جنم کا... چوٹی کے افسر سے لے کر نچلی ترین سطح کے کارکن تک۔ ہر ایک کو اُس پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ کسی مذہبی کتاب کے تقدس کی طرح ... تبدیلی اگر ہوتی تھی تو صرف اس کاغذی حجم پر ششماہی نظرثانی میں ہوتی تھی اور وہ درجہ بہ درجہ بلند ہوتی ہوئی مجاز سطح پر ہی ہو سکتی تھی۔ اس درجہ بندی کو توڑنے کی کوشش ایسے ہی تھی جیسے کسی زندہ اور فعال جسم میں خنجر گھسیڑ دیا جائے۔ اس لیے اس سے پرہیز کیا جاتا تھا۔

پھر کیمبرج یونیورسٹی کی عمیق تعلیم اور مطالعے سے اس راز کا بھی انکشاف ہوا کہ چند اوراق کے یہ کتابچے صرف انگلستان میں اچھی گورننس کا راز نہ تھے بلکہ ساری برٹش ایمپائر کا نظم و نسق چلانے کی کنجی بھی تھی۔ ان کا نفاذ کرنے والوں میں سے کسی کی ''میں'' کا کوئی دخل نہ تھا۔ نہ تو کسی کارکن کی چالاکی کا... نہ کسی نگران کی ناجائز خواہشات کا اور نہ ہی کسی زور والے کے زور کا... زور اگر تھا تو انھی اوراق، کتابچوں یا کتابوں کے تقدس کا تھا۔

اپنے سائز اور آبادی کے لحاظ سے انگلستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ مگر جو انسانی تاریخ تحریر میں آ چکی ہے، اس میں برٹش ایمپائر سب سے بڑی قلمرو گنی جاتی ہے۔ یہ سولھویں صدی کے آخر میں طلوع ہونے لگی۔ پھر اُبھرتے اُبھرتے پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنے نصف النہار پر تھی۔ ۱۹۲۰ء میں سمندروں کو چھوڑ کر یہ روئے زمین کی ایک چوتھائی خشکی اور دنیا کی آبادی کے پانچویں حصے پر پھیلی ہوئی تھی۔

اس کے پھیلاؤ کی داستان تو ہرگز قابلِ تعریف نہیں۔ جس میں انگریزوں کی دھونس دھاندلی، مکاری، خودغرضی اور بدترین انسانی صفات کے بے دریغ استعمال کا بہت دخل تھا۔ میر جعفروں کی خریداری، جلیانوالہ باغ جیسے ظلم، مقامی تہذیب کو پھانسی اور شاطرانہ چالوں کے شب خون کی بہتات بھی شامل تھی۔ مگر ساتھ ہی مفتوحہ علاقوں کے جرمِ ضعیفی اور مرگِ مفاجات کا بھی کچھ حصہ تھا۔ اس کے علاوہ چین میں روایتی آتشبازی والے بارود کے حصول کے بعد یورپ میں بندوق کی ایجاد کا بھی بہت دخل تھا لیکن ان قابلِ مذمت وجوہات کے بعد یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اپنے حُسنِ انتظام (Good governance) کی بنا پر یہ بڑی مستحکم سلطنت شمار ہوتی تھی اور اس وسیع قلم رو کے مستحکم نظم و نسق کی کنجی یہی اوراق یا پمفلٹ تھے، جس کی بدولت یہ ایمپائر تین صدیوں پر محیط رہی اور ان میں سے ایک صدی تک یہ دنیا کی عظیم ترین طاقت (Superpower) مانی گئی۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم میں فتح یاب ہونے کے بعد ۱۹۴۵ء سے یہ تحلیل ہونے لگی۔ دنیا کی تاریخ اس عالمی غنڈہ گردی اور

دہشت گردی سے تراشے ہوئے نوآبادیاتی نظام کی بجا طور پر مذمت کرتی تھی۔ مگر ساتھ ہی مفتوحہ علاقوں میں انگریز کی انتظامی صلاحیتوں کو اس طرح تسلیم بھی کرتی ہے۔ جس طرح ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے عذاب سے گزرنے والے مرزا غالب ان کی سائنسی برتری کے بھی قائل تھے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں اپنے تھیسس (thesis) کے موضوع کا انتخاب میں نے تو محض اپنے بچپن کی یادوں کی بنیاد پر کیا تھا مگر اس کام کے دوران جب اس راز کا انکشاف ہوا تو یوں لگا جیسے بچپن میں پڑھی ہوئی کہانیوں کے بھاری بھرکم دیو کی جان جس طرح ایک چھوٹے سے طوطے میں ہوتی تھی اسی طرح اس وسیع ایمپائر کی جان مذکورہ بالا کتابچے میں ہوتی تھی جو قانون، قواعد اور ضابطے کا ضامن تھا۔

اس انکشاف کے ساتھ ہی میرے لاشعور کے تہہ خانوں میں کنڈلی مار کر سوئی ہوئی چیزیں ہلنے لگیں ... اُٹھنے لگیں ... اور آنکھوں کے سامنے ایسے چھانے لگیں جیسے میں پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔ میں پھر سے گجرات پہنچ گیا... دوبارہ اپنے مینار کی بنیاد کی طرف دیکھنے لگا... اب وہ خالی تماشا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے کچھ معنی بھی تھے کہ چار انسانی ٹانگوں اور دو کندھوں پر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے والی سیڑھی اور رات بھر ہر لیمپ میں جلنے والا متناسب اور ہموار شعلہ انھی اوراق کے مندرجات کی حاصل جمع تھا یعنی قانون اور قواعد اور ان کے مطابق کارکنوں کی تربیت، کارکردگی، نگرانی اور احتساب وغیرہ۔

میری نظریں میرے مینار کی نچلی منزلوں میں بھٹک رہی تھیں۔ اُوپر کی منزلوں کی طرف اُڈ رہی تھیں۔ اندر باہر جھانک رہی تھیں اور آٹھویں منزل کی بصیرت مجھے بتا رہی تھی کہ گجرات کے تماشے والے شعلے کی متناسب روشنی اور لندن کے کھنڈرات سے اُگنے والی فلک بوس عمارتوں کی بلندی کا راز ایک ہی ہے۔ جو قواعد وضوابط کے ان چند اوراق یا کتابچوں میں لپٹا ہوا ہے۔

کیمبرج پیچھے رہ گیا... گجرات اس سے بھی پیچھے رہ گیا۔ میں نے اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے نیچے جھانکا تو نیچے ... بہت نیچے ... مینار کی اُلجھی ہوئی جسامت کے تانے بانے، سیڑھیوں کے دائروں، درزوں، سوراخوں اور روزنوں سے گجرات اور کیمبرج دور ٹمٹمانے والے ستاروں کی طرح نظر آ رہے ہیں۔ میں انھیں ماضی کے نقشِ پا کے طور پر دیکھ رہا ہوں۔ مگر اس منزل کی بصیرت میرے ذہن میں نئی گدگدی کرتی ہے۔

وہ صرف گجرات نہیں تھا جو تم اُن دنوں دیکھ رہے تھے۔ وہ تو بڑی سی دنیا میں جھانکنے والی چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ رُوئے زمین پر پھیلی ہوئی خشک زمین کے ایک چوتھائی حصے پر جب شام مشرق

سے مغرب تک کا سفر کرنے لگتی تھی تو ڈوبتے سورج کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہر جگہ سیڑھیاں، دیا سلائیاں اور لیمپ متحرک ہو جاتے تھے اور زبانِ حال سے بتاتے تھے کہ مقامی محکوموں اور بیرونی حاکموں کے مابین صرف ایک چھوٹے سے شعلے کا فرق ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کی نااہلی اپنے دیے کی روشنی اپنے شہر یا ملک میں پھیلا نہیں سکتی تو وہ محکوم بن جاتی ہے اور جو قوم منظم انداز میں یہ شعلے جلا سکتی ہے وہ حاکم بن جاتی ہے اور انھی محکوموں کے ہاتھ سے انھی کی اپنی گلیاں روشن کرواتی ہے۔

مشہور تھا کہ برٹش ایمپائر پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی وسعت میں کہیں نہ کہیں سورج ہر وقت طلوع ہو رہا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جہاں بھی سورج غروب ہوتا تھا وہاں دیے، لیمپ اور قمقمے اسی تواتر سے اندھیرا دور کر دیتے تھے۔ میری نظریں بے اختیار اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے پھسل کر وطن کے مینار کی بالائی منزلوں کو دیکھنے کی سعی کرتی ہیں۔ مگر وہ لوڈ شیڈنگ (load shedding) کی تاریکی میں نظر نہیں آتیں۔

... میں بار بار کوشش کرتا ہوں

گھپ اندھیرا...

نہ کوئی شعلہ...

نہ کوئی شعلہ جلانے والا...

نہ کسی کو شعلہ جلانے کی عجلت ...

اندھیرے میں صرف عوام کی عبث دہائی سنائی دے رہی ہے...

گجرات کے چھوٹے سے روزن میں سے برٹش ایمپائر کی وسعت میں تمام راتوں کی روشنی نظر آتی تھی... جبکہ میرے مینار کے صرف چار صوبوں کے چھوٹے سے وطن کی تمام راتوں میں مہیب سی تاریکی چھائی ہوئی تھی...

میں گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ آنکھیں بند کرتے ہی نہ معلوم کرسٹفر اینڈرسن (Christopher Anderson) کا چہرہ کیوں اُبھر کر میرے سامنے آ جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ ان دنوں آبادی کے تناسب سے جگہ جگہ راشن ڈپو قائم کیے گئے تھے۔ بعض تو خالص سرکاری ادارے تھے، مگر اکثریت مقامی دکانداروں کو لائسنس دے کر راشننگ نظام کا حصہ بننے والوں کی تھی۔ عمر کے لحاظ سے ہر گھر کے افراد کی تعداد راشن کارڈ میں درج ہوتی تھی اور ہر کارڈ کسی مخصوص ڈپو سے منسلک ہوتا تھا۔ مخصوص مدت کے لیے فی کس ایک گز لٹھا اور ایک گز ململ، یا دو گز گرم کپڑا یا کھانڈ، چائے اور گھی وغیرہ کی مقررہ مقدار یا انڈوں کی مقررہ

تعداد دی جاتی تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی راشن ڈپو میں غبن یا بے ایمانی کی شکایت سنی ہو۔ کیونکہ راشننگ کے محکمے کی نگرانی بہت کڑی تھی۔ اس زمانے میں لوگ پہلی دفعہ بناسپتی گھی سے متعارف ہوئے (ڈالڈا کی شکل میں) ورنہ تو ہمیشہ خالص دیسی گھی استعمال ہوتا تھا۔

۲۔ ۱۹۶۰ء میں لندن میں ایک سرکاری افسر نے مجھے کہا: You people have Rolls-Royce of world railways.

۳۔ حبیب بینک لمیٹڈ۔

نچلی سطح

کیمبرج یونیورسٹی میں کرسٹفر اینڈرسن (Christopher Anderson) میرے ہی کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔

دوسری جنگِ عظیم نے برٹش ایمپائر کی چولیں ہلا کر اُس کی شکست و ریخت کا عمل تو شروع کر دیا تھا، مگر یہ قیامتِ صغریٰ بھی انیسویں صدی کے وکٹورین اقدار کی گرفت ڈھیلی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ برٹش معاشرہ اب بھی پرانے زمانے کی باقیات میں رنگا ہوا تھا اور اُس پر ابھی امریکی کلچر کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ نئی نئی سپر پاور (Superpower) کے طور پر امریکہ ابھی خود آگہی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اور پرانی نوآبادیاتی شراب کو نئی بوتلوں میں انڈیلنے سے اور روزافزوں اُمنڈنے والی سرد جنگ سے اس کے رویے ابھی اُلٹ پلٹ نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت امریکہ میں نہ تو ہپی ازم (hippyism) کے مرغولے اُٹھنے شروع ہوئے تھے اور نہ ہی ساٹھ کی دہائی کے جنسی انقلاب (sexual revolution) یا بے راہ روی کے کوئی آثار تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگلستان ابھی امریکہ کا حاشیہ نشین اور خوشامدی مصاحب نہیں بنا تھا۔ اس لیے برٹش سوسائٹی کے رویّوں میں روایتی اقدار، کلاسیکل رکھ رکھاؤ، تلفظ اور لب و لہجے پر اترانے والے طرزِ عمل، لباس کی نوک پلک اور حفظِ مراتب کے تکلفات وغیرہ قومی افتخار کی علامت سمجھے جاتے تھے۔

یونیورسٹی کے مضبوط ڈسپلن کے مطابق دوپہر کا کھانا سب طلباء کو کالج میں کھانا پڑتا تھا، تاکہ وہ آپس میں گھل مِل کر برادرانہ یگانگت پیدا کر سکیں۔ ڈائننگ ہال کے ایک طرف کچن اسٹاف کے چند افراد طلباء کی لمبی قطاروں کی پلیٹوں میں بڑی پھرتی سے کھانا ڈالتے جاتے تھے اور وہ اپنے اپنے دوستوں کے گروپ بنا کر لمبی میزوں کے ساتھ نصب شدہ بنچوں پر بیٹھتے جاتے تھے۔

ایک دن میں کھانا لے رہا تھا تو ایک انگریز لڑکے نے میرے قریب آ کر ''ہیلو'' کہا اور پوچھنے لگا، ''کیا ہم ٹیبل پر اکٹھے بیٹھ سکتے ہیں؟''

میں نے خوش آمدید کہا تو ہنس کر کہنے لگا، ''باہمی تعارف کے لیے ان بنچوں سے بہتر کوئی جگہ نہیں!''

تھوڑی دیر ابتدائی خوش کلامی ہو چکی تو اُس نے پوچھا، ''کیا میری اطلاع درست ہے کہ

آپ کا تعلق پاکستان کی سول سروس (Civil Service) سے ہے؟''

میرے سر کی مثبت جنبش دیکھ کر وہ مسکرایا، ''میرا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔''

پھر بات چل نکلی۔ کرسٹفر اینڈرسن بھی زیرِ تربیت افسر تھا۔ جو یونیورسٹی میں تربیتی کورس کر رہا تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے آئی سی ایس (ICS) یعنی انڈین سول سروس کے لوگ ہمارے برِعظیم میں تعینات ہوتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد یہ سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن افریقہ کے جو علاقے ابھی آزاد نہیں ہوئے تھے، وہاں برٹش حکومت سابقہ روایت کے مطابق ایسے ہی افسران بھیج رہی تھی اور وہ ان میں سے ایک تھا۔

باتوں باتوں میں ہم دونوں اپنے اپنے تربیتی پروگرام کا تقابل کرنے لگے۔ اس کا پروگرام افریقہ کے حالات کی ضروریات کے مطابق تھا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی استعمار کے مقاصد اور استحصالی ضروریات کے مطابق بھی تھا۔ پر نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ پھر بھی اس گفتگو سے یہ واضح ہو گیا کہ استعماری اور استحصالی پالیسیاں تو لندن میں بنتی تھیں اور نوآبادیوں میں بھیجے جانے والے افسران کی بنیادی ڈیوٹی اچھا نظم ونسق یا گڈ گورننس (Good governance) تھی۔

''ہماری ساری ٹریننگ اچھے انتظام و انصرام کے لیے ہوتی ہے، تاکہ کالونیز (colonies) مطمئن رہیں۔ ہر جگہ کے مقامی مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔ مگر اچھے نظم ونسق کے بنیادی اصول یکساں اور آفاقی ہوتے ہیں۔'' وہ بتا رہا تھا۔ ''بے اطمینانی سے بغاوت پھوٹتی ہے۔ جس کے لیے فوج کشی لازمی ہو جاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ہمیشہ گڈ گورننس کو ترجیح دی جاتی ہے۔''

''مگر تاریخ بتاتی ہے کہ فوج کشی میں بھی کبھی کمی نہیں ہوئی۔'' میرے اندر کا مغلوب ماضی یہ کہے بغیر رہ نہ سکا۔

''ہماری ضرورت کے وقت یقیناً ہوئی ہے!'' وہ مدافعتی انداز میں کہنے لگا ''مگر کم ترین وقت کے لیے... دیکھیں نا، فوج کو مرنا مارنا اور قبرستان پھیلانا سکھایا جاتا ہے۔ مگر ہمیں شہر بسانا اور زندگی سنوارنا سکھایا جاتا ہے۔ وہ جلاّد، ہم مصلح، مگر ریاست دونوں کو ہی اپنے اپنے کام کی اعلیٰ تربیت دیتی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہی ریاست کے اہم ستون ہوتے ہیں۔''

اُس وقت تک میرا کتابی علم صرف کالج اور یونیورسٹی تک محدود تھا اور اصل زندگی صدر ایوب کے مارشل لاء کا صرف پہلا برس دیکھ سکی تھی، جس کی تعریف میں اس وقت کے نقیب ہر وقت رطب اللسان رہتے تھے۔ اس لیے اس وقت مجھے اُس کی باتیں کچھ اجنبی سی لگیں اور میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا،

''آپ کو کس قسم کی تربیت دی جاتی ہے؟''

سروس میں چناؤ کے بعد دو برس تک ہماری اسی یونیورسٹی میں تعلیم ہو گی۔ چاہے ہم پہلے سے کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں۔ یہاں ہمیں اکنامکس، تاریخِ عالم، حالاتِ حاضرہ اور پبلک ایڈمنسٹریشن جیسی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں، مگر خصوصی توجہ افریقہ پر رہتی ہے۔ ان کی سیاسی تاریخ پر، معاشرتی خدوخال پر، قبائلی نظام اور مختلف قبائل کے مقامی طرزِ عمل پر اور ان کی سماجی رسوم وغیرہ پر۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ افریقہ کی زندگی کی ہر تفصیل جان سکیں۔ اس کے بعد ایک برس تک افریقہ کے مختلف علاقوں میں میری عملی تربیت ہو گی اور تب میں اس قابل سمجھا جاؤں گا کہ نچلی سطح پر کوئی ذمے داری سنبھال سکوں۔ چھوٹی ریاست ہو یا بڑا ملک ہو یا پھیلی ہوئی ایمپائر ہو۔ ان سب میں انتظامیہ کی سب سے اہم کڑی نچلے آدمی کی ہی ہوتی ہے اور حکومت اُس کی پشت پناہی کرتی ہے۔

''مگر نچلے آدمی تو وہاں کے مقامی لوگ ہوں گے۔''

وہ نچلے آدمی نہیں ہوتے۔ بلکہ نچلے کارکن ہوتے ہیں۔ نچلا آدمی تو شاہِ انگلستان کا وہ افسر ہوتا ہے۔ جو اس ٹریننگ کے بعد کالونی کے دور افتادہ کونے میں تعینات ہوتا ہے۔ موقع پر موجود فرد (Man on the spot) جو ایک اسٹیتھوسکوپ (stethoscope) کی طرح برٹش حکومت کو وہاں کی زمین کی مقامی دھڑکن سناتا ہے۔ نچلے کارکن تو نچلے افسر کے خود تراش کردہ مقامی ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں، جنھیں وہ پہلے تربیت دیتا ہے۔ پھر ان کی کارکردگی کی نگرانی کرتا ہے اور اس پرکھ کی بنا پر سزا یا جزا دیتا ہے۔ نچلی سطح کی کارکردگی ریاست کے سارے ڈھانچے کو متوازن رکھتی ہے۔ جیسے پاؤں مضبوط ہوں تو انسان کا سارا جسم سیدھا کھڑا رہتا ہے۔

گفتگو چلتی رہی ... موضوع بدلتے رہے ... تکلف اور جھجک ختم ہوتی گئی ... اور ہم نہ معلوم کیسے نوآبادیاتی نظام کے موضوع میں ایسے جا پھنسے، جیسے ایک ہی سکے کے دونوں اطراف اپنی اپنی اجنبی پیٹھ موڑ کر پہلی دفعہ اچانک روبرو ہو گئے ہوں۔ میرے اندر سے تو سابقہ محکوم کالونی کے باشندے کی تلخی بول رہی تھی۔ جو عالمی طاقتوں کے استعماری عزائم اور استحصالی ہتھکنڈوں سے دلگیر تھا۔ مگر وہ غیر ترقی یافتہ ممالک کو ''سفید فام نسلوں کی ذمے داری'' (White Man's Burden) سمجھتے ہوئے ایک احساسِ برتری سے مخمور تھا۔ اس کے لیے نوآبادیاتی نظام نہ صرف جائز بلکہ تاریخ کی سیاسی ضرورت تھی۔ چنانچہ بات چیت میں کسی بات پر بھی رواداری سے زیادہ اتفاق ممکن نہ تھا اور ہم پھر ملنے کے آئندہ وعدوں پر روانگی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

باہر نکلنے سے پہلے کوٹ، مفلر اور ٹوپی پہنتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔

مائی فرینڈ (My Friend) جس ملک کی حکومت کی نچلی سطح غیر جانبداری سے لوگوں کو انصاف اور تحفظ دے

سکتی ہے۔ وہ ملک نہ تو خود کالونی بنے گا اور نہ کوئی اسے کالونی بنا سکے گا لیکن جہاں نچلا آدمی غلط کار ہوگا، وہ ایک نہ ایک دن ضرور کالونی بنے گا اور شاید اسی میں وہاں کے لوگوں کی بہتری ہوتی ہے۔ اب تو عالمی تواریخ بھی اسے ثابت کر چکی ہیں۔

"تواریخ تو شاید ایسا ہی کہتی ہیں، مگر یہ عالمی تواریخ لکھتا کون ہے اور عالمی حالات کے رُخ موڑتا کون ہے؟" میں نے پوچھا تو مشترکہ قہقہے پر بات ختم ہوگئی۔

ہم باہر نکلے تو کالج کے گیٹ سے افریقہ کی ایک حبشی لڑکی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کرسٹوفر نے ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں لہراتے ہوئے اسے متوجہ کیا تو ہمیں دیکھتے ہی وہ بڑی بشاش چال اور کھلی مسکراہٹ سے ہماری طرف لپکی چلی آئی۔ ہمارا تعارف کراتے ہوئے کرسٹوفر اینڈرسن نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر بالکل قریب کر لیا اور مسرت بھرے لہجے میں بولا، "یہ میری گرل فرینڈ ہے۔"

وہ لڑکی افریقہ کے کسی ملک سے آئی ہوئی تھی اور کیمبرج میں گرٹن (Girton) کالج کی طالبہ تھی جو صرف لڑکیوں کا کالج تھا۔ کیونکہ ان دنوں کیمبرج یونیورسٹی کے کسی بھی کالج میں کو ایجوکیشن (co-education) نہ تھی اور دو کالج صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص تھے۔

وہاں پہنچ کر مجھے پہلی دفعہ احساس ہو رہا تھا کہ برٹش سوسائٹی کے متعلق ہمارے تاثرات حقائق سے کافی دور تھے اور زیادہ تر ان شخصی محرومیوں کے تراشیدہ تھے، جو فرد کی فطرت اور ذات پر ہماری سخت گیر سوسائٹی کی کڑی گرفت سے پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ مجھے یہ جان کر بھی حیرت ہوئی کہ انگلستان میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی ۱۹۲۸ء میں ہی دیا گیا۔ یعنی میرے وہاں پہنچنے سے صرف تیس برس پہلے۔ حالانکہ تب برٹش ایمپائر دو تین صدیاں پرانی ہو چکی تھی۔

سفید فام کرسٹفر اینڈرسن اور اس کی سیاہ فام گرل فرینڈ سے رُخصت ہو کر میں واپس آ رہا تھا۔ تو دل ہی دل میں لڑکے کی مقصدی ریاضت پر غور کر رہا تھا کہ کیا یہ اُس کی ذاتی ترجیح تھی یا تربیتی پروگرام کی سوچ کی طرف سے حوصلہ افزائی تھی اور کیا یہ اس کی سنجیدہ محبت تھی یا افریقہ شناسی کا ایک وقتی ذریعہ تھی... جو بھی تھا۔ یہ بتاتا تھا کہ ٹریننگ اور تربیت کو یہ قوم کتنی اہمیت دیتی ہے۔

کرسٹوفر سے میری ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں۔ کیونکہ ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ اس لیے ہماری پہلی ملاقات والی نو آبادیاتی نظام کے متعلق بحث بھی جاری رہتی۔ بغیر کسی تلخی کے، کبھی ہلکی پھلکی جملہ بازی سے اور کبھی سنجیدگی سے۔ دریں اثنا اس کی یونیورسٹی کی تعلیم کا اختتام آ گیا اور وہ افریقہ جانے کو تیار ہو گیا۔ ہماری آخری ملاقات میں اس نے معذرت کے انداز میں بتایا کہ اس موضوع پر وہ دانستہ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

مجھے براہِ راست کوئی اندازہ نہ تھا کہ ہماری کالونیز کے روشن خیال لوگ کیسے سوچتے ہیں۔ اس لیے ان تبادلۂ خیالات سے میں نے بہت کچھ اخذ کیا ہے جو آئندہ میرے کام آئے گا۔ جیسا مجھے یقین ہے کہ تم بھی یہاں کی ٹریننگ سے بہت کچھ اخذ کر رہے ہو، جس سے اپنے ملک کی بڑی مفید خدمت کر سکو گے۔

اس طرح ہم دونوں دوستوں کی طرح رُخصت ہو گئے، مگر بدقسمتی سے بعدازاں کوئی رابطہ نہ رکھ سکے۔ آج نصف صدی سے بھی زائد مدت کے بعد میرے وطن کے مینار کی تاریک چوٹی میں سے اُس کا چہرہ جھانک رہا ہے۔ مگر سابقہ خوش خلقی کی بجائے اس کا چہرہ میری طرف طنزیہ مسکراہٹ پھینک رہا ہے کہ یا تو تم نے اُس زمانے میں کچھ سیکھا ہی نہیں تھا اور اگر سیکھا تھا تو اسے استعمال نہیں کیا۔ ورنہ تمھارے وطن میں یہ تاریکی نہ ہوتی... لوڈ شیڈنگ کی تاریکی...

میں شرمندگی سے نظریں چراتے ہوئے سوچتا ہوں کہ کاش کرسٹفر میرے وطن کی سماجی ساخت اور معاشرتی رویّوں سے واقف ہوتا۔ میں اسے کیسے سمجھاتا کہ انگریزی راج کا دیا ہوا فیوڈلزم اب ہمارے معاشرے کا محور ہے اور ہر تاریکی کا منبع ہے۔ مگر اس سوچ کے باوجود اس کا چہرہ میرے لیے ایک طعنہ تھا کہ تم اپنی ریاست کے لیے صحیح قسم کے نچلے آدمی ثابت نہیں ہوئے۔ تم سے تو ہمارا نچلا کارکن ہی بہتر ہوتا ہے۔

احساسِ زیاں سے لت پت ہو کر اُس کے چہرے سے نظر ہٹا لیتا ہوں اور مجھے نو آبادیاتی نظام کے نچلے آدمی کا تراشا ہوا وہ نچلا کارُکن یاد آنے لگتا ہے۔ جسے عرصہ بعد میں نے اپنے مینار کی چھٹی منزل میں دیکھا تھا۔ وہ یاد آتے ہی میرے مینار کی چھٹی منزل میں ایک شرارہ سا لپکتا ہے۔ لمحہ بھر کی روشنی میں مجھے لندن کا وہ ہسپتال نظر آیا، جہاں بارہ برس کے وقفے کے بعد ۲۰۰۱ء میں میرے دل کا دوسری دفعہ بائی پاس (bypass) آپریشن ہو رہا تھا۔

دس گھنٹے کے طویل آپریشن اور ایک دن کی مکمل بے ہوشی کے بعد میں نے آنکھ کھولی، تو ادھیڑ عمر کی حبشی عورت کی میٹھی مسکراہٹ میرا سواگت کر رہی تھی۔ میرے محبوس جسم کے چاروں طرف نلکیوں اور تاروں کے جال میں سے راستہ بناتا ہوا اُس کا نرم ہاتھ آگے بڑھا اور مادرانہ شفقت سے میرے ماتھے کو سہلانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اسی ہاتھ نے اسی احتیاط سے میری ناک کے نیچے آکسیجن والی نلکی کا زاویہ درست کیا اور اورینج جوس کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اتنی نرمی سے کہ گھاس پر پھول کی پتی گرنے کا گمان ہوا۔

"طبیعت کیسی ہے؟" بالآخر وہ دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔ جکڑے ہوئے سر اور آنکھوں کی

ہلکی جنبش سے میں نے بتایا کہ ٹھیک ہوں۔ وہ ہنسی، ''تم محض ٹھیک نہیں ہو بلکہ بالکل ٹھیک ہو... جو ہونا تھا، ہو چکا۔ جو خرابی تھی وہ آپریشن کے ذریعے ختم کر دی گئی ہے۔ اب تم بالکل صحت مند ہو۔ بس ذرا زخم بھرنے ہیں۔ پھر وقت کے ساتھ سارے کھرنڈ خودبخود گرتے جائیں گے اور تمھیں پتا بھی نہیں چلے گا۔'' اپنا سر ہلا کر اُس نے میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی اور ساتھ میرا کندھا تھپتھپایا۔

پھر اس کے ہاتھ اور بازو اتنی پھرتی اور مہارت سے میرے چاروں طرف نلکیوں اور تاروں کے جال میں گردش کرنے لگے جیسے کسی بڑے سے جالے میں مکڑی اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گھومتی رہتی ہے۔ نہ اُس کا ہاتھ کسی تار سے ٹکراتا اور نہ ہی کوئی تار اُس کی پھرتیلی حرکات و سکنات میں رکاوٹ بن سکتا۔ ساتھ ساتھ وہ دیوار پر لٹکے ہوئے چارٹ سے دیکھتی بھی جاتی کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ تار، بٹن، نلکیاں، انجکشن، آلات وغیرہ کے آس پاس کبھی اس کے ہاتھ گردش کرتے اور کبھی وہ خود گردش کرنے لگتی۔ ساتھ ساتھ فائل میں اندراجات بھی کرتی جاتی، تاکہ بعد میں آنے والا اسٹاف اور نگران ڈاکٹر اس کی کارکردگی پرکھ سکیں۔ وہ بڑی یکسوئی، لگاوٹ اور پھرتی سے یہ سب کچھ کرتی رہی اور کافی دیر بعد فارغ سی ہو کر وہ میرے چہرے پر جھک گئی۔

''فیلنگ او کے؟'' (Feeling ok?)

میری آنکھوں کی مثبت جنبش دیکھ کر کہنے لگی، ''بہت بہتر... اب ہم باتیں کریں گے... ادھر ادھر کی گپ شپ تاکہ تمھارا دھیان بٹے اور تم اپنے آپ کو نارمل محسوس کرنے لگو لیکن زیادہ میں بولوں گی۔ تم اتنا ہی بولنا جتنا آسانی سے بول سکو۔'' پھر سے یہ غیر مساوی سی گفتگو چالو ہو گئی۔

وہ جزائر غرب الہند (West Indies) کے کسی جزیرے کی رہنے والی تھی۔ وہاں نرسنگ کے پیشے سے تعلق تھا۔ اتفاق سے انگلستان آنے کا موقع مل گیا اور کام میں اچھی ہونے کی وجہ سے اسے ایک مشکل ڈیوٹی مل گئی کہ بائی پاس سرجری کے بعد کی لمبی بے ہوشی کے بعد جب مریض ہوش میں آتا تو پہلے چوبیس گھنٹے وہ اس کی نگہداشت پر مامور ہوتی۔

میں پچھلے بائیس برس سے یہی ڈیوٹی دے رہی ہوں۔ پہلے چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی... کافی عرصے تک تو یہ آپریشن ایک ہی دفعہ ہوتا رہا، مگر جب دوسری دفعہ کی سرجری ایجاد ہوئی تو اس کے لیے اسپیشل اسٹاف بنایا گیا۔ خاص سرجن... خاص نرسیں۔ کیونکہ دوسری دفعہ کا یہ آپریشن بہت نازک اور بہت مشکل ہوتا ہے اور بڑی مہارت مانگتا ہے۔ پھر مجھے ترقی دے کر اس پر لگا دیا گیا۔ اسی لیے میں آج تمھارے ساتھ ہوں... اچھا یہ بتاؤ کبھی کسی عورت نے تمھارا شیو کیا ہے؟ مجھے پتا ہے نہیں کیا ہوگا... چلو تمھیں آج یہ مزہ بھی چکھا دیتی

ہوں۔

ایک سربمہر لفافہ پھاڑ کر اس نے کریم اور سیفٹی بلیڈ وغیرہ نکالے اور چہرے کی نلکیاں ہٹا کر بڑی مہارت سے شیو کرنے لگی ''ہمیں یہ ریزر (razor) سے ہی کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ الیکٹرک شیور کی تھرتھراہٹ (vibration) ان تمام آلات پر اثر انداز ہوتی ہے۔'' پھر اس کے ہاتھ بھی کام کرتے رہے اور زبان بھی چلتی رہی۔

''جب تک تم شیو نہیں کرو گے اپنے آپ کو بیمار سمجھتے رہو گے۔ یہ غلط فہمی دور ہو جائے تو صحت یابی تیز تر ہو جاتی ہے۔'' اور اس کی کہانیاں جاری رہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ مجبوری میں انگلستان آئی تھی۔ کیونکہ اس کے ملک میں روزی کے وسائل بہت محدود کر دیے گئے ہیں۔

کیا کریں... ہم لوگ طاقتور استعماری قوتوں کے کمزور خدمت گزار ہیں۔ نام کی آزادی تو ہے، مگر فکر و عمل کی آزادی نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں کام ہے ہی نہیں... دیکھیں نا۔ ہمارے سارے جزیرے میں ہمیں کیلے کے علاوہ کچھ اور کاشت کرنے کی اجازت نہیں اور یہ ساری فصل امریکہ کی ضرورت کے مطابق ہے۔ وہ اپنی زمینوں پر تو حسب مرضی مہنگی اور زیادہ آمدنی والی فصلیں (cash crops) اُگاتے ہیں یا انڈسٹری لگاتے ہیں۔ یونیورسٹیاں بناتے ہیں، مگر پھل اور سبزیاں اُگانے کے لیے ہمارے جزیروں کو پابند کیا ہوا ہے۔ امریکہ ہمیں اپنی خدمت گزاری تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور ہمیں حقیقی ترقی نہیں کرنے دیتا۔

گفتگو کا رُخ مڑ گیا۔ امریکہ کے خلاف تھوڑا سا تبصرہ کر کے وہ اپنے لیڈروں کے خلاف اُبل پڑی۔ ''وہ بڑی طاقتوں کے ہاتھوں بکنے والے نہ ہوتے تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ہمارے ملک بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن سکتے ہیں۔ مگر ہم اچھے لیڈر کہاں سے لائیں... بڑی طاقتیں ہمیں اچھے کارکن تو بنا دیتی ہیں۔ مگر اچھے لیڈر نہیں اُبھرنے دیتیں۔''

پھر گفتگو کے دوران ٹوٹے ہوئے بے ربط جملوں یا پھبتیوں سے وہ ظاہر کرتی رہی کہ وہ اپنے حاکموں سے دلگیر نہ ہوتی تو وطن چھوڑ کر کبھی اجنبی ملک میں ساری زندگی نہ گزارتی۔ اس نے دو تین نمونے میرے خون کے لیے اور چلتے چلتے کہنے لگی، ''بس زیادہ حرکت وغیرہ نہ کرنا میں ابھی آئی۔''

مجھے قدرے یکسوئی ملی تو بند آنکھوں کے عقب میں خیالات کا سلسلہ چل نکلا۔ مجھے بارہ برس پہلے والا ویسا ہی دن یاد آ گیا جب ۱۹۸۹ء کے لندن میں میرے دل کی پہلی دفعہ بائی پاس سرجری ہوئی تھی۔ ایسی ہی طویل بے ہوشی کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو بیگم کا دھندلا چہرہ نظر آیا۔ تھوڑی دیر میں دھندلاہٹ ہٹنے لگی تو میری کنکھیوں کو کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ آنکھیں گھما کر اور گردن سرکا کر دیکھا تو چند قدم دور کرسی پر مشتاق احمد یوسفی ساکت بیٹھے تھے اور ایک ڈاکٹر ان

کے پاس کھڑا تھا۔

ان دنوں یوسفی صاحب لندن کے بینک میں تھے اور میری ملازمت منیلا (فلپائن) میں تھی اور ہم دونوں جانتے تھے کہ اپنے اپنے انداز میں ہم دونوں ہی اپنے ملک میں ملازمت کے ماحول سے دلگیر تھے۔ میں نے تو یقیناً اسی وجہ سے وطن چھوڑا تھا۔ مگر کہہ نہیں سکتا کہ یوسفی صاحب کی کیا وجہ تھی۔ شاید یہی ہو۔ آج والی ماہرِفن نرس بھی کسی ایسی ہی دل آزاری سے دلگیر تھی۔ نہ معلوم تیسری دنیا کے باشندے کس آسیب کے سائے میں ہیں کہ وہ اپنے ملک میں سکون سے ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں، کیونکہ وہ کسی نہ کسی انداز میں نوآبادیاتی طاقتوں کے غلام ہی ہوتے ہیں۔ کبھی ایمپائر کا حصہ بن کر براہِ راست غلام اور کبھی نام نہاد آزادی میں اپنے بکاؤ لیڈروں کی وجہ سے بالواسطہ غلام۔ بوتلیں نئی نئی شکلوں کی، مگر مشروب وہی پرانا...

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' نرس کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''ہاں بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے آلوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمھارا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔ یہ اس وقت ہرگز نہیں بڑھنا چاہیے۔'' میں خاموش رہا۔

''تم جو بھی سوچ رہے تھے ... وہ سوچنا چھوڑ دو۔ میں تمھاری ڈرپ (drip) میں دوائی ڈال دیتی ہوں۔ تمھیں جلد ہی نیند آ جائے گی۔''

جب میری آنکھ کھلی تو غالباً چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ جا چکی تھی اور دوسری سفید فام نرس میرے اردگرد تاریں اور نلکیاں سلجھا رہی تھی۔

شرارہ بجھ جاتا ہے۔ منظر بدلنے لگتا ہے ... اور اب میرے مینار کی آٹھویں منزل سے غیر مقامی حاکمیت اور مقامی محکومی کا رشتہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ نچلی سطح کے آدمی اور نچلے کارکن کا رشتہ ... بکنے والے سرشار لیڈر اور مایوس شہری کا رشتہ ... کم روزی والے ملک اور زیادہ روزی والے ملک کا رشتہ ... خلوص اور بدنیتی کا رشتہ ... میں اس تعلق پر غور کرنے لگتا ہوں۔ تو میری نظر خودبخود پھسل کر ایک کشادہ سے اُجالے میں جا کر اٹک جاتی ہے۔ یہ اجالا کیسا؟ میں حیران ہو کر دیکھتا ہوں۔

یہ اُجالا تو میرے مینار کی دو تین نچلی منزلوں میں ہو رہا ہے ... مگر کچھ مختلف قسم کا اُجالا ہے۔ یہ رات کو جلنے والے بلب کا اُجالا نہیں۔ بلکہ صبح کی ترچھی دھوپ کی درآمد سے کمرے میں چھا جانے والی بے شناخت سی روشنی ہے ... اور اس میں کہیں کہیں داغ دھبے بھی ہیں۔ جیسے نیم اُجلے کمرے کے کونوں کھدروں میں سائے سے ہوتے ہیں ... میں غور سے دیکھ کر اس کا منبع دیکھنے کی کوشش کرتا

ہوں۔

نہ معلوم وہ منبع کہاں ہے ... شاید وہ کہیں نہیں ہے اور یہ داغ کیوں ہیں؟ کہیں چھوٹے اور کہیں بڑے کیوں ہیں؟

میری لاحاصل تلاش کے دوران آٹھویں منزل کی فراست میرے کان میں سرگوشیاں کرنے لگتی ہے۔ یہ کسی منبع سے نکلنے والی روشنی نہیں۔ بلکہ حُسنِ انتظام (Good governance) کی متوازن تابانی ہے جس میں گلشن کا نرم رفتار کاروبار چل رہا ہے۔

پھر یہ سرگوشی ایک دم دھیمی پڑنے لگتی ہے۔ جیسے کوئی بہت ہی راز کی بات کہہ رہا ہو۔ یہ اُجالا اس لیے ہے کہ انگریز کی حکومت نچلی سطح پر اپنی بنیادی ذمے داریاں پوری کر رہی ہے۔ دفاع کی، خوراک کی، تعلیم کی، صحت عامہ کی، امن و امان کی، رسل و رسائل کی، نقل و حمل کی ... اور ... اور ... روزی بہم پہنچانے کی ... اور داغ دھبے اس عوامی خلش کے ہیں کہ یہ ریاست ہماری ہے لیکن اس پر غیروں کا قبضہ ہے۔ وہ صرف اتنی ذمے داری نبھاتے ہیں جتنی وہ چاہتے ہیں اور اتنی نہیں نبھاتے جتنی ہم چاہتے ہیں ... اور جتنی آزاد ریاستوں میں نبھائی جاتی ہے۔ یہ تابانی ہماری نہیں ہے بلکہ کسی اور کا پرتو ہے۔ انعکاس ہے ... بلکہ بھیک ہے۔

یہ سرگوشیاں سن کر میں مزید غور سے اپنے مینار کی پہلی منزل میں جھانکنے لگتا ہوں جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ اور وہ انگریز حاکموں کا دور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ سوکھی مکئی کے بھنے جانے والے دانوں کی طرح میرے ذہن میں وہ یادیں اُچھل اُچھل کر اپنا آپ دکھانے لگتی ہیں۔ جو میرے بچپن میں دبی ہوئی تھیں یا وہ باتیں گونجنے لگتی ہیں جو میرے بڑے آپس میں کیا کرتے تھے اور ہم چھوٹے سنا کرتے تھے۔ پہلے راولپنڈی میں اور پھر لاہور میں۔

انگریزی دور میں شہریوں اور حکومت کا رشتہ بڑا انوکھا سا تھا۔ جیسے بہت چھوٹے چوزوں کے غول کا مرغی کے پھیلے ہوئے پروں کے اردگرد ہوتا ہے۔ تحفظ کا ایسا سرسبز احساس جو وقت کے ساتھ خود ہی مرجھانے والا بھی ہوتا ہے۔ چوزوں کی اس جبلّت کی وجہ سے کہ بڑے ہو کر ہم اپنی اپنی راہ لیں گے اور مرغی کو پہچانیں گے بھی نہیں۔ گویا کڑوے بادام پر میٹھے غلاف کی طرح اندرونی بے وفائی پر بیرونی طور پر رضاکارانہ سنگت کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ یہ پکی لگاوٹ، محبت یا فریفتگی کا رشتہ ہرگز نہیں تھا۔ صرف وقتی اعتبار اور عارضی صداقت سے حصولِ مقصد کا عملی سا رشتہ تھا۔ اگر کسی مالی معاملے کا ایک فریق شہری ہوتا اور دوسرا فریق حکومت ہوتی تو شہری آنکھیں بند کر کے شامل ہو جاتا۔ اس ایمان کے ساتھ کہ حکومت تو دھوکا دہی، وعدہ خلافی یا بے ایمانی کا چلن اختیار کر ہی نہیں سکتی۔ وہ

مخصوص حالات میں ظلم تو کر سکتی ہے، مگر عمومی طور پر عوام دشمنی نہیں کر سکتی۔ اسی پُراعتماد فضا کی وجہ سے شہریوں کی اوّلین ترجیح سرکاری ملازمت ہوتی تھی، جو صرف چوبیس برس کی عمر تک مل سکتی تھی۔ اس کے بعد سرکاری ملازمت کے دروازے عمر بھر کے لیے بند ہو جاتے تھے اور کسی کی بھی سفارش چل نہیں سکتی تھی۔ اس لیے سمجھ دار باپ اپنے لڑکوں کی عمر کا اندراج میٹرک کے امتحان میں ایک دو برس کم کروایا کرتے تھے، تاکہ بیماری یا ایک آدھ برس امتحان میں ناکامی کی وجہ سے وہ کہیں زائد المیعاد (over age) نہ ہو جائے۔ حکومتی گزٹ (Gazette) میں شائع ہونے والے حکم نامے، اطلاع یا خبر میں شک کی کبھی گنجائش ہی نہ ہوتی تھی اور لوگ اسے پتھر پہ لکیر کی طرح تسلیم کر لیتے تھے۔

ظاہری صداقت کے اس رشتے کی بنیاد یہ تھی کہ حکومت کے جتنے محکمے تھے وہ اپنا کام پوری توجہ اور یکسوئی سے کرتے تھے اور آج کل کی طرح عوامی تحسین حاصل کرنے کے لیے اخباروں میں لاف زنی والے بڑے بڑے اشتہارات کسی نااہل محکمے کی طرف سے کبھی نہیں چھپتے تھے۔ نہ ہی کبھی وائسرائے یا گورنر یہ ڈھنڈورا پیٹتے تھے کہ معمولی مگر ہنگامہ خیز واقعے کا انھوں نے نوٹس لے لیا ہے۔ ان دو چیزوں کا تصور بھی نہ تھا۔ اسی طرح کسی فالتو محکمے کا بھی کوئی تصور نہ تھا اور نہ ہی کسی نااہل محکمے میں فالتو یا نکھے افراد بھرتی کیے جاتے تھے۔

مرکزی حکومت کا دارالحکومت دہلی تھا۔ جہاں مرکزی حکومت کا سیکرٹریٹ تھا۔ وہاں بڑے افسروں کے مقابلے کے امتحان کی طرح کلرک، اسسٹنٹ اور اسٹینوگرافر بھرتی کرنے کے لیے ہندوستان بھر کے ہر بڑے شہر میں ایک ہی دن امتحانات منعقد ہوتے تھے اور یہ وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے، تاکہ حالیہ اسٹاف کی ترقی یا ریٹائرمنٹ کی وجہ سے خالی اسامیاں فوری طور پر باقاعدگی سے پُر ہوتی رہیں۔ اسی قسم کے امتحانات چیدہ چیدہ مرکزی اور صوبائی محکموں میں بھرتی کے لیے اکثر اوقات ہوتے رہتے تھے۔ ایمپلائی منٹ ایکس چینج (Employment Exchange) ان کے علاوہ تھے۔ یہ مستقل قسم کے ادارے تھے جہاں ہر سرکاری محکمے میں خالی اسامیوں کی فہرست موجود رہتی تھی اور ملازمت کا خواہش مند وہاں جا کر درخواست دیتا تھا اور اُسے اپنی قابلیت کے مطابق خالی اسامی کے لیے تعارفی خط مل جاتا تھا۔ وہ متعلقہ محکمے میں جا کر انٹرویو دیتا تھا جس کا فوری فیصلہ سنا دیا جاتا تھا۔

میرٹ پر بھرتی کے اتنے بندوبستوں کی موجودگی میں ایسا کوئی تصور بھی نہ تھا کہ کسی اسمبلی کے رکن یا سیاسی پارٹی کو اپنے آدمی بھرتی کروانے کی سہولت دی جا سکتی ہے، بلکہ یہ تمام بندوبست ایسے امکانات کو روکنے کے لیے کیے جاتے تھے۔

اس وقت میرے مینار کے انگریزی دور میں روزمرہ محکمانہ کارکردگی کے متعلق تین شرارے چمک رہے ہیں۔ محکمۂ صحت، محکمۂ تعلیم اور محکمۂ ڈاک کے متعلق۔

میں ہائی اسکول کی سب سے نچلی کلاس میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ دن کے دس بجے ساری کلاس پی ٹی کے اُستاد (ڈرل ماسٹر) کی سرکردگی میں راولپنڈی کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال کی طرف مارچ کر رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر برآمدے میں انتظار کیا گیا تاکہ دوسرے اسکولوں سے آئے ہوئے طلباء کے پچھلے گروپ فارغ ہو جائیں۔ اس دوران ہماری کاغذی کارروائی بھی ہوتی رہی۔ پھر ایک ایک لڑکا اندر جانے لگا، تاکہ ایکس رے کی مشین کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی چھاتی کی اسکریننگ (screening) کروا سکے۔ جو صحت مند تھے وہ خوش خوش واپس آ گئے جن کے بارے میں ذرا بھی شک تھا، ان کا ایکس رے سے باقاعدہ فوٹو لیا گیا اور کہا گیا کہ اپنی فائل اور فوٹو لے کر فلاں تاریخ کو اپنے والدین سمیت فلاں ٹی بی کلینک (TB Clinic) میں پہنچ جائیں۔

اس مثال کو سمجھنے کے لیے زمان و مکان کا علم ضروری ہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور اس دوران زندگی کے ہر شعبے میں ہونے والی نئی ایجادوں کا وہ سیلاب ابھی ظاہر نہ ہوا تھا، جس نے چند ہی برسوں میں ہمیں پرانے زمانے سے نکال کر نئے زمانے میں داخل کر دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک دنیا پرانے زمانے میں ہی رہ رہی تھی نہ تو تب پنسلین (penicilline) یا کسی اور ضد نامیہ (Antibiotic) کا ظہور ہوا تھا، نہ ہی ٹیکہ لگانے کا کوئی تصور تھا۔ دواؤں کی گولیاں بھی خال خال تھیں (مثلاً ملیریا کا واحد علاج کونین کی گولی)۔ اس لیے ہر مرض کے لیے مریض کی طبیعت کے مطابق کچھ دواؤں کو پانی میں حل کر کے ایک محلول (mixture) کی شکل میں اسے خوراکوں والی شیشی تھما دی جاتی تھی۔ ہر بڑے دیہات اور شہر کے ہر محلے میں مفت علاج کے لیے ایک سرکاری ڈسپنسری قائم ہوتی تھی، جس میں مختلف قسم کے محلول (mixtures) کی بڑی بڑی بوتلیں ہر وقت موجود ہوتی تھیں۔ تحصیل اور ضلع کے ہیڈ کوارٹرز میں بڑے ہسپتال ہوتے تھے جہاں علاج دوائیاں اور خوراک مفت دیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کی بھی دکانیں تھیں اور پورے پورے کنبے ان کے مستقل مریض ہوتے تھے۔ معمولی سی فیس کے عوض ڈاکٹروں کو گھر بھی بلایا جا سکتا تھا۔ ملک بھر میں حکیموں کے دواخانوں یا اداروں کا جال ان کے علاوہ تھا۔ غرض پرائیویٹ سستا علاج معالجہ لوگوں کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا اور سرکاری اداروں میں مفت علاج کے لیے ہر قسم کی سہولت تھی۔

اُن دنوں راولپنڈی کے گرد و نواح میں تپ دق کا مرض سلگتی ہوئی مسلسل وبا کی شکل میں ہر

وقت موجود رہتا تھا۔ مرض کی ابتدائی صورت کا علاج تو ہسپتال میں یا ٹی بی کے مخصوص کلینک میں ہو جاتا تھا، مگر شدید حالت میں نقل مکانی کر کے پہاڑی علاقوں میں سینی ٹوریم (sanatorium) میں جانا پڑتا تھا۔[۲]

ہمارے ہمسائے میں ایک کشادہ گھر میں ایک باپ بیٹی رہتے تھے۔ شنید تھی کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ بھرا پُرا گھرانہ تھا۔ مگر جب تپ دق گھر میں آن گھسی تو یکے بعد دیگرے گھر کے افراد کم ہوتے گئے۔ لڑکی بیس بائیس برس کی تھی اور اتنی خوبصورت تھی کہ اپنی پرائمری اسکول کی عمر میں مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ اسے دیکھ کر انسان کو کیا ہونے لگتا ہے، مگر بڑوں کی باہمی گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کی شادی میں بھی یہی مشکل تھی کہ مرض نے وہ گھر دیکھا ہوا تھا۔ چند ہی برسوں میں وہ باپ بیٹی تپ دق کا نشانہ بن گئے اور گھر پر ''برائے فروخت'' کا اشتہار لگ گیا۔

ایسی کہانیاں مختلف گھروں کے بارے میں ہم اکثر سنا کرتے تھے۔ مگر اپنے ایک کلاس فیلو کے گھرانے کا یہی المیہ تو میں بار بار عینی شاہد کے طور پر دیکھا کرتا تھا۔ اسی پس منظر میں تمام سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں کے طلباء کو وقتاً فوقتاً چھاتی کی اسکریننگ کے لیے باجماعت ہسپتال لایا جاتا تھا۔ جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ یہ محکمۂ صحت کی کارکردگی کی صرف ایک مثال تھی۔

دوسری مثال محکمۂ تعلیم کی تھی جس کے نگران شعبے (inspection) سے والد صاحب وابستہ تھے۔ وہ ہر ماہ کے دوران دو چار دفعہ چند روزہ دوروں پر جا کر سرکاری اور غیر سرکاری ہر قسم کے اسکولوں کا معائنہ کرتے تھے۔ ان کا چپراسی کھانے پینے کا بنیادی سامان گھر سے لے جاتا اور ثانوی سامان مقامی بازار سے خرید لیتا تھا۔ وہ کبھی تو اسی علاقے کے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں قیام کرتے تھے اور اس کی عدم موجودگی میں اسکولوں کی عمارت میں ہی ٹھہرتے۔ جہاں وہی چپراسی کھانا پکایا کرتا تھا۔ ایک ہی دورے میں وہ کہیں ٹرین میں سفر کرتے، کہیں بس میں، تانگے پر یا سائیکل پر سوار ہوتے۔ دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں یا دور افتادہ اسکولوں کے معائنے کے لیے پیدل چل کر جاتے۔ چنانچہ ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے مطلوبہ اشیا ساتھ رکھتے۔ مثلاً چھتری، ٹارچ، ادویات وغیرہ۔ بڑے کڑے قواعد کے تحت سفر خرچ حکومت کی طرف سے دیا جاتا تھا اور ابا جان سے کئی دفعہ سنا تھا کہ فرضی معائنہ دکھانے یا فرضی سفر خرچ لینے والے فلاں فلاں افسر کو پوری انکوائری کے بعد ملازمت سے فارغ ہونا پڑا۔ نوآبادیاتی دور میں جھوٹا سفر خرچ لینے سے بڑا محکمانہ جرم شاید ہی کوئی ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ بغیر کسی خاص وجہ (بیماری وغیرہ کے) ہر ماہ کے مقررہ دنوں سے کم دورے کرنے پر فوراً جواب طلبی ہو جاتی تھی اور اس کا براہِ راست ترقی پر منفی اثر

پڑتا تھا، کیونکہ ان دنوں ترقی صرف اور صرف سالانہ کارگزاری کی بنا پر ہوتی تھی۔ مع اس پرکھ کے کہ کیا اس ملازم کی جملہ کارکردگی ''سرکاری ملازمین کے طرزِ عمل'' (Govt. Servants Conduct Rules) کے مطابق تھی یا نہیں۔

یہ سب باتیں ہم بچوں کے لیے نئی ضرور تھیں، مگر ہمیں ان سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ہمارے لیے تو تب عید ہو جاتی، جب کبھی ہمارے اسکول کی چھٹیوں کے زمانے میں ابا جان کو قریبی علاقے میں صبح سے شام تک صرف ایک روزہ دورے پر جانا ہوتا تھا اور وہ ہم میں سے کسی ایک بچے کو ساتھ لے جاتے۔ وہ خود تو اسکول کا معائنہ کرتے رہتے اور بچہ کسی نگران کے ساتھ قریبی گاؤں میں گھوم پھر کر دیہاتی زندگی سے آشنا ہوتا رہتا۔ مجھے صرف دو دفعہ ایسا موقعہ ملا۔ پہلی مرتبہ موضع سیّد پور گیا، جو اس وقت راولپنڈی کے قریبی علاقوں میں شامل تھا اور اب کافی عرصہ اسلام آباد کا بغلی گاؤں رہنے کے بعد اسلام آباد ہی کی بغل میں سما گیا ہے۔

یہ بڑا ہی پُرفضا گاؤں تھا۔ پہاڑ کا دامن، آبادی سے ذرا بلند حصے پر ہندوؤں کا شوخ رنگوں والا خوبصورت مندر۔ ڈھلان پر قرینے سے لگائے ہوئے درخت، گملے اور گھاس۔ دامن میں گاؤں کے اندر جانے والی مٹی، پتھر اور روڑوں بھری کچی مگر ہموار سڑک، اس کے ساتھ ساتھ کسی وفادار سنگی کی طرح صاف ستھرے شفاف اور چمکیلے پانی کا لہکتا اور گنگناتا ہوا چشمہ جس میں اپنی ہی خوشیوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی سبک خرام مچھلیاں۔ اردگرد موسمی پھولوں کی بہتات۔ گلی کوچوں سے نکلنے والے چہروں پر اطمینان کا عکس، رواداری کی مسکراہٹ اور زندگی سے لگن والی سرگرمی ... ایسا اُجلا، سایہ دار، ہوادار اور سرسبز ماحول دیکھ کر میرا شہری سراپا جیسے ایک سُرور میں تیرنے لگا۔ مجھے گاؤں کے کسی نگران کے پاس چھوڑ کر ابا جان اسکولوں کا معائنہ کرنے کے لیے سامنے والی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور شام کو واپسی پر مجھے ساتھ لیتے آئے۔ (یہ چشمہ آج ایک گندہ نالہ ہے اور کافی حد تک جنگل جھاڑیوں اور کوڑے کرکٹ کی پناہ گاہ ہے)۔

اسی قسم کے دوسرے دورے پر میں موضع بھنگڑیل گیا جو راول ندی کے کنارے تھا۔ گاؤں تو پانی سے ذرا ہٹ کے قدرے بلندی پر واقع تھا۔ مگر میری دلچسپی اس قریباً بیس فٹ اُونچی آبشار میں تھی، جو گاؤں کے سامنے راول ندی کی اصل رونق تھی۔ بلندی سے اچانک اُمنڈنے والے بھاری پانی کی بجلی، دلربا اور خوش رفتار قوس کی گرانڈیل خمیدگی میں بھی ایک شاندار فخریہ اُٹھان تھی جو قدم بہ قدم اُوپر اُٹھنے کی بجائے نیچے اُترتی ہوئی نظر آتی تھی۔ مگر اُترتے ہی بھاری پتھروں سے ٹکرا کر اپنا رنگ روپ شکل وصورت اور مزاج بدل کر پُرشور چنگھاڑتے ہوئے جھاگ بھرے طوفانوں میں

ڈھل جاتی تھی۔ پھر اپنی ہی ٹوٹ پھوٹ پر پچھتاوے میں سر پٹختی ہوئی آگے بڑھتی۔ مگر خود ہی اپنے ہیجان کو فضول سمجھ کر ایک دم ڈھیلی پڑ جاتی اور گاؤں کے لڑکوں کے پلّے پڑ جاتی جو چادریں پھیلا کر، گھی کے خالی کنستر ڈبو ڈبو کر یا پانی میں بنسیاں لٹکا کر مچھلیاں پکڑنے لگتے۔ میں اسی آبشار کی نمی، دھند اور شور میں دن بھر کھیلتا رہا اور ابا جان قرب و جوار میں اسکولوں کا معائنہ کرتے رہے۔ میں بھاگ بھاگ کر آبشار کو کبھی اُوپر جا کر دیکھتا اور کبھی نیچے آ کر۔

قیامِ پاکستان کے بعد اسلام آباد کے جنم لینے اور پھیلنے پر اس طرحدار آبشار نے راول ڈیم کا روپ دھار لیا اور جس جگہ میں گھومتا پھرتا رہا وہ مقام اب راول ڈیم کی وسیع جھیل کے نیچے زیرِ آب ہے۔ آج کل اس جھیل میں پانی کے علاوہ قریبی بلندی پر واقع بنی گالا کی بستی سے کوڑے کرکٹ کی بھی آمد ہے اور اردگرد کے علاقے کے لیے پینے والے پانی کی بھی نکاسی ہے۔ چنانچہ عین دارالحکومت میں یہ جھیل ہماری حکومتوں اور عوام کے حقیقی رشتے کی علامت بن چکی ہے کہ اُجالا کم، داغ زیادہ اور وطن کی ہر سحر بری طرح شب گزیدہ۔

گھر میں یا دوستوں کی محفل میں ابا جان کی جو باتیں میں سنتا رہتا تھا ان سے یوں لگتا تھا کہ محکمۂ تعلیم کڑے قواعد و ضوابط کا ایک قید خانہ ہے جس میں ہر کوئی ہر کسی کو تربیت بھی دے رہا ہے اور ہر کوئی ہر کسی کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ نئے اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں لالہ موسیٰ میں نارمل اسکول کا ذکر سنا تو معلوم ہوا کہ یہ مخصوص انداز کا اسکول ہے جس میں طلباء تو عام لڑکے ہی ہوتے ہیں مگر اساتذہ عام اُستاد نہیں ہوتے، بلکہ زیادہ تر وہ نو آموز ہوتے ہیں، جو عملی تربیت حاصل کرنے کے لیے یہاں تعینات کیے جاتے ہیں۔ اساتذہ کے تربیتی ادارے (سینٹرل ٹریننگ کالج، لاہور) سے بی ٹی (BT) کی ڈگری یا سی ٹی (CT) کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد اُن کا پہلا پڑاؤ یہاں ہوتا ہے، تا کہ ان کے سابقہ طالب علمانہ مزاج کو اُستادی رنگ میں رنگا جائے۔ اس لیے درس و تدریس کی عملی تربیت کے لیے انھیں کچھ عرصہ ایسے ہی نارمل اسکولوں میں پڑھانا پڑتا تھا۔ پھر اس کے بعد ہی انھیں سرکاری یا غیر سرکاری اسکولوں میں ملازمت مل سکتی تھی۔

لاہور میں اپنی ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران میں نے یہ بھی دیکھا کہ بی ٹی (BT) کے طلباء کا آخری امتحان بھی ہماری کلاس میں ہوتا تھا۔ وہ اس طرح کہ سینٹرل ٹریننگ کالج، لاہور کے طلباء کو آخری دنوں میں چند دنوں کے لیے شہر کے اسکولوں میں بطور ''شاگرد اُستاد'' (pupil teacher) تعینات کر دیا جاتا تھا اور جب وہ ہمیں پڑھا رہے ہوتے تھے تو ان کے ممتحن ہماری کلاس کی پچھلی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کو پرکھتے رہتے تھے اور اس پرکھ کی بنیاد پر ڈگری حاصل کرنے کے لیے انھیں

پاس (pass) یا فیل (fail) قرار دیا جاتا تھا۔ بیرونی حاکموں کے اس طریقِ کار میں آج کی اندرونی آزادی والی جعلی ڈگریاں حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

میں اپنے بینار میں جھانکتا ہوں تو وہاں بہت زیادہ شرارے محکمۂ تعلیم کے متعلق ہیں۔ کیونکہ ابا جان کے علاوہ ہمارے کئی عزیز اس سے وابستہ رہے۔ مگر ان کی بتائی ہوئی کہانیوں کے ہجوم کی بجائے میں صرف اپنی ذاتی یادوں کی چند جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں۔

اس نظام کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ گنتی کے چند کانونٹ (convent) اسکولوں کے علاوہ باقی ساری قوم کے لیے ایک ہی طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم تھا اور شاید اتنا ہی اہم پہلو یہ بھی تھا کہ تعلیم انتہائی سستی تھی۔ تعلیمی اداروں کی فیس اتنی کم تھی، جیسے فقیر کے کشکول میں چھوٹا سا سکہ ڈال دیا جاتا ہے اور دینے والے کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کی جیب ہلکی ہوئی ہے۔ جس طرح آپ ایک چھوٹے سے سکّے کے عوض بہت سی دُعائیں لیتے تھے۔ اسی طرح تھوڑا سا خرچ کر کے آپ بہت سی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی وجوہات کی بنا پر فیس بھی بڑی آسانی اور فراخ دلی سے آدھی یا پوری معاف کر دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں سرکاری اور غیر سرکاری (مثلاً مسلمانوں کے اسلامیہ اسکول، سکھوں کے خالصہ اسکول اور ہندوؤں کے سناتن دھرم اسکول وغیرہ) کے قوانین یکساں ہوتے تھے کہ ایک ہی گھرانے کے پہلے بچے کی فیس پوری ہوتی تھی۔ مگر دوسرے اور تیسرے بچے کی فیس (اگر وہ بیک وقت اُسی اسکول میں پڑھتے تھے) آدھی معاف ہو جاتی تھی۔ تعلیم سستی ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ نہ تو نصاب کبھی بدلتا تھا اور نہ ہی کبھی کتابیں بدلتی تھیں۔ ایک ایک دو برس کے وقفے سے ہم چار بھائی مختلف اسکولوں میں پڑھ رہے تھے، مگر سب سے چھوٹے نے آخر میں وہی کتابیں استعمال کیں جو شروع میں سب سے بڑے نے خریدی تھیں۔

ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بھی تھا کہ تمام تعلیمی اداروں اور اساتذہ کی طرف سے پرائیویٹ ٹیوشن کی شدید حوصلہ شکنی کی جاتی تھی اور اسے انتہائی برا سمجھا جاتا تھا، کیونکہ اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاتا تھا کہ کلاس ٹیچر نکما ہوگا، جس کی وجہ سے ٹیوشن کی ضرورت پڑی۔ اس لیے اپنے اپنے اسکول کی اچھی شہرت کے لیے وہ ادارے ٹیوشن کی حوصلہ شکنی کرتے تھے اور اساتذہ اسے اپنی بدنامی تصور کرتے تھے۔

اس کی صرف ایک مثال۔ ساتویں جماعت میں ہمارے ایک بہت لائق، اچھے اور محنتی اُستاد نے محسوس کیا کہ سالِ رواں میں شاید نصابی کورس پورا نہ ہو سکے۔ اس لیے وہ صرف پندرہ دن کے لیے اسکول کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے تمام لڑکوں کی اضافی اور خصوصی کلاس لینے لگے۔ دو ایک روز

بعد والد صاحب نے مجھے گھر سے نکلتے دیکھ کر روک لیا کہ یہ ٹیوشن کی غلط رسم ڈالی جا رہی ہے۔ بعدازاں میں معمول کے مطابق اسکول گیا۔ تو اپنے پیریڈ میں اُستاد نے مجھے صبح کی کلاس سے غیر حاضری کے لیے سزا دی۔ اگلے دن میں چوری چھپے گھر سے نکلا تو اباجان بھی خاموشی سے میرے ساتھ چل دیے اور مجھے سیدھا ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں لے جا کر ٹیوشن کی غلط رسم پر احتجاج کیا۔ ہیڈ ماسٹر نے فوراً اُستاد کو طلب کر لیا، مگر انھوں نے کہا کہ میں پوری کلاس میں سے صرف انسپکٹر صاحب کے بچے کو استثنیٰ نہیں دے سکتا۔ یہ میرا فرض ہے کہ جیسے بھی ہو میں ساری کلاس کو پورا کورس پڑھاؤں۔ اس دفعہ بھی تاخیر کی وجہ یہی ہے کہ چند کمزور لڑکوں پر زیادہ توجہ کی وجہ سے میرے پڑھانے کی رفتار کم رہی۔

والد اور اُستاد میں تصادم دیکھ کر میں رونے لگا تو مجھے کلاس میں بھیج دیا گیا۔ بعد میں معلوم نہیں کیا ہوا مگر اس کے بعد اباجان سے اجازت مل گئی اور میں پندرہ دن کے اختتام تک خصوصی کلاس میں جاتا رہا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُستاد نے یا اسکول نے مجھ سے یا کسی اور سے اس اضافی کلاس کی اضافی فیس نہیں لی۔ سرکاری ملازمت کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ انگریز کی گورننس (governance) میں اساتذہ کی تنخواہیں نہ صرف مناسب تھیں بلکہ دوسری جنگِ عظیم کی طوالت سے مہنگائی میں اضافہ ہونے لگا تو اساتذہ سمیت سارے سرکاری ملازموں کو اُسی تناسب سے مہنگائی الاؤنس ملنے لگا۔ سالانہ بجٹ میں ہر اسکول کو اتنے وافر وسائل دیے جاتے تھے کہ ہر کلاس کے ہر فریق یا سیکشن کے طلباء اگر اپنی ٹیم بنا کر کرکٹ، فٹ بال، ہاکی یا بیڈمنٹن اور والی بال کھیلنا چاہتے تھے تو انھیں محض ایک مشترکہ عرضی کی بنا پر اسکول سے سارا سامان فی الفور مہیا کر دیا جاتا تھا۔ اسی لیے ہر شام ہمارے اسکول کے وسیع گراؤنڈ اور دوسرے اضافی گراؤنڈز میں شام کو کئی ٹیمیں کھیل رہی ہوتی تھیں۔ یہی حال دوسرے اسکولوں میں بھی تھا اور انھی میں سے حفیظ کاردار، امتیاز، خان محمد اور فضل محمود جیسے کھلاڑی بنتے رہے۔ آج کے تعلیمی حلقوں میں اگر میں یہ قصہ سناتا ہوں تو غالب کا مصرع میرا منھ چڑاتا ہے۔ ع

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات

ہماری تعلیمی زندگی کی باقاعدگی اور ترتیب کا قرینہ گویا قدرتی موسموں کی باقاعدگی اور قرینے کی نقالی تھی اور دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک کی طرح اوقات کی تابع تھی۔ صوبہ پنجاب[۳] کے تمام اسکولوں کی تمام کلاسوں کے سالانہ امتحانات ہمیشہ ۱۵ / مارچ کو شروع ہوتے تھے اور ۳۱ / مارچ کو پورے صوبے میں بیک وقت ہر جماعت کے نتائج کا اعلان ہوتا تھا۔ پھر پندرہ دن کی چھٹی کے بعد

ہر برس ۱۶ / اپریل کو کامیاب طلباء اگلی کلاس میں بٹھا دیے جاتے تھے۔ یونیورسٹی کی ہوا کا پہلا جھونکا میٹرک کے امتحان کی شکل میں طلباء تک پہنچتا تھا۔ اسی لیے اس امتحان کو انٹرنس (entrance) کا امتحان کہا جاتا تھا۔ اس کے نتیجے کی تاریخ کا اعلان البتہ ہر برس الگ الگ ہوتا تھا۔ اس تاریخ سے ایک شام پہلے یونیورسٹی گزٹ (Gazette) کی چند جلدیں[۴] سربمہر پیکٹ کی شکل میں بذریعہ ریل ہر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ آدھی رات کے وقت نتیجہ سننے والے طلباء بھی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاتے۔ رات کے عین بارہ بجے اس ہجوم کے سامنے اسٹیشن ماسٹر سربمہر پیکٹ کی مہریں توڑتا۔ گزٹ کی ایک کاپی عوام کی اطلاع کے لیے خود استعمال میں لے آتا اور باقی جلدیں یونیورسٹی کی طرف سے چند مجاز خریداروں کے حوالے کر دیتا۔ ہم نے کبھی یہ شکایت نہیں سنی تھی کہ مقررہ وقت سے پہلے کسی پیکٹ کی مہر توڑی گئی ہو اور لوگوں کو آدھی رات سے پہلے اپنے رزلٹ کا پتا چل گیا ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انتظامیہ کی ہر سطح اپنے سے نچلی سطح پر کڑی نگرانی قائم رکھتی تھی اور مجاز سطح پر قومی احتساب ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں تمام دیہاتوں اور شہروں میں تاریخِ پیدائش کے ریکارڈ کا بندوبست نہ تھا۔ اس لیے حکومت صرف وہ تاریخِ پیدائش تسلیم کرتی تھی جو میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہوتی تھی۔ (میونسپل کمیٹیاں قائم ہونے سے پہلے رواج یہ تھا کہ گاؤں کے مولوی، میراثی اور دائی کو یاد ہوتا تھا کہ کس کے گھر کب بچہ پیدا ہوا ہے اور یہی لوگ پورے گاؤں کے چلتے پھرتے شجرۂ نسب کے امین ہوتے تھے)

نوآبادیاتی دور کے حُسنِ انتظام کی تیسری مثال محکمۂ ڈاک اور تار (یعنی ٹیلی گرام) کی تھی جس کی کارکردگی میں عوامی رسائی کے علاوہ ایثار اور لگن کا رنگ بھی جھلکتا تھا۔ ہر موسم کی شدت کے باوجود خاکی پگڑی، خاکی وردی اور خاکی رنگ کی سائیکل والا ڈاکیا کان اور پگڑی کے درمیان قلم اُڑس کر گھر گھر گھومتا تھا۔ تاکہ ہفتے میں سات روز خطوط اور چھے دن منی آرڈر تقسیم کر سکے۔ وہ اتوار وغیرہ کی چھٹی سے بے نیاز ہوتا تھا۔ ڈاک خانہ چھوٹی بچت والوں کا بینک بھی تھا اور پنشن یافتہ ملازمین کی پنشن کی ترسیل کا ذریعہ بھی تھا۔ انگریزی دور میں تھانہ اور کچہری اگر حکومت کی جابر حاکمیت کی علامت تھے تو ڈاک خانہ حکومت کی عوامی حکمت کی علامت تھا، جو ہر لحاظ سے عوام دوستی کا تاثر دیتا تھا اور ڈاک خانے کی مہر پر ہر شہری کو پورا اعتماد ہوتا تھا۔ اسی لیے ملک بھر میں پھیلا ہوا ڈاک خانوں کا جال ہر اُس کام کے لیے فی الفور استعمال ہوتا تھا جہاں حکومت کی آواز سلطنت کی ہر گلی کوچے تک پہنچانا ہوتی تھی۔ مؤرخوں کا استدلال ہے کہ اگر محکمۂ ڈاک و تار (Post & Telegraph Dept.) میں تار یا ٹیلی گراف کا عنصر انھی دنوں شامل نہ ہوا ہوتا تو انگریز ۱۸۵۷ء کی

جنگِ آزادی یا غدر جیت نہ سکتے تھے۔ بلکہ ان کی شکست یقینی تھی۔ اس محکمے کا خدمتی پہلو یہ تھا کہ ہمارے زمانے میں ڈاکیا ان لوگوں کے بتانے پر خطوں کے جواب بھی تحریر کر دیتا تھا جو ان پڑھ تھے اور جہاں تعلیمی ادارے قائم نہ تھے۔

مشتے از خروارے کے طور پر یہ صرف تین محکموں کی سطحی سی جھلک تھی۔ لیکن بیوروکریسی کے پورے پھیلاؤ میں مثبت اور منفی رجحانات کا پیچیدہ تانا بانا تھا۔ ان دنوں بیرونی جابر حاکم اور مقامی مجبور محکوموں کے درمیان بلاشبہ بہت سے نسلی، سماجی، سیاسی اور انتظامی فاصلے تھے۔ مگر تمام سرکاری محکمے ان دونوں کے درمیان بڑے ہی غیر شخصی اور غیر ذاتی انداز میں کسی غیر محسوس ناقابلِ دید رابطے کا پُل بناتے تھے۔ یہ پوشیدہ مگر مضبوط پُل ان آہنی قواعد وضوابط کی مربوط کڑیوں سے بنتا تھا، جن کی مشترکہ گرفت میں ہر محکمہ کسی بڑے خاندان کی طرح کام کرتا تھا۔ اسی گرفت سے پہلے تو حسنِ انتظام یا گڈ گورننس (Good governance) بنتا تھا۔ اور پھر وہ اعتماد والا اُجالا بنتا تھا جو اب مجھے چوٹی سے میرے مینار کی نچلی منزلوں میں نظر آ رہا تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ ایک بیرونی غاصب قوت ماضی کی طوائف الملوکی سے نجات دہندہ کے طور پر فی الحال اس لیے قبول ہو چکی تھی کہ وہ امن اور عوامی روزی کی ضامن تھی۔

قبولیت کی اس بنیاد کو یہ بدیشی حکومت خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ اپنے حسنِ انتظام سے وہ ہماری محدود سی ابتدائی ضرورت پوری کر رہی تھی۔ مگر دراصل وہ اپنے لامحدود مفادات کو وسعت اور مضبوطی دینے میں مصروف تھی۔ ہمارے وطن میں تو محض امن و آشتی کا محدود سا اُجالا تھا، مگر ہمارے ہی قدرتی وسائل کے بے دریغ استعمال سے انگلستان کی خوشحالی لامحدود تھی اور وہاں سنہری کرنوں والے کہکشاں لہرا رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد یہی کہکشاں ہمارے ہاں بھی لہرا سکتے تھے، مگر ہماری اپنی حکومتوں کو عوامی قبولیت کے اُس معیار کا ادراک نہ تھا۔ ہمارے وطن کے مینار کی نچلی منزلوں میں تو پرانا ادراک قائم رہا جس کی وجہ سے اُجالا بھی موجود تھا، مگر جیسے جیسے مینار اونچا اُٹھتا گیا یہ ادراک تحلیل ہوتا گیا اور اس اُجالے پر بتدریج تاریکی غالب آتی گئی۔

اب اسی تاریکی میں سے کرسٹفر اینڈرسن کی طنزیہ مسکراہٹ مجھے طعنہ دینے لگی کہ تم اب اسی لاقانونیت کی طرف واپس لوٹنا چاہتے ہو، جسے روکنے کے لیے میں اور میری طرح کا نچلا آدمی کوشاں رہتا تھا۔ کہاں غلام ہندوستان کے بیرونی حاکموں کا نچلا آدمی اور کہاں آزاد پاکستان کے اندرونی حاکموں کا تم جیسا نچلا آدمی جس کے دور میں یہ تاریکی پھیل رہی ہے۔

میں نے چاہا کہ میں گلا پھاڑ کر اسے بلند آواز میں بتاؤں کہ تمھارے نچلے آدمی کو تمھارا اوپر

والا آدمی ریاست کے لیے تراشتا اور سنوارتا ہے، مگر ہمارا اوپر والا آدمی ہمارے نچلے آدمی کو اپنی ذات اور اپنے مفادات کے لیے سدھارتا ہے، مگر میرے بولنے سے پہلے ہی وہ چہرہ غائب ہو گیا۔

میرے گلے سے یہ آواز اس لیے بھی نہ اُبھر سکی کہ آٹھویں منزل کی فراست میرا کندھا تھپتھپانے لگی۔ جیسے سمجھا رہی ہو کہ خواہ مخواہ گلا نہیں پھاڑو۔ کبھی ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ بھی لیا کرو۔ اوپر والے اور نچلے آدمی کا موازنہ اور تقابل صرف وہاں ہو سکتا ہے جہاں ہم سری ہو یا ہم رنگی ہو۔ جہاں دونوں اطراف ہم صورت یا ہم سیرت ہوں، اور اگر یہ نہیں تو کم از کم ہم خیال ضرور ہوں، اور اگر یہ بھی نہیں تو ہم مقصد تو ضرور ہوں۔ اُوپر والی سطح پر بھی اور نچلی سطح پر بھی ... تم یہ فراموش کر رہے ہو ... بلکہ بے خبر ہو کہ کرسٹفر اینڈرسن کے دیس میں اوپر والی اور نچلی سطح ہم قدم، بلکہ ہم قبیلہ ہیں۔ ایک طرح سے سوچتی ہیں، دیکھتی ہیں، خاکہ بناتی ہیں اور عمل کرتی ہیں۔ اسی لیے انھیں حقوق العباد کی پہچان بھی ہے اور قدر بھی ہے۔ اسی لیے وہ سب مل کر فرد کی ذات اور حقوق کا تحفظ کرتے ہیں اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ مگر تمھارے دیس میں اُوپر والی سطح کا رُخ ایک طرف ہے اور نچلی سطح کا رُخ دوسری طرف۔ ان کی ساخت مختلف، رنگ مختلف، سوچ مختلف اور مقاصد بالکل متصادم۔ اوپر والا صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کی طرف دیکھتا ہے۔ نیچے والا صرف اپنے حقوق یا محرومی کی طرف دیکھتا ہے۔ فرائض سے دونوں ہی غافل ہیں۔ اسی لیے حقوق العباد کا نہ تو ادراک ہے نہ پہچان اور نہ ہی ان کا کوئی تحفظ ہے اور یہی تمھارے زوال کی وجہ ہے۔ ان کا نچلا آدمی اپنی قانون پرستی سے ریاست کی کلغی بلند رکھتا ہے۔ مگر تمھارا نچلا آدمی صرف اوپر والوں کی خدمت گزاری کرتا ہے اور اپنی کلغی بھی سرنگوں ہی رکھتا ہے۔

یہ سن کر مجھے یوں لگا کہ میرے کندھے پر اس منزل کی مربیانہ تھپتھپاہٹ نہیں ہے، بلکہ خدائی قانون میرے کندھے پر گرز مار رہا ہے۔ میں گھبرا کر ازسرِنو اپنے مینار کی نچلی منزل میں نظریں دوڑانے لگتا ہوں۔

نیچے ... بہت نیچے ... میرے مینار کی پہلی اور دوسری منزلوں میں اب شیخ سعدی شیرازی کا چہرہ جھانک رہا ہے۔

آج کل یہ چہرہ میرے وطن کے مینار میں بالکل اجنبی ہے۔ نام لو، تو ''شیخ سعدی کون؟'' کہہ کر نوجوانوں کی بھنویں سوالیہ نشان بن جاتی ہیں۔ جس نسل نے پہلی کلاس کے قاعدے میں ایک خوبصورت رنگدار تصویر دیکھ کر ''سیب'' کے پُرمسرت نعرے سے اس پر اپنی چھوٹی سی اُنگلی رکھی تھی۔ مگر استاد کے کہنے پر ''اے فار ایپل'' (A for Apple) کی تکرار کرنے لگی تھی۔ اس نے اپنی

مادری یا قومی زبان میں ''س سے سیب'' پڑھنا یا لکھنا سیکھا ہی نہ تھا اور اب وہ نسل جوان ہو کر ہر مقامی ورق کو بدیشی عینک اور پرائے ذہن سے دیکھتی ہے۔ کبھی اتفاق سے اگر شیخ سعدی کی داڑھی والی تصویر دیکھ بھی لے تو اسے ارنسٹ ہیمنگوے (Ernest Hemingway) سمجھ کر انگریزی ناولوں کی ہنرمندی پر سر دھننا شروع کر دیتی ہے۔ اس نسل سے اس چہرے کا سرسری تعارف کرانا ضروری ہے۔

بارھویں صدی عیسوی کے آخیر میں یتیمی، غربت اور افلاس میں گھرا ہوا یہ بچہ شیراز سے بھاگا ... بغداد کی علمی فضا میں پناہ گزیں ہوا اور طوائف الملوکی کے زمانے میں درسِ نظامی کی تعلیم میں فضیلت اور اعزازات حاصل کیے۔ ہلاکو خان کی منگول آندھی ایران سے ہوتی ہوئی بغداد پہنچی تو صرف بارہ روز کے محاصرے کے بعد ۱۲۵۸ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ علمی لائبریریوں کی قلمی کتابوں کی سیاہی کے گھلنے سے دریائے دجلہ کی روانی کالی ہو گئی اور عباسی دور کے ساتھ ہی اسلام کا سنہری دور ختم ہو گیا۔ اس واردات کا عینی شاہد شیخ سعدی شیرازی سقوطِ بغداد کے بعد تیس برس تک دنیا میں بھٹکتا رہا۔ دمشق کا قحط دیکھا اور چکھا۔ یورپ، افریقہ، ہندوستان کی خشکی اور وسیع سمندروں کی طوفانی لہریں دیکھتا رہا۔ سقوط میں اُجڑے ہوئے امیروں، بادشاہوں، وزیروں، درباریوں، تاجروں، کسانوں، مبلغوں، صوفی منش بزرگوں، مزدوروں، راہگیروں، رہزنوں اور چور ڈاکوؤں سے ملتا رہا۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کا جنگی قیدی بن کر سات برس تک غلام کے طور پر کبھی خندقیں کھودتا رہا اور کبھی کال کوٹھڑیوں میں سڑتا رہا۔ حالات بدلنے پر چند درہم (غالباً دس) کی ادائیگی پر مملوک حاکموں نے رہا کروایا۔ ہندوستان میں سندھ اور تھر کے علاقے دیکھے اور سومنات میں برہمنوں کے ہاتھوں زک اُٹھا کر واپس چلا گیا۔

بڑھاپے میں شیراز واپس پہنچا تو بے چین روح کو باغ میں شانت کرتے کرتے گلستان اور بوستان کے عنوان سے دو کتابوں کی صورت میں روشنی کے دو ایسے مینار اُٹھائے کہ ان کی روشنی سمندروں پار اور صدیوں پار سے نظر آتی رہتی ہے۔ یہ مینار یورپ کے Eiffel Tower سے تو اب بھی نظر آتے ہیں۔ مگر ہمارے مینارِ پاکستان کے اردگرد چھائی ہوئی اینگلو، امریکن دھند کی وجہ سے نئی نسلوں کو نظر نہیں آتے۔

میرے مینار کی نچلی منزلوں سے یہ چہرہ میری طرف تاسّف بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تو نہیں ٹپک رہے مگر حکایاتِ سعدی کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ اپنی آنکھوں کے پپوٹوں سے دو ٹپکتی ہوئی حکایات کو تھام کر یہ میری طرف دیکھنے لگتا ہے۔

پہلی حکایت

اسکندر رومی (اعظم) سے لوگوں نے پوچھا کہ شرق و مغرب تو نے کیسے فتح کر لیے۔ حالانکہ پہلے بادشاہ خزانوں، عمر، ملک اور لشکر میں تجھ سے افضل تھے۔ مگر ایسی فتوحات انھیں بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ سکندر نے کہا کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جو ملک میں نے فتح کیا وہاں کے باشندوں کو نہ تو ستایا اور نہ ہی گزرے ہوؤں کی عمدہ اور اچھی روایات کو منسوخ کیا۔ گزشتہ بادشاہوں کی اچھائی کو ہمیشہ اچھائی سے یاد کیا اور حتی الامکان قائم رکھا۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار!

(جو لوگ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں ان کے نیک نام کو ضائع نہ کر تا کہ تیرا نیک نام بھی باقی رہے)[۵]

دوسری حکایت

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ سادہ لباس پہنتا تھا۔ درباریوں نے بہترین ریشم کی قبائیں تیار کرا دیں۔ تو عاقل اور عادل بادشاہ نے کہا کہ دل تو میرا بھی اعلیٰ درجے کا لباس پہننے کو چاہتا ہے لیکن کیا کروں یہ خزانہ صرف میرا نہیں۔ یہ تو رعایا کا مال ہے۔ جو مجھے مضبوط فوج بنانے کے جتن پر خرچ کرنا ہے، تا کہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہو سکے۔ اس مال میں دہقان کا مالیہ بھی شامل ہے۔ جو مجھے اس لیے دیتا ہے کہ اسے ظالموں کے شر سے بچایا جا سکے۔ اب اگر کوئی ظالم اس دہقان کا گدھا چھین کر لے جائے تو میں یہ مالیہ بھی وصول نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ یہ اُس کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ پھر جو بادشاہ دیبا و حریر کی قبائیں پہن کر اپنے جسم کو عورتوں کی طرح سجاتا ہے وہ میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ رعایا بادشاہ کے لیے پھل دار درخت کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی پرورش اور نگہداشت بادشاہ کا فرض ہے۔ اگر وہ اس درخت کی جڑ پر کلہاڑا چلائے گا تو خود بھی سائے اور پھلوں سے محروم ہو جائے گا۔ اُس سے زیادہ بزدل اور کمینہ کوئی نہیں جو چیونٹی کے سامنے سے دانہ اُٹھا لے۔ شجاعت کی قسم! پوری دنیا کی حکومت بھی اس قابل نہیں کہ اس کے لیے خونِ ناحق کا ایک قطرہ بھی بہایا جائے۔[۶]

میں اثبات اور تائید میں سر ہلاتا ہوں۔ تو شیخ سعدی کے چہرے کے بے آواز ہونٹ ہلتے نظر آتے ہیں۔ میں آٹھ صدیوں پار اس سرگوشی کو ایسے سن رہا ہوں جیسے میرے ہمسائے میں واقع

قریبی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کی اذان ہو۔ وہ کہہ رہے ہیں...

تمھارے جیسے خالی الذہن لوگ حُسنِ انتظام (Good governance) کی ہر کڑی کرسٹوفر اینڈرسن اور اس کی قوم کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی ہمارے ہی پرانے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ روم کے سکندرِ اعظم کی طرح کبھی تو وہ سابقہ سلطنتوں کی عمدہ انتظامی روایات قائم رکھتے تھے اور کبھی اپنے پُرشکوہ سامراج کے پر پھیلاتے تھے۔ مغلیہ دور کے راجہ ٹوڈرمل کے کھیوٹ، کھتونی، فردحقیت، انتقال اور جمع بندی کے پرانے نقش پا میں اپنے بھاری بوٹ جما کر وہ تمھاری زمینوں پر قابض رہے۔ انگریز بھی ان متاثرین سے مالیہ وصول نہیں کرتے تھے۔ جو قحط سالی کا شکار ہوتے تھے یا جن کے گدھے ظالم چھین کر لے جاتے تھے۔ انگریز بھی لباسِ فاخرہ اور باادب باملاحظہ پکارنے والے نقیبوں پر خرچ کرنے کی بجائے منظم فرض شناس فوج اور دیانت دار ضابطہ پرست افسر شاہی کے آہنی ڈھانچے کی تعمیر پر خرچ کرتے تھے۔ اسی لیے انھیں تمھارے آج کے حاکموں کی طرح نہ تو بلٹ پروف (bullet proof) گاڑیوں کی ضرورت تھی اور نہ ہی درجنوں حفاظتی کاروں کے قافلوں یا بندوق بردار محافظوں سے لدے ہوئے ٹرک کی ضرورت تھی۔ وہ بدیشی حاکم ملک کے وسائل یقیناً لوٹتے تھے مگر عوام کا سکون نہیں چھینتے تھے۔

انگلیوں کو ٹیڑھا بینکا کر کے شیخ سعدی مجھے اشاروں سے سمجھاتے ہیں کہ تمھاری گنتی اتنی کمزور ہے کہ زمانے کا بھی حساب نہیں رکھ سکتے۔ تم بے خبر ہو کہ جب گلستان اور بوستان کی اکثر حکایتیں دنیا بھر کے نصابوں میں شامل ہو رہی تھیں۔ تو اس وقت پسماندہ اور غریب انگلستان میں Oxenford [7] اور دریائے کیم (CAM)[8] کے چھوٹے چھوٹے پایاب نالوں کے کنارے اکا دُکا ابتدائی علمی ادارے سر اُٹھا رہے تھے۔[9] پھر زمانوں بعد انھی اداروں میں یہ حکایتیں پہنچیں تو انگریزوں نے انھیں غور سے پڑھا۔ کھلے ذہن سے سوچا، ایمان سے باور کیا۔ خلوص سے عمل کیا اور اپنی قوم میں تھوک کے حساب سے دھڑا دھڑ کرسٹوفر اینڈرسن جیسے لوگ پیدا کرنے شروع کر دیے۔

شیخ سعدی کا چہرہ مسکرایا۔ دیہاتی فراست والی مسکراہٹ اور اپنائیت کے ساتھ۔ پھر ان کی داڑھی کے ریشے ریشے سے یہ سبق ٹپکنے لگا کہ حُسنِ انتظام (Good governance) کے اصول تو ازلی اور آفاقی ہوتے ہیں۔ جن کی رُو سے ضرورت ایجاد کی ماں بنتی ہے اور پُرخلوص ریاض باپ بن جاتا ہے۔ اسی کی مثال خود خدا کی حکمت نے ہمیں یہ سمجھائی کہ بنانے والے کی نیت نیک ہو اور منشا قوی ہو تو مٹی سے آدم بنایا جا سکتا ہے اور اس کی پسلی سے حوا پیدا کی جا سکتی ہے۔ جو ساری اولادِ آدم کو تمام مذاہب کے ذریعے صرف ایک ہی پیغام بھیجتے رہتے ہیں کہ دیانت داری سے انصاف کرتے

رہو... جب سے خدا نے انسان کو بنایا ہے تو ساتھ گڈ گورننس کے بنیادی اصول اس طرح سامنے رکھ دیے ہیں جیسے آج کل کے زمانے میں کسی سپر مارکیٹ کا شیلف (shelf) ہوتا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے اپنے اپنے ظرف اور طلب کے مطابق۔ ع

جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اسی مسکراہٹ کے ساتھ شیخ سعدی کا چہرہ اس خدائی قانون کا وِرد کرتے کرتے تحلیل ہو جاتا ہے۔

اے زبردست زیر دست آزار
گرم تا کے بماند ایں بازار
بہ چہ کار آیدت جہاں داری
مُردنت بہ کہ مردم آزاری

''اے زیردستوں کو ستانے والے زبردست۔ تیرے ظلم و جور کا بازار کب تک گرم رہے گا۔ بادشاہت تیرے کس کام آئے گی۔ تیرا مرنا ہی بہتر ہے کہ تو مخلوق کو ستاتا ہے۔''

شیخ سعدی رُخصت ہو گئے۔ تو میں از سرِ نو اپنے مینار کی پہلی منزل میں جھانکنے لگتا ہوں۔

حواشی

۱۔ میں نے اپنی جوانی میں کرسٹوفر اینڈرسن کا دعویٰ سنا تھا کہ اُس کی ساری ٹریننگ اچھے نظم و نسق کے لیے تھی اور اب میرے مینار کی بلندی سے نظر آنے والے بچپن کی ہر یاد اس دعوے کی تائید کر رہی تھی۔

۲۔ پنسلین (Penicillin) کی ایجاد کے بعد تپ دق رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔

۳۔ اس وقت کا صوبۂ پنجاب اٹک سے لے کر دہلی کے مضافات تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کے دو ٹکڑے ہوئے۔ (ہندوستان کا مشرقی پنجاب اور پاکستان کا مغربی پنجاب) بعد ازاں ہندوستان نے سکھوں کے مسئلے کے پیش نظر مشرقی پنجاب کے تین صوبے بنا دیے۔ اس طرح ۱۹۴۷ء کا صوبہ پنجاب اب چار حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور اب پاکستان کے مغربی پنجاب کو بھی مزید ٹکڑوں میں بانٹنے کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ اُس وقت کے پنجاب کی تقسیم در تقسیم کے اس عمل کا آغاز خشونت سنگھ نے اپنی کتاب ٹرین ٹو پاکستان میں درج ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ خدا معلوم یہ عمل کہاں جا کر رُکے گا... اور کیسے رُکے گا؟

"It (Partition) was a botched-up surgical operation. India's arms were chopped off without any anaesthetic, and streams of blood swamped the land of the five rivers known as the Punjab... It was not like other wars in which armed men battle with each other, but one in which one side armed with swords, knives and staves slew the other side, unarmed and unresisting."

- Khushwant Singh, Introduction to the 2006 edition of *Train to Pakistan*.

۴۔ ان دنوں بڑا صوبہ ہونے کی وجہ سے میٹرک کا رزلٹ اخباروں میں نہیں سما سکتا تھا۔ اس لیے آج کے legal سائز کے برابر ایک موٹی سی کتاب کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ جس پر یونیورسٹی کے دیگر اعلانات کی طرح یونیورسٹی گزٹ کا عنوان جلی حروف میں چھپا ہوتا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں میں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے میٹرک کے طلباء کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔

۵۔ طالب ہاشمی، حکایاتِ سعدی (لاہور: شعاع ادب، مسلم مسجد، چوک انارکلی)۔

۶۔ نذر زیدی، حکایاتِ بوستان سعدی (لاہور: فیروز سنز)۔

۷۔ یہ نام نالے کے اس پایاب مقام کا تھا جہاں سے مویشی نالے کے پار جا سکتے تھے۔

۸۔ دریائے کیم CAM کے اوپر بنا ہوا چھوٹا سا پل جو CAM Bridge کہلاتا تھا۔

۹۔ یہ دونوں صدیوں بعد اوکسفر ڈ اور کیمبرج بن گئے۔

دوسرا تماشا

وہاں اب ایک اور تماشے کی بازگشت اور لشکارا ہے۔ گجرات کا پہلا تماشا شام کے جھٹپٹے میں گلیوں اور چوراہوں کے لیمپ روشن کرنے والا تھا اور یہ سرکاری کارکردگی کا تماشا تھا، لیکن دوسرا تماشا بالکل غیر سرکاری تھا اور عوامی اُمنگوں کی ایک طوفانی لہر سے بن رہا تھا۔ وہی سڑک ... وہی مکان ... صدر دروازے کے دونوں طرف وہی مونڈھے ... ان پر چڑھنے کے لیے ... اور چڑھ کر کھڑے ہونے کے لیے وہی بے تابی اور کھینچا تانی ... مگر وقت ذرا مختلف ہو جاتا تھا۔ ہم رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے ہوتے۔ قریب کی مسجد سے عشاء کی اذان بلند ہوتی اور ہم بچے ذہنی طور پر تیار ہونے لگتے کہ تھوڑی دیر بعد دوسرا تماشا شروع ہونے والا ہے۔

لیکن یہ تھوڑی دیر لمبی ہو جاتی یا ہمارے کھڑے کانوں کو لمبی محسوس ہونے لگتی۔ پھر جیسے ہی دور سے ایک ہلکی سی صدا سنائی دیتی ''چپ راست چپ...'' تو ہم باہر کی طرف بھاگتے اور سروں پر اُٹھائے دو گیس لیمپوں کی نسبتاً تیز روشنیوں کو دور سے اپنی طرف آتا دیکھنے لگتے۔ ایک آگے، ایک پیچھے۔ ان دونوں کے درمیان منظم انداز میں ہلتے ہوئے سائے اور اکا دُکا بیلچے کی تھرکتی ہوئی چمک ... ہفتے کے دن اور موقع کے مطابق خاکساروں کی ایک یا دو یا تین چار قطاریں بڑے باوقار انداز میں مارچ کرتی ہوئی قریب سے قریب تر آ رہی ہوتیں۔

ہوا کے جھونکے سالار کی بارعب ہدایات کے آہنگ کو ان کی رسائی سے پہلے ہم تک پہنچانے لگتے۔

''چَپ راست چَپ ... چَپ ... چَپ ... چَپ راست چَپ'' اعضاء کی موسیقی بن جانے والے اور اکٹھے مل کر ہلنے والے بازو اور قدم اپنی سریلی حرکت سے ساری بے ترتیب فضا کو ایک نئی ترتیب میں سمونے لگتے۔ مجبور رعایا کی یہ منظم تحریک ہر لحاظ سے ایک طاقتور اور مغرور حاکم کی ضد اور تردید تھی۔ اس لیے پریڈ میں ''لیفٹ رائٹ'' کی انگریزی کمانڈ کی بجائے سب ہدایات اور احکام زیادہ فارسی اور تھوڑی عربی ملا کر اُردو میں دیے جاتے تھے۔

منظم سایوں اور ہلتے بازوؤں کی یہ لہر قریب سے قریب تر آنے لگتی تو گیس لیمپ بڑی دریا دلی سے سفید روشنی انڈیلنے لگتے ... بیلچوں کی چمک زیادہ جگمگانے لگتی ... انسانی چہروں کے خدوخال

اُبھرنے لگتے۔

''چپ راست ... چپ ... چپ ... چپ ... چپ ...''

اکٹھے ہلنے والے بازوؤں کے اوپر والے حصے پر باندھا ہوا ''اخوت'' کا سرخ و سفید نشان رقص کے انداز میں لہراتا ہوا نظر آنے لگتا۔ پاؤں کی ہم قدمی کی متواتر دھمک دھیرے دھیرے اُونچی ہونے لگتی۔ ہم سب بچے اپنی اپنی جگہ منجمد ہو جاتے ... راہگیر ساکت ہو کر مسحور انداز میں اس رواں لہر کو دیکھنے لگتے۔ سڑک پر چلنے والے تانگے اور سائیکلیں دم بھر کو رک کر یا ہلکی رفتار سے جھونک کھا کر انھیں راستہ دینے لگتے۔

''چپ راست چپ...'' دھمک ... دھمک ... دھمک...

بچے مبہوت ... راہگیر ساکت بت ... فضا مسحور ... اور سالار کی بلند ہدایات سارے ماحول پر چھا جاتیں۔ ''چپ راست چپ ... نظریں سامنے ... سینہ باہر ... بیلچہ سیدھا ... قدم ملا کر ... چپ راست ... چپ ... چپ...'' بعض راتوں میں سالار کی طرف سے ''تیز خرام'' کا حکم سننے کے بعد وہ ہمارے گھر کے سامنے سے تیزی سے گزر جاتے اور بعض دفعہ اس بڑے سے انسانی پیکر کی ساری لہر سالار کی طرف سے ''جیش باش'' کا حکم سن کر ایک زوردار دھمک سے تھم جاتی۔ جیسے سڑک کے کنارے ایک دیوار بن جائے۔ مہینے کی جس رات بڑا جیش تین یا چار قطاروں کی شکل میں نکلتا تو سامنے بلند فضا میں سفید چاند تارے اور چار شعاعوں والا سرخ جھنڈا لہرا رہا ہوتا۔ سر پر اُٹھائے گیس لیمپوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی اور کبھی کبھی بینڈ کا بڑا ڈھول، چند نقارے اور بگل بھی سنگت دے رہے ہوتے اور گجرات کی خاموش سنسان رات ایک دم کسی طلسماتی دنیا کا منظر بن جاتی!

تماشا ختم ہو جاتا اور چاندنی رات ہوتی تو ہم سب بچے بھاگ کر اپنی چھت پر چڑھ جاتے اور قطار بنا کر ''چپ راست'' کہتے ہوئے مارچ کرنے لگتے۔ اپنے اپنے سائز کے چھوٹے بڑے بیلچے سب کے پاس ہوتے۔ جو اُن دنوں بازاروں میں عام بکتے تھے۔ بلکہ چاندی اور سکے کے ڈھالے ہوئے بہت چھوٹے چھوٹے بیلچے بھی جو ٹوپی یا کوٹ کے کالر پر چپکائے جاتے تھے۔ تاکہ خاکسار تحریک سے اپنی وابستگی کی تائید یا ہمدردی کا اعلان ہوتا رہے۔ وقت کی پکار کے مطابق اکثر والدین اپنے بچوں کو خاکی شلوار قمیص کی خاکساروں والی وردی بھی بنوا دیتے تھے اور کئی بچے یہ وردی پہن کر اپنے جوتوں کے نیچے دھات کے چھوٹے چھوٹے نعل بھی لگوا لیتے۔ تاکہ مارچ کرتے ہوئے ٹھک ٹھک کی آواز نمایاں ہو سکے۔ کئی گھروں کی چھت پر خاکساروں کا سرخ جھنڈا لہراتا رہتا یا ان کے دروازے کے ساتھ دیوار پر آویزاں رہتا۔ سرخ رنگ کے چوکور جھنڈے کے اوپر والے

خاکساروں کے مارچ پاسٹ کا ایک منظر — ۱۹۳۷ء

علامہ عنایت اللہ مشرقی — مکمل وردی میں

نشانِ اخوت

کونے میں سفید چاند تارا بنا ہوتا جس کی چار سفید شعاعیں چاروں کونوں کی طرف پھیل جاتی تھیں۔ اسی رنگ اور نمونے کا ایک چھوٹا سا پارچہ بھی ہوتا تھا۔ تقریباً پانچ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا۔ جس پر عربی رسم الخط میں ''اخوت'' لکھا ہوتا۔ اس کے چاروں کونوں پر لگے ہوئے تسموں کے ذریعے اسے دائیں بازو کے اوپر والے حصے پر باندھ لیا جاتا اور پریڈ کے دوران ملتے ہوئے بازوؤں کی لمبی قطار میں اس کی یکساں طور پر ہموار اور متحرک لہر ایک الگ بہار دیتی تھی۔

مختلف علاقوں میں اور مختلف شاموں میں کبھی چھوٹے اور کبھی بڑے مارچ کے علاوہ خاکساروں کے وسیع جنگی کیمپ بھی وقتاً فوقتاً لگائے جاتے تھے۔ شہر کے بڑے گراؤنڈ میں دو اطراف متعدد خیموں کی قطاریں چند گھنٹوں کے دوران اچانک اُگ پڑتی تھیں اور تیسری طرف ایک قلعے کا عارضی ڈھانچہ کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ اس تحریک کی باطنی سوچ اور پورا چلن انتہائی سادگی کا تھا۔ اس لیے بھُنے ہوئے چنوں کی بوریاں، گڑ سے بھرے ہوئے ڈبے اور بہشتی کی مشک سے بھرے جانے والے مٹی کے گھڑوں کا ذخیرہ کر کے سیکڑوں خاکسار چند روز کے لیے ان خیموں میں پڑاؤ کرتے۔ چند روز کے اس پڑاؤ میں ان کی خوراک یہی ذخیرہ ہوتی تھی۔ یہاں وہ دن بھر حالتِ جنگ کی مشقوں میں مصروف رہتے اور اذان دے کر عسکری نمازیں ادا کرتے۔[۲] گراؤنڈ میں داخلے کو روکنے کے لیے باوردی بیلچہ بردار خاکسار پہرے پر کھڑے رہتے اور گراؤنڈ کے باہر شہر بھر سے اُمڈے ہوئے مرد، برقع پوش عورتیں اور بچے تماشائیوں کا میلہ لگا دیتے۔ آخری دن جب گھمسان کی جنگ کے بعد ایک فریق نے قلعہ فتح کرنا ہوتا تھا تو آفاقی قسم کی عوامی دلچسپی کی وجہ سے تماشائیوں کا ہجوم دیدنی ہوتا تھا۔ جن میں بہت سے سکھ اور بودی والے ہندو پہچانے جا سکتے تھے۔

کئی دفعہ ہم چھوٹے بچے بھی اپنے والدین اور بڑے بہن بھائیوں کی اُنگلیاں پکڑ کر یہ کیمپ دیکھنے جاتے تھے اور میں کسی بڑے بھائی یا کزن کے کندھے پر بیٹھ کر حیرت سے دیکھتا رہتا کہ جس بیلچے سے ہم روزمرہ زندگی میں خاکساروں کو خدمتِ خلق کرتے ہوئے مٹی، ملبہ اور کئی دیگر اشیا اُٹھاتے دیکھتے تھے یا پریڈ میں ان کے کندھے سے اُوپر اُٹھا دیکھتے تھے، وہی بیلچہ اب جنگ میں بندوق کی طرح استعمال ہو رہا ہے۔ حملہ کرنے والی کئی ٹولیوں میں بعض کھڑے ہو کر، بعض بیٹھ کر اور بعض پیٹ کے بل رینگتے ہوئے خاکسار جب بیلچوں کو بندوق کی طرح تان کر پیش قدمی کرتے تو بیلچے کو کندھے پر لٹکانے والی پٹی کو ہلا کر بیلچے کے ہینڈل پر مارنے سے گولیاں چلنے جیسی تڑ تڑ تڑ کی آواز پیدا ہونے لگتی اور حملے کا حقیقی سماں بندھ جاتا۔ دوسری طرف سے مدافعت کرنے والا مرکزی لشکر اور اِدھر اُدھر بٹی ہوئی کئی ٹولیاں مختلف اطراف سے قلعے کی حفاظت کرتے۔ جس کی چھت پر

سے حملہ آوروں کی طرف رائفل کے انداز میں بیلچے تان کر شدید فرضی فائرنگ ہوتی رہتی۔ پھر اِدھر اُدھر سے بگل کی للکار کے ساتھ کافی دیر تک دست بدست جنگ میں قلعے پر یلغار ہوتی رہتی۔ بالآخر سہ پہر کے قریب قلعہ فتح ہو جاتا۔ بگل واپسی (retreat) کی کوک دیتا رہتا اور شکستہ خوروں میں کچھ پسپا ہو جاتے۔ پھر میدانِ جنگ میں بکھرے پڑے زخمیوں اور لاشوں کو کندھوں پر لاد کر یا اسٹریچر کی مدد سے اُٹھایا جاتا اور کیمپ ''برخاست'' ہو جاتا۔

ان کیمپوں میں تمام خاکساروں کو ''خاکسار سپاہیو'' کے طور پر مخاطب کیا جاتا تھا اور بیلچے پر معینہ وہی قواعد سکھائے جاتے تھے جو رائفل بردار فوجی سیکھتے ہیں۔ پریڈ میں کندھے سے بیلچہ لٹکانے کا انداز بھی رائفل جیسا، حملے کے وقت تان کر آگے بڑھنے کا انداز بھی ویسا۔ رائفل لوڈ کرنے کے لیے بیلچے کی پٹی کو ایک دفعہ کھڑکانا بھی اسی طرح وغیرہ وغیرہ۔ بیلچے کی وساطت سے دراصل رائفل ٹریننگ کی مخصوص حرکات و سکنات سے ایسی تنظیم تیار ہو رہی تھی جو ضرورت پڑنے پر کم از کم وقت میں مسلح فوج بن سکتی تھی۔ چنانچہ بیلچہ خدمتِ خلق اور عسکری تربیت کی دُہری علامت بن گیا تھا۔

لاؤڈ اسپیکر پر ''برخاست'' کا حکم سنتے ہی چشم زدن میں لکڑی کے دو چار شہتیروں کو جوڑ کر ان پر تختے رکھ کر فٹ بھر اُونچا اسٹیج بن جاتا۔ سارے خاکسار گول دائروں کی شکل میں قطار اندر قطار اس کے سامنے زمین پر بیٹھ جاتے۔ باہر سے تماشائی بھاگ کر گراؤنڈ میں گھس پڑتے اور خاکی گول دائروں کے گرد اپنے گول دائرے بنا کر کھڑے ہو جاتے۔ پھر اسٹیج سے دھواں دھار تقاریر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سارے علاقے میں گونجنے لگتیں۔ جن کا لب لباب یہی ہوتا تھا کہ علامہ مشرقی کا ایمان ہے کہ انگریزی سامراج کے عالمی تسلط سے صرف وہی قوم آزادی حاصل کر سکتی ہے جس کا ہر فرد صاحبِ کردار ہو۔ جماعتی تنظیم کی مربوط کڑی سے وابستہ ہو اور اپنے خون کی قربانی دینا جانتا ہو۔ اسی لیے وہ اپنی قوم کو سادہ مزاج، مخلص اور باکردار خاکساروں کے مخصوص اور منظم سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس تحریک میں شامل ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پھر سارے خاکسار خود تو قواعد کے ڈسپلن کی وجہ سے خاموش رہتے۔[۳] مگر عوام کے گول دائروں سے ''خاکسار تحریک زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے گونجنے لگتے۔

اسی دوران میں بڑی توجہ سے اردگرد کھڑے تماشائیوں کے تبصرے اور تحسین سنتا رہتا اور بڑے بھائی کے کندھے پر بیٹھے بیٹھے تماشائیوں کے چہروں کا تماشائی بنا رہتا۔ میرے اردگرد کئی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے اور کئی ہاتھ دعائیہ انداز میں اُٹھ کر اس تحریک کی یقینی کامیابی کے لیے فریاد کر رہے ہوتے۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں پنجاب گورنمنٹ نے خاکسار تحریک کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے کالعدم کر دیا۔ پھر یہ ممانعت صوبہ یو پی اور بعد ازاں سارے ہند میں نافذ ہو گئی۔ اس پابندی کا بظاہر تو یہ جواز دیا گیا کہ زمانۂ جنگ میں پرائیویٹ آرمی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مگر تبصروں میں ہٹلر سے رابطوں اور جرمن نازی پارٹی کے بیلچے کے بھی اشارے ملتے رہے۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد اور پنجاب کے گورنر اسے برٹش حکومت کے لیے خطرہ قرار دے چکے تھے اور زمینی حقائق بھی تھے کہ یہ تحریک اس وقت بہت طاقتور ہو چکی تھی اور علامہ مشرقی وائسرائے، گورنروں، قائداعظم، علامہ اقبال کے علاوہ ہندوستان بھر کے مسلم رہنماؤں سے رابطے میں رہتے تھے۔

اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ملک بھر میں انتخابات کے بعد تمام صوبوں میں ہندوستانی وزارتیں قائم ہو چکی تھیں اور لکھنؤ میں شیعہ سنّی فسادات کو رکوانے کے لیے علامہ مشرقی یو پی کی حکومت کو سیاسی فیصلے تبدیل کرنے پر مجبور کر چکے تھے۔ مگر ساتھ ہی یو پی کی حکومت وہاں چھے لاکھ خاکساروں کا جنگی کیمپ لگانے میں رخنے بھی ڈال رہی تھی۔ دیگر اساتذہ کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد بیلچے سمیت پریڈ میں شامل ہو چکے تھے اور علی گڑھ کے طلباء باقاعدگی کے ساتھ مقامی خاکساروں کے ساتھ خدمتِ خلق اور جنگی کیمپوں میں شامل ہو رہے تھے۔ حیدرآباد کے شعلہ بیان مقرر نواب بہادر یار جنگ نہ صرف سرگرم خاکسار تھے بلکہ تحریک پر پابندی اور علامہ مشرقی کی قید کے دوران انھیں تحریک کا سربراہ بنانے کا ذکر چل رہا تھا۔ صوبہ سندھ کے سب سے سینئر (senior) خاکسار جی ایم سیّد کے ذریعے صوبائی حکومت سے گفت و شنید کے بعد ایک فرضی پیر کی طرف سے لاواری (Lawari) میں ''مقامی حج'' بند کیا جا چکا تھا اور صوبہ سرحد کے چیف منسٹر سردار عبدالقیوم پر زور ڈال کر انگریز ڈپٹی کمشنروں کی طرف سے خاکساروں پر ماضی میں لگائی گئی پابندیاں بھی ختم کروا چکی تھی۔ کم و بیش پورے ہندوستان کی سیاست میں یہ تحریک کافی حد تک دخیل ہو چکی تھی۔[۴]

یہ صرف چند عکسی پیکر ہیں جو اوائل عمر میں میرے کچے ذہن پر عمر بھر کی گہری چھاپ لگا گئے، مگر جیسے جیسے میرا مینار اونچا ہوتا گیا اور میں باشعور ہوتا گیا تو اس تحریک کی اصل روح مجھ پر آشکار ہوتی گئی۔ کیونکہ وہ خاکسار تحریک کے پورے عروج کا زمانہ تھا۔ لوگ اُٹھتے بیٹھتے اس تحریک کا ذکر کرتے رہتے۔ حوالے دیتے اور بحثیں کرتے، برما (موجودہ میانمار) اس وقت برٹش انڈیا کا حصہ تھا۔[۵] اس لیے رنگون سے پشاور تک اور جنوبی ہندوستان سے کشمیر تک کے مسلمان علاقوں میں ''چپ

راست'' کی صدا بلند ہوتی رہتی تھی۔ ہر رات عشاء کی نماز کے بعد مسجدوں میں سے خاکساروں کی ٹولیاں یا اِکا دُکا افراد برآمد ہو کر کسی معینہ مقام پر اکٹھے ہوتے اور منزل کا تعین کر کے ہر روز مختلف راستوں پر مارچ کرنے لگے۔ ہفتہ وار نسبتاً بڑے اجتماع، ہر ماہ اس سے بھی بڑے اجتماع، کبھی کبھار دن کے وقت شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر بینڈ کی معیت میں مارچ اور کبھی کبھی کسی بڑے گراؤنڈ میں چند روز کا جنگی کیمپ، جب یہ نہ ہوتا تو گلیوں میں کھیلنے والے بچے کبڈی کھیلتے، بنٹے کھیلتے، شاہ شاپو کھیلتے، پٹھو گرم کھیلتے، کوٹلہ چھپاکی کھیلتے یا پھر جوش میں آ کر بانس، سرکنڈے، سائیکل کا پمپ (اور اگر کچھ نہ ملتا تو اپنا ہی بازو دُہرا کر کے) کندھے پر بیلچے کے انداز میں رکھے ہوئے مارچ کرنے لگتے۔

''چپ راست ... چپ راست چپ ... چپ ... چپ ... تیز خرام ... قدم مارچ ... جیش باش ... برخاست'' اور پھر حسبِ سابق دھینگا مشتی میں مصروف ہو جاتے۔

یہ تو اس تحریک کا عسکری رنگ تھا جو پورے جمال و جلال سے تقریباً ساری مسلمان قوم پر چڑھ چکا تھا، سوائے مستند اور سکہ بند علمائے کرام کے۔ تمام مساجد کے مولویوں اور ان کے پیروکاروں کے۔[۶] مگر اس کا غیر عسکری، اصلاحی بلکہ فلاحی رنگ کہیں زیادہ توانا تھا۔ جس نے اس وقت کی مسلمان قوم کو حیرت انگیز انسانی عظمت بخش دی تھی۔ کیونکہ یہ ہمہ گیر کردار سازی کی بڑی مؤثر تحریک تھی۔ جس کے فوری نتائج تو ظاہر ہو رہے تھے مگر دور رس نتائج سے انگریزی استعمار لرز رہا تھا۔ بظاہر تو انگریز نے یہ پابندی پرائیویٹ آرمی کہہ کر لگائی تھی۔ مگر اس وقت اکثر سیاسی پارٹیوں کا یہی انداز تھا۔ مجلس احرارِ اسلام کے دستے سرخ وردی پہن کر اور اپنے سامنے ہاتھ میں ننگی تلوار کھڑی کر کے پریڈ کرتے تھے۔ ان کی عظیم طلسمی شخصیت والے لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاری جب اپنے سیاسی جلسوں میں عشاء کی نماز کے بعد اپنے دھیمے اور میٹھے انداز میں تقریر شروع کر دیتے تو صبح کی اذان تک سامعین میں سے کوئی بھی اُٹھ کر جانے کو آمادہ نہ ہوتا۔[۷] اسی طرح ایک دو دفعہ میں نے نیلی وردی والے گروپ کی پریڈ بھی دیکھی تھی۔ (یہ ''نیلی پوش'' کہلاتے تھے) مگر بعد ازاں مجھے اس کے متعلق کچھ پتا نہ چل سکا۔ صوبہ سرحد میں ''خدائی خدمت گار'' (Red Shirts) کی ایسی ہی منظم تحریک اپنے علاقے میں بہت مقبول تھی اور ۱۹۳۲ء میں علامہ مشرقی ان کی پریڈ دیکھ کر بہت تعریف کرتے تھے۔ خود مسلم لیگ نے سبز وردی والی نیشنل گارڈ (National Guard) بنائی تھی اور ۱۹۴۲ء میں جب گاندھی نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' (Quit India) تحریک چلا کر سرکاری املاک کو جلانا اور تباہ کرنا شروع کیا (عدمِ تشدد کے پرچار کے باوجود) تو کانگریس کے اسی طرح کے دستے

سرگرم تھے۔ اس لیے عسکری رنگ کی سیاسی تنظیموں کی اُس وقت کمی نہیں، بلکہ بہتات تھی، مگر خاکسار تحریک اور مسلم لیگ کے علاوہ ان سب کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ یا تو ہندو کانگریس کے زیر اثر تھیں یا اس سے منسلک تھیں۔ جن کی وجہ سے مسلمان قوم میں ان کی اپیل محدود ہی رہی اور یہ ہندوستان کے پورے منظرنامے کے گوشوں میں ہی نظر آتی رہیں۔ چنانچہ انگریز کی حکومت نے کبھی ان تنظیموں پر پرائیویٹ آرمی جیسی پابندی کا سوچا بھی نہیں تھا۔

مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ اپنی آزاد اور نئی سوچ کی وجہ سے خاکسار تحریک چھے سات برس میں ہی پورے ہندوستان (برما سمیت) پر چھا چکی تھی اور ہر بین الاقوامی استعماری قوت کی طرح برٹش ایمپائر بھی اپنے علاقے میں باکردار، خوددار اور قومی حمیّت سے چھلکنے والے افراد یا گروپ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ہماری جنگِ آزادی، انگریز کے غدر کے دلخراش واقعات، عوام کے قتلِ عام اور بعد ازاں قوم فروش جاگیرداروں کا مضبوط انگریزی بندوبست اس کا واضح ثبوت ہیں۔ عالمی تاریخ میں نوآبادیاتی استعمار ہمیشہ مقامی محبِ وطن لوگوں کو نشانِ عبرت بنانے کے انداز میں تباہ کرتا رہا ہے۔ اس طرح سفید فام قوموں نے دنیا بھر کے وسائل پر قبضہ کر لیا، بلکہ اب تو ماڈرن ٹیکنالوجی کی وجہ سے ساری دنیا کا ہر شخص ذہنی، جسمانی، مذہبی، معاشی اور سیاسی طور پر ان کی ان دیکھی گرفت میں ہے۔ اب ان استعماری قوتوں کے پاس ہر فرد کے انفرادی قتل سے لے کر ہیروشیما اور ناگاساکی کے انداز میں قتلِ عام کے ایسے وسائل موجود ہیں کہ ہلاکو اور چنگیز خان کے بنائے ہوئے کھوپڑیوں کے مینار ہیچ ہو جاتے ہیں۔ مگر ابھی تک یہ استعماری قوتیں کسی باکردار، غیرت مند اور جرأت سے چھلکنے والے فرد کی عزتِ نفس کو تباہ کرنے والا ہتھیار ایجاد نہیں کر سکیں۔ یہ اختیار خدا نے صرف اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔

علامہ مشرقی کا واحد قصور یہ تھا کہ وہ مسلمان قوم کو ویسا ہی باکردار بنانا چاہتے تھے جیسا خدائی منشا کے مطابق اسے ''تسخیرِ کائنات'' کے لیے تراشا گیا تھا۔ (فوجی انداز میں نہیں بلکہ علم، عقل، عمل اور حکمت کے ذریعے)۔ عسکریت تو خاکسار تحریک کے پُرجوش چہرے کی سرخی اور لالی تھی۔ اصل رنگ تو وہ کردار تھا جو تازہ خون بن کر تحریک کی رگوں میں دوڑ اور پھر رہا تھا اور غالب کے الفاظ میں آنکھ سے ٹپکنے کے لیے بے تاب تھا۔

خلیل جبران نے کہا تھا:

''اللہ نے فکر کی اور اس کی پہلی فکر فرشتہ تھا۔
اللہ نے کلام کیا اور اس کا پہلا کلمہ انسان تھا۔''

علامہ مشرقی اب اس کلام کے وہی الفاظ، گرامر اور صیغے ہندوستان کے مسلمانوں کو دوبارہ سکھانا چاہتے تھے۔[8] جن کے ذریعے خداوند تعالیٰ قرآن کے ذریعے انسان سے ہم کلام ہوا۔ مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خدا اور انسان کے درمیان مولوی اور ملائیت کی اتنی موٹی دیوار حائل ہے جس کے آر پار دیکھنا یا سننا ممکن ہی نہیں۔ اس پر بیٹھ کر وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں قوموں کی امامت نہیں کر سکتا بلکہ مولوی اب ''دو رکعت کا امام'' بن چکا ہے۔ پھر چھے سو برس سے اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے بعد اب وہ پتھر کا غیر شفاف بت بن گیا ہے۔ جس سے گفتگو کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔

مگر رُوئے زمین پر اپنی دسترس پھیلانے والا سفید فام انسان اس کلام کی خود تو خوشہ چینی کرتا رہا ہے۔ کبھی اپنی قوم کے لیے حقوق العباد کے ذریعے اور کبھی کم تر قوموں کی گڈ گورننس (Good governance) کے ذریعے۔ مگر یہ نہیں چاہتا کہ اس کی غلام سلطنت میں لوگ اس کلام کو سن سکیں، سمجھ سکیں یا اس کی آہٹ بھی پا سکیں۔

علامہ مشرقی نے انگریز کی اپنی اور ملائیت کی اپنی سرخ لائن کو کراس (cross) کرنے کی بے لوث جرأت کی تھی۔ مگر مشیت نے ان دونوں سرخ لکیروں کو کسی رتی کی طرح بانٹ کر یکجا کر دیا۔ اور یہ دونوں اس تحریک کو کچلنے کے لیے یکساں طور پر سرگرم ہو گئے۔

خدا کی مشیت نہ معلوم کس مینار کی کون سی منزل میں جا کر کس کی سمجھ میں آتی ہے .... اور نہ معلوم اس ہر دم پھیلنے والی کائنات میں وہ مینار ہے کہاں؟

اس کردار کی چند جھلکیاں جن کے اخلاقی سانچے میں ہر خاکسار کارکن اور پوری خاکسار تحریک ڈھالی جا رہی تھی، مگر پہلے ان جھلکیوں کے چند عنوانات....

اس تحریک کا فکری فلسفہ اور عملی پروگرام صرف دو الفاظ میں سمویا جا سکتا تھا ''خدمتِ خلق'' ... اور دیگر اضافی عنوانات تھے: دیانت، خودداری، عزتِ نفس، قناعت، کفایت شعاری، انکساری اور سب سے اہم اخوت یا باہمی بھائی چارہ۔ جو مختلف مسلکوں کے باہمی ٹکراؤ کو شیر و شکر میں بدل ڈالنے کی قوت رکھتا تھا۔[9]

یہ تمام ایسی صفات ہیں جو ''اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً''o (البقرہ: ۳۰) (میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں) کے شایانِ شان ہیں، انسان کو اَسْفَلَ سٰفِلِينَ (التین: ۵) (پستی سے بھی پست تر) بننے سے روکتی ہیں اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍo (التین: ۴) (کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے) کے خدوخال بتاتی ہیں۔ اس لیے زمانے کی ناہموار چال رقم کرنے والی تاریخ سے ہمارا زمانہ پوچھ رہا ہے کہ اگر خاکسار تحریک کی باعمل عمر صرف ایک

دہائی کی بجائے مسلم لیگ اور کانگریس کی طرح کئی دہائیاں ہوتی تو کیا موجودہ انحطاط کی انتہاء پستی سے بھی گہرے جس گڑھے میں آج کی پاکستانی قوم کسی لاعلاج مریض کی طرح کراہ رہی ہے اس سے ہم بچ سکتے تھے؟

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مشیت سے ہم ایسے سوالات پوچھ تو سکتے ہیں مگر ضروری نہیں کہ مشیت کا جواب بھی ہماری ہی نسل کو ملے۔ بسا اوقات یہ جواب بہت بعد میں آنے والی نسل کو ملتا ہے۔ کیونکہ انسانی آواز کی محدود سی کوک اور قدرت کی ندا کی لامحدود نشری لہروں (frequency) کے ملاپ کے لیے تو کوہِ طور کی اوٹ اور موسیٰ کلیم اللہ کی وارفتگی چاہیے جو آج کی پاک سرزمین کی کرپشن، منافقت اور دیگر ہر ناپاکی سے لتھڑی ہوئی فضا میں ناپید ہے... شاید یہ ہماری اگلی نسلوں میں پیدا ہو جائے۔

یہ ماضی بعید کا نہیں بلکہ ماضی قریب کے بھی گزشتہ کل کا جائزہ ہے کہ آج کی بگڑی نسل کے باپ یا زیادہ سے زیادہ دادا خاکسار تحریک کی وساطت سے کردار اور اخلاقیات کی بہت اعلیٰ منازل سے گزر رہے تھے۔ ببیں تفاوتِ راہ از کجا تا بہ کجا... مگر صرف ایک یا ڈیڑھ دو نسلوں کے مختصر فاصلے میں اتنی طویل اور شدید گراوٹ کہ ہم لوگ احسنِ تقویم سے لڑھکنی کھاتے کھاتے اسفل سافلین تک جا پہنچے ہیں۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟

شاید وطن کے مینار کی سب سے اُوپر والی منزل سے جھانک کر دیکھنے سے اس کا جواب مل جائے۔ خاکسار تحریک کو خدمتِ خلق کے لیے کسی پرچار یا نعرے بازی کی ضرورت نہ تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر گھڑی اسی کا مظاہرہ ہوتا رہتا تھا۔ اپنے علاقے کی رہائشی گلیوں میں بے ڈھب بارش کی وجہ سے اگر پانی جمع ہو جاتا یا گلی کی نالی بند ہو جانے سے اگر گندہ پانی پھیلنے لگتا تو مقامی خاکساروں کا اولین فرض تھا کہ بیلچے سے رکاوٹ دور کر کے گلی کی اصل اور قابلِ استعمال شکل بحال کریں۔ یہی طریق کار عمارتی ملبے یا غلط جگہ پر بکھرنے والی غلط اشیاء سے بھی نمٹنے کے لیے تھا۔ بیلچے کو خدمتِ خلق کا کثیر المقاصد آلہ بنا کر خاکسار اپنے اپنے علاقے کے عوام کے لیے ہر وقت مشکل کشائی میں مصروف رہتے اور یہ مشکل کشائی بلا لحاظ مذہب و مسلک ہوتی تھی۔

مشہور تھا کہ ۱۹۳۴ء کے آس پاس علامہ مشرقی نے جرمنی میں ہٹلر (Hitler) سے ملاقات کی تھی جس کے فوراً بعد نازی پارٹی نے بھی بیلچے کو نشان بنا لیا تھا اور پھر ہر پیریڈ میں بیلچے ان کے کندھے کی زینت بننے لگا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ اس زمانے میں شائع ہونے والی اخباری تصویروں

میں خاکساروں کا بیلچہ تو بیضوی شکل کا تھا۔ مگر نازی پارٹی کا بیلچہ چوکور تھا۔ مجھے علم نہیں کہ نازی پارٹی کے فلسفے میں بیلچے کا مقام اور استعمال کیا تھا، مگر ہمارے ہاں تو یہ خاکسار تحریک کی مرکزی سوچ (خدمتِ خلق) کا آفاقی مظہر، عملی ترجمان اور خود آگہی کا روشن آئینہ تھا۔

ابھی میرے بچپن کا ابتدائی طلوع تھا، مگر دو واقعات میری کچی یادداشت میں اب تک جگمگا رہے ہیں۔ ہمارے گھر کے سامنے سڑک کے اُس پار ایک چھاپہ خانہ ہوتا تھا جس میں ایک دن اچانک آگ لگ گئی تو فائر بریگیڈ کی ٹیم کے ساتھ ساتھ کئی خاکسار بھی متاثرین کی مدد کر رہے تھے۔ وہ شعلوں کی یلغار کو محدود کرنے کے لیے بیلچوں سے کھدائیاں کرتے۔ ریت ڈالتے، پانی کی بالٹیاں لے کر ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے۔ اندر سے سامان نکال نکال کر باہر لاتے۔ پھر اندر بھاگے جاتے اور اسی انداز میں آگ پر مکمل طور پر قابو پانے تک سر دھڑ کی بازی لگا کر حالات کو سنوارنے کی کوشش کرتے رہے۔

اسی طرح سڑک کی دوسری طرف ہندوؤں کی آبادی میں ایک جوان لڑکی منڈیر سے جھانک رہی تھی تو منڈیر ٹوٹ گئی اور گلی میں سر کے بل گرنے سے اس کی فوری موت واقع ہو گئی تو بیسیوں بیلچہ بردار خاکسار ان کی مدد کو پہنچ گئے تھے۔ انھی وجوہات کی بنا پر کئی شہری اگر کسی لاینحل مسئلے سے بہت پریشان ہوتے تو وہ خاموشی سے اپنے محلے کے خاکسار سالار سے رجوع کرتے (سوائے مالی امداد یا بھیک مانگنے کے جس کی ہرگز اجازت نہ تھی) اور وہ دیگر خاکساروں سے سرجوڑ کر حتی الامکان مدد کی کوشش کرتا۔

آزادی کی جدوجہد کے علاوہ خاکسار تحریک نے مسلمان قوم کو ارفع کردار کے ایک مدار میں ڈال دیا تھا۔ پارٹی کا منشور اور جماعتی ڈسپلن خالص اخلاقیات کے سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ مشتے از خروارے کے طور پر چند موٹے موٹے فرمان یا اصول ایسے تھے... آج یہ بات حیرت بلکہ بے یقینی سے سنی جائے گی کہ یہ تحریک نقد یا کسی اور شکل میں چندہ مانگنے کو گناہِ کبیرہ سمجھتی تھی۔ ہر خاکسار اپنی سیاسی سرگرمیوں پر اپنی جیب سے خرچ کرتا تھا۔ اس لیے اخراجات کم رکھنے کے لیے اس تحریک کے تمام جلسے، اجتماع یا جنگی کیمپ انتہائی سادگی اور کفایت شعاری سے منعقد کیے جاتے تھے۔ اپنی جیب سے خرچ کرنے کا فلسفہ یہ تھا کہ ہر مسلمان کے لیے ملکی امور (سیاست) میں حصہ لے کر اسے سدھارنا اور صراطِ مستقیم پر رکھنا زندگی کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ اس لیے زندگی کے دوسرے فرائض کی طرح یہ فرض بھی آپ کی اپنی جیب سے پورا ہوگا۔ کسی خاکسار یا سالار کو اجازت نہیں تھی کہ جس فرد، گھر یا گروہ کی خدمت کی گئی ہے اس سے عوضانے میں کچھ وصول کیا

جائے، کھانا کھایا جائے بلکہ ٹھنڈا پانی پینے کی بھی ممانعت تھی۔ اگر کوئی خاکسار کسی دوسرے شخص یا خاکسار کو ملنے جاتا تو یا تو اُن سے کسی قسم کی میزبانی قبول کرنے سے انکار کر دیتا یا اس کا معاوضہ پیش کر دیتا۔ چنانچہ اگر مہمان اور میزبان مل کر اکٹھے کھانا کھاتے تو دونوں کے لیے لازم تھا کہ اپنے اپنے کھانے کا بل خود ادا کریں۔ اس کی تشریح کے لیے میں احمد ندیم قاسمی کی شہادت پیش کرنا چاہوں گا جس کے لیے میری اپنی ہی پرانی تحریر کا مندرجہ ذیل اقتباس قابل توجہ ہے:

احمد ندیم قاسمی نے بتایا کہ میری ادبی زندگی اور ملازمت کا آغاز تھا۔ جب ن م راشد اپنے ایک دوست کے ساتھ میرے گاؤں آئے۔ گرمیوں کے دن، سہ پہر کا وقت، میں نے ان دونوں کے سامنے شربت کے گلاس رکھے تو دونوں نے جیب سے ایک ایک چونّی (چار آنے) نکال کر میز پر رکھ دی اور وضاحت کی کہ وہ خاکسار ہیں اور علامہ مشرقی کا حکم ہے کہ مناسب معاوضے کے بغیر کسی قسم کی خاطر تواضع قبول نہ کی جائے۔ یہ تاویل میزبان کو قبول نہ تھی۔ گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی چونّی اُٹھا کر چل دیے اور شربت کے گلاس ویسے کے ویسے دھرے رہ گئے۔ (جھرنوں سے کرنیں، مضمون "آخری ملاقات"، ص:۱۵)

علّامہ مشرقی کفایت شعاری کی تلقین بہت شدت سے کیا کرتے تھے اور اپنی تقریروں میں اکثر کہتے تھے کہ آپ کو خاکسار بن کر خاکی وردی کے لیے خاکی کپڑا خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ عام سفید لٹھے کو اگر آپ دو تین دفعہ انار کے چھلکے کے ساتھ اُبالیں گے تو کپڑے کا رنگ پکا خاکی ہو جائے گا۔ کفایت شعاری سے عجز و انکسار پیدا ہوتا ہے اور عجز و انکسار والے انسان پر خدا کی رحمتیں برستی ہیں۔ اس کے لیے وہ نہ صرف قرآنی حوالے دیتے تھے بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے خطبے Sermon of the Mount کا ذکر بھی کرتے تھے۔ تاکہ انگریز حاکم ان کی تحریک کے کردار والے فلسفے کو سمجھ سکیں۔ اسی عاجزی کے اظہار کے لیے خاکساروں کو اجازت نہ تھی کہ وہ کسی بھی قسم کی سیاسی یا مذہبی نعرہ بازی سے اپنی انا یا تکبر کا مظاہرہ کریں یا ریاستی قوانین کی خلاف ورزی کریں۔ چنانچہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا سے طویل خط و کتابت کرتے رہے کہ سارے ہندوستان میں سرکاری ملازموں کو خاکسار تحریک میں کھلی شمولیت کی اجازت دیں۔ وہ تو نہ ہوا۔ مگر بلوچستان میں زیادہ اور صوبہ سرحد (موجودہ KPK) اور پنجاب میں کم کم سرکاری ملازمین علامہ مشرقی کے اس اعلان کی آڑ میں حصہ لیتے رہے کہ خاکسار تحریک ایک سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی تحریک ہے جس کے ممبران محض اپنے اچھے کردار کی وجہ سے حکومت کرنے کا حق رکھتے تھے۔

برعظیم کے تناظر میں ایک باکردار سیاسی تنظیم کا قیام دراصل علامہ مشرقی کی اس وسیع سوچ کی ایک محدود سی جھلک تھی۔ جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہونے والی ان کی شہرۂ آفاق تصنیف تذکرہ کی

انقلابی بصیرت میں سموئی ہوئی تھی[1]۔ یہ قرآنِ کریم پر سائنس کی رُو سے ایک تبصرے کی شکل (Scientific Commentary on Holy Quran) تھی۔ جس میں مذہب، کائنات اور سائنس کی مشترکہ تکون کے تجزیے سے بتایا گیا تھا کہ خدا کا فرمان (وحی)، خدا کی تخلیق (کائنات) اور خدا کا نائب (انسان) ایک دوسرے سے لاتعلق، مختلف یا متصادم نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ تینوں ایک دوسرے کی باہمی تکمیل کرتے ہیں۔

اس تصنیف کی جلدیں دنیا بھر کی نمایاں شخصیات کو بھیجی گئیں تو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خان نے باضابطہ انداز میں نوبل پرائز (Nobel Prize) کے لیے تجویز بھیج دی۔ نوبل پرائز کمیٹی نے شرط لگائی کہ اگر علامہ مشرقی اس کا ترجمہ کسی نمایاں یورپی زبان میں کر دیں تو یہ نوبل پرائز کی حقدار ٹھہرے گی۔ اپنے طور پر انگلستان کے پروفیسر نکلسن (Prof. Nicholson) نے تذکرہ کا انگلش میں ترجمہ کیا۔ مگر علامہ مشرقی کا کہنا تھا کہ اس ترجمے سے ان کے مافی الضمیر کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکی۔ مگر جب علامہ مشرقی نے البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstien) سمیت یورپ کے مختلف سائنسدانوں سے تذکرہ کے مندرجات کے متعلق زبانی تبادلۂ خیالات کیا اور آئن اسٹائن کی Theory of Relativity سے اس کی موزونیت (relevance) پر بحث کی تو آئن سٹائن کا خیال تھا کہ اس نقطۂ نظر پر مزید کام کر کے اگر سائنسدانوں کی عالمی سوسائٹی کے سامنے پیش کر دیا جائے تو سائنس، مذہب اور انسان کے متعلق مروجہ نظریات میں انقلابی تبدیلی کے امکانات ہیں۔ اس کے بعد آئن اسٹائن کی مدد سے علامہ مشرقی کو یورپ کی کئی سائنسی انجمنوں کا فیلو (fellow) بنا دیا گیا، مگر ۱۹۲۷ء کے بعد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عملی زندگی سنوارنے کی طرف بہت شدت سے مائل ہو گئے اور یہ معاملات ملتوی ہوتے گئے۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۲۷ء کے قریب دوقومی نظریے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ قائداعظم مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے ممبر تو ضرور تھے مگر ساتھ ہی کانگریس کے اسٹیج پر ہندو مسلم اتحاد کے سفیر اور نقیب بھی تھے۔ گو کڑوی حقیقت یہ تھی کہ کانگریسی لیڈروں کی طرف سے مسلمانوں کے لیے آئینی تحفظات حاصل کرنے میں وہ مسلسل ناکام ہو رہے تھے اور کانگریس کے ساتھ ان کی مایوسی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں وہ کانگریس سے مکمل طور پر نااُمید ہو گئے اور سیاست سے کنارہ کش ہو کر انگلستان میں قیام کرنے لگے۔ پھر اس تین سالہ خود ساختہ جلاوطنی میں وہ محسوس کرنے لگے کہ مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد مسلمان کسی قابلِ ذکر لیڈر کی رہنمائی کے بغیر کانگریس کے ہاتھ میں کھلونا بن رہے تھے۔ اس لیے علامہ اقبال کے اصرار پر وہ ۱۹۳۴ء میں

واپس وطن لوٹے اور مسلم لیگ کے مفلوج جسم میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی دور میں علامہ مشرقی نے بھی ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کے متعلق یہی کچھ سوچا اور ۱۹۲۷ء کے آس پاس اپنی زندگی کی ہر ترجیح کو پس پشت ڈال کر تذکرہ کی آفاقی سوچوں کو خاکسار تحریک کی مقامی صورت میں ڈھالنے لگے۔ کیونکہ اس طرح وہ عمر بھر کی سوچوں سے تراشی ہوئی ''اپنی تصنیف'' کو اب اصلی زندگی میں ''اپنی تخلیق'' کا روپ دے سکتے تھے۔ چنانچہ خاکسار تحریک کی تخلیق ان کی اوّلین ترجیح بن گئی اور یورپ کے سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی اور نوبل پرائز کمیٹی کی پیش کش قصۂ پارینہ بننے لگی۔

لیکن کہکشانوں پر چلنے والی مشیّت کی ہموار یا ناہموار چال کو زمین کے فرشی ادراک اور وجدان والے لوگ کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ چنانچہ اس تخلیق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام کی وہ روایتی شکل بن گئی جو ملائیت اور فرقہ واریت نے گزشتہ کئی صدیوں میں تشکیل دی تھی۔ جس میں خدا کے قرآن اور رسول ﷺ کی سنّت سے کہیں زیادہ افضل انسان کی بنائی ہوئی فقہ تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے اسی رکاوٹ کو توڑنے کی ضرورت تھی۔

اس کا آغاز کرنے کے لیے علامہ مشرقی نے علم ریاضی کی مدد سے یہ پہلا انکشاف کیا کہ نماز کی ادائیگی میں مسلمانوں کے قبلہ کا رُخ درست نہ تھا۔ بلکہ اس میں اتنے ڈگری کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔[1] علماء کا فوری ردِعمل علامہ مشرقی کے خلاف کفر کا فتویٰ تھا۔ جس کے بعد علامہ مشرقی کی طرف سے وقتاً فوقتاً کئی پمفلٹ شائع ہونے لگے۔ جن میں ایک نمایاں عنوان یہ تھا مولوی کا غلط مذہب۔ اسی عنوان کے تحت جب کوئی نیا پمفلٹ آتا، تو سڑکوں گلیوں میں بآواز بلند اس پکار کے ساتھ بکتا جاتا، ''مولوی کا غلط مذہب، قیمت ایک پیسہ'' یا ''دو پیسے۔'' ان تحریروں کا استدلال یہ تھا کہ اسلام مذہبی رسومات اور عبادت کے طور طریقوں کا مذہب نہیں، بلکہ عمل اور محض عمل کا مذہب ہے جو اعلیٰ کردار اور عسکری طرزِ زندگی سے انسانی فطرت کو سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ اس لیے نماز کو بھی عسکری نماز ہونا چاہیے۔ یعنی قرأت اور تلاوت کی بجائے عسکری قواعد کے انداز میں ادا کی جانی چاہیے اور تیزی سے تکبیر پڑھتے ہوئے رکوع و سجود اور قیام کرنا چاہیے۔ مولوی کا اندازِ قرأت و تلاوت برائے برکت دراصل مسلمانوں کی توجہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے سے ہٹانے کے لیے ہے، تاکہ قرآن خوانی پر مولوی کی اجارہ داری قائم رہے اور وہ قوم کو قرآن فہمی سے دور ہی رکھ سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان مؤثر تحریروں کی کاٹ اور خاکسار تحریک کی آفاقی مقبولیت میں مولوی کو اپنی ہستی

خطرے میں نظر آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز کی خفیہ پولیس اور مولوی کا صد سالہ زیرِ زمین رشتہ اب اعلانیہ طور پر ایک متحدہ الحاق بن کر سب کے سامنے اُبھر آیا جس کے مہلک نتائج آئندہ نظر آئیں گے۔

یہاں پر ایک اور یاد۔

ہمارے سب سے بڑے ماموں اتنے بزرگ تھے کہ میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور میں اپنی زندگی میں ایک ہی دفعہ چند روز ان کے پاس گزار سکا تھا۔ وہ تحریکِ خلافت کے دنوں میں (۱۹۲۲ء کے لگ بھگ) گورنمنٹ ہائی اسکول، پشاور میں سیکنڈ ماسٹر تھے۔ جب مرکزی حکومت میں انڈین ایجوکیشن سروس کے رکن علامہ مشرقی سے انگریزوں کی ناراضی اور تنزلی کی وجہ سے انھیں اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر لگا دیا گیا تھا۔ سرکاری رشتے کے علاوہ بھی میرے ماموں علامہ مشرقی کے بہت قریب تھے اور ان کی زبانی علامہ مشرقی کی اس زندگی کی چند جھلکیاں ہم تک پہنچیں۔ جب خاکسار تحریک چلانے سے پہلے ان کی سرکاری ملازمت کا دور تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ اپنے ملک وقوم کے لیے انگریز کی حب الوطنی اور قومی کردار سنوارنے میں حقوق العباد کے تحفظ کے لیے وہ انگریز کے بہت معترف تھے لیکن دوسری قوموں کے استحصال میں انگریز کی خود غرضی، مکاری اور غیر انسانی بربریت کے لیے وہ ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ان دونوں انتہاؤں کو چھونے والے رویّوں کی ایک ایک مثال انھوں نے یہ سنائی۔

انگلستان میں اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران علامہ مشرقی حیرت سے دیکھتے تھے کہ سڑک کے کنارے اخبارات پڑے ہوئے ہیں۔ مگر دکاندار کوئی نہیں ہوتا اور لوگ ساتھ پڑی ہوئی پلیٹ میں پیسے ڈال کر اخبار اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔[2] ایسی ہی اخلاقی تربیت کے لیے علامہ مشرقی نے پشاور کے اسکول کی ٹک شاپ (Tuck shop) میں یہی نظام رائج کر دیا اور کسی بھی بے قاعدگی پر کڑی سزا دے کر اسے انتہائی کامیاب بنا دیا۔

دوسری مثال یہ تھی کہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے سامنے ایک چلمن لٹکی ہوتی تھی اور ساتھ اسٹول پر بیٹھے ہوئے چپراسی کے لیے مستقل حکم یہ تھا کہ پہلے ہر ملاقاتی سے نام پوچھ کر اندر اطلاع کرے اور اجازت ملنے پر اسے عزت و تکریم سے اپنے ساتھ اندر لائے۔ سبھی مقامی اور انگریز ملاقاتی اس طریقِ کار کا احترام کرتے تھے۔ مگر ایک دن ایک انگریز اس چپراسی کے روکنے کے باوجود چلمن اُ کر اندر گھس آیا۔ علامہ مشرقی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور گ کر چپراسی کو طلب کر کے اس کی جواب طلبی کی۔ اس نے اپنی بے بسی کی کتھا سنائی تو ا۔

کے کونے میں مرغا بن کر کان پکڑ لو اور جتنی دیر ملاقاتی بیٹھا رہے گا تم ایسے ہی رہو گے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے لیے مقامی زبانیں سیکھنا اور بولنا لازمی تھا۔ اس لیے اُس نے یہ مکالمہ سنا بھی اور سمجھا بھی۔ چنانچہ بڑی مختصر سی بات کر کے فوراً ہی چلا گیا۔

برسوں بعد خاکسار تحریک کے زمانے میں مجھے علامہ مشرقی کے ڈسپلن کا یہ واقعہ بھی مختلف لوگوں سے اکثر سننے کا موقع ملا۔ علامہ مشرقی کا دستور تھا کہ ہر شام ملک کے جس شہر میں بھی موجود ہوتے وہاں بعد از نمازِ عشاء مقامی خاکساروں کے ساتھ عام سپاہی کی طرح پیریڈ میں شرکت کرتے تھے۔ ایک دفعہ پیریڈ کے دوران کسی بے ضابطگی کے مرتکب ہوئے۔ تو سالار نے ''جیش باش'' کا حکم دے کر پریڈ روکی اور عام خطا کاروں کی طرح علامہ مشرقی کو بھی قطار سے باہر بلا کر اتنے ہی دُرّے لگائے گئے۔ جتنے ایسی خطا کے لیے مخصوص تھے۔ دُرّے کھانے کے بعد علامہ مشرقی نے تمام خاکساروں اور تماشائیوں کے سامنے تقریر میں سالار کی نہ صرف تعریف کی بلکہ یہ کہا کہ اگر آج یہ مجھے یہ سزا نہ دیتا تو میں سمجھتا کہ یہ سالار بنے رہنے کے قابل نہیں۔ مگر اب میں واپس جا کر پورے جائزے کے بعد اسے حسبِ ضابطہ ترقی دوں گا۔

ایسی یادوں کی بازگشت مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ تو میں یادوں کا ڈھکن بند کر دیتا ہوں۔ پھر اُس بے تاب بچے کی طرح جو اپنی مٹھی میں بھینچے ہوئے سکے کے گر جانے پر حرص بھری نظروں سے ادھر اُدھر ڈھونڈنے لگتا ہے۔ میں بھی اپنے مینار اور وطن کے مینار کی نچلی بلندیوں میں بے تابی سے تلاش کرنے لگتا ہوں کہ خاکسار تحریک کے فلسفے، ڈسپلن اور تربیت نے جو افراد تراشے تھے وہ نہ جانے قوم کی مٹھی میں سے کہاں گر گئے۔ تو مجھے ان دونوں میناروں کے کونوں کھدروں میں اور مختلف منزلوں میں بے چارگی سے اٹکے ہوئے چند شرارے ملتے ہیں۔ ان کوئلوں کی طرح جو سلگ سلگ کر اب راکھ کے غلاف میں لپیٹے جا چکے ہیں۔ معدوم سی دید، موہوم سی آنچ، معصوم سی دمک، یہ وہ لوگ ہیں جن سے اپنی ملازمت کے دوران مجھے ان دنوں واسطہ پڑتا تھا۔ جب کسی ناگہانی قدرتی آفت (زلزلہ، سیلاب یا ٹڈی دل کا حملہ) سے نبٹنے کے لیے ضلعی انتظامیہ کو ہنگامی مہم چلانا پڑتی تھی اور ہر جگہ چند ایثار والے رضا کار پیش پیش ہوتے تھے۔ پوچھنے سے یہی پتا چلتا تھا کہ ان کا ماضی بیلچہ بردار خدمتِ خلق میں گزرا ہے۔ اس لیے ان کے ہاتھ پاؤں اور تخلیقی سوچ تربیت یافتہ ہوتے تھے کہ کسی ماہر کوزہ گر کی طرح مصیبت زدگان کی ضرورت کے مطابق خدمت کی نئی نئی شکلیں ایجاد کر سکیں۔ یہ رضا کار پورے خلوصِ دل اور گرمئ جاں سے تن اور من کی بازی لگا دیتے تھے۔ جیسے خاکسار تحریک کا ماضی میں سمویا ہوا کردار ان کے اندر تک سرایت کر کے رگ و پے کو شرابور کر چکا ہو اور اب کی ہنگامی

صورتِ حال انھیں نرم اسفنج کی طرح نچوڑ کر اسے لہر در لہر باہر لا رہی ہو۔

وطن کے مینار میں اچانک ایک ایسے ہی شرارے پر میری نظریں جم جاتی ہیں اور ہٹائے نہیں ہٹتیں۔ کیونکہ وہ انتہائی چمکدار شرارہ ہے۔ رات کے آسمان پر ایوننگ اور مارننگ اسٹار (Evening / Morning Star) کی طرح ہر ستارے سے زیادہ روشن اور پُرنور۔ یہ اختر حمید خان تھے جو کچھ عرصہ خاکسار تحریک کے سرگرم کارکن رہے اور پھر عمر بھر خاکسار تحریک کے تراشیدہ کردار کی روشن مثال اور مثالی تفسیر بنے رہے۔ یہ علامہ مشرقی کے داماد بھی تھے۔

میرٹھ اور آگرہ کے تعلیم یافتہ اختر حمید خان ۱۹۳۶ء میں آئی سی ایس (Indian Civil Service-ICS) آفیسر بنے اور کیمبرج یونیورسٹی، انگلستان میں ابتدائی تربیت حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں بنگال میں تعینات تھے کہ انگریزی راج کے ساتھ ساتھ بنگال کے قحط میں موت کا راج بھی چھا گیا اور چاروں طرف بھوکی لاشوں کے انبار لگنے گئے۔ ساتھ ہی مشرقِ بعید سے یلغار کرتی ہوئی جاپانی فوجیں سبھاش چندر بوس کی باغیانہ انگلی پکڑے ہوئے بنگال کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اُوپر سے جاپانی طیاروں کے بم بنگال کی مٹی میں گرنے لگ گئے تھے۔ حکومتی مشینری کا پرزہ ہونے کی وجہ سے اختر حمید خان رازِ درونِ خانہ جان گئے کہ یہ قدرت کی طرف سے خشک سالی والا قحط نہیں تھا، بلکہ انگریز کی سوچی سمجھی اور دانستہ حکمتِ عملی کے مطابق ایک مصنوعی قحط انتظامیہ کی طرف سے پیدا کیا جا رہا تھا تا کہ بے کل اور بے چین بنگالی انگریز سے بغاوت کر کے بڑھتی ہوئی جاپانی فوجوں اور سبھاش چندر بوس کو خوش آمدید نہ کہہ سکیں۔ اختر حمید خان نے بھوکے عوام کے لیے خوراک کے تالا بند گوداموں کے منہ کھول دیے اور خود ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

آئی سی ایس افسر کا لبادہ اُترا تو اندر سے خالص خاکسار برآمد ہوا اور روزی کمانے کے لیے دو برس تک بازار میں بیٹھ کر تالے مرمت کرتا رہا۔ مگر ۱۹۴۷ء میں جامعہ ملّیہ میں پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ بعد ازاں ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ کر مختلف ترقیاتی اسامیوں پر کام کرتے کرتے بالآخر قومی اور بین الاقوامی سطح پر دیہی ترقیاتی منصوبوں کے تخلیقی فنکار اور ماہر کے طور پر اُبھرے۔ کراچی اور سندھ میں کچی آبادیوں کو سنوارنے میں بڑا نام پیدا کیا اور کئی بین الاقوامی انعامات حاصل کیے۔ ''اپنی مدد آپ'' کے تحت کراچی میں ''اورنگی'' اور اندرون سندھ میں ''خدا کی بستی'' جیسے کامیاب منصوبوں سے غریبوں کی عزتِ نفس قائم رکھتے ہوئے ان کی صاف ستھری رہائشی آبادیوں کو سربلند کیا، جنھیں اب لاہور اور پنجاب میں بھی پھیلایا جا رہا ہے۔

اختر حمید خان ۱۹۹۹ء میں فوت ہوئے تو ان کی تخلیقی سوچوں اور عملی کاوشوں کی وجہ سے ملک

بھر میں پھیلی ہوئی بیش قیمت چمکدار ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے بالکل متوازی کم خرچ سادہ سی غریب آبادیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ یہ دونوں ہی خاکی وردیوں کا تحفہ تھیں۔ مگر چار کامیاب فوجی ڈکٹیٹروں کی خاکی وردیاں صرف معاشرے کے عرش کو سجاتی رہیں اور دو ناکام خاکسار لیڈروں کی خاکی وردیاں صرف فرش والوں کی اشک شوئی کرتی رہیں۔ ایک وردی غریب سے زمین سمیت سب کچھ لیتی رہی۔ دوسری وردی غریب کو بہت کچھ دیتی رہی۔ رائفل آزارِ خلق بنتی رہی اور بیلچہ خدمتِ خلق کرتا رہا۔ مگر ہماری منافقانہ تاریخ لینے والوں کے تو قصیدے گاتی رہیں اور دینے والوں کو مذمتی انداز میں فراموش کرتی رہی۔ اسی لیے وطن کا مینار جو پہلے اپنی بنیاد سے سیدھا اوپر اُٹھ رہا تھا۔ اب دھیرے دھیرے Leaning Tower of Pisa بنتا گیا۔[۳۱] جسے عرشی لوگوں کے وسوسے گرنے والا کہتے رہے۔ مگر فرشی لوگ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اس کی کجی کے سیدھا ہونے کی دعائیں کرتے رہے۔ عرشی لوگ اپنے اثاثے ملک سے باہر لے گئے اور فرشی لوگ اس کے فرش کی مٹی پر سجدہ ریز ہوتے رہے۔

میں دونوں میناروں کی سب سے اوپر والی منزلوں میں سے جھانک کر دیکھ رہا ہوں کہ یہ کیسا عمارتی ڈھانچہ ہے، جس کی نچلی اور اُوپر والی منازل میں کوئی تواتر یا تناسب نہیں ہے۔ جس کا فرش مٹی کا ہے اور چھت سونے چاندی کی ہے۔

خدمتِ خلق اور اعلیٰ انسانی کردار کے جس سانچے میں خاکسار تحریک کا ہر فرد ڈھالا جا رہا تھا اور جس جرأت مندی سے علامہ مشرقی مولوی کے غلط مذہب کے روایتی سانچے کو توڑنے پر تلے ہوئے تھے وہ سات صدیاں پہلے مولانا روم کے فرمان کی یاد دلاتا تھا:

ما دل اندر راہِ جاں انداختیم	غلغلے اندر جہاں انداختیم!
ما ز قرآں بر گزیدم مغز را	استخواں پیشِ سگاں انداختیم
تخم اقبال و سعادت تا ابد	از زمیں تا آسماں انداختیم
جبہ و دستار و علم و قیل و قال	جملہ در آبِ رواں انداختیم
از کمالِ شوق اصلِ معرفت	راست کردہ بر نشاں انداختیم

ترجمہ: ہم نے دل کو جان کے راستے میں ڈال کر دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ ہم نے قرآن سے اس کا مغز نکال کر ہڈی کتوں کو ڈال دی۔ اقبال و سعادت کا بیج ابد تک کے لیے ہم نے زمین سے آسمان تک بو دیا۔ جبہ، دستار، علم اور قیل و قال (جیسے نشاناتِ فخر و مباہاتِ دنیا) کو پانی میں بہا دیا... (ہم نے) روحِ معرفت کو انتہائے شوق سے شایانِ شان مرتبے پر پہنچا دیا۔

لیکن برِعظیم کے چھوٹے سے جہاں میں جو غلغلہ خاکسار تحریک نے پیدا کر دیا تھا، آج اُس کی گونج تو کیا سرسراہٹ بھی باقی نہیں کیونکہ پرانے سانچے کے رکھوالوں نے اسے ہماری سیاسی اور ادبی تواریخ کی کتابوں سے ایسے حذف کر دیا کہ اس کے نقشِ پا بھی نہ مل سکیں، تاکہ اس قوم میں یہ احساس دوبارہ جاگ ہی نہ سکے کہ یہ اعلیٰ کردار کی بلندیوں پر پہنچنے کی بھی اہل ہے۔ اسی طرح اس کے ماضی کا عکس اس کے مستقبل پر نہ پڑ سکے۔ پرانے سانچے کے صدیوں پرانے وجود، بقا، تسلسل اور گرفت کا راز ہی یہی ہے کہ مسلم اُمہ کے مریضانہ حد تک منجمد ذہن پر ہر نئی سوچ کی دستک کو خاموش کر دو۔ اسی لیے ہماری ہر حکومت اجتہاد کے بند دروازے پر ایک نئی کیل ٹھونک دیتی ہے جس سے مُلا کا مسلسل مفاد بھی محفوظ ہو جاتا ہے اور نقلی جمہوریت میں اصلی ملوکیت کی روح بھی قائم رہتی ہے۔

مولانا جلال الدین محمد رومی کی لکھی ہوئی مثنوی کے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں: ع

ہست قرآں در زبانِ پہلوی...

کیونکہ اس کی تمام حکایات مجموعی طور پر وہی پیغام دیتی ہیں جو قرآنِ کریم کی آیات سے اُبھرتا ہے۔ اسی طرح علامہ مشرقی چست و چالاک، بیلچہ بردار خاکسار کو بھی عملی طور پر انسانیت کے اُسی نمونے کے قریب تر لانا چاہتے تھے، جو قرآن کریم کی سطور سے اُبھرتا ہے، مگر قسمت نے ان کے عملی پروگرام کو صرف ایک دہائی کی زندگی دی (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء) جو اچانک ہی دو زمانوں کے سنگم میں ایسے گم ہو گئی جیسے تیز رفتار گھوڑا اچانک کسی کھائی میں جا گرتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم بھی دو زمانوں کا سنگم تھی... پرانا زمانہ اور نیا زمانہ... کوڑی، دمڑی، پائی، دھیلا پیسے اور چاندی کے روپے کا پرانا زمانہ اور نوٹ، چیک، کریڈٹ کارڈ (credit card) اور آن لائن (online) ادائیگی کا نیا زمانہ۔

اس سے پہلے انسانی دست و بازو کا زمانہ تھا۔ تلوار، بندوق اور بندوق سے آگے لگی ہوئی سنگین سے دست بدست لڑائی کا زمانہ تھا۔ مگر اس جنگ کے دوران مشیت نے پھر ویسا ہی ورق اُلٹا۔ جیسے ماضی قدیم میں ورق پلٹنے پر پتھر سے دھات کا زمانہ بدل گیا تھا۔ پھر اوراق پلٹتے رہے اور زمانے بدلتے رہے۔ اسی عمل سے دوسری جنگِ عظیم کے بعد انسانی دست و بازو کی بجائے انسانی دماغ کا زمانہ شروع ہو گیا اور ہماری زندگیوں کی لگام قوتِ بازو کی بجائے ٹیکنالوجی نے تھام لی۔

یہ لگام صرف چند دنوں کے وقفے سے اکیلے اکیلے اُڑنے والے ان دو طیاروں میں بدل گئی جن میں سے ایک جاپان کے شہر ہیروشیما (Hiroshima) پر اُڑا اور دوسرا ناگاساکی (Nagasaki)

کے اُوپر۔ اس کے بعد دنیا کے گلشن کا بندوبست بہ رنگِ دگر بدلنے لگا۔ برٹش ایمپائر برف کی ڈلی کی طرح پگھلنے لگی۔ تاریخ کے پرانے لیمپ کی رگڑ سے امریکہ کا جن بند بوتل سے نکلنے لگا۔ دنیا دو دھڑوں میں بٹ کر سرد جنگ کے اکھاڑے میں اُتر گئی اور غلام قومیں اپنے آزادی کے پرچم لہرا کر یہ خوش فہمی پالنے لگیں کہ وہ واقعی آزاد ہو گئی ہیں۔ کیونکہ وہ نو آبادیاتی نظام کے نئے روپ کو تا حال سمجھنے سے قاصر تھیں اور فقط یہ محسوس کر رہی تھیں کہ زمانہ نئی کروٹ لے رہا ہے۔

مگر اس کروٹ کا واضح احساس تو ۱۹۴۵ء میں اُبھرا۔ اس سے پہلے تو چند آثار اُبھر رہے تھے۔ بارش کے اُن آوارہ قطروں کی طرح جو ہوا کے اِکا دُکا تیز جھونکوں پر سوار ہو کر کسی پُرسکون آبادی میں اس وقت جا گرتے ہیں جب وہاں کے لوگوں کے گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ طوفان باد و باراں ان کی طرف بڑھا آ رہا ہے۔

بدلتے زمانے کے یہ چند پیش رو قطرے لاہور کی سرزمین پر مارچ ۱۹۴۰ء میں گرے اور صرف چار روز کے وقفے کے آر پار ۱۹ / مارچ سے ۲۳ / مارچ تک[۱۴] خاکسار تحریک کے لیے زمانہ بدل گیا تھا۔

پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات نے فروری ۱۹۴۰ء میں خاکسار تحریک خلافِ قانون قرار دے دی تھی جس سے وردی پہننے، بیلچہ اُٹھانے اور پریڈ کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ چنانچہ، علامہ مشرقی نے تمام خاکساروں کو ہدایات جاری کر دی تھیں کہ تاحکم ثانی وہ اپنے آپ کو صرف خدمتِ خلق تک محدود رکھیں اور حسبِ تربیت کوئی غیر قانونی قدم نہ اُٹھائیں اور خود دہلی جا کر قائد اعظم، سر سلیمان شاہ، سر ظفر اللہ خان، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور دوسرے مسلم عمائدین سے ملاقاتیں کرتے رہے اور وائسرائے سے انٹرویو کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۸ / مارچ کو لاہور کے سالارِ اوّل علامہ مشرقی سے مزید ہدایات لینے کے لیے دہلی گئے تو شعلہ بیاں مقرر خوشحال خان قائم مقام سالار تھے، جو حال ہی میں اس تحریک میں شامل ہوئے تھے مگر دہلی سے ہدایات کا انتظار کرنے کی بجائے انھوں نے جنگ بدر کے انداز میں ۳۱۳ خاکساروں کا جیش تیار کیا اور ۱۹ / مارچ ۱۹۴۰ء کو بھاٹی گیٹ، لاہور میں اونچی مسجد سے برآمد ہو کر شاہی مسجد، لاہور کی طرف ظہر کی نماز کے لیے مارچ کرنے لگے۔ مگر ٹبی بازار میں گھڑ سوار پولیس نے راستہ روک لیا۔ پھر انگریز ایس ایس پی (SSP) مسٹر گینز فورڈ (Mr. Gains Ford) نے سالار کے منہ پر جب تھپڑ مار دیا تو بندوقوں، سنگینوں اور بیلچوں کی دست بدست جنگ میں ٹبی بازار میدان کارزار بن گیا۔ بیلچوں کی ضربوں سے پولیس کے گھوڑے بدک کر مڑے اور اپنے ہی سپاہیوں کو روندتے ہوئے بھاگ گئے۔ تب اردگرد کی گلیوں

میں روپوش پولیس کی بھاری نفری برآمد ہو گئی اور بقول سید شبیر حسین، ''اسی قسم کے ظالمانہ اور وحشیانہ انداز میں گولیاں چلنے لگیں جیسی جنرل ڈائر (Dyer) نے ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں چلائی تھیں۔''[۱۵]

نو گزے کی قبر کے پاس ایک پھل والے کی دکان تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر بھاگا اور جب گولیاں تھم جانے کے بعد دوبارہ واپس لوٹا تو اس کی نشست پر ایک آنے کا خون آلود سکہ پڑا تھا اور ساتھ ایک خاکسار کی لاش پڑی ہوئی تھی، جو قیمت کی ادائیگی کے بعد دکان سے سنگترہ اُٹھا کر چھیلتے چھیلتے اپنی پیاس بجھانے سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔[۱۶]

ملک بھر میں قیاس آرائیاں گردش کرنے لگیں کہ کیا علامہ مشرقی کی طرف سے واضح ہدایات کی غیر موجودگی میں خوشحال خان نے یہ جیش خفیہ پولیس کی ایما پر ترتیب دیا تھا تاکہ انگریز حکومت اس تحریک پر فیصلہ کن وار کر سکے؟ تاریخ کا یہ اہم سوال کسی پاکستانی مؤرخ یا محقق کے لیے اہم نہیں ہے۔

علامہ مشرقی کو گرفتار کر کے غیر مسلم آبادی والے علاقے مدراس میں واقع ویلور جیل بھیج دیا گیا اور ۱۹۴۲ء میں اس وقت رہا کیا گیا۔ جب انھوں نے مرنے کے لیے مسلسل ۸۰ / روز کا فاقہ کیا۔ مگر یہ آزادی صرف مدراس کی ریذیڈنسی تک محدود تھی اور باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس طرح شمالی اور مشرقی ہندوستان ان کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ جہاں مسلمان آبادی کی اکثریت کی وجہ سے خاکسار تحریک کی منجدھار والی لہر تھی۔

۷ / مارچ ۱۹۴۲ء کو جاپانی فوجیں رنگون میں داخل ہو چکی تھیں اور ان کے بم بنگال کی سرزمین پر گرنے لگے تھے۔ ان نئے زمینی حقائق نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل کو بدحواس کر دیا اور پرانی پالیسی ترک کر کے ہندوستان سے آزادی کی بات چیت کرنے کے لیے سر اسٹیفورڈ کرپس (Sir Stafford Cripps) ۲۳ / مارچ ۱۹۴۲ء کو دہلی پہنچ گئے اور ہندوستانی سیاست بظاہر ایک نئے زمانے میں داخل ہو گئی۔ حالانکہ زمانے کی یہ کروٹ دو برس پہلے ہی لاہور میں شروع ہو چکی تھی۔ جب مارچ کے چار دنوں میں بیلچے، وردی اور پریڈ پر جنگ کے سارے دورانیے کے لیے پابندی لگ گئی۔ علامہ مشرقی دو برس کے لیے قید میں چلے گئے اور بعدازاں ان کی نقل و حرکت پر پابندی کی وجہ سے اس انقلابی سیلاب کی روانی یک لخت رک گئی تھی۔

۱۹ / مارچ ۱۹۴۰ء کی دست بدست جنگ اور قتل عام کے بعد لاہور اور ہندوستان کی سرزمین پر باوردی پریڈ میں ''چپ راست'' کی صدا کبھی نہیں اُبھری۔[۱۷] مگر چار دن بعد ۲۳ / مارچ ۱۹۴۰ء

کو پاکستان ریزولیوشن کی نئی صدا منٹو پارک، لاہور سے اُبھری۔ پھر ڈھیلی چال چلتی رہی۔ مگر ۱۹۴۴ء کے بعد اُبھرتی ہی چلی گئی۔ یوں لگتا ہے چار دن کے وقفے سے ہندوستانی مسلمانوں کے رہبر کی فوری اور مکمل تبدیلی مشیت کا سوچا سمجھا منصوبہ تھی۔ جیسے ایک دم بجلی کا سوئچ (switch) دبا کر برقی رو کی سمت بدل دی جائے۔ مگر اس پر کسی مؤرخ یا ادیب نے غور نہیں کیا۔ کیونکہ دونوں ہی اپنی اپنی مصلحتوں کے اسیر تھے۔

یوں لگتا ہے کہ مشیت کے اس منصوبے کا ایک اور مخفی پہلو بھی تھا جو وقت کی کوکھ سے دھیرے دھیرے برآمد ہوگا۔

حواشی

۱۔ اس تحریک کے نسبتاً طویل ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایک عینی شاہد کا بیان اس وقت ریکارڈ ہو جائے۔ جب قیامِ پاکستان کے بعد مسٹر خورشید کمال عزیز اپنی کتاب *The Murder of History* میں بالکل درست انکشاف کر چکے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ کو جھوٹ کی ملاوٹ سے دانستہ مسخ کیا جا رہا ہے۔ فروغِ ادب کے متعدد سرکاری اداروں، اہلِ ذوق کے کئی حلقوں اور اُردو کانفرنسوں کے ہجوم کے باوجود ہمارے ادب میں قومی زندگی کے اُس دور کا ذکر بالکل نہیں ہے، سوائے عرصہ پہلے کی ایک اُچٹتی ہوئی تحریر کے جب ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے نقوش کے آپ بیتی نمبر (جون ۱۹۶۴ء) کے ایک طویل مضمون میں صرف مختصر پیرے میں تحریر کیا کہ کس طرح علامہ مشرقی کی تصنیف تذکرہ نے اُن کی زندگی بدل ڈالی (ص: ۱۲۷۹)... حال ہی میں ڈاکٹر یونس جاوید اور مستنصر حسین تارڑ کی تحریریں میری نظر سے گزریں، *Al- Mashriqi — The Disowned Genius* جن میں خاکسار تحریک یا اُس کے زمانے کی طرف ہلکے اشارے ملتے ہیں... مزید معلومات کے لیے دیکھیں:

(i) انگریزی کی کتاب: سیّد شبیر حسین، *Al- Mashriqi — The Disowned Genius* (لاہور: جنگ پبلشرز، اپریل ۱۹۹۱ء)۔

(ii) علامہ مشرقی کے پوتے نسیم یوسف اب امریکہ میں ریسرچ کے بعد نیا لٹریچر شائع کر رہے ہیں۔ رابطے کے لیے دیکھیں: https//www.facebook.com/nasimyousaf.26۔

(iii) انٹرنیٹ پر دیکھیں علامہ عنایت اللہ خان المشرقی... ادب اور زندگی کے بلند بانگ نعروں کے باوجود ہماری دانستہ مسخ شدہ قومی اور ادبی تواریخ کے ساتھ ہمارے منافقانہ چلن کا تسلسل اب ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکہ کے ساتھ بھی جاری ہے۔ اس ضمن میں ہمارے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی تواریخ کی کتابیں دیکھیں۔ اور دیگر حوالے کے لیے دیکھیں: (i) حمود الرحمان کمیشن رپورٹ (ii) چھپے اور مہرے از مسعود مفتی۔

پاکستان میں لکھی جانے والی تاریخ اگر نہ پڑھی جائے تو بے خبری لیکن اگر پڑھ لی جائے تو گمراہی ؏

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

۲۔ عسکری نمازوں کی تشریح آگے بیان ہوگی۔

۳۔ دوسری سیاسی پارٹیوں کے برعکس خاکساروں کو کسی قسم کا نعرہ لگانے کی اجازت نہ تھی۔

۴۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں سیّد شبیر حسین کی انگریزی کتاب *Al- Mashriqi — The Disowned Genius*۔

۵۔ تیسری اینگلو برمی جنگ (Anglo-Burmese War) کے بعد برما کو ۱۸۸۶ء میں برٹش انڈیا کا صوبہ بنا لیا گیا تھا، مگر ۱۹۳۷ء میں چھوٹی سی تبدیلی کے بعد اس کا انتظام جزوی طور پر اس انداز میں الگ کیا گیا تھا کہ یہ لندن میں Secretary of State for India and Burma کے ماتحت ہو گیا۔ گو سرکاری انتظامیہ کا مشترکہ بندوبست حسبِ سابق ہی رہا۔ پھر ۴ رجنوری ۱۹۴۸ء کو برما ایک آزاد ملک بن گیا۔ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی نے خاکسار تحریک ۱۹۳۰ء میں اچھرہ، لاہور سے شروع کی تھی اور ۱۹۳۷ء تک یہ (برما سمیت) پورے برٹش انڈیا میں پھیل چکی تھی۔

۶۔ ان کی علامہ مشرقی سے گہری مخاصمت کی وجہ آگے بیان ہوگی۔

۷۔ میں نے اپنے ہائی اسکول کے زمانے میں صرف ایک دفعہ ان کی تقریر چند گھنٹوں کے لیے سنی تھی، مگر اب تک ان کا رسیلا لہجہ نہیں بھول سکا۔

۸۔ اس کا ذکر مولوی کی مخاصمت کے ضمن میں آگے آئے گا۔

۹۔ حالاتِ زندگی: علامہ عنایت اللہ خان المشرقی ۲۵ راگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر کے ایک متمول پنجابی راجپوت کے گھر میں پیدا ہوئے اور ۲۷ راگست ۱۹۶۳ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔ امرتسر کے مقامی اسکول اور ایف سی کالج (F.C.College) لاہور میں تعلیم کے بعد پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ایم اے (ریاضی) فرسٹ کلاس میں مکمل کیا۔ اس کے بعد انگلستان چلے گئے اور کرائسٹ (Christ) کالج، کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء تک پانچ برس کے عرصے میں اعلیٰ نمبروں سے چار ٹرائی پوس (Tripos) مکمل کیے (ریاضی، قدرتی سائنس، میکینکل (Mechanical) سائنس اور علوم شرقیہ جن کی وجہ سے علامہ مشرقی کہلائے) پھر ڈی فل (DPhil) میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اتنی قلیل مدت میں اتنے اعلیٰ تعلیمی مدارج کے حصول پر انگلستان کے اخبارات (لندن ٹائمز، ڈیلی ٹیلی گراف، ڈیلی مرر (*Mirror*)، ویسٹ منسٹر گزٹ اور کئی دوسرے) نے اپنے اداریوں میں تحسین کی اور یہ ریکارڈ کیمبرج یونیورسٹی سے آج تک کوئی نہیں توڑ سکا۔
وطن واپسی پر پچیس برس کی عمر میں اسلامیہ کالج، پشاور کے پرنسپل تعینات ہوئے اور بعد ازاں مرکزی حکومت کی انڈین ایجوکیشن سروس (IES) میں شامل ہو کر مرکزی محکمۂ تعلیم میں سر جارج اینڈرسن کی جگہ انڈر سیکریٹری مقرر کیے گئے۔ مگر خلافت تحریک کے زمانے میں ان کے خیالات کی وجہ سے انگریز آقا ناراض ہو گئے اور تنزلی کے بعد سزا کے طور پر گورنمنٹ ہائی اسکول، پشاور میں ہیڈ ماسٹر لگا دیا۔ کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۳۰ء میں اچھرہ، لاہور سے خاکسار تحریک شروع کی۔
اپنی ملازمت کے دور میں ہی علامہ مشرقی نے قرآن حکیم پر سائنس کی رُو سے ایک تبصرہ لکھا جس کا عنوان تھا تذکرہ اسے ۱۹۲۵ء میں نوبل پرائز کے لیے نامزد کیا گیا۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں انٹرنیٹ پر ''علامہ عنایت اللہ خان المشرقی'')۔

۱۰۔ سیّد شبیر حسین *Al- Mashriqi — The Disowned Genius*، ص: ۱۶ تا ۹۸۔

۱۱۔ جاپانیوں نے تو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں کمپاس (Compass) کی مدد سے قبلے کی سمت بتانے والی گھڑی تیار کی تھی۔ مگر علامہ مشرقی نے اپنے ریاضی کے علم کی مدد سے ۱۹۳۰ء میں ہی اس کی نشان دہی کر دی تھی۔

۱۲۔ ۱۹۵۹ء میں جب میں انگلستان گیا تھا تو اس وقت بھی اخبارات بیچنے کا یہی طریقہ رائج تھا اور ہر صبح ہر گھر کے باہر دودھ کی بھری ہوئی بوتلوں کی موجودگی اس کے علاوہ تھی۔ مجھے یہ بھی تجربہ ہوا کہ ایک دفعہ میں رات گئے گھر کی طرف پیدل جا رہا تھا۔ راستے میں مشین دیکھ کر رُکا، اس میں شلنگ کے سکے ڈالے۔ مشین نے شلنگ تو ہضم کر لیے مگر دودھ کی بوتل برآمد نہ ہوئی۔ چند منٹ ناکام کوششوں کے بعد میں آگے چل پڑا۔ کافی دور تک جانے کے بعد کسی کی ہانپتی ہوئی دوڑ کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کا انگریز مشین سے بوتل نکال کر مجھے دینے کے لیے دوڑا آ رہا تھا۔

۱۳۔ اٹلی میں پیسا (Pisa) کے مقام پر ایک مینار جو بنیاد سے اوپر کی طرف اٹھتے اٹھتے ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ مگر گرتا نہیں ہے۔

۱۴۔ اپنی کتاب *The Murder of History* میں خورشید کمال عزیز لکھتے ہیں کہ لاہور ریزولیوشن آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس میں ۲۳ ر مارچ کو بنگال کے لیڈر فضل الحق نے پیش کیا۔ جو قائد اعظم کی زیر صدارت ۲۴ ر مارچ کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اسی دن خاکسار تحریک کے لیے زمانہ بدل گیا تھا۔

۱۵۔ فرق صرف یہ تھا کہ غیر مسلموں نے جلیانوالہ باغ کے سانحے کو تاریخ کی کتابوں میں زندہ رکھا، مگر مسلمان قوم نے اپنا نیا ملک بن جانے کے باوجود نبی بازار، لاہور کے سانحے کو تاریخ کی کتابوں میں شامل ہی نہیں ہونے دیا اور زیرِ زمین دفن کر دیا۔ تاریخ کے قتل کی ایک اور تاریخی مثال۔

۱۶۔ سیّد شبیر حسین، ص: ۱۳۲۔

۱۷۔ جنگ ختم ہونے کے دو برس بعد پاکستان بنا تو مختلف پاکستانی حکومتیں مختلف موقعوں پر مختلف الزامات میں علامہ مشرقی کو پانچ دفعہ گرفتار کرتی رہیں۔ مگر وہ ہر دفعہ عدالتی کارروائی میں عدم ثبوت کی بنا پر بری ہوتے رہے۔ ان میں یہ الزام بھی شامل تھا کہ ۱۹۶۲ء میں وہ صدر ایوب کی حکومت گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دراصل قیامِ پاکستان کے بعد اور قائد اعظم کی وفات کے بعد باقی سب حکومتیں بھی علامہ مشرقی کی انقلابی سوچ سے اتنی ہی خوفزدہ تھیں جتنی بیرونی حاکمیت والی انگریز حکومت تھی۔

تیسرا تماشا

ابھی وطن کا مینار ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس بدلتے زمانے کی جملہ شہادت صرف میرے مینار کی نچلی منزلوں سے ہی مل رہی ہے، جہاں میرا بچپن طفلانہ کُدکڑے مار رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پاؤں ڈیوڑھی، دالان، بیٹھک، صحن، سیڑھیوں اور چھتوں پر رُخ رُخ دوڑتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بے وقعت سے کان ہر وقت بڑوں کی ہنسی مذاق اور سنجیدہ باتیں جذب کرتے رہتے تھے اور بے چین آنکھیں ہر نئے پرانے منظر کو ایک دل چسپ تماشے کے طور پر حیرت سے دیکھتی رہتی تھیں۔ لیکن نوخیز اور ناپختہ ذہن کے نہ معلوم کس نہاں خانے میں یہ بے معنی طفولیت کیسے مرتب ہو رہی تھی کہ آج جب میں اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے نیچے جھانک کر قریباً صدی بھر ماضی کا جائزہ لیتا ہوں تو میرا ذہن اُس زمانے کی ہر آواز، حرکت، اور منظر کی گویا جگالی کرنے لگتا ہے۔ پھر اُس میں سے بلند پرواز سوچوں کی اونچی نیچی اُڑان برآمد ہونے لگتی ہے ... اور اُس وقت کا معصوم تماشا آج کا غور طلب اور انتہائی سنجیدہ موضوع بن کر جھولنے لگتا ہے۔

اُس زمانے کا تیسرا تماشا سڑک پر یا گلی میں نہیں بلکہ ہمارے گھر میں ہوتا تھا۔ مسلسل ہوتا تھا... اور اب قریباً ایک صدی گزرنے کے بعد بھی جاری ہے۔ مگر تب کی شکل اور ... اور ... اب کی شکل کچھ اور ... اُس وقت میں اسے ایک کھلنڈرا تماشائی بن کر دیکھتا تھا۔ مگر آج کل وہ پاکستانی معاشرے کا سب سے پیچیدہ مسئلہ ہے۔

اس کا موضوع تو ایک ہی تھا۔ یعنی اسلام فہمی ... مگر رنگ کئی تھے۔ کسی قوسِ قزح کی طرح ... وسیع پھیلاؤ ... کندھے سے کندھا ملے ہوئے ہر رنگ کی اپنی اپنی کشش ... اس کی جاذبیت سے الگ الگ شدت کی عقیدت... اور اس عقیدت سے اُبھرنے والی طویل بحثیں، جن میں ایک سلیقہ اور ربط و ضبط ہوتا تھا۔ زبان سے زیادہ فہم کا استعمال اور آواز کے اُتار چڑھاؤ پر ادب آداب کی لگام۔ کیونکہ ان مباحثوں کی مرکزی شخصیت خاندان کے ایک بزرگ ہوتے تھے۔

یہ بزرگ ہمارے بڑے تایا تھے۔ جو میری پیدائش سے بھی پہلے محکمۂ تعلیم سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ جب ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۵ برس ہوتی تھی۔ کسی زمانے میں پشاور میں باری باری ایڈورڈ کالج اور اسلامیہ کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے اور ریاست قلات میں تعلیمی مشاورت کے فرائض

انجام دینے کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی ملازمت کر چکے تھے۔ میں اپنے ہوش سنبھالنے سے ان کے ہوش بند ہونے تک انھیں ریٹائرڈ فرد کے ایک ہی حلیے اور روپ میں دیکھتا رہا۔ مناسب اور متناسب انداز میں ترشی ہوئی سفید داڑھی۔ جس کی محتاط لمبائی نہ تو سوٹ کی نکٹائی کو ڈھانپتی تھی اور نہ ہی اچکن کے اوپر والے بند بٹنوں کو۔ شفاف گنجے سر پر لباس کی مناسبت سے پھندنے والی ترکی ٹوپی یا پست سے زرکار کلاہ پر مشہدی دستار یا قراقلی کی ٹوپی... سنہری زنجیر کی ہلچل کے ساتھ جیب کی گھڑی۔ سیدھے بدن کی پُراعتماد چال۔ مگر رسمی لباس کے ساتھ مزید تکلف کے لیے ہاتھ میں چھڑی۔ جو عصائے پیری جیسا سہارا نہ تھی بلکہ اظہارِ بزرگی کی علامت تھی۔ پنجابی گفتگو میں اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کا حسبِ ضرورت استعمال۔ مگر غیر ضروری بھرمار سے دانستہ گریز اور ہر دم مشرق و مغرب کا ایسا امتزاج کہ مغربیت کی واضح چھاپ بھی مشرقیت پر حاوی نہ ہو سکے۔

ریٹائر ہونے کے بعد وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اسی جدی گھر میں رہائش پذیر تھے اور گجرات میں ابا جان کی تعیناتی کے دوران ہمارا گھرانہ بھی وہیں مقیم تھا۔ اس لیے میں نے پاک پتن شریف میں پیدائش کے بعد ہوش گجرات کے اسی گھر میں سنبھالا۔ جو گھر سے زیادہ پوری برادری کے لیے ایک چوپال کا کام دیتا تھا، کیونکہ اُس زمانے میں خاندانی حفظِ مراتب کا پروٹوکول بھی یہی تھا اور تہذیبی اقدار کی معراج بھی یہی تھی کہ بزرگوں کو سلام کرنے جاتے رہیں۔ اس لیے سبھی رشتے دار کبھی اہتمام سے اور کبھی سرِ راہے وہاں آ جاتے تھے۔ تایا جان کو اس دربار نما حاضری سے جو فرصت ملتی تھی وہ انگریزی اور عربی زبانوں کے قرآن مجید، دیگر کتابوں، ادبی رسالوں، اخبار، شطرنج اور حقّے کی نذر ہو جاتی۔

اسلام فہمی کے لیے عام بحث مباحثے میں اُس زمانے کی تاریخ اور ہمارے گھر کے جغرافیے کا بہت دخل تھا۔ تاریخی پہلو تو یہ تھا کہ علّامہ مشرقی مولوی کے غلط مذہب کو للکار کر صدیوں پہلے سے اجتہاد کا بند دروازہ بھی دیوانہ وار کھٹکھٹا رہے تھے اور ساتھ ہی مُلّا کی مضبوط گرفت کے خلاف جہاد بھی کر رہے تھے۔ اس طرح شاہراہوں اور گلیوں میں ''چپ راست'' کرنے والی عسکری اور فلاحی تحریک جتنی انگریز کی سیاسی غلامی کے خلاف تھی اتنی ہی ملائیت کی روحانی اور مذہبی غلامی کے بھی خلاف تھی۔ اس لیے اس تحریک کی مقبولیت کی وجہ سے ہر گھر اور گلی کوچے میں یہی چرچا رہتا تھا کہ اگر مولوی کا اسلام غلط ہے تو اصل اسلام کیا ہے؟ اس منظرنامے کے ساتھ ساتھ علّامہ اقبال کی شاعری کی بھی اونچی گونج تھی جو نہ صرف مولوی کو ''ابلۂ مسجد'' کہتی تھی بلکہ علی الاعلان سوال اُٹھاتی تھی کہ ع

ابلۂ دنیا ہے کیوں دانائے دیں

اس طرح ہماری قوم کے اس تاریخی مرحلے میں میرا شعور دھیرے دھیرے بیدار ہو رہا تھا

اور دوسری طرف ہمارے گھر کا جغرافیائی قیام بھی اس کی معاونت کرتا تھا۔ شہر کی بڑی سڑک پر ہمارا گھر شاہ دولی گیٹ کے باہر اور بالکل ساتھ واقع تھا۔ اس لیے نہ صرف ہماری برادری کی ان خواتین کی گزرگاہ میں تھا جو تھوڑی ہی دور شاہ دولہ کے مزار پر جانا پسند کرتی تھیں۔ بلکہ مزار کی مخصوص علامتی مخلوق (جنھیں عرفِ عام میں شاہ دولہ کے چوہے کہتے تھے) کی اس عملداری میں بھی واقع تھا۔ جہاں وہ مزار کے لیے نذرانہ اکٹھا کرنے کے لیے اکثر گھومتے رہتے تھے اور اکثر اوقات روحانی کرامات کا موضوع بنتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان تاریخی اور جغرافیائی عوامل کی وجہ سے میں اپنے بڑوں کی باہمی بحث مباحثوں میں اسلام کے بہت سے روپ دیکھتا رہتا تھا، جن میں سے صرف چند ایک ہی کا ذکر یہاں کیا جائے گا۔

پہلا روپ ملائیت کی روایتی شکل تھا جس کی بہترین مثال ہمارے دوسرے تایا تھے۔ ہمارے ایک اور تایا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے سرکاری ملازم تھے، مگر اسلام کو روایتی مولوی کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے عرصہ پہلے ہمارے گھرانے سے اس لیے قطع تعلق کر لیا تھا کہ میری پیدائش سے پہلے میری بڑی بہنیں پرائمری اسکول میں فراک پہنتی تھیں اور پانچویں چھٹی کلاس میں پڑھنے والے بڑے بھائی نیکر کے ساتھ گلے میں تسموں والی ٹی شرٹ (t-shirt) اور دھوپ میں سر پر سولا ہیٹ (sola hat) پہنتے تھے۔ اس غیر اسلامی لباس کے خلاف احتجاج کی وجہ سے انھوں نے ہمارے ہاں آنا ترک کر دیا تھا۔ اس لیے میں بچپن میں صرف ان کی ناراضی اور غصے کا ذکر سنتا رہا اور انھیں دیکھنے کا پہلا موقع اس وقت ملا جب میں پندرہ سولہ برس بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ ان کے دو بیٹوں میں سے ایک نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایس سی میں داخلہ لیا اور دوسرے نے مغل پورہ کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا، جن کی وجہ سے پورا خاندان لاہور آن بسا۔ میرے دونوں تایا زاد تو اب کالج اور یونیورسٹی میں کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ مگر ان کے والد ابھی تک اسلام کی تعبیر و تشریح اپنے سابقہ انداز میں ہی کرتے تھے۔ جس سے میری بچپن کی یادوں میں گہری نقش گری ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ اب وہ بادل نخواستہ اپنے جوان بیٹوں کی غیر اسلامی پوشاک سے سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ ۱۹۵۵ء کے آس پاس کا پاکستانی معاشرہ متوازن رویّوں کا خوشنما گلدستہ تھا، جس میں نمایاں پھولوں کے ساتھ ساتھ مختلف رنگ کے سبز پتّے بھی تھے اور انھی میں کہیں ڈھکے چھپے چھوٹے چھوٹے کانٹے بھی تھے۔ مگر سبھی مل کر گلدستے کی شان بڑھاتے تھے اور کوئی ایسا بڑا اور نمایاں کانٹا اپنی نوک اُٹھائے نہیں کھڑا تھا، جس کی مذہبی انتہا پسندی چبھنے والی ہو یا نوکِ خار کسی بھی انداز سے نمایاں ہو۔ حالانکہ صرف دو برس پیشتر ہی احمدیت کے

متعلق فسادات اور لاہور کا مارشل لاء ایک اچانک آندھی کی طرح گزر چکے تھے!

اس گلدستے کی خوشبو اور ماضی قریب میں خدمتِ خلق کی تربیت کی وجہ سے لوگوں کے فہم میں اگلی زندگی کے ساتھ ساتھ موجودہ زندگی کی اہمیت بھی بڑھ گئی تھی اور پاکستانی معاشرے کا ہر فرد اور ہر ادارہ اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی سوچ کے مطابق اس زندگی کو سنوارنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت، کاروبار، فلم سازی، ادب، موسیقی اور مصوری وغیرہ سبھی کچھ قلانچیں بھرتے بڑھ رہے تھے۔ نئے ملک کے معجزنما قیام کی وجہ سے لوگوں کے ایمان مضبوط تھے۔ وطنیت سرشار تھی۔ خود اعتمادی فزوں تر تھی اور وطن کے سارے چمن میں بڑی خوشگوار سی بہار تھی۔ ایسے پُرسکون، پُرفضا اور ہوادار ماحول کو میرے تایا اپنی بوڑھی مٹھی میں تو بند نہیں کر سکتے تھے، البتہ یہ کر سکتے تھے کہ اپنے گھر کی چار دیواری میں حتی الامکان اپنی سوچ لاگو کر سکیں جو وہ کافی حد تک کرتے رہے اور جلد ہی اس کے نتائج سامنے آنے لگے۔

ان کے دونوں بیٹے بہت لائق اور ہونہار تھے۔ اور اچھے نمبروں میں ڈگریاں لینے پر انھیں جلد ہی امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے وظائف مل گئے۔ کیونکہ جنگِ عظیم کے بعد بہت سے نئے آزاد شدہ ممالک میں آئندہ رہبری کرنے والوں کو اپنانے کے لیے یورپ اور امریکہ کی طرف سے وظائف کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ علاوہ ازیں اس وقت تک پاکستان میں وظائف کی بانٹ میں لسانی تعصب نے پوری طرح جڑ نہیں پکڑی تھی اور ہر خاص و عام کو صرف میرٹ (merit) پر وظیفہ مل جاتا تھا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان دونوں نے وہیں غیر ملکی خواتین سے شادیاں کر لیں اور بیرونی ملازمتوں میں کھپ گئے، تاکہ وہ اپنے گھر کی مذہبی گھٹن سے دور آزاد زندگی بسر کر سکیں۔ اب وہ میرے قریباً ہم عمر ہیں اور دیارِ غیر میں اپنا تنہائی زدہ بڑھاپا وطن اور عزیزوں کی یاد میں سرد آہوں کے ساتھ گزار رہے ہیں۔

میرا سارا بچپن سنتا رہا۔ ساری جوانی دیکھتی رہی ... مگر سمجھنے کے لیے بڑھاپے میں اپنی عمر کے مینار کی آٹھویں منزل تک چڑھنا پڑا۔ اُوپر سے جھانک کر نیچے ساری منزلوں کا بیک وقت جائزہ لینا پڑا۔ تب آشکار ہوا کہ اسلام کے اس روپ نے دو نسلوں تک دو خاندانوں کو بلاجواز بکھیرے رکھا اور ایک نوزائیدہ ملک کو دو ہونہار شہریوں کی افادیت سے محروم رکھا۔ کیونکہ اسوۂ حسنہ کے متعلق تنگ نظر من مانے اور ساکت و جامد تصورات میں یہ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ حُسنِ کردار کی وسعت تک پہنچ ہی نہیں پاتا تھا۔ بقول ظفر اقبال ؂

ہماری نسبت ہے خاک سے اور ثبوت یہ ہے
کہ آج زندہ ہی اس زمیں میں گڑے ہوئے ہیں

نیا پھوٹنے والا بیج جب پہلی دفعہ زیرِ سطح مٹی میں سے باہر جھانکتا ہے تو بیضوی شکل کے دو شکن آلود مُڑے تُڑے پتے بھی ساتھ لاتا ہے۔ یہ عام پتے نہیں ہوتے بلکہ ماں کے دودھ کی طرح اُس بیج کے لیے ان ابتدائی دنوں کی خوراک کا ذخیرہ ہوتے ہیں۔ جب بیج کی جسامت زیرِ زمین جڑوں میں ڈھل رہی ہوتی ہے اور اُوپر کیاری میں ایک جھینپتی ہوئی شرمیلی سی کونپل نئی فضا کی حیرت انگیز کشادگی دریافت کر رہی ہوتی ہے۔ اس ابتدائی پرکھ سے اطمینان کے بعد وہ نئے پتے اور نئی ٹہنیاں پھیلانے لگتی ہے تاکہ اسے دھوپ اور بادو باراں کی دنیا کا ادراک ہو سکے۔

میرا بچپن بھی زندگی کی اسی منزل میں اسلام کے مختلف رنگوں میں اسی انداز میں آشنا ہو رہا تھا۔ اُس وقت تو نئے پھوٹنے والے بیج کی طرح میں مٹی، ہوا اور دھوپ کے متعلق کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ نہ الفاظ، نہ معانی، نہ دلائل، نہ مذہب۔ مگر بڑے اپنے تبادلۂ خیالات میں مصروف رہتے اور اردگرد یا اوپر نیچے کے کھیل کود میں میرے کان اُن کی آوازیں اُچکتے رہتے۔ لہجے جذب کرتے رہتے اور آنکھیں تماشے دیکھتی رہتیں۔ ان سب کا حاصل ضرب یہ تھا کہ کچھ باتیں، کچھ فقرے، کوئی ردِ عمل، کوئی اظہارِ عقیدت یا کوئی اختلاف نہ معلوم میرے ذہن میں کہاں اور کن میخوں سے گاڑے جاتے کہ زندگی کے بہاؤ میں جیسے جیسے مشاہدوں کے نئے پتے نکلتے، تجربوں کی نئی ٹہنیاں پھیلتیں تو بچپن کی اُسی منزل کی انھی آوازوں کی ٹوٹی پھوٹی بے ربط گونج کے ٹکڑے ان میں سمانے لگتے۔ اس طرح دو نسلوں کی بصیرت یک جا ہوتی گئی اور دو میناروں پر چڑھتے چڑھتے ایک ہی اسلام کے کئی روپ میرے سامنے کھلتے گئے۔

مذکورہ بالا پہلے روپ سے تو میں ہوش سنبھالتے ہی آشنا ہو چکا تھا۔ جس کی جوئے کم آب میں چھوٹے پتھر بھی بڑی رکاوٹیں بن جاتے اور بچوں کے ''غیر اسلامی'' لباس بڑوں کے فکر و عمل کے گرد کوہِ ہمالیہ جیسا بلند پہاڑ بن جاتے۔ جو خونی رشتوں کی محبت سے لبریز ہواؤں کو بھی روک دیتا تھا۔ پھر جیسے جیسے دونوں میناروں کی اُوپر والی منازل میں چڑھتا گیا تو اس روپ کو مزید پھیلتے سکڑتے دیکھتا رہا۔ جس کی گیرائی تو گھٹتی بڑھتی رہتی۔ مگر گہرائی کہیں بھی نہ تھی۔ یہ ایک سطحی اور ظاہری روپ تھا جو مخصوص حلیے، رکوع و سجود، قرأت اور تسبیح و مناجات کی تلقین تو ہر دم کرتا تھا مگر اپنے کردار اور دوسروں کے درد کا ذکر کم کم ہی کرتا تھا۔ اس کا محدود محور اپنی اور صرف اپنی ذات کی بخشش کے گرد گھومتا تھا۔ رضائے دیگراں اور صلائے عام کے تصورات سے بالکل خالی تھا اور بقولِ غلام احمد پرویز یہ صرف عبادت ہی عبادت تھا۔ جو ''تقوے کے تکبر'' کی وجہ سے اتنا خود پسند تھا کہ خدا کی عبودیت کے دیگر تمام تقاضے فراموش کر دیتا تھا۔ مجھ پر بہت دھیرے دھیرے کھلا کہ یہ روپ قرآن

کریم کی ایسی آیات کے قریب بھی نہیں جاتا جن میں ''تتفکرون'' (تم غور کرو یا سوچو) جیسے الفاظ شامل ہوں۔ غالباً علامہ اقبال نے اسی روپ کا موازنہ اصل اسلام سے یوں کیا تھا ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

دوسرے روپ سے میں اب آشنا ہو رہا تھا۔ ہمارے گھر کے محلِ وقوع کی وجہ سے شاہ دولہ دربار کی مخصوص مخلوق اس علاقے میں گھومتی رہتی تھی، جن سے میں خوفزدہ بھی تھا اور حیرت زدہ بھی۔ خوف اس لیے کہ بہت چھوٹے سر کے نیچے پورا بھرپور انسانی جسم اور لکنت زدہ زبان میرے بچپن کو کہانیوں والے غیر متناسب بھوت پریت کی یاد دلاتے تھے اور حیرت اس لیے کہ ان کے متعلق گھر کے افراد کی چہ میگوئیوں سے میری خام حسیات کو پسینے آنے لگتے تھے کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ گھر میں اردگرد کی یا عزیزوں کی دو چار خواتین کی موجودگی میں اگر کوئی شاہ دولی نذرانہ لینے گھر میں آن گھستا تو میں خوف سے بھاگ کر کسی کمرے میں گھس جاتا یا کسی خاتون کی گود میں چھپ جاتا اور دوپٹے کے حصار میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا۔ لیکن خوف کے باوجود دوپٹے کی کسی درز میں سے اپنی حیران مگر ترچھی نیم نظریں اس کے چھوٹے سر اور بڑے چہرے سے نہ ہٹا سکتا اور مزید ڈرتا رہتا۔ وہ تو خواتین سے پیسے وغیرہ لے کر اور دو چار باتیں کر کے چلے جاتے۔ مگر میں خوف سے مارا اسی پناہ گاہ میں دبکا ہوا خواتین کی باتیں سننے لگتا جن کا واحد موضوع اب ایسی روحانی کرامات ہوتی تھیں جس کے نتیجے میں شاہ دولہ کے کرم سے ایسے بچے پیدا ہوتے تھے اور شاہ کی خاص بخشش سمجھے جاتے تھے۔ اس گفتگو میں اُن خواتین کے حوالے دیئے جاتے جن کے ساتھ یہ ہوا یا اُن کی جاننے والیوں کے ساتھ ہوا یا جنھوں نے خواب میں دیکھا کہ انھیں مزار پر منت ماننے کو کہا گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

غالب تاثر یہی بنتا تھا کہ بے اولاد عورتیں اگر مزار پر یہ منت مان لیں کہ اولاد ہونے کی صورت میں وہ پہلا بچہ مزار کے لیے وقف کر دیں گی تو ان کا پہلا بچہ اسی طرح چھوٹے سر اور لکنت والی زبان کے ساتھ پیدا ہوتا۔ اگر وہ خاتون اسے مزار کے حوالے کر دیتی تو بعد میں اُسی کے ہاں نارمل صحت مند اولاد پیدا ہونے لگتی۔ یہ ساری باتیں انتہائی یقین اور گہری عقیدت سے ہوتی تھیں۔ پھر پہاڑی پگڈنڈیوں کی طرح یہ موضوع اِدھر اُدھر سے منڈلاتا ہوا دیگر پیروں اور مزاروں کی مختلف اور روحانی کرامات کی آنسو بھری داستانوں میں گھومنے لگتا۔ میں مبہوت ہو کر یہ باتیں سنتا رہتا۔ قریباً

اسی دلچسپی سے جس سے رات کو بڑوں سے پریوں اور جنوں کی کہانیاں سنتا تھا۔ کیونکہ دونوں ہی مجھے تخیل کی یکساں سی اُڑان میں لے جاتی تھیں۔

پھر گود سے چھٹی ملتی تو میں بھاگ کر اپنے ہم عمر بچوں میں پہنچ جاتا اور انھیں یہ طلسماتی قصے سنا کر اپنی حیرت کا عجیب سا وزنی بوجھ ہلکا کرتا۔ بات چلتے چلتے گھر میں کھیلنے والے نسبتاً بڑے چچازادوں اور خالہ زادوں تک جا پہنچتی تو بعض اوقات وہ بھی اپنی معلومات جتانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگتے۔ مگر ان کی تشریح کا رنگ بالکل مختلف ہوتا تھا کہ مزار والے چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے ان کے سر پر لوہے کی ٹوپی پہنا کر انھیں قید کر دیتے ہیں۔ تاکہ دوسروں کی بے خبری میں ان کا سر چھوٹا رہے اور جسم بڑھتا رہے۔ پھر جوان ہونے پر انھیں آزاد کر دیا جاتا ہے۔ مزید خوف اور حیرت سے مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ کس کی بات پر یقین کروں۔ اس الجھن سے نجات کے لیے ایک دن یہی بات میں نے ایک بزرگ خاتون کو بتا دی تو وہ ہنس کر کہنے لگیں، ''انھیں کیا پتا... یہ کبھی ماں بنے ہوں تو انھیں پتا چلے۔ یہ تو صرف نذرانہ لینے والوں کو دیکھ کر کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔''

اصل حقیقت کیا تھی۔ یہ نہ مجھے تب پتا چلا نہ اب پتا ہے، مگر اپنی آئندہ زندگی میں جیسے جیسے اپنے اور وطن کے مینار پر چڑھتا گیا تو اسلام کے اس مخصوص روپ سے مزید آشنائی ہوتی رہی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ روپ مذہب کو روحانیت کا زینہ کہتا ہے لیکن روحانیت کا مسکن صرف پیروں اور مزاروں کو گردانتا ہے اور صالح اعمال یا خدمتِ خلق سے اتنا ہی لاتعلق تھا جتنا پہلا روپ تھا۔ اس طرح اس کی روحانیت کا دائرہ صرف پیری مریدی، مزار پرستی اور دربارِ عالیہ کی کرامات تک ہی محدود تھا۔

دونوں میناروں کی اُوپر والی منزلوں تک سفر کے دوران مجھے یہ محسوس ہوا کہ اسلام کے یہ دونوں روپ ان لوگوں سے تقویت حاصل کرتے تھے جن کے مالی، معاشرتی بلکہ سیاسی مفادات بھی ان سے سیراب ہوتے رہتے تھے اور قرآن کریم میں ''غور کرنے والوں'' کے لیے جو حکمت بھری مثالیں دی گئی ہیں یا سب کی ہدایت کے لیے ماضی میں تباہ ہونے والی اقوام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے ان پر غور کرنے کے لیے یہ دونوں گروپ آمادہ نہ تھے۔ خداوند تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی مثال [۲] دے کر یہ فرمایا ہے کہ یہ ایک مثال ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ خود قرآن مجید کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کتاب الحکیم ہے اور ''قرآنِ مبین'' ہے جو حکمت والی کتاب ہے اور چیزوں کو واضح کرتی ہے۔ چنانچہ اسی وضاحت کے لیے مکڑی کے جالے کی مثال [۳] دی گئی ہے۔ جھوٹے خداؤں اور مکھی کی مثال دی گئی ہے [۴] اور سوت کاتنے والی عورت کی مثال [۵] دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بار بار اہلِ ایمان کو غور و فکر کی ترغیب دی گئی ہے۔ نہ معلوم اتنی مثالوں اور غور و فکر کی دعوت کے باوجود یہ دونوں روپ اس

کتاب کی اصل حکمت سے کیوں اتنے لاعلم رہتے ہیں کہ علامہ اقبال کو احتجاج کرنا پڑا ؎

کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اِک روز
کتابِ صوفی و مُلا کی سادہ اوراق!

جو قرآن ہم پڑھتے ہیں اس میں تو یہ مثالیں اور دعوتِ فکر نمایاں ہیں۔ مگر ان کی الہامی کتاب کے یہ اوراق سادہ اور صاف کیوں ہیں؟ اس کی وجہ مجھے اُس وقت معلوم ہوئی جب ایک مدت بعد میں اپنے مینار کی ساتویں منزل میں داخل ہوا۔ اُس وقت تک میرا یہ احساس بھی راسخ ہو چکا تھا کہ کسی قوی ہیکل انسان کے دو سڈول بازوؤں کی طرح اسلام کے یہ دونوں روپ ہمارے معاشرے کو اپنے مضبوط کلاوے میں اس طرح لیے ہوئے ہیں جس طرح شاہ کے مزار والے بچوں کے سر کو لوہے کی ٹوپی میں جکڑ دیتے تھے تا کہ وہ نمو سے محروم ہو کر تا زندگی چھوٹا رہ جائے۔ اس طرح اس کلاوے میں جکڑے جانے کے بعد ہمارا فرد اپنی سوچ کی وسعت اور ذہن کی تازگی کھو چکا ہے اور بے ڈول جسم پر لکنت زدہ زبان کی طرح عقیدے کی اس لکیر کا فقیر بنے رہنے پر قانع ہے۔

اسلام کا تیسرا روپ وہ تھا جس سے میں اپنے مینار کی پہلی منزل میں بغیر کچھ سمجھے آشنا ہو رہا تھا۔ یہ آشنائی ہر روز صبح کے وقت گھر میں ہونے والی اس گفتگو سے ہوتی تھی جو ابا جان میرے بڑے بہن بھائیوں اور گھر کے دیگر افراد سے اس وقت کرتے جب وہ چہرے کا شیو (shave) بنانے بیٹھتے۔ ان دنوں سیفٹی ریزر (safety razor) اگر ایجاد ہو چکا تھا تو گجرات تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے اپنا شیو خود بنانے والے لوگوں کو قریباً گھنٹے بھر کا اہتمام کرنا پڑتا تھا جس میں پتھر کی وٹی اور چمڑے کی لمبی پٹی (strip) پر استرا تیز کرنا اور چہرے پر برش سے دیر تک جھاگ بنانا وغیرہ شامل تھا۔ اس دھیمی کارروائی کے دوران ابا جان مختلف دنوں میں مختلف بچوں کو پاس بٹھا کر انھیں ہم نصابی تعلیم بھی دیتے رہتے۔ ہفتے کے بعض دنوں میں بڑی بہنیں شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان پڑھتی تھیں یا بعض دنوں میں بڑے بھائی علامہ اقبال کی بانگ درا پڑھتے تھے یا قرآنِ مجید کا پہلا پارہ معنی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اسی طرح وہ بعض دفعہ گھر کے دیگر افراد کو شاہ دولہ دربار کے حوالے سے سمجھاتے رہتے تھے کہ قبروں اور مزاروں پر صرف فاتحہ خوانی کے لیے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر کسی قسم کی منت ماننے سے یا دلی مرادوں کے لیے دعا کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ایسی دعائیں صرف خدا سے مانگنی چاہییں۔ اس ضمن میں وہ خدا کی عبادت، مزار پرستی، پیری مریدی اور شرک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔ قرآن کریم کے حوالے دیتے اور علامہ اقبال کے اشعار سے اپنی بات کی تائید و تصدیق کرتے رہتے۔ بہت چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں اس روزانہ غیر رسمی درس میں شامل

نہ ہوتا تھا، مگر قرب و جوار میں موجودگی کی وجہ سے بہت کچھ سن لیا کرتا تھا۔ بغیر سمجھے یا بلا سوچے۔ پھر آئندہ زندگی میں میرے مطالعے میں کبھی کبھار ان کی باتوں کی گونج بھی شامل ہوتی رہی، تو اپنے مینار پر چڑھتے چڑھتے میں اسلام کے اس روپ کو دھیرے دھیرے سمجھنے لگا جو ابا جان بتایا کرتے تھے۔

بالکل اسی انداز میں اسلام کا چوتھا روپ بڑے تایا جان کی باتوں سے مجھ پر وقت کے ساتھ آشکار ہوا۔ پہلے محض ایک تماشا... ان بڑوں کی بحث کا جو تایا جان کے پاس آنے والوں میں ہوتی رہتی تھی۔ پھر میری بڑھتی ہوئی عمر، مطالعے اور مشاہدے کے ساتھ کسی اکا دُکا فقرے کی گونج... مزید وقت کے بعد اس فقرے کے معنی در معنی... پھر بصیرت کی اُٹھان کے ساتھ ان معانی کی اصل روح... اس طرح اس روپ کو سمجھنے میں سب سے زیادہ وقت لگا۔

میرے مینار کی اس پہلی منزل میں حالاتِ حاضرہ کا سب سے گرم موضوع علامہ مشرقی کے پمفلٹ تھے (مولوی کے غلط مذہب کے متعلق)۔ اس لیے جب کبھی گلی کوچوں میں کسی ایسے پمفلٹ کی فروخت کی آواز لگتی تو تایا جان اس کی بہت سی کاپیاں خرید کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنا بیشتر وقت قرآن اور اس کے انگریزی ترجمے کے مطالعے میں گزارتے اور زندگی کے ہر موضوع پر علیحدہ علیحدہ فہرستیں بنا لیتے جن میں قرآن کی متعلقہ آیات کے حوالے درج ہوتے، تا کہ اس موضوع پر قرآن میں جہاں کہیں بھی جو کچھ کہا گیا ہے اس کا اندازہ اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہو جائے۔ چنانچہ جس کسی سے جس موضوع پر بھی بحث ہوتی اُسے جاتے وقت اس موضوع سے متعلق فہرست دے دیتے اور ساتھ مولوی کے غلط مذہب کا پمفلٹ بھی کہ جب فرصت ملے تو اطمینان سے ان پر نظر ڈال لینا اور پھر اکیلے بیٹھ کر خود ہی سوچتے رہنا۔ جیسے جیسے میں اپنے مینار پر چڑھتا گیا ان بحثوں کے دوران سُنے ہوئے اکا دُکا بے ربط فقروں کی گونج بڑھتی گئی۔ جس سے میری اپنی سوچوں میں ایک تسلسل اور ربط بڑھتا گیا اور واضح ہوتا گیا کہ تایا جان کی باتوں کی سمت کیا تھی یا ان کا لبِ لباب کیا تھا۔ وہ دراصل مذہب کو ایک فرد کی آنکھ سے دیکھتے تھے جس نے اپنی قبر میں اکیلے جانا ہے۔ روزِ قیامت اکیلے ہی اپنی جواب دہی کرنی ہے۔ اُس دم اُس کی مدد یا پیروی کے لیے وہ مولوی، پیر یا مرشد نہیں ہو گا جس کی درست یا غلط ہدایات پر وہ عمل کرتا رہا ہے۔ چنانچہ مناسب یہی ہے کہ اس وقت وہ صرف اپنی غلطیوں کی سزا خود بھگتے اور دوسروں کی غلط فہمی یا غلط بیانی کی سزا نہ بھگتے۔ اسی لیے وہ اجتہاد کا حق بھی ہر فرد کو ہی دیتے تھے کہ ترجمے کے ساتھ قرآن خود پڑھ کر غور و فکر کرے اور پوری نیک نیتی سے اس پر عمل کرے۔ اگر بالفرض وہ غلط بھی سمجھا ہے تو خدا اُس کے فہم کی بجائے اس کی نیت کو پرکھے گا ؎

جس کا عمل ہے بے غرض
اُس کی جزا کچھ اور ہے (اقبال)

وہ ہر معاملے میں فرد کی اپنی سوچ اور نیت پر زور دیتے تھے اور اسی سوچ کے فقدان کو مسلمانوں کے زوال کی وجہ قرار دیتے تھے۔ بقول اقبال

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے گرد و پیش میں جھانکتے ہوئے مجھے تایا جان کے اکا دُکا جملے یاد آتے رہے۔ کیونکہ مینار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اور اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں یہ بھی دیکھتا رہا تھا کہ مُلّا اور ملوکیت کے منفی گٹھ جوڑ سے مسلمانوں کے ساتھ کئی شعبدہ بازیاں ہوتی رہی ہیں جن کے نتیجے میں ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

اس طرح جھانکنے کے دوران مجھ پر کھلا کہ میرے مینار کی پہلی دو چار منزلوں میں اسلام کے یہ چاروں روپ قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح ایک دوسرے سے مختلف تو یقیناً تھے مگر آپس میں متحارب نہ تھے، بلکہ باہمی یگانگت سے اتنے پُرامن انداز میں رواں دواں تھے جیسے سمندر کی وحدت میں گرم اور سرد رویں اور لہریں اکٹھی بہتی رہتی ہیں۔ لیکن بعدازاں جب وطن کا مینار کچھ بلندی پر پہنچا تو ریاستی سرپرستی میں پہلے اور دوسرے روپ کی جارحانہ یلغار سے تیسرا اور چوتھا روپ پسپائی اختیار کرتے گئے۔

اس غیرمتوازن صورتِ حال سے اسلام کا پانچواں بندوق بردار روپ بڑے غیظ و غضب سے برآمد ہوا اور اسلام کے نام پر ہی مسجدوں میں سجدہ ریز نمازیوں کو گولیوں سے چھلنی کرنے لگا۔ اس کا صحیح تناظر تو وطن کے مینار میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں صرف روپ شماری کے لیے اس کا ذکر ناگزیر ہے... اور اس واقعے کا بھی جو مجھے اپنے مینار کی ساتویں منزل میں پیش آیا اور کتاب، صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی کی وجہ بتا گیا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں ایک باریش عالم ٹی وی کے کسی چینل پر اسلام کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ (اگر میری یادداشت غلطی نہیں کر رہی تو غالباً ان کا نام مولانا غلام مرتضیٰ ملک تھا)۔ ان کی باتیں سن کر میرا تاثر یہ تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے اور سوچنے والے فرد ہیں اور اپنے

مذہبی خیالات کو مندرجہ بالا پانچ اشکال میں سے کسی ایک روپ تک محدود نہیں رکھتے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پاکستان میں تعلیمی ترقی کے موضوع پر ایک سیمینار میں دیگر ماہرین کے ساتھ ہم دونوں بھی مدعو تھے۔ مجھے تعلیمی شعبے میں بیرونی امداد پر روشنی ڈالنا تھی اور انھیں مذہبی تعلیم کے متعلق کچھ کہنا تھا۔ خوش قسمتی سے سیمینار میں مختلف تقاریر اور اضافی بحث کا رُخ کھری کھری باتوں کی طرف مڑ گیا۔ مثلاً میں نے تعلیم کے معاملے میں حکومتوں کی دانستہ بیخ کنی کا برملا ذکر کیا۔ میرا استدلال یہ تھا کہ ایشیا کے دوسرے ممالک نے تعلیم کے لیے بیرونی اداروں سے بہت تھوڑے قرضے لیے اور ان کے صحیح استعمال سے بڑی تعلیمی ترقی کی، مگر ہمارے ملک نے تعلیم کے نام پر بہت زیادہ قرضے لیے، مگر تقریباً سبھی حکومتیں ان کے غلط استعمال اور بددیانتی سے اپنے حواریوں کے پیٹ بھرتی رہیں اور تعلیم مجموعی طور پر روبہ زوال ہی رہی۔ دوسرے ماہرین نے بھی اپنے اپنے موضوع پر بہت صاف گوئی سے کام لیا۔ جب ملک صاحب کی باری آئی تو وہ کہنے لگے کہ رنگِ محفل نے مجھے اُکسا دیا ہے کہ میں وہ تقریر نہ کروں جو میرے ذہن میں تھی، بلکہ جو کچھ یہاں کہا گیا ہے اسی کے رنگ میں کچھ فی البدیہہ گوش گزار کر دوں۔ جو دراصل میری اپنی زندگی کی کہانی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میں بچپن سے ہی مدرسوں کی تعلیم کا پروردہ ہوں اور یہ اعتراف بلکہ انکشاف کرنا چاہتا ہوں کہ میرے علم میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں جہاں قرآن کریم شروع سے آخر تک مکمل کتاب کی شکل میں پڑھایا جاتا ہو۔ یہی حال حدیث شریف کا بھی ہے اور اسلامی تاریخ تو کہیں بھی پڑھائی نہیں جاتی۔ ان دینی مدارس کا طریقۂ تعلیم یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے صرف وہ حصے پڑھاتے ہیں جو ان کے اپنے دینی مسلک یا مذہبی فرقے سے مطابقت رکھتے ہوں۔ ساتھ ساتھ طلبا کو مختلف طریقوں سے مسلسل یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اصل اسلام یہی ہے۔ جو کوئی اس پر ایمان نہیں رکھتا وہ عمومی طور پر تو کافر ہے اور بعض حالات میں واجب القتل ہو جاتا ہے۔ مدارس کی تعلیم کے متعلق انھوں نے اسی قسم کی مزید باتیں بھی بتائیں جو ہم سب کے لیے نئی اور حیران کن تھیں۔

ملک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اپنا شعور پختہ ہونے پر انھوں نے یہ طریقِ تعلیم دانستہ رد کر دیا اور نسبتاً بڑی عمر میں سرکاری اسکول کی چھوٹی جماعت میں داخل ہو کر اپنی تعلیم یونیورسٹی کی سطح تک مکمل کر لی اور آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ (Audit and Account) کے شعبے میں ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن ملازمت کے ساتھ ساتھ بچپن کی دینی تعلیم کی بنیاد پر قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ میں اپنا مطالعہ بڑے کھلے ذہن کے ساتھ جاری رکھا اور آج وہ جو کچھ بھی ہیں اس ذاتی مطالعے اور اپنی ذاتی سوچ کی وجہ سے ہیں۔

ان کی تقریر کے بعد سوال و جواب شروع ہوئے تو کسی نے پوچھا کہ جو چشم کشا حقائق آپ نے اس محفل کے محدود سے سامعین کو بتائے ہیں وہ آپ تحریر میں لا کر پوری قوم کو کیوں نہیں بتاتے؟

ملک صاحب ہنس کر کہنے لگے، ''بتا تو سکتا ہوں۔ مگر پھر کچھ اور بتانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ کیونکہ پھر آپ مجھے زندہ نہیں دیکھیں گے۔''

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دراصل یہ کام حکومتوں کا ہے۔ (جو اب تک کم و بیش تیس تعلیمی پالیسیاں بنا چکی ہیں) کہ ان کا جائزہ لے کر اس صورتِ حال کا مداوا کریں۔ مگر بدقسمتی سے ہماری تمام حکومتیں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اس صورتِ حال کو مزید ہوا دیتی ہیں، تاکہ وہ قوم کو جاہل رکھ کر اور تقسیم کر کے اپنے اقتدار کو دوام دے سکیں۔

سیمینار ختم ہو گیا۔ مگر ہمارے وطن کی تاریخ کی وہ لہر ختم نہ ہوئی جو جنرل ضیاء الحق دو تین دہائیاں پہلے گناہ و ثواب کے سونامی جیسے ریلے کی طرح اُٹھا چکے تھے اور مدرسوں کو بڑی بڑی زمینیں، مالی نوازشات، گرانٹس (grants) اور دیگر مراعات کا طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مختلف مسلم ممالک سے بیرونی امداد ان کے علاوہ تھی۔

دن گزرے... ہفتے اور مہینے طلوع اور غروب ہوئے۔ بلکہ شاید چند برس بھی بیت گئے۔ ایک شام میں نے دیوار پہ لگا بٹن دبایا۔ ٹیلی ویژن چونک کر بولا تو بریکنگ نیوز (breaking news) یہی تھی کہ مولانا غلام مرتضیٰ ملک پر نامعلوم افراد نے کئی گولیاں چلا کر انھیں شہید کر دیا ہے۔

میں اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے جھانک کر اس منظر کو دوبارہ دیکھتا ہوں۔ تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسلام کے پانچویں روپ کی اُٹھان کا زمانہ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور واقعہ بھی اسی اٹھان میں اٹکا ہوا نظر آتا ہے۔

اسلام آباد کی ضلع کچہری میں ایک باریش بزرگ صورت اسٹامپ فروش سے میں عدالتی کاغذ خرید رہا تھا۔ جب وہ اپنے کاغذات میں اندراج کر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار پر ایک فل سکیپ (foolscap) کاغذ کے اوپر والے نصف حصے میں جلی قلم سے لکھا ہوا ایک نوٹس آویزاں تھا جس کا نمایاں عنوان ''توجہ فرمائیں'' ایک حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ نوٹس کا متن کچھ اس قسم کا تھا کہ فجر کی نماز ادا نہ کرنے سے اتنے گناہوں کا عذاب ہوتا ہے۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کے لیے گناہوں کی تعداد میں بتدریج اضافے کی تنبیہ تھی۔ اسٹامپ پیپر کی قیمت کی ادائیگی کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ اس نوٹس والے صفحے کا نچلا حصہ خالی ہے اور آپ عدالت کے زیرِ سایہ کچہری کے احاطے میں بیٹھے ہیں۔ کیوں نہ اس خالی حصے پر نوٹس کا حصہ بناتے ہوئے یہ

لکھ دیا جائے کہ تمام نمازیں ادا کرنے کے باوجود اگر کوئی عدالت میں حلف اُٹھا کر جھوٹی شہادت دیتا ہے تو اسے اتنے گناہوں کا عذاب ہوتا ہے۔ میری بات سن کر انھوں نے برا سا منہ بنایا اور مجھے اتنی خشمگیں نظروں سے گھورا جیسے میں کوئی کلمۂ کفر کہہ رہا تھا یا دین میں غلط قسم کی مداخلت کر رہا تھا۔ ان کی شعلہ بار آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمت ہی نہ پڑی کہ میں اگلا سوال پوچھ سکوں کہ آپ ایک گناہ یا نیکی کا پیمانہ یا یونٹ (unit) مقرر کیسے کرتے ہیں؟

ایسے سوال یا اظہار پر غصے کا اُبال اور ایمان کی برہمی اسلام کا چھٹا روپ تھا۔ جس سے مجھے اپنے اور وطن کے مینار پر چڑھنے کے دوران کئی مرتبہ سامنا ہو چکا تھا اور ایسی متعدد مثالیں ان دونوں میناروں میں پتنگوں کی طرح اُڑتی نظر تو آتی تھیں۔ مگر قابلِ ذکر الفاظ میں ڈھل نہیں سکتی تھیں۔

میری نظریں اب اپنے مینار کی دوسری منزلوں میں بھٹکنے لگتی ہیں اور وہاں جا اٹکتی ہیں جہاں انٹرنیٹ (internet) کا زمانہ کمپیوٹر پر راج کرنے لگا۔ جس کے ذریعے دنیا کے کونوں کھدروں سے بھی ہم پر تاک جھانک ہونے لگی تھی۔ وہاں مجھے اسلام کا ساتواں روپ نظر آ رہا تھا۔ جس پر عرصہ پہلے حیدر علی آتش نے یوں روشنی ڈالی تھی ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

بظاہر تو ایسے شیشے چند برس پہلے ایجاد ہوئے ہیں، جن کے ایک طرف آئینہ سازی سے آپ اندر سے باہر تو دیکھ سکتے ہیں مگر باہر سے اندر نہیں دیکھ سکتے۔ مگر یوں لگتا ہے کہ مسلم اُمہ صدیوں سے ان شیشوں سے ملتی جلتی ذہنی کیفیت میں ایسے عجب انداز میں جکڑی ہوئی ہے کہ اسے اپنے بارے میں وہ کچھ نظر نہیں آتا (بلکہ محسوس بھی نہیں ہوتا) جو دوسروں پر روزِ روشن کی طرح عیاں رہتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ زبانِ خلق کے معاملے میں ہم ''سن تو سہی'' پر آمادہ ہی نہیں ہیں کیونکہ ہمیں ملائیت کی اس خود فریبی نے جکڑ رکھا ہے کہ ہم خدا کی بہترین اُمت ہیں۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ قرآن اور حدیث میں اس ضمن میں جو ارشادات ہیں وہ اُس اُمت کے بارے میں ہیں، جس کی تشکیل و ترتیب خود نبیٔ کریم ﷺ نے کی تھی۔ جس میں اس قسم کے ۷۰ سے زیادہ فرقے نہیں تھے جو ایک دوسرے کو کافر یا واجب القتل قرار دیتے ہوں، بلکہ کوئی بھی فرقہ نہ تھا اسی لیے ان ارشادات کا اطلاق آج کی اُمتِ مسلمہ پر نہیں ہو سکتا۔ جس کے حکمرانوں کی اکثریت اپنے ہی عوام کی خداداد صلاحیتوں کا اس طرح قتلِ عام کرتی رہتی ہے کہ وہ رُوئے زمین پر اپنے آپ کو خدا کا خلیفہ ثابت کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔[6] اور نہ ہی وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی

رحمت کے ایک حصے سے نوازا ہے۔[۷]

اپنے ہی برِ عظیم سے صرف دو مثالیں... جہاں مسلم اور غیر مسلم اقوام اپنی صدیوں کی سنگت کی وجہ سے ایک دوسرے کے ظاہر و باطن کو خوب سمجھتی ہیں۔ پہلی مثال ہندوستان کے پنڈت شنکر دیال شرما[۸] کے چند اشعار ہیں۔ جو دو نظموں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ پہلی کا عنوان ہے ''یہ آپ نے کیا کر دیا'' اور یہ ہماری دینی کتاب قرآن مجید کے متعلق ہے۔ جس کے بارے میں ہم دنیا بھر کو بتاتے ہیں کہ یہ کتاب الحکمت اور قرآنِ مبین ہے:

عمل کی کتاب تھی!
دعا کی کتاب بنا دیا
سمجھنے کی کتاب تھی
پڑھنے کی کتاب بنا دیا
زندوں کا دستور تھا
مُردوں کا منشور بنا دیا
جو علم کی کتاب تھی!
اُسے لاعلموں کے ہاتھ تھما دیا
تسخیرِ کائنات کا درس لائی تھی
صرف مدرسوں کا نصاب بنا دیا
مردہ قومیں زندہ کرنے آئی تھی
مردوں کو بخشوانے پر لگا دیا
اے مسلمانو! یہ تم نے کیا کیا

دوسری نظم کا عنوان ہے ''کفر اور اسلام کیسا؟'' چند اشعار ہیں:

ایک ہی پربھو کی پوجا ہم اگر کرتے نہیں
ایک ہی درگاہ پر سر آپ بھی دھرتے نہیں
ہم اگر دیوی کے استھانوں پہ ہیں سجدہ گزار
آپ کے سجدوں کے مرکز بھی ہیں پیروں کے مزار
جتنے کنکر، اتنے شنکر، یہ اگر مشہور ہے
اتنی ہی قبروں پہ سجدے آپ کا دستور ہے

اپنے دیوی دیوتاؤں کو ہے گر کچھ اختیار
آپ کے ولیوں کی طاقت کا نہیں ہے کچھ شمار
جس طرح سے ہم بجاتے مندروں میں گھنٹیاں
آپ کو دیکھا مزاروں پر بجاتے تالیاں!!
ہم بھجن گا کر سنائیں دیوتا کی خوبیاں
آپ بھی قبروں پہ گائیں جھوم کر قوالیاں
ہم چڑھاتے ہیں بتوں پر دودھ اور پانی کی دھار
ہے مزاروں پر چڑھاوا، مرغ و چادر شاندار
تم بھی مشرک ہم بھی مشرک، معاملہ جب صاف ہے
جنتی تم، دوزخی ہم، یہ کوئی انصاف ہے؟

دوسری مثال بنگلہ دیش سے ہے... سال ۲۰۰۱ء ... افغانستان پر امریکہ کی وحشیانہ بمباری کا آغاز (غالباً تورا بورا پر)... انگلستان کے ہسپتال میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا میں سامنے ٹی وی پر اس بربریت کے دل خراش مناظر دیکھ رہا ہوں... کمرے کا دروازہ کھلتا ہے تو ایک سینئر ڈاکٹر اپنے جونیئر ڈاکٹروں اور نرسوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں۔ سوال و جواب، زخموں کا معائنہ، سرہانے لٹکے چارٹ اور مشین کی اسکرین کا جائزہ اور آخر میں مروّت کا سوال، ''آپ کیا ہندوستان سے ہیں؟''

''جی نہیں!'' میں بڑی وضاحت سے جواب دیتا ہوں۔ ''میں پاکستان سے ہوں۔ آپ کیا انڈیا سے ہیں؟''

وہ میری بات کا جواب نہیں دیتا اور اپنے ماتحت عملے سے پوچھتا ہے، ''یہ کیا آخری مریض ہے؟'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہیں۔ تو سینئر ڈاکٹر انھیں روانہ کر دیتا ہے اور خود ٹھہر جاتا ہے۔ ''میں بنگلہ دیش سے ہوں۔'' وہ اب اپنا تعارف کراتا ہے۔ ''پچیس برس پہلے یہاں میڈیکل اسٹوڈنٹ کے طور پر آیا تھا۔ پھر یہیں کا ہو رہا۔''

باتیں شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ تبلیغی جماعت کے رکن ہیں اور رائے ونڈ کے علاوہ پاکستان کے دیگر شہروں میں بھی کبھی کبھار ان کے سالانہ دُعائیہ اجتماع میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ گفتگو آگے چلتی ہے تو میں وہ سوال پوچھے بغیر رہ نہیں سکتا جو میں اس جماعت کے اکثر لوگوں سے پوچھتا رہتا ہوں۔ مگر کسی شافی جواب سے ابھی تک محروم ہوں۔

''سنا ہے ڈھاکہ میں جو اجتماع چند برس پہلے ہوا تھا۔ وہ حج کے اجتماع سے دوسرے نمبر پر آتا تھا۔ تو آپ ایسے گراں قدر مواقع سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے کہ مسلمانوں کو تعلیم کے فوائد بتائیں اور اس طرف ایک فرض کی طرح راغب کریں۔''

میں حیرت سے ان کا پُراعتماد جواب سنتا ہوں۔ ''ہمیں تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اور ان کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ کوٹ پتلون، نکٹائی، کلین شیو، اندازِ گفتگو، چال ڈھال، خود اعتمادی، ایک ایسا روشن خیال پیکر جو بظاہر پچیس برس میں انگلستان کی سوسائٹی سے ذہنی طور پر مستفید ہو چکا ہے، مگر اس جواب نے چغلی کھائی کہ انگلستان ان کے لیے اور وہ انگلستان کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔

میں بے اختیار بول اُٹھتا ہوں، ''ہمیں تعلیم کی ضرورت کیسے نہیں ہے؟''

''اس لیے...'' وہ پہلے سے زیادہ اعتماد سے کہتے ہیں کہ ''خدا ہمارے ساتھ ہے''

''ہمیں کیسے یقین آئے کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ جب عرصۂ دراز سے مغربی قومیں مسلم اُمہ کی درگت بنا رہی ہیں اور ہمارے وسائل پر صدیوں سے قابض ہیں۔''

میں ٹی وی کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ ''آپ کے خیال میں کیا یہ ثبوت کافی نہیں؟'' ایک ہوائی جہاز نے بڑی بلندی سے فائر کیا۔ تو دھوئیں کی کئی متوازی دھاریں مجسّم عذاب بنی نیچے پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اُڑانے لگتی ہیں۔

وہ لاپروائی سے کندھے اُچکاتے ہیں۔ ''یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ہمیں بہترین اُمت کی بشارت دی گئی ہے۔''

میں سکتے میں آ جاتا ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں میں قائل ہو کر چپ ہو گیا ہوں۔ وہ بڑی خوش دلی سے ہاتھ ملا کر چل دیتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کے قدموں کی چاپ مدھم ہو رہی ہے ویسے ویسے میرے مینار کی ساتویں منزل لرزتی جاتی ہے اور اُس میں شدت آتی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔

چند روز بعد مجھے ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ طبیعت سنبھلی تو ایک نئی کتاب خریدی۔ جو انھی دنوں لندن میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے انتہائی مختصر دیباچے کا مکمل ترجمہ درج ذیل ہے:

اس کتاب کے پروف تیار ہو رہے تھے جب ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں دہشت گردی کے حملے ہوئے۔[9] اس لیے اس کتاب میں ان کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ ویسے بھی اس کتاب کا موضوع یہ نہیں ہے کہ وہ حملے کیسے ہوئے اور ان کے بعد کیا ہوا۔ بلکہ اس کا موضوع یہ ہے کہ ایک وسیع تناظر میں ان حملوں سے پہلے کیا ہوتا رہا، یعنی وہ فکری پیش رفت، حالات، نظریات اور رویّوں کا طویل سلسلہ جس نے بالآخر کچھ حد تک ان حملوں کو جنم دیا۔

مسلمانوں، عربوں اور مشرق وسطیٰ کے متعلق نصف درجن کتابیں لکھنے والے ایک مشہور یہودی مصنف بیرنارڈ لوئیس (Bernard Lewis) کی اس کتاب کا عنوان ہے:

What Went Wrong ...

یہودی ہونے کے باوجود مصنف رطب اللسان ہے کہ شروع کے قریباً ایک ہزار برس تک اسلام نے کئی براعظموں پر مشتمل ایک ایسی عالمی تہذیب قائم کی جس کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اُس زمانے میں اسلام ایک عظیم عسکری قوت اور اتنی ہی عظیم معاشی ایمپائر (Empire) تھا جس نے انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ آرٹ اور سائنس کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ شرقِ اوسط کی پرانی روایات کے ساتھ ساتھ یونان اور فارس کے علمی خزانوں کو بھی کھنگالا اور پھر اپنے تجرباتی رویّوں اور ایجادوں سے ان میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ان کی عربی تصانیف سے نہ صرف یورپ تب فیض یاب ہوتا رہا بلکہ ان بنیادوں پر اپنی موجودہ ترقی کا محل بھی کھڑا کر لیا۔ (ص: ٦ اور ٧)

مسلمانوں کی اتنی عالمگیر بلندی کے بعد موجودہ عالمگیر پستی کی وجوہات کا مصنف نے کئی زاویوں سے تجزیہ کیا ہے۔ جن سے ہم اتفاق بھی کرتے ہیں اور اختلاف بھی۔ لیکن ان کا یہ مشاہدہ بالکل درست ہے کہ اپنے عروج کے زمانے میں مسلمانوں کی روز افزوں خود اعتمادی کا نقصان یہ ہوا کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ یورپ کے مذہبی انقلاب (reformation) اور علمی انقلاب (renaissance) کو نظر انداز کرتے رہے۔ حالانکہ یورپ کے بعض ممالک میں تعینات سلطنتِ عثمانیہ کے بعض سفیر خلیفۂ وقت کی توجہ اس طرف دلاتے رہے۔

اس طرح براہِ راست تو نہیں مگر بالواسطہ انداز میں مصنف نے مسلمانوں کے زوال کی متعدد وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی شناخت کی ہے کہ مسلمان ہر دم اپنے آپ کو خدا کی بہترین اُمت سمجھتے ہیں اور دوسروں کی خوبیاں بھی ان کی نظر میں نہیں جچ سکتیں۔ اس لیے وہ ان خوبیوں کو اپنانے کی کوشش نہیں کرتے۔

مقامِ عبرت یہ ہے کہ اتنے طویل عروج کے بعد ایسے حیران کن زوال میں گر کر بھی ہم ایسی کتابیں خود نہیں لکھتے بلکہ ہمارے بارے میں غیر لکھتے رہتے ہیں اور اگر مسلمانوں میں کبھی ایسی آواز اُٹھ جائے کہ موجودہ امتِ مسلمہ خدا کی بہترین مخلوق کہلانے کی حقدار نہیں ہے تو اسلام خطرے میں آ جاتا ہے۔ میرے مینار کا عظیم المیہ یہ ہے کہ پہلی منزل سے آٹھویں منزل تک کے سفر کے دوران ہر وقت اسلام کے خطرے میں ہونے کی فریاد بلند ہوتی رہی۔ غالباً اسی لیے اقبال نے کہا تھا کہ ؏

اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

میرے مینار کی آٹھویں منزل سے دیکھیں تو اسلام کو محبوس کرنے والے یہی مختلف سات روپ (اور کئی ان جیسے دیگر روپ) ہیں اور اسلام کو سب سے زیادہ خطرہ انھی کی عدم برداشت اور باہمی تعصب سے ہے۔ بیگانوں کی نسبت اپنوں کا خطرہ کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

یہ تیسرا تماشا جو میں اپنے مینار کی ساری منزلوں میں اوپر چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا ہوں۔ اب وطن کے مینار کی اوپر والی منزلوں میں ایسا تماشا بن گیا ہے جس میں بقول غالب ''ساری قوم کے پرزے اُڑ رہے ہیں۔''

حواشی

۱۔ ان فسادات کا محرک عقیدہ نہیں تھا، بلکہ سیاسی شعبدہ بازی تھی اور یہ دیرپا اثرات کے بغیر ایک مرغولے کی طرح گزر گئے۔

۲۔ سورۂ النحل، آیت ۹۔

۳۔ سورۂ العنکبوت، آیات ۱، ۲۔

۴۔ سورۂ الفتح آیت ۹۲۔

۵۔ سورۂ النحل، آیت ۹۲۔

۶۔ سورۂ البقرہ، آیت ۳۰۔

۷۔ سورۂ الحجر، آیت ۲۹۔

۸۔ ماضی میں پنڈت شنکر دیال شرما ہندوستان کے صدر تھے۔

۹۔ اُس روز نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر بلڈنگ (World Trade Centre Building) سے دو جہاز اور واشنگٹن میں وزارتِ دفاع کی بلڈنگ سے ایک جہاز دانستہ ٹکرا گئے۔ چوتھا جہاز گرا لیا گیا۔ اس طرح کم و بیش تین ہزار لوگ مارے گئے۔

وطن کا مینار

طلوع

۲۳ر ۲۴ر مارچ ۱۹۴۰ء کو وطن کے مینار کی بنیاد لاہور کی سرزمین پر ظاہر ہونے لگی۔

کسی بھی عمارت کی بنیاد کے لیے پہلے کھدائی کی جاتی ہے پھر اس میں بھرائی کی جاتی ہے۔ مگر ہمارے وطن کے مینار کی بنیاد اس سے مختلف تھی۔ اس کے لیے زمین کو کھودا نہیں گیا بلکہ یہ زمین کے اندر کی طرف سے اُگ کر باہر نمودار ہونے لگی۔

ماڈرن سائنس کا انکشاف ہے کہ اپنے اندرونی اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے زمین کی tectonic plates انتہائی سست رفتاری سے مگر بڑی شدت سے آپس میں ٹکرانے لگتی ہیں تو صدیوں تک ان پلیٹوں کے باہمی ٹکراؤ، دباؤ اور توانائی کی وجہ سے ان کے ٹکرانے والے کنارے ذرا ذرا اوپر اُٹھنے لگتے ہیں۔ جن سے ان کی اُوپر والی مٹی بھی اوپر کی طرف اُٹھنے لگتی ہے اور بالآخر ہمیں رُوئے زمین پر وہ اُونچائیاں نظر آنے لگتی ہیں جنھیں ہم پہاڑ کہتے ہیں۔

ہمارے وطن کے مینار کی بنیاد ہی مختلف قسم کی tectonic plates کی وجہ سے ظہور میں آئی۔ یہ پلیٹیں ارضی مادّے سے نہیں بنیں، بلکہ کئی تہذیبوں کی باہمی طاقت، دباؤ اور ٹکراؤ سے بنی ہیں، جن کی وجہ سے قومیت کا اُبھار تشکیل پانے لگا اور لاہور کی سرزمین پر ان کی پہلی جھلک وطن کے مینار کی بنیاد بن کر ظاہر ہونے لگی۔

یہ ایک طویل اور پیچیدہ ارتقائی عمل ہے۔

کرۂ ارض کسی سیب یا ناشپاتی کی طرح یک جان نہیں ہے، بلکہ ایک پیاز کی طرح ہے۔ ایک پرت کے اُوپر دوسرا پرت لپٹا ہوا۔ تعداد میں بہت کم۔ مگر انداز وہی کہ باہر والے ہر خول نے اندر والے کو اپنے مضبوط کلاوے میں لیا ہوا ہے۔ یعنی اندر ایک ٹھوس مرکز، اس کے گرد پہلا نیم رقیق پرت، اس پر اگلا کافی گاڑھا مگر نیم ٹھوس خول اور سب سے اُوپر وہ ٹھوس اور مضبوط خول جس پر قدرت کے نظارے بکھرے پڑے ہیں اور ہماری بود و باش ہے۔

مادّے، مائعات اور گیس جیسے اجزائے ترکیبی کے مختلف تناسب نے ان تمام خولوں کو مختلف اوصاف دیے ہیں۔ چنانچہ باہمی کلاووں کے دباؤ سے پیدا ہونے والی حرارت ان سب پر مختلف انداز میں اثرانداز ہوتی ہے۔ کسی خول کے کچھ اجزا حرارت سے پگھل جاتے ہیں۔ کچھ اجزا سخت ہو

جاتے ہیں اور کچھ بُھر بُھرے ہو کر کیمیائی عمل سے اپنی صورت اور سیرت بدلتے رہتے ہیں، جن سے معدنیات، آگ اور پتھر وغیرہ بن جاتے ہیں اور زلزلوں کے ساتھ آتش فشاں دہانوں سے آتشیں لاوا کے فوارے بن باہر اُبل پڑتے ہیں۔ جیسے دوزخ ابکائیاں کر رہی ہو۔

اسی پیچیدہ عمل کے طویل دورانیے میں وہ tectonic plates بن چکی ہیں۔ ان کی سخت اور مضبوط چھاتی پر سمندر اور خشک براعظم ٹکے ہوئے ہیں۔ کئی کئی صدیوں میں انتہائی سست رفتار دھیمی دھیمی جنبش کے دوران یہ پلیٹیں آپس میں جہاں جہاں ٹکراتی ہیں وہاں ان کی باہمی قوت اور دباؤ سے ان کے کنارے اُوپر کو اُٹھ جاتے ہیں اور زمین کی سطح پر سلوٹ پڑ جانے سے پہاڑ نمودار ہو جاتے ہیں۔

ہمارے وطن کا مینار بھی اسی ارتقائی انداز میں لاہور کی سرزمین پر ۱۹۴۰ء میں اُٹھنے لگا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی tectonic plates ارضی اجزائے ترکیبی کی بجائے کئی تہذیبوں کے تار و پود اور تانے بانے سے بنی تھیں، جن میں مخصوص تہذیبی تیور، مذہبی نظریات کے پتھریلے مواد، سیال معاشرتی رویے اور قربت و دوری کے گنجلک ایک دوسرے پر کیمیائی عمل کی طرح اثر انداز ہوتے رہے۔ باہمی محبتوں اور نفرتوں کے حاسدانہ اور رشک بھرے رویّوں کی غیر ہموار جنبش ان تہذیبی پلیٹوں کو خفیف حرکت دیتی رہی۔ جس سے ان کے نفسیاتی اور جذباتی کنارے باہمی ٹکراؤ سے اُوپر اُٹھنے لگے اور ہمارے وطن کا اوّلین اُبھار ایسے نمودار ہونے لگا جیسے قرن ہا قرن کے ماضی میں کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سطحِ زمین پر پہلے پہل نمودار ہوئی ہو گی۔

قدرت کے اس طویل ارتقائی عمل کی یہ مثال صرف اس وضاحت کے لیے دی گئی ہے کہ جس طرح زمین کی چھاتی پر کوہ ہمالیہ کا اُبھار ناگزیر تھا اسی طرح متعدد تہذیبوں کی اتھل پتھل میں ہمارے وطن کے مینار کا اُبھار بھی ناگزیر تھا۔ قائداعظم تو صرف اس قدرتی عمل کے بالکل ایسے ہی سہولت کار تھے جیسے دایہ بچے کی پیدائش کے قدرتی عمل کو آسان بنا دیتی ہے۔

اس وضاحت کی ضرورت اس لیے بھی ضروری تھی کہ ہندوستان کی کرم نوازیوں سے سرشار ہمارے بعض ادیب اصرار کرتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند غلط تھی۔ وہ نہ صرف قدرت کے اس ارتقائی عمل کو یکسر فراموش کر رہے ہیں بلکہ اس طرح وہ اپنے وطن اور اپنی ذات کو بھی فراموش کر رہے ہیں۔ خود فراموشی اور وطن فراموشی کی اس دیمک کو بے نقاب کرنے کے لیے فتح محمد ملک نے بھی اپنے منفرد انداز میں ایک کتاب تصنیف کر دی ہے۔[1]

مجھے اس دیمک کا سامنا اپنے مینار کی چھٹی اور ساتویں منازل میں ہوا۔ جب وطن میں ہمہ جہت

قومی زوال کی دھند... بلکہ نیم تاریکی... چھائی ہوئی تھی اور قوم بڑی بددل تھی۔ میں اپنے ایک ایسے ہی ادیب دوست سے حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ جب انھوں نے یہ اظہار کیا کہ قائداعظم کی غلط سوچ کی وجہ سے کئی قوموں کی ہموار شراکت والے پُرسکون معاشرے کو تقسیمِ ہند جیسے عظیم المیے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لیے پاکستان کی پیدائش شروع سے ہی غلط تھی۔ تو میں نے انھیں اس بچے کی مثال دی، جو اپنی پیدائش کے بعد سدھرے ہوئے بچپن اور درخشاں لڑکپن کے بعد آغازِ جوانی میں غلط صحبت میں پڑ کر آوارہ ہو جائے اور پچیس برس کی عمر میں اپنی ماں کو برا بھلا کہنے لگے کہ اُس نے اسے جنم ہی کیوں دیا اور پوچھا کہ اس میں قصور ماں کا ہے یا بچے کا؟

میری بات سن کر وہ خاموش تو ہو گئے، مگر یوں لگتا ہے کہ قائل نہ ہوئے۔ کیونکہ اس گفتگو کے بعد بھی ان کی صریرِ خامہ میں ماضی کے متحدہ برِعظیم کی سرسراہٹ حاوی رہی۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس تہذیبی ارتقا پر ذرا اور نظر ڈالی جائے۔

تہذیبوں کے اس ڈھیر میں سب سے نیچے کول اور دراوڑ قبائل کا معاشرہ ہے۔ جس کی جسامت اور گیرائی سے ہم زیادہ تر لاعلم ہیں، لیکن اس کی گہرائی کا اندازہ اس بیرونی پتھر سے ہوتا ہے جس کے گرنے سے اس معاشرے کی سطح پر شکست و ریخت کے متعدد دائرے پھیلنے لگے۔ یہ پتھر شمال سے آنے والے آریاؤں نے پندرہ صدیاں قبل از مسیح کے آس پاس پھینکا۔ جب پنجاب میں منڈا اور دراوڑی قبائل آباد تھے۔ یہاں کی نمدار مٹی میں انھوں نے پہلے تو اپنی زبان سنسکرت کا بوٹا لگایا۔ پھر چھوٹی بڑی سولہ ریاستوں اور راجواڑوں میں ہندو مذہب کی آبیاری کی اور گہری جڑوں والی ایک مضبوط کھیتی اُگا دی۔ بعد ازاں اس تہذیب کے اپنے رنگ بھی بدلتے رہے اور جب بارھویں صدی قبل از مسیح میں رگ وید وغیرہ تحریر میں آئے تو اگلے ہزار برس تک ویدوں کا زمانہ چھایا رہا۔ جس میں آریا لوگ تو اپنے اپنے پیشے کے مطابق ذات پات میں بٹتے گئے۔[2] اور کول دراوڑ جیسے غیر آریاؤں کو ''شودر'' کہہ کر زیست کے کونوں کھدروں میں دھکیل دیا گیا۔ انھیں چھونا حرام[3] اور صبح صبح دیکھنا نحس قرار دیا گیا۔ میل ملاپ انتہائی محدود کر دیا گیا۔ ان سے رشتے ناتے ممنوع ہو گئے اور ان حدود کی خلاف ورزی کرنے والے آریہ ملیچھ (پلید یا ناپاک) گنے گئے۔ کیونکہ جبری نفاذ کے لیے یہ حدود دھرم کا حصہ بنا دی گئی تھیں، تاکہ ''شودروں'' سے نفرت کرنا ایک مذہبی عمل بن جائے جو کسی نہ کسی شکل میں آج تک قائم ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ باہر سے آ کر قبضہ کرنے اور کول دراوڑوں کو زندگی سے بے دخل کرنے والے آریائی لوگ اپنے آپ کو بلاشرکتِ غیرے اس سرزمین کے مالک ہونے کا دعویٰ

کرنے لگے اور یہ دعویٰ بھی کسی نہ کسی انداز میں آج تک قائم ہے۔ اسی لیے ہمارے وطن کے اوّلین اُبھار کی بھی ۱۹۴۰ء سے شدید مذمت اور مخالفت ہونے لگی۔

اگلے دو تہذیبی یلغار اس وقت ہوئے جب پہلے تو ۵۲۰ ق م میں آج کے پاکستان اور افغانستان کے علاقے زائرس اعظم نے ایرانی سلطنت میں شامل کر لیے۔ اور بعد ازاں ۳۲۶ ق م میں سکندرِ اعظم نے ایرانی سلطنت کو پامال کرنے کے بعد دریائے سندھ کو اٹک کے مقام پر عبور کیا۔ پھر دریائے جہلم کے کنارے (موجودہ قصبہ جلال پور شریف) پورس کو شکست دینے کے بعد پنجاب کا بیشتر علاقہ یونانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ شکست خوردہ پورس بدستور حاکم رہا، مگر یونان کا باجگزار بن کے اسے مقامی حاکمیت واپس ملی۔ سکندر اعظم آگے بڑھا تو ملتان کے اردگرد والے علاقے کے لوگوں نے ایسی بہادری سے مقابلہ کیا کہ پورس والی انتہائی خوں ریز جنگ سے نڈھال یونانیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ دریائے بیاس عبور کیے بغیر واپس چلے گئے۔

اس کے بعد پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی کے وسط تک پہلویوں، پارتھیوں، ستواہنوں اور ہنوں کے حملے ہوتے رہے۔ ۵۵۵ء میں ترکوں نے ہندوستانی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے ہندوستان پر دستک دے دی۔ ساتویں صدی میں اسلام کا ظہور ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (۵۷۰ء — ۶۳۲ء) کے بعد صرف ۸۰ برس کے مختصر عرصے میں مسلمان عرب کے علاوہ ایران، مغربی ترکستان، سندھ، مصر اور جنوبی اسپین کے حکمران بن گئے۔[۴] اس کے بعد غزنی[۵] اور غور[۶] کے علاقوں سے مسلمانوں کے حملے ہوتے رہے اور ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے برصغیر جنوبی ایشیا میں اسلامی سلطنت قائم کر کے دہلی کو دارالخلافہ بنایا۔ ان حملوں کے علاوہ صوفیا اور مشائخ خدمتِ خلق کے ذریعے مقامی معاشرے میں اپنی جڑیں پھیلاتے رہے اور تبدیلیاں پیدا کرتے رہے۔

بارھویں صدی عیسوی میں بھگتی تحریک نے مختلف عقائد کو یک جا کر کے نیا مذہب بنانے کی کوشش کی۔ اس تحریک کے دو بڑے پیشوا بھگت کبیر داس اور بابا گورو نانک تھے جن میں سے گورو نانک (۱۴۶۹ء-۱۵۳۹ء) نے سکھ مذہب رائج کیا۔ ان سب کے علاوہ شمال ہی سے خراسان کے نادر شاہ کے حملے۔ افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کے متعدد حملے۔ ہلاکو اور چنگیز خان کی اولاد میں سے فرغانہ سے اُٹھنے والے ظہیر الدین بابر کے حملے اور مغلیہ سلطنت کا طویل دور اور ساتھ ساتھ جنوب سے آنے والے پرتگیزی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز اس برعظیم کو ایک اکھاڑہ بناتے رہے جس کے نتیجے میں برعظیم بالآخر برٹش ایمپائر کا حصہ بنا رہا اور اُس دور کے خاتمے کی پہلی گھنٹی ۱۹۴۰ء میں بجی تو وطن کے مینار کا پہلا ابھار ظاہر ہونے لگا۔

تاریخ کے اس اُچٹتے ہوئے جائزے کا ماحصل یہ ہے کہ کول دراوڑ کے زمانے کے بعد سے بیسویں صدی کے وسط تک برعظیم ہندوستان ان گنت حملے سہتا رہا۔ متعدد تہذیبوں کا گہوارہ بنا رہا۔ قریباً درجن بھر مذاہب کو اپنی گود میں پالتا رہا[۷] اور ان سب کے پیچیدہ گنجلک تلے شکست و ریخت سہتے ہوئے اپنی شکل وصورت بدلتا رہا۔ اس طویل ارتقائی عمل میں آریائی قابض صرف ایک ارتقائی کڑی تھے۔ جس پر سے ۳۵ صدیوں کی زندگی گزر چکی ہے۔ اس دوران دوسرے لوگ بھی اسی طرح قابض رہے ہیں جیسے آریاؤں کا قبضہ تھا۔ اگر قبضہ ہی حق ہے تو دوسرے تیسرے چوتھے اور دیگر قابض کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا پہلے قابض کا تھا۔ مگر وہ اب بھی پہلے دن کی طرح اس سرزمین کے کُلّی مالک ہونے کے دعویدار ہیں۔ نہ اپنے سے پہلے بسنے والوں کو قبول کرتے ہیں نہ اپنے سے بعد آنے والوں کو قبول کرتے ہیں۔[۸]

مزید برآں انھوں نے اپنی پرانی روش کے مطابق اس ملکیتی دعوے کو بھی اپنے دھرم کا ایسا ہی حصہ بنا دیا ہے۔ جیسے دھرم نے کول اور دراوڑ قبائل کو شودر بنا کر انھیں اپنے وطن کے علاوہ پوری انسانی زندگی سے ہی خارج کر دیا تھا۔ بعد میں تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دُہرایا اور پانچویں صدی عیسوی میں خالص حقوق العباد والی بدھ قوم کو بھی ہندو تہذیب نے نہ صرف شودر بنا دیا، بلکہ گھیراؤ جلاؤ کے کئی مختلف طریقوں سے ایسے ختم کر دیا کہ جس ہندوستان میں بدھ مت پیدا ہوا تھا وہاں سے اس کا نام ونشان بھی مٹا دیا۔[۹] حالانکہ اردگرد کے تمام علاقوں میں یہ ابھی تک قائم ہے۔

ہندوستان کے بنگالی دانشور نراد چوہدری نے اپنی کتاب Continent of Circe میں ہندومت کو ایسی تہذیب قرار دیا ہے جو اس برعظیم پر آنے والی دوسری تمام تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔[۱۰] لیکن اگر مصنف کے محتاط اور میٹھے الفاظ کا غلاف اُتار دیا جائے تو اندر سے یہ کڑوی حقیقت برآمد ہوتی ہے کہ ویدوں کے زمانے میں پیدا ہونے والا ذات پات کا نظام (caste system) تمام غیر آریائی انسانوں کے خلاف بھرپور نفرت کو اپنا مذہب قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اس برعظیم پر پلنے والی تمام تہذیبوں اور مذاہب میں سے برہمن تہذیب اور مذہب سب سے زیادہ خود پسند بھی ہے اور سب سے زیادہ جارح (militant) بھی۔ دو تہذیبوں کو ”جذب“ کرنے کے بعد اب وہ تیسری دفعہ محمد بن قاسم کی دستک کے بعد سے اُٹھنے والی اسلامی تہذیب کو بھی اپنے اندر اسی طرح جذب کرنا چاہتی تھی۔ جس طرح کول دراوڑ اور بدھ مت کے پیروکار ماضی بقیہ میں بڑی کامیابی سے ”جذب“ ہو چکے تھے مگر قائد اعظم نے ۳۵ صدیوں سے ایک ہی طرف بہنے والے

تاریخی دھارے کا منہ موڑ دیا۔

حواشی

۱۔ فتح محمد ملک کی تصنیف فتنۂ انکارِ پاکستان جو سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۸ء میں شائع کی۔

۲۔ ''برہمن'' مذہب کے رکھوالے بن گئے۔ جنگ و جدل کرنے والے ''کھشتری'' کہلائے اور زراعت و تجارت کرنے والوں کے علاوہ مختلف ہنرمند ''ویش'' بن گئے۔

۳۔ اسی لیے یہ اچھوت کہلائے۔

۴۔ اس کے برعکس پاکستان کے قیام کو ۶۷ر برس گزر چکے ہیں۔ جس دوران یہ پھیلنے کی بجائے سکڑ کر آدھا رہ گیا کیونکہ اقبال کے زمانے والی ''یہ اُمت خرافات میں کھو گئی تھی۔'' اب یہ خود ساختہ زوال کے چندے میں لڑھک رہے ہیں اور پھر بھی اس خود فریبی پر مصر ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں خدا کی بہترین اُمت کہلانے والے مسلمان آج بھی اسی طرح بہترین اُمت کہلانے کے حق دار ہیں۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک...

محض کلمہ گو ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے بے غرض کردار بھی چاہیے۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را (اقبال)

۵۔ سلطان محمود غزنوی۔

۶۔ شہاب الدین محمد غوری۔

۷۔ ہندومت، اسلام، سکھ مذہب، بدھ مت، جین مت، عیسائیت، پارسی مذہب، یہودی وغیرہ۔

۸۔ قیامِ پاکستان سے پہلے قائداعظم کا یہ فقرہ بہت مشہور تھا کہ ''ہندو قوم ایک روپے میں سے ۱۸ر آنے کا حصہ مانگتی ہے!'' (اُن دنوں ایک روپے میں ۱۶ر آنے ہوتے تھے)۔

۹۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں پانچویں صدی عیسوی کو برہمنی تہذیب کی تجدید کا سنہری زمانہ کہا گیا ہے۔ مہاراجہ اشوک کی بدھ سلطنت میں ایک طرف موجودہ افغانستان اور ایران کے کچھ حصے شامل تھے اور دوسری طرف شمال میں بنگال آسام بلکہ برما سے بھی پرے کے علاقے اور جنوب میں میسور تک کے علاقے شامل تھے۔

۱۰۔ یونانی دیومالا کے مطابق اساطیری داستانوں میں Circe (سرسے) طلسمات کے دیوتا کی بیٹی تھی اور خود بھی ایک دلربا سی ساحرہ تھی جو اپنے جادو کے زور سے اپنے جزیرے پر آنے والے انسانوں کو جانور بنا کر جنگل میں دھکیل دیتی تھی یا وہ اسے دیکھ کر پتھر بن جاتے تھے۔

وطن کے مینار کا ظہور

جب میرے وطن کا اُبھار ظاہر ہونے لگا تو میں اپنے مینار میں پہلی منزل میں تھا اور دوسری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ہندو دھرم کی اس ۳۵ر صدی پرانی مقدس ہٹ دھرمی سے بھی آشنا ہو رہا تھا۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو انہی دنوں کے آس پاس ہم والد صاحب کے تبادلے کی وجہ سے گجرات سے راولپنڈی منتقل ہو گئے اور میں پہلی دفعہ اسکول میں داخل ہوا، جہاں مجھے براہِ راست تیسری جماعت میں داخلہ مل گیا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں گھر پر والدہ سے تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ ان دنوں راولپنڈی چھاؤنی کی اہمیت جنگ کی وجہ سے بہت بڑھ گئی تھی۔ جس سے متصل سفید پوش مڈل کلاس مسلمانوں کی اکثریت والا بڑا شہر راولپنڈی تھا۔ اور مفلوک الحال ہندو سکھوں کی زور آور اقلیت کے دم سے خوب بارونق تھا۔ میرے دو بڑے بھائی گورڈن کالج میں داخل ہو گئے اور دو بڑی بہنیں اس کے قریب کیمبرج کالج میں داخل ہو گئیں۔ جہاں پرائمری کلاس سے بی اے تک کی مسلسل تعلیم دی جاتی تھی۔ ان دونوں کالجوں میں ہندو اور سکھ طلباء کی بھاری اکثریت ہوتی تھی۔ اسی طرح ہمارے گھرانے کے بڑے بچوں کی واضح مذہبی شناخت کا ایک غیر واضح معاشرتی کشمکش اور کھینچا تانی سے کھلا واسطہ پڑنے لگا۔ جس کا رنگ گجرات جیسے چھوٹے شہر کی نسبت زیادہ گہرا اور گاڑھا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے بھی اس صدیوں پرانے معاشرے کا شعور آنے لگا جو بظاہر تو کسی بڑے سمندر کی طرح پُرسکون سطح والا معاشرہ تھا، مگر جس کے اندر گرم اور سرد لہریں اور رویں ساتھ ساتھ ہمیشہ سے رواں دواں تھیں لیکن کبھی کبھار کہیں نہ کہیں آپس میں اُلجھ کر فضا میں دھند اٹھا دیتی تھیں۔

جب ہم راولپنڈی پہنچے تو فضا صاف تھی اور کوئی دُھند نہ تھی لیکن پھر ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کا دن آ گیا۔ جب لاہور کے منٹو پارک میں مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں قراردادِ پاکستان پیش کر دی۔

سورج طلوع ہوتا ہے تو صبح کی تازگی و بشاشت اور زندگی کی حرکت و حرارت اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر ہمارے وطن کا مینار جب اُس روز سطحِ زمین سے اوپر اُبھرا تو مخالفت کمر باندھنے لگی اور نفرتیں گھور کر دیکھنے لگیں۔ کیونکہ ۲۷ر برس تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی جوانی قربان کر دینے والے محمد علی جناح نے Continent of Circe کی جامد اور جاذب تہذیب کی پختہ دیوار پر

ایک دفعہ پھر ویسی ہی دستک دے دی تھی جیسی بارہ صدیاں پہلے محمد بن قاسم نے دی تھی۔ یہ دستک صرف اس اطلاع کی حد تک تھی کہ موجودہ مسلمان معاشرہ سابقہ تہذیبوں کی طرح ''جذب'' ہونے پر آمادہ نہیں۔

۲۱ ؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو محمد علی جناح[1] لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن سے سیدھے میو (Mayo) ہسپتال پہنچے اور دو دن پہلے کے تصادم میں زخمی خاکساروں کی عیادت کی۔ شام کو منٹو پارک میں مسلم لیگ کی پرچم کشائی کے دوران مختصر تقریر میں خاکساروں کے قتلِ عام پر اظہارِ افسوس کیا۔[2] اور ۲۲ ؍ مارچ کو نمازِ جمعہ کے بعد منٹو پارک میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس میں صدارتی تقریر کی، جس میں اس دستک کی روح کو سمو دیا کہ ہم برہمنی تہذیب میں جذب ہونے سے کیوں مکمل انکار کرتے ہیں۔ اس تقریر کے چند فقرے غور طلب ہیں۔[3] (بالخصوص اُن نوجوانوں کے لیے جو اُس زمانے کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر قیامِ پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار رہتے ہیں)۔

اس بات کو غلطی سے ہمیشہ مان لیا گیا ہے کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں۔ مسلمان ہرگز ایک اقلیت نہیں ہیں بلکہ ہر لحاظ سے ایک قوم ہیں۔ ہندوستان کے مسئلے کی نوعیت فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بین الاقوامی نوعیت کا مسئلہ ہے اور اسی حیثیت سے اس پر غور ہونا چاہیے۔ ہندو اور مسلمان دو مختلف اور جداگانہ مذہبی فلسفوں، سماجی روایات اور ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نہ تو آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور نہ مل بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے ہے جو بنیادی طور پر متصادم خیالات و تصورات پر مبنی ہیں۔ ان کا تصورِ حیات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کی رزمیہ داستانیں، ہیرو، قصے اور تاریخ الگ الگ ہیں۔ اکثر ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا دشمن ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی تاریخ میں ایک فریق کی فتوحات دوسرے کی شکست رہی ہے۔ ایسی دو قوموں کو اکثریت اور اقلیت کی حیثیت میں زبردستی ایک ریاست میں اکٹھا رکھنے سے بے چینی اور کشمکش میں اضافہ ہوگا اور بالآخر وہ ڈھانچہ ہی تباہ ہو جائے گا جسے ایک مملکت کی حکومت کے لیے معرضِ وجود میں لایا جائے گا۔ قوم کی ہر تعریف کے مطابق مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کے پاس اپنا وطن، اپنا علاقہ اور اپنی مملکت ضرور ہونا چاہیے۔

اس تقریر کے بعد رات اور اگلے دن تک قراردادِ پاکستان کا مسوّدہ تیار ہوتا رہا۔ جو ۲۳ ؍ مارچ کو شام چار بجے بنگال کے وزیرِاعظم اے کے فضل حق نے اجلاس میں پیش کیا۔ ۲۴ ؍ مارچ کو یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی۔[4] جس کے بعد قائداعظم نے اپنے سیکرٹری مطلوب الحسن سیّد سے کہا، ''آج اقبال ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو انھیں خوشی ہوتی کہ ہم نے ان کی

خواہش پوری کر دی ہے۔''

اسی لمحے اس ریزولیوشن نے اس لرزش کو جنم دیا جو زمین پھٹنے سے پہلے محسوس کی جاتی ہے۔ وطن کے مینار کی بنیاد اب ہندوستان کی سرزمین سے برآمد ہونے کو تھی۔ بالکل اُسی انداز میں جس طرح قرن ہا قرن پہلے ہمالہ کی چوٹی نے سطحِ زمین سے سر اُٹھایا تھا۔

وہ زیرِ زمین tectonic پلیٹوں کا باہمی دباؤ اور ٹکراؤ تھا۔ یہ بالائے زمین دو تہذیبوں کا باہمی دباؤ اور ٹکراؤ تھا۔ وہ قدرتی عوامل کی تبدیلی تھی۔ یہ تواریخی عمل کا تقاضا تھی۔ وہ ارضی اُبھار تھا اور یہ ارتقائی اُبھار تھا۔ اُس لمحے اور اس ریزولیوشن کی یاد دلانے کے لیے اب ''مینارِ قراردادِ پاکستان'' اقبال پارک، لاہور میں کھڑا ہے اور حیرت سے ان منفی سرگوشیوں کو سن رہا ہے جو اس ارتقاء کو سمجھے بغیر کہتی ہیں کہ وہ لمحہ ایک تقصیر تھی اور وہ ریزولیوشن ایک غلطی تھی۔

قائداعظم نے Continent of Circe کے تعصب کی موٹی دیوار اور آہنی پھاٹک پر دستک تو دے دی۔ مگر یہ ایسی دستک تھی جس سے کھٹ پٹ بھی ہوئی۔ مگر دروازہ نہ بجا نہ ہلا۔ قراردادِ پاکستان تو منظور ہو گئی مگر عوامی پذیرائی مفقود تھی۔ جس نے آگے چل کر تاریخ بننا تھا۔ کیونکہ اس وقت مسلم لیگ کی ڈھیلی ڈھالی تنظیم معروف تو تھی مگر مقبول نہ تھی۔ اس کی آواز تو سنائی دیتی تھی مگر اس میں کان کھڑے کر دینے والی کھنک نہیں تھی۔ یہ زیادہ تر نواب زادوں اور چند قابلِ ذکر متمول گھرانوں کے سیاسی شغل کی جماعت تھی۔ جس کی باگ ڈور تھوڑا عرصہ پہلے قائداعظم نے صرف اس لیے سنبھالی تھی کہ علامہ اقبال کی قومی اور سیاسی بصیرت اور دردمندی نے انھیں ترغیب دی تھی اور اتنے عرصے میں یہ عوامی جماعت نہ بن سکی تھی۔

ایسی ہی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملکی فضا تین چار روز پہلے کے سانحۂ ۱۹ ؍ مارچ سے مغموم اور نڈھال تھی اور قومی درد والے مسلمان ایک عجیب سے نفسیاتی مخمصے میں تھے۔ ایک طرف تو ان کی واضح ہمدردیاں خاکساروں کے اس سرخ و سپید پرچم سے تھیں جو دس برس تک پورے برِعظیم کے زمینی طول و عرض کے اوپر بلند فضا میں پُرشور اور منظم پھڑپھڑاہٹ سے لہراتا رہا۔ مگر اسی ہفتے میں وہ ایسا سرنگوں کیا گیا تھا کہ جنگِ عظیم کے پورے دورانیے کے لیے یہ تحریک غیرقانونی قرار دے دی گئی۔ اس کی خبر لگانے، تصویر چھاپنے اور اخباری تبصروں پر بھی کڑی پابندی تھی لیکن دوسری طرف مبہم اور دھندلے سے جذبات مسلم لیگ کے اس سبز پرچم کے لیے بھی تھے۔ جو تحریکِ خلافت کے سبز پرچم کی یاد دلاتا تھا اور دو دہائیاں پہلے کے پُرسوز تلاطم کا علامتی مرثیہ تھا۔ تاریخ کے متعدد حملہ آوروں کی گزرگاہ ہونے کے باوجود شاید لاہوری عوام اس سے پہلے ایسی

نفسیاتی اُلجھن سے کم ہی دوچار ہوتے ہوں گے جس سے انھیں مارچ کے ان چند دنوں میں گزرنا پڑا کہ ایک آنکھ میں درد کے آنسو اور دوسری آنکھ میں کسی دور افتادہ کرن کی جھلمل۔ ان دنوں لاہور میں ایک عجیب طرح کی بے کلی تھی جس کے دائرے چہار سو سرایت کر رہے تھے۔

اس تاریخی دستک سے مسلمان عوام تو نہیں چونکے۔ مگر قوم پرست ہندو چونک اُٹھے۔ پوری کانگریس چونک گئی۔ اس کے زیر اثر سکھوں کی اکالی دل چونک گئی اور سارے کانگریسی مسلمان بالخصوص چونک گئے۔ پھر یہ سب چونکنے والے اس قرارداد کی مخالفت کرنے لگے۔ ان کے علاوہ نہ صرف پنجاب کی یونینسٹ (Unionist) گورنمنٹ مخالف تھی بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمان علمائے کرام بھی مخالف تھے۔ کیونکہ کانگریس کی دوست جمعیت العلمائے ہند اس کی مخالف تھی۔ تاہم سب سے زیادہ پُرشور مخالفت ہندو پریس کی طرف سے تھی لیکن ع

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

(ترجمہ: بعض دفعہ دشمن ایسا شر پیدا کرتا ہے کہ اس میں ہمارا بھلا ہو جاتا ہے)

اسی بلند بانگ مخالفت کی بدولت عام مسلمان مطالبۂ پاکستان سے واقف ہونے لگے۔ اس طرح مشیت نے مسلم لیگ کی اپنی ڈھیلی تنظیم کی پہلی مدد کی۔[۵] مشیت کی دوسری مدد یہ تھی کہ ہندو پریس کے جواب میں مسلمان پریس بیدار ہونے لگا۔[۶] اور اسی کشمکش میں محمد علی جناح کا یہ پیغام مسلمانوں تک پہنچنے لگا:

''اس ملک میں ہم آزادی اور عزت سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسی حکومت کبھی قبول نہیں کریں گے جس کا مقصد ہماری غلامی اور ہندو کی آزادی ہو۔''

پھر مشیت نے یہ پیغام پھیلانے میں تیسری مدد یوں کی کہ پنجاب میں یونینسٹ وزیراعظم سر سکندر حیات کی مخالفت ختم ہو گئی۔ کیونکہ وہ دسمبر ۱۹۴۲ء میں حرکت قلب کے اچانک بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

قرارداد کے ایک برس بعد لاہور میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن[۷] نے قائداعظم کی زیرِ صدارت پاکستان کانفرنس منعقد کی۔ قائداعظم نے صدارتی خطبے میں کہا، ''یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کی قرارداد اسی شہر لاہور میں مارچ کے مہینے میں منظور ہوئی اور آج آپ کی کانفرنس بھی اسی شہر میں مارچ ہی میں ہو رہی ہے۔ لہٰذا مارچ آن (March on)۔'' یہاں طلباء کی صفوں میں مستقل کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اور دیہاتوں میں پاکستان ریزولیوشن کا مطالبہ پھیلانے والی کمیٹی کے صدر حمید نظامی تھے۔ اس کمیٹی نے ایک ہی سال میں پنجاب میں ۱۳۸ شاخیں قائم کیں اور ۱۴۸۲۳

ممبران بنا دیے۔ پھر بھی مسلم لیگ کے ''مارچ'' میں خاصی آہستہ روی تھی۔ مگر قرارداد کی مخالفت تیز رو بھی تھی اور پُرشور بھی۔ جس میں مولویوں کے فتوے بھی شامل ہونے لگے۔ جو ماضی میں علاّمہ مشرقی کی طرح اب قائداعظم کو کافر کہتے تھے۔ حتیٰ کہ دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنی نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے اور قائداعظم دراصل کافرِ اعظم ہیں۔[۸]

ایک ہزار برس ہندو کی سنگت میں رہنے کے بعد اب ہماری ملائیت بھی مذہب کا ویسا ہی سیاسی استعمال سیکھ چکی تھی۔ جیسا برہمنی تہذیب کی مصلحتیں دھرم کے تیز آلات سے ''شودر'' اور ''ملیچھ'' تراشنے میں استعمال کرتی تھیں۔ چنانچہ ہمارے مولوی حسب منشا ''کافر'' تراش دیتے تھے۔ ویسے تو اسلامی تاریخ میں پہلے بھی دنیاوی مقاصد کے لیے مذہب کا حربہ استعمال ہوتا رہا تھا۔ مگر برصغیر میں آ کر اس پر ہندو ہم نشین کا منفی رنگ زیادہ چڑھ رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ماضی بعید میں دھرم رائے عامہ کو روند ڈالتا تھا۔ مگر بیسویں صدی میں یورپ کی رائے عامہ تو مذہب اور دھرم کو تین سو برس پیشتر ہی روند چکی تھی اور برعظیم کے عوام میں صرف اتنی سکت پیدا ہوئی تھی کہ بعض دفعہ رائے عامہ مُلا اور پنڈت کو نظرانداز کرتی ہوئی اپنا رُخ برقرار رکھتی تھی۔ قراردادِ پاکستان کے معاملے میں بھی یوں ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ چند ایک علماء پاکستان کے حامی بن گئے اور دھیرے دھیرے باقی رائے عامہ کا رخ بھی بدلنے لگ گیا۔ ان علماء کی سرکردگی مولانا شبیر احمد عثمانی کر رہے تھے جنھوں نے بالآخر ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کی نمازِ جنازہ کی امامت کی۔

دریں اثنا دیگر زندگی اپنی دلکی چال چل رہی تھی۔ اس زمانے میں پرائمری اسکول نسبتاً دیر سے کھلتے تھے۔ ایک دن میں اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتہ کرنے پہنچا تو والدہ کے پاس مونڈھے پر بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت بے ہوشی کے عالم میں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی اور وہ اُس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھیں۔ مجھے انھوں نے فوراً بھگایا کہ میں قریب کے بازار سے شربتِ صندل اور خمیرہ گاؤ زبان لے آؤں[۹] اور خود اسے سنبھالنے لگ گئیں۔ میں بھاگم بھاگ مطلوبہ اشیاء لے آیا۔ تو وہ عورت مونڈھے کے پاس ہی دری پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ شربت وغیرہ پی کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ ابا جان اور بڑے بہن بھائی دفتر اسکول اور کالج جا چکے تھے۔ اس لیے اپنی پریشانی میں امّی نے مجھے اسکول جانے سے روک دیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ تب ان کی باہمی گفتگو سے بات واضح ہونے لگی۔

ان دنوں شہروں میں بھینس رکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جنگ کی وجہ سے اشیائے خوردنی کی قلت ہونے لگی اور انتہائی سستے زمانے کے بعد لوگوں کو روز افزوں مہنگائی سے پہلی دفعہ واسطہ پڑنے

لگا تو وہ پریشان ہو گئے۔ سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں مہنگائی الاؤنس کا اضافہ ہو گیا۔ غیر سرکاری لوگ آمدنی بڑھانے کے دیگر نسخے آزمانے لگے۔ بعض سفید پوش گھرانے اپنے بچوں کی ضرورت کفایت شعاری سے پوری کرنے کے لیے گھر میں ایک یا دو بھینسیں پال لیتے اور اپنی ضرورت سے فالتو دودھ دو تین گھروں میں خاموشی سے بیچ دیتے۔ یہ ہمیشہ اچھا اور خالص دودھ ہوتا تھا اور اس کی اِکا دُکا اتفاقیہ سپلائی کو ترجیح دی جاتی تھی۔

ہمارے ہاں بھی ہر صبح ایک لڑکا یا اس کی چھوٹی بہن پیتل کے ڈھکن دار ڈول میں دودھ دینے آتے تھے۔ اگر کبھی کبھار وہ کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آ سکتے تو ان کی والدہ برقع اوڑھ کر خود ڈول اُٹھا لاتی۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا اور وہ امّی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ اس گفتگو کے دوران پتا چلا کہ اس کا بڑا بیٹا خاکساروں کے اس جیش میں شامل تھا جس کا لاہور میں انیس مارچ کو پولیس سے تصادم ہوا تھا۔ وہ اب تک لاپتا تھا اور گھر والے لاعلم تھے کہ وہ زندہ ہے یا گولیوں کی زد میں آ کر مارا گیا ہے۔ اس گفتگو میں وہ جذبات کی شدت سے غش کھا کر گر پڑی۔ اب وہ ہوش میں آ کر رو رو کر باتیں کر رہی تھی اور میں اپنی اُس کچی عمر میں پہلی دفعہ عام زندگی پر اس المیے کے واضح اور دور رس اثرات سے واقف ہو رہا تھا۔ حیرت اور ملال میں ڈوبا ہوا ... باہر سے خشک آنکھیں مگر اندر سے گریہ ہی گریہ ... اس کی وجہ کچھ عرصہ پہلے کا دیکھا ہوا منظر تھا اور اس کے بعد کے احوال تھے۔

۱۹ / مارچ کو لاہور کے تصادم کے بعد ۲۰ / مارچ کو پورے ہندوستان میں اس تحریک پر ہر قسم کی پابندیوں کے بعد خاکساروں نے ملک بھر میں مسجدوں میں پناہ لے لی تھی۔ راولپنڈی میں وہ جامع مسجد میں اس طرح پناہ گزیں بنے کہ پوری مسجد پر اُن کا قبضہ تھا۔ سڑک پر کھلنے والے دروازے کو بند رکھا جاتا تھا۔ مسجد کی سیڑھیوں اور منڈیروں پر ان کا باوردی پہرہ تھا۔ ہر نماز کے وقت دروازہ کھلتا اور نماز کے بعد بند ہو جاتا۔ پھر بھی شہر کے لوگ جوق در جوق انھیں دیکھنے اور ملنے جاتے تھے۔ سننے میں آتا کہ لوگ ان کی ضروریات بتانے کی درخواست کرتے تھے مگر وہ قبول نہ کرتے تھے۔

ایک رات عشاء کی نماز کے فوراً بعد ہمارے گھر کے بڑے لڑکے اور لڑکیاں جامع مسجد جا کر انھیں دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے، تو میری شدید ضد کے بعد مجھے بھی شامل کر لیا گیا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو کئی اور تانگے اور بہت سے پیدل لوگ بھی انھیں دیکھنے آ رہے تھے۔ کئی تو ان کے لیے کھانا، مشروبات اور پھل وغیرہ اپنے ساتھ لائے تھے اور منڈیر یا دروازے پر کھڑے ہر خاکسار

کے سامنے سڑک پر مجمع اکٹھا ہو جاتا۔ ہم بھی شامل ہو گئے اور ان کی فرمائش یا ضرورت پوری کرنے کی پیش کش کی۔ مگر سب لوگوں کے لیے ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ہمارا ڈسپلن اور ہماری تربیت ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ہمارے پاس بھنے ہوئے چنے اور گڑ کی بھیلیاں کافی مقدار میں ہیں اور آج کل یہی ہماری غذا ہے۔ اسی انداز میں جامع مسجد کے سامنے ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا، جن میں ہندو سکھ تو محض تماشائی ہوتے، مگر مسلمان پورے حمایتی ہوتے، جو نمدار آنکھوں سے انھیں دیکھتے رہتے اور بعض اوقات آنسوؤں کی جھڑی میں دستِ دعا بلند کر دیتے۔

مسجدوں کے باہر سے انگریز حکومت اور مسجدوں کے اندر سے مولوی خاموشی سے یہ حالات دیکھتے رہتے اور باہمی مشوروں سے مناسب وقت پر مناسب کارروائی کے منصوبے بناتے رہتے۔

دو اڑھائی ماہ کی پناہ کے بعد ۳۱ / اگست ۱۹۴۰ء کی نصف شب کو وہ مناسب وقت بھی آ گیا۔ جب ملک بھر میں پناہ گزینوں والی تمام مساجد میں بیک وقت چھاپہ مارا گیا۔ باہر سے مسلح پولیس کی یلغار میں اندر سے مولویوں نے دروازے کھول دیے اور گولیاں برساتی پولیس مسجدوں میں گھس گئی۔ کچھ دیر بعد لاشوں اور زخمیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر ٹرکوں میں ڈالا گیا اور نہ معلوم کہاں بھیج دیا گیا۔

اگلا گھنٹہ مسجدوں کے فرش سے جمتے ہوئے خون کی پپڑیاں، بہتے خون کے جوہڑ اور پھیلے ہوئے خون کے دھبے دھلتے رہے۔ پھر صبح تک سارے پنکھے پوری رفتار سے چلتے رہے اور صبح کی اذان کے بعد نہ صرف معمول کی نماز ہوئی، بلکہ امام نے حسبِ معمول اہل بیت کی مغفرت اور عالمِ اسلام کے استحکام کے لیے ایسی لمبی لمبی دعائیں مانگیں، جیسے رات بھر یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا، مگر جن نمازیوں نے آدھی رات کو گولیوں کی آواز سنی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ آج نماز میں پناہ گزین کیوں شامل نہیں ہوئے۔

اگلے دن پولیس کے ٹرک شہر میں دن بھر گشت کرتے رہے اور خوفزدہ لوگ سینہ بہ سینہ رات کے چھاپے کی خبر ایک سے دوسرے تک پہنچاتے رہے۔ مسلم لیگ کی پرواز تو صرف بالائی سطح پر تھی اور زمینی تنظیم ابھی مفقود تھی۔ ایسے میں گلی کوچوں میں احتجاج کون کرتا؟

وہ قیامت والی رات گزر گئی۔ وہ سہمی ہوئی صبح گزر گئی۔ وہ مجبوری والا دن گزر گیا اور اس کے ساتھ ہی صرف مہینوں یا برسوں تک نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے خاکسار تحریک کسی اندھے کنوئیں میں گر گئی اور سناٹا چھا گیا۔ نہ چپ راست کی آواز ... نہ لہراتی ہوئی پریڈ میں بیلچوں کے لشکارے ... نہ خاکی وردی کی جھلک ... نہ علامہ مشرقی کے پمفلٹ ... نہ ہفت روزہ اخبار الاصلاح کا انتظار ... نہ اخباروں میں کوئی خبر یا تبصرہ ... ایسا گہرا سناٹا کہ اب اس تحریک کا نام بھی یاد نہ آتا تھا ذکر تو کیا

ہوتا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ چنانچہ اگلے چار پانچ برس بعد جب مسلم لیگ ایک عوامی تحریک بننے لگی، تب تک خاکسار تحریک ایک قصۂ پارینہ بن چکی تھی اور اس قابل نہیں تھی کہ تحریک پاکستان کی مخالفت یا حمایت کرسکتی۔

بوڑھی عورت ہمارے گھر آتی رہی۔ اسے وقتاً فوقتاً غشی کے دورے پڑتے رہے اور ہمارے گھر والے اس کے بیٹے کا پتا نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔

ان دنوں زمانہ بدلنے کی کئی مبہم سی نشانیاں سوکھے زرد پتوں کی طرح ہوا میں اُڑنے لگیں۔ جنگی سامان بنانے کے لیے دھاتوں کی مانگ بڑھی تو پوری ایک تولہ چاندی کا کھنک دار روپیہ کھرے کھوٹے کی پہچان سمیت غائب ہوگیا اور اس کی جگہ دس پانچ اور ایک ایک روپے کے نوٹ آ گئے۔ اس سے سناروں کے نازک ترازو مصدقہ وزن کا ایک مصدقہ پیمانہ کھو بیٹھے۔[۱۰] دوّنی (دو آنے) اور چونی (چار آنے) کے نِکل (nickle) کے سکے اور دمڑی پائی کے تانبے کے سکے مع کوڑیوں (corals) کے غائب ہو گئے۔ ایک پیسے کا تانبے کا سکہ سائز میں چھوٹا ہو گیا اور مزید دھات بچانے کے لیے درمیان میں کھلا سوراخ بنا دیا گیا۔ چنانچہ اکثر مستری اور کاریگر اس ارزاں قیمت پیسے کو بیش قیمت واشر (washer) کے طور پر ہر قسم کی مشین میں استعمال کرنے لگے۔ نِکل کا ایک آنے کا سکہ بھی غائب ہو گیا اور اس کی مالیت تانبے کے دو عدد ٹکوں میں بٹ گئی (ایک ٹکہ دو پیسے کے برابر اور ایک آنہ چار پیسے کے برابر گنا جاتا تھا)۔

کرنسی کی دھاتوں کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء اور کپڑے لتے کی بھی دن بدن زیادہ قلت ہونے لگی۔ چینی، دودھ، انڈے، لٹھے، ململ، دوسوتی، بوسکی اور گرم کپڑوں کا راشن کر دیا گیا۔ پھر جیسے جیسے مزید اشیا پر راشن پھیلتا گیا ویسے ویسے راشننگ (rationing) کا نیا محکمہ حکومت کے سب سے اہم محکمے کے طور پر بڑ کے درخت کی طرح پھیلتا گیا۔ باہمی میل ملاپ میں رواداری نئے روپ دھارنے لگی اور لوگوں کے تحفوں یا اپنائیت کی شکل اب پاؤ بھر چینی، نصف درجن انڈوں اور دو اڑھائی گز لٹھے یا ململ میں بدلنے لگی۔ ہر گھر کی سب سے اہم دستاویز چار اوراق کا راشن کارڈ بن گئی جو آج کل کے شناختی کارڈ کی طرح جان سے بھی عزیز رکھا جاتا تھا، کیونکہ مختلف سرکاری مراعات کے لیے فیملی کا اندازہ صرف راشن کارڈ سے ہی لگایا جاتا تھا۔

دوسرا تیزی سے پھیلنے والا نیا محکمہ سول ڈیفنس (civil defence) یا عوامی تحفظ کے متعلق تھا جو عام اصطلاح میں اے آر پی (Air Raid Precautions) والا محکمہ کہلاتا تھا۔ اس محکمے کے رنگ برنگے کارکن کئی کام کرتے تھے جن میں سب سے نمایاں یہ تھا کہ شہر کے ہر بڑے میدان میں یہ

لوگوں کو ہوائی حملوں کا سامنا کرنے، بم باری سے اپنا بچاؤ کرنے اور حملے کے بعد آگ وغیرہ بجھانے کی تربیت دیتے رہتے تھے۔[۱۱] بلیک آؤٹ کی مشقیں بھی عام تھیں۔ راولپنڈی کی فضا میں ایک دوسرے کے اوپر دو پروں والے طیارے[۱۲] اُڑتے رہتے تھے اور شہر سے باہر زرعی فارم سے پرے[۱۳] فوجیوں کو پیراشوٹ سے اترنے کی تربیت دیتے رہتے تھے۔ راولپنڈی میں کئی ملکوں کے فوجی اکٹھے ہوتے۔ کیونکہ یہ مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور یورپ میں لڑنے والی اتحادی فوجوں کے لیے دوسرا اسمبلی ایریا (Assembly area) تھا۔[۱۴] اس لیے گورے کالے غیر ملکی فوجی اور جفاکش گورکھے فوجی آرمرڈ کاروں (Armoured cars) اور ٹینکوں سمیت مری روڈ سے گزرتے دکھائی دیتے تھے اور کبھی کبھار بھاری تعداد میں پیدل مارچ اور پریڈ بھی کرتے تھے۔ محکمۂ اطلاعات بڑی باقاعدگی سے جنگ کی خبریں کے عنوان سے ایک باتصویر ہفتہ وار اخبار شائع کرتا تھا جو نمایاں شہریوں، اسکولوں اور دفتروں میں مفت بانٹا جاتا تھا۔ ان دنوں شہروں میں کئی جگہ لوگوں نے پرائیویٹ قسم کی چھوٹی چھوٹی لائبریریاں بنائی ہوئی تھیں جن میں اُردو ادب کی کتابوں کے علاوہ کئی ملکی اخبارات مفت پڑھنے کی صلائے عام تھی۔ ایسی جگہوں پر محکمۂ اطلاعات کا یہ خبرنامہ وافر مقدار میں پڑا نظر آتا تھا۔ گھروں میں ریڈیو خال خال ہونے کی وجہ سے لوگ رات ۹ بجے کی خبریں سننے کے لیے ایسے چائے خانوں کے اندر اور باہر جمع ہو جاتے۔ جنھوں نے ریڈیو رکھے ہوتے تھے اور اتنا رش ہو جاتا کہ اردگرد کی سڑکیں بند ہو جاتیں۔ آدھے گھنٹے بعد خبریں ختم ہوتے ہی لوگوں کا جمِ غفیر لمحوں میں بکھر جاتا۔ پھر زبانی تبصروں سے بغضِ معاویہ چھلکنے لگتا کہ انگریزوں کی ہر شکست پر لوگوں کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگتیں اور چال میں اُٹھان آ جاتی۔ مگر جرمنی اور جاپان کی ہر شکست پر آنکھیں اور چال ماند پڑنے لگتے۔

کئی ماہ گزرے تو بالآخر لاہور سے خبر آ گئی۔ ہمارے ایک عزیز لاہور میں نہ صرف سرگرم خاکسار تھے بلکہ محض تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے انیس مارچ کے جیش میں شرکت نہ کر سکے تھے۔ اُن کی معرفت پتا چلا کہ اس بوڑھی عورت کا بیٹا زندہ ہے۔ حکومت کی قید میں ہے مگر نہ معلوم کہاں۔ کیونکہ خاکسار قیدیوں کو سارے ملک کی دور دراز جیلوں میں بکھیر کر محبوس کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے قید خانے بار بار تبدیل بھی ہوتے رہتے تھے۔ ہماری والدہ نے اس خاتون کو بہت تسلی دی کہ ــ

چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی (فیض احمد فیض)

مگر اس کی بے کلی کم نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کے اپنے آسمان پر زندگی کے چاند تارے نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک قراردادِ پاکستان کا نیا چاند تھا جو بہت دھیرے دھیرے طلوع ہو رہا تھا۔ اس کا ذکر اخباری خبروں اور تبصروں میں تو تھا مگر ابھی یہ عام لوگوں کا گرم موضوعِ گفتگو نہیں بنا تھا۔ کیونکہ قائداعظم کئی محاذوں پر تنہا لڑ رہے تھے۔

ہماری آج کی نسل کا المیہ یہ ہے کہ وہ دائیں بائیں مشرق و مغرب کی طرف تو دلچسپی اور ذہانت سے دیکھتے رہتے ہیں مگر پیچھے مڑ کر اپنے قومی سفر کے نقوشِ پا کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ مفاد پرست عناصر شرم و غیرت سے منہ موڑ کر انھیں دانستہ مٹاتے جا رہے ہیں۔ اس لیے ہماری نئی نسل کو ان مشکلات کا ذرہ بھر بھی اندازہ نہیں جن سے نحیف و نزار قائداعظم اُس وقت دو چار تھے۔

سب سے پہلے تو کانگریس کا محاذ تھا جس کی ذہنی ساخت ۳۵ ؍صدیوں کی جارح خود پسندی نے بنائی تھی اور جس کا دھرم متحدہ ہندوستان کو گائے ماتا قرار دیتا تھا اور ناقابلِ تقسیم سمجھتا تھا۔ چنانچہ، جنگ کے شروع میں جرمن اور جاپانی فوجوں کی فتوحات سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کانگریس کی بے صبری بڑھتی جا رہی تھی اور ابتدائی سول (civil) نافرمانی کے بعد ۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' (Quit India) کی باغیانہ پُرتشدد تحریک سے اب انگریزوں پر دباؤ بڑھا رہی تھی کہ پورے ہندوستان کو بطور ایک قوم فوراً آزادی دے دی جائے اور وہ اُس آزادی کے بعد ہی عالمی جنگ میں انگریز سے تعاون کرے گی۔ لیکن قائداعظم بار بار یاد دلا رہے تھے کہ ہندوستان میں دوسری قوم بھی بستی ہے جس کے مطالبے مختلف ہیں اور طرزِ عمل بھی ایک حد تک مختلف ہے کہ جنگی معرکوں میں وہ اب بھی انگریز سے تعاون کر رہی ہے۔ اس لیے اسے علیحدہ ریاست کا حق ہے۔

دوسری طرف اکالی دل کے سکھوں کا محاذ تھا، جنھیں قائداعظم بار بار حال کے اتحاد اور مستقبل کے پائیدار حقوق کی طرف بلاتے تھے، مگر وہ ماسٹر تارا سنگھ کی قیادت میں کانگریس کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے اور شور کرتے تھے کہ مغلوں کے زمانے میں مسلمانوں نے ہم پر ظلم کیے اور ہمارے گرو قتل کیے۔ اس لیے ان سے اتحاد ممکن ہی نہیں ہے۔ اس شور پر کانگریس ہندو مہاسبھا اور راشٹر سیوک سنگھ تالیاں بجاتے تھے۔ مزید شبہ دیتے تھے اور کبھی آزاد خالصتان اور کبھی خودمختار پنجابی صوبے کا مطالبہ اگلواتے تھے۔ مگر اس مطالبے پر سر اسٹیفورڈ کرپس (Sir Stafford Cripps) کے کابینہ مشن (Cabinet Mission) نے کوئی دھیان نہیں دھرا۔ کیونکہ دس کروڑ مسلمانوں کے مقابلے میں سکھوں کی آبادی صرف ۵۵ ؍لاکھ تھی اور پنجاب کی صرف دو تحصیلوں ترن تارن (ضلع امرتسر) اور موگا (ضلع فیروز پور) میں ان کی اکثریت تھی۔ اس لیے قائداعظم انھیں بار بار مجوزہ

پاکستان میں محفوظ حقوق دینے کی پیشکش کرتے رہے، مگر ماسٹر تارا سنگھ انکار کرتے رہے۔

تیسری طرف کانگریسی مسلمانوں اور کانگریس کے زیرِ اثر مسلمان تحریکوں (مجلسِ احرار الاسلام اور جمعیت العلمائے ہند) کا محاذ تھا۔ جن کا وجود، نعرے اور سوچ قراردادِ پاکستان کی براہِ راست نفی تھی۔

چوتھا محاذ مسلمان مولویوں کا تھا جو ملک بھر میں بآوازِ بلند قائداعظم کے خلاف کفر کے فتوے جاری کرتے رہتے۔ چھے سو برس سے مسلم اُمّہ کو یرغمال بنائے رکھنے والے مُلا اب ہر تبدیلی کے خلاف تھے اور ہیں۔ سوائے اس تبدیلی کے جو ان کی گرفت کو مضبوط کرے۔

پانچواں محاذ پنجاب کی یونینسٹ (Unionist) حکومت کا تھا جو مسلمان، ہندو اور سکھ جاگیرداروں کی جماعت تھی۔ انگریزی مفادات کی پروردہ تھی اور مطالبۂ پاکستان کی شدت سے مخالفت کر رہی تھی۔

چھٹا اور سب سے مشکل محاذ برٹش حکومت کا تھا، جو کانگریس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی باغیانہ تحریک کے باوجود تقسیمِ ہند کی حوصلہ شکنی کر رہی تھی۔ کیونکہ انگریز کی اپنی انا ایک وسیع برعظیم کی اکائی میں اٹکی ہوئی تھی۔ انگریز کی سلطنت کے قیام سے پہلے برعظیم کی دو ہزار سالہ تاریخ کے دو ادوار تھے۔ ہندو دور اور مسلم دور۔ ان دو ہزار برسوں میں یہ برعظیم مختلف اوقات میں صرف ایک سو بارہ برس متحد رہا۔ جب اشوک، محمد شاہ تغلق اور اورنگ زیب کی حکومتیں تھیں۔[15] اس کے بعد انگریز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد صرف ۹۰ ؍برس تک متحدہ برعظیم پر حکومت کرتا رہا۔ مگر اسے اپنے اس دور کی اکائی پر بہت ناز اور فخر تھا جس کی وجہ سے وہ جذباتی طور پر تقسیمِ ہند کے خلاف تھا۔

اس تاریخی پس منظر میں خدا معلوم ہندو ''اکھنڈ بھارت'' کا دعویدار کیسے بن گیا، جب کہ ہندومت کے دور کے کسی بھی حصے میں یہ برعظیم متحد نہ ہو سکا تھا، بلکہ اس کے اتحاد کے زمانے صرف بدھ مت (اشوک)، اسلام (محمد شاہ تغلق اور اورنگ زیب) اور عیسائیت (انگریز) کے دور میں تھے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب کی دانستہ بیخ کنی، بگاڑ اور کجی کی وجہ سے ہماری نئی نسل ان حقائق سے بے بہرہ ہے اور بڑی آسانی سے ہندوستانی پروپیگنڈا کا شکار ہو کر قیامِ پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اپنے سینے میں پلنے والی تپ دق پر پوری رازداری کا ڈھکن دبائے قائداعظم ان چھے محاذوں پر اکیلے برسرِپیکار تھے۔

جون ۱۹۴۵ء میں پہلی شملہ کانفرنس میں قائداعظم نے اصرار کیا کہ ہندوستان کی آزادی کی

طرف جو پہلا قدم اٹھایا جا رہا ہے کہ وائسرائے کی نئی ایگزیکٹو (Executive) کونسل صرف ہندوستانی ممبران پر مشتمل ہوگی، اس میں مسلمان ارکان کو نامزد کرنے کا مکمل حق صرف مسلم لیگ کو ہوگا اور کانگریس صرف ہندو نمائندے نامزد کر سکتی ہے۔ اس پر کانفرنس ناکام ہوگئی۔[۱۶] تو چند ہفتوں بعد جولائی میں قائداعظم نے کھلا چیلنج دے دیا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے عام انتخابات کر کے اس حقیقت کو پرکھ لیا جائے کہ کتنے مسلمان کانگریس کے ساتھ ہیں اور اگر نہیں ہیں تو کانگریس کو نمائندے کی نامزدگی کا حق کیسے مل سکتا ہے۔ یہ بلاشبہ ''کرو یا مرو'' (Do or Die) والا راستہ تھا۔ کیونکہ مسلم لیگ کی مخالف آوازیں ابھی بھی بلند اور پُرشور تھیں، مگر اس کے باوجود اس چیلنج کی وجہ سے مسلم لیگ بڑی تیزی سے ڈرامائی انداز میں ایک عوامی جماعت میں تبدیل ہونے لگی۔

یوں لگتا ہے کہ قائداعظم کے منہ سے یہ چیلنج مشیت نے دلوایا تھا، کیونکہ یہ انتہائی بروقت ثابت ہوا۔ عین اُس وقت جب مشیت خود زمانے بدلنے میں ایک نیا ورق پلٹ رہی تھی اور حیرتوں سے لدے ہوئے لمحوں کی بوچھاڑ تھی۔ صرف چند ہی ہفتوں کے دوران دن اور رات جیسے ایک ہڑبونگ کے عالم میں واقعات اور حادثات اُگل رہے تھے۔ مئی میں سقوطِ برلن کے بعد ہٹلر (Hitler) لاپتا ہو چکا تھا، مگر جاپان لڑ رہا تھا۔ جولائی میں انگلستان کے انتخابات میں ونسٹن چرچل (Winston Churchill) کی جگہ ایٹلی (Clement Attlee) اور اس کی لیبر (Labour) پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی۔ اگست میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر تاریخ میں پہلی دفعہ ایٹمی دوزخ انڈیلی گئی اور جاپان کی شکست کے بعد ۲ رستمبر ۱۹۴۵ء کو دوسری جنگِ عظیم ختم ہوگئی۔ جاپانی فوجوں کے ساتھ سبھاش چندر بوس کی قیادت میں لڑنے والی آزاد ہند فوج نے بھی ہتھیار ڈال دیے، تو آزاد ہند فوج کے حقیقی بانی جنرل موہن سنگھ اور دیگر تین ہیرو افسران[۱۷] کے خلاف کورٹ مارشل شروع ہو گئے۔ تب پنجاب میں احتجاجی جلوس نکلنے لگے۔ کیونکہ ان چاروں کا تعلق پنجاب سے تھا۔

اسی ہلچل سے کچھ عرصہ پہلے اسلامیہ کالج، لاہور سے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قراردادِ پاکستان کے لیے بڑی منظم جدوجہد شروع کر چکی تھی اور ۳۰ رطلباء پر مشتمل دستے صوبے کے دیہاتوں میں پھیلتے جا رہے تھے تاکہ یونینسٹ پارٹی کا زور توڑ سکیں۔ یہ بہت جلد یونینسٹ حکومت کے خلاف ایک طاقتور تحریک بنتے گئے۔ قائداعظم کے چیلنج کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء بھی یوپی (United Provinces) میں پھیلنے لگے اور صوبۂ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) میں ریفرنڈم سے پہلے اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء نے بھی دیہاتوں میں پھیل کر پاکستان کے حق میں ایسا کامیاب جہاد کیا کہ کانگرس کی حمایتی حکومت کے باوجود سارے صوبے نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیے۔ اس

طرح حصولِ مقصد کی پُرخلوص جدوجہد ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں تیزی سے پھیل گئی۔

آج ہندوستان کے سابقہ یوپی سے آنے والوں میں سے بعض کا یہ اصرار درست نہیں کہ پاکستان صرف انھوں نے ہی بنایا تھا اس لیے اس ملک کو چلانے کا زیادہ حق بھی انھی کو ہے۔

اس طرح ۱۹۴۵ء میں ہر طرف سیاسی گرد اُڑنے لگی تھی جس کی دھند میں مستقبل اپنا روشن چہرہ چھپائے دھیرے دھیرے قریب آ رہا تھا۔ ہر گزرنے والا دن اسے ایک قدم آگے لے آتا لیکن اس زمانے سے کچھ ہی عرصہ پہلے (غالباً ۱۹۴۴ء میں) وقت نے ایک اُلٹی زقند بھری۔

صبح کی سفیدی اپنے معمول کے مطابق دھیرے دھیرے بیدار ہو رہی تھی اور اندھیرا شرمندہ سی پسپائی کر رہا تھا کہ ہمارے دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی... ماضی کی دستک... کھولا گیا تو باہر وہ دونوں بچے خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے جو ہمارے ہاں صبح دودھ لایا کرتے تھے اور جن کی والدہ کو بیٹے کی جدائی کے غم میں غشی کے دورے پڑتے تھے۔

''ہمارے بھائی جان رات کو گھر واپس آ گئے۔'' وہ بے خودی کے عالم میں چلّائے اور پھر یہ خبر دوسروں تک پہنچانے آگے بھاگ گئے۔

ان بچوں کے ذریعے واقعی ماضی ایک بھولی بسری دستک دے رہا تھا۔ ان کا بڑا بھائی ۱۹۴۰ء میں برطانوی حکومت اور خاکساروں کے گمبھیر تصادم کا مجاہد تھا۔ وہ جب چار برس بعد گھر واپس لوٹا تو اس المیے کی گونج صدا بہ صحرا کی طرح گم ہو چکی تھی۔ حکومت اس تحریک پر ہر پابندی کی کڑی نگرانی کر رہی تھی اور جلیانوالہ باغ جیسا لاہور کا سانحہ پرانے محاورے ''تل کی اوٹ پہاڑ'' کی مثال بن چکا تھا۔ کیونکہ رعایا کی آنکھ کی پتلی پر سامراجی پابندیوں کا تل اتنی مضبوطی سے رکھ دیا گیا تھا کہ پہاڑ جیسی تاریخ آنکھ اوجھل ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں ملک کے گلی کوچوں میں مسلمانوں کی سیاست میں خلا کی سی کیفیت تھی۔ کیونکہ علامہ مشرقی کی ہمہ جہت حاوی شخصیت کی گرفتاری کے بعد کسی مضبوط قومی قیادت کی مسند بالکل خالی پڑی تھی۔ جس کی طرف محمد علی جناح دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے اور ان کے قائداعظم تک پہنچنے میں ابھی فاصلہ بھی تھا اور دشوار گزار مراحل بھی تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے معدودے چند بکھرے ہوئے پودوں کو تراشنے اور ان کے گرد عوامی گھاس کا فرش بچھانے کے لیے وقت درکار تھا، تاکہ اس وسیع سبزے کی شناخت کا سبز پرچم بالآخر سربلند ہو کر لہرا سکے۔ ہماری قومی تاریخ کا حیران کن پہلو یہ ہے کہ محمد علی جناح نے یہ طویل فاصلہ چند ہی برس کے مختصر وقت میں انتہائی فہم و فراست اور چابک دستی سے طے کر لیا۔

واپسی کے چند روز بعد وہ لڑکا اپنی والدہ کے ساتھ اظہارِ تشکر کے لیے ہمارے گھر والوں

سے ملنے آیا۔ مگر میں کہیں باہر تھا۔ اس لیے اپنے اشتیاق کے باوجود نہ دیکھ سکا، مگر دو چار روز بعد میں مری روڈ پر چوہدری مولا داد کی بیٹھک کے پاس نذر مسلم لائبریری[۱۸] گیا۔ تو وہ حاضرین کے جھرمٹ میں گھرا تھا۔ جو اس سے اُسی سانحے کی تفصیلات پوچھ رہے تھے۔ میری مشتاق آنکھیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ قریباً پچیس برس کی عمر... چار سالہ قید با مشقت سے مرجھایا ہوا جوان وجود... گولیاں لگنے سے مستقل طور پر لنگڑی ٹانگ... اور شکست خوردہ لہجے میں یاس آمیز گفتگو۔ جیسے اسے احساس ہو کہ گیا وقت اور لمحۂ موجود اسے کہیں بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اپنی رہائی کے بعد وہ یقیناً سن چکا ہو گا کہ علامہ مشرقی کو اب اکثر لوگ پاگل مشرقی کہتے تھے۔ کیونکہ گزشتہ چار برس کے دوران ایک منظم مہم کے تحت جمعے کے وعظ میں مولوی صاحبان یہ کہتے رہتے تھے کہ قید کے صدمے سے علامہ مشرقی جیل میں پاگل ہو چکا ہے۔

"سب سے آگے صوبہ سرحد کا پٹھان ضیغم خان جھنڈا اُٹھائے مارچ کر رہا تھا۔ میں اس کے بعد چوتھی قطار میں تھا۔" وہ دھیرے دھیرے بتا رہا تھا لیکن کبھی کبھی ماضی کے شرارے اس کی آنکھوں میں بے اختیار چمکنے لگتے۔

"کیا صحت مند جوان گبرو تھا جی... چھے سات فٹ اونچا قد... چوڑا چکلا سینہ... سرخ و سپید رنگت... جیسے خدا نے ضیغم پیدا ہی اس لیے کیا ہو کہ جھنڈا اُٹھا کر گوروں سے مقابلے کا سامنا کر سکے۔ بھاٹی دروازے کے ہیرا منڈی بازار میں ہم مارچ کر رہے تھے۔ ۳۱۳ خاکساروں کی تین قطاریں بھی خاصی لمبی تھیں۔ اگلے سرے کے سامنے جھنڈا بلند کیے ہوئے جب ضیغم تھانہ ٹبی اور نوگزے کی قبر کے درمیان پہنچا تو گورا پلٹن کی گھڑسوار پولیس نے راستہ روک لیا۔ ہمارے سالار نے "جیش باش" کا حکم دیا تو گورا ڈی ایس پی (DSP) مسٹر بیٹی (Mr. Betty) پہلے تو سالار سے اُلجھتا رہا۔ پھر اس کے افسر نے پاس کھڑے سالار کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اس پر ہڑبونگ مچ گئی۔ تب کسی نے چیخ کر آرڈر دیا اور گوروں نے ہماری صفوں پر یلغار کر دی تاکہ ہم منتشر ہو جائیں۔ لیکن جدھر ایک گھوڑا جاتا وہاں کئی بیلچے اُٹھ جاتے۔ تب زخمی گھوڑے گھبرا کر واپس بھاگے اور اپنی پولیس پر ہی چڑھ دوڑے۔ پھر پولیس کی کئی سیٹیاں بجنے لگیں اور اردگرد کی گلیوں سے رائفل پولیس والے بھاگتے ہوئے نکل آئے۔ بھاگم بھاگ میں ہی انھوں نے قطاریں بنائیں اور گورے افسر انھیں چیخ چیخ کر آرڈر دیتے رہے... اور... پھر تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔

اس نے سر پکڑ لیا... زور سے آنکھیں میچ لیں... اور... جھرجھری سی لی... لوگوں کے جھرمٹ میں سے کسی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر دلاسہ دیا... تو چند لمحوں کے سکوت کے

بعد اس نے بات جاری رکھی۔

میں نے ضیغم کو ڈولتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اسے گولی لگی ہے۔ مگر اس نے بڑی مشکل سے اپنا توازن قائم رکھا اور جھنڈے کو نیچا نہیں ہونے دیا۔ میں اپنی چوتھی قطار سے آگے بھاگا کہ جھنڈا تھام لوں، مگر میری ٹانگ میں دو گولیاں لگیں اور میں زمین پر گر گیا۔ اس طرح گرنے سے میری جان تو بچ گئی کیونکہ اس کے بعد گولیاں سنساتی ہوئی میرے اوپر سے گزرتی رہیں اور میں ادھر اُدھر سر گھما کر دیکھتا رہا۔ مگر جو منظر میں نے دیکھے وہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ مگر اب کسی نے دلاسہ نہ دیا۔ جیسے کسی کو دلاسہ دلانے کا ہوش ہی نہ ہو۔

"کیا دیکھا؟" بالآخر کسی نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

کیا بتاؤں جی کیا کیا دیکھا۔ گولیوں سے ساتھیوں کو دائیں بائیں گرتے دیکھا۔ غصے میں بیلچے گھماتے ہوئے خاکساروں کو گولی چلانے والوں کی قطار پر حملے کرتے دیکھا۔ پولیس والوں کو اپنے ساتھیوں کے پیٹ میں سنگینیں گھسیڑتے ہوئے دیکھا۔ مقابلہ اس وقت تک جاری رہا جب ہمارے سالار نے خود گرنے سے پہلے "برخاست" کا حکم نہیں دیا۔ اس کے بعد جس خاکسار کا جدھر منہ اُٹھا وہ بھاگا... ان کے تعاقب میں سنگینیں تانے اور گولیاں چلاتے پولیس والوں کو دیکھا۔ کئی خاکسار اردگرد کی عمارتوں میں طوائفوں کے بالاخانوں کی سیڑھیاں چڑھ گئے تو میں نے پولیس والوں کو پہلے تو ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا... اور پھر... اور پھر ... دوسری اور تیسری منزل کی بالکونیوں سے خاکساروں کو نیچے بازار میں پھینکتے دیکھا۔ دیکھیں ناں جی... ان پولیس والوں میں کئی ہندو اور سکھ بھی تو تھے ناں۔

پھر وہ چپ... سب چپ... تھوڑی دیر سناٹا چھایا رہا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" کسی کی آواز اُبھری، "کہ ہندو، سکھ اور مسلمان طوائفوں نے خاکساروں کو اپنے گھروں میں چھپا کر بہت مدد کی؟"

اس کا گلا جذبات بھرے گھونٹ نگلنے کی سی حرکت کرتا رہا۔ ساتھ ہی اس کا سر اثبات میں ہلتا گیا۔ پھر اس نے آنکھوں سے مچلنے والے آنسو دونوں ہاتھوں سے پونچھے اور بمشکل اتنا کہہ سکا،

"بہت... بہت... مدد کی۔"

لوگوں کے جھرمٹ میں سے کسی نے بلند آواز میں انگریزوں کو دو تین انتہائی فحش گالیاں سنا دیں... اور یہ گالیاں سن کر جیسے اس کا کیتھارسس (catharsis) ہو گیا اور وہ ایک دم سنبھل کر بولنے لگا۔

"طوائفوں کی مدد کے تو ایسے ایسے قصے ہمارے ساتھیوں نے جیل میں سنائے کہ حیرت ہوتی

ہے...“

میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ مڑ کر دیکھا تو بڑے بھائی مجھے کھینچتے ہوئے جھرمٹ سے باہر لے گئے۔

”تم کافی دیر سے باہر ہو۔ ابا جان نے بھیجا ہے کہ جا کر اسے لے آؤ۔“

میرا خیال تھا کہ جلد ہی اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ مگر انھی دنوں ابا جان کے تبادلے کی وجہ سے ہمیں لاہور منتقل ہونا پڑا اور راولپنڈی سے رابطہ بالکل ٹوٹ گیا۔

تب چار برس پیشتر لاہور سے اُڑان بھرنے والے دو قومی نظریے نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور اس کی اُڑان اونچی بھی ہونے لگی اور چاروں طرف پھیلنے بھی لگی۔

حواشی

۱۔ اُس وقت محمد علی جناح، قائداعظم نہیں کہلاتے تھے۔

۲۔ تفصیلات کے لیے دیکھیں: ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری کی تصنیف تحریک پاکستان میں پنجاب کا کردار ۱۹۹۶ء ایڈیشن (کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۶ء) ص: ۱۲۲۔

۳۔ محمد اعظم چوہدری، ص: ۱۲۳۔

۴۔ اس کے ساتھ بحث مباحثے کے بغیر ایک اور قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ۱۹ / مارچ کو خاکساروں پر گولی چلائے جانے کی فوراً عدالتی تفتیش کرائی جائے۔

۵۔ قراردادِ پاکستان کے ایک برس بعد تک ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کے ابتدائی ممبران اور شاخوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لاہور شہر میں صرف پانچ شاخیں اور ۲۰۰۰ / ابتدائی ممبران تھے۔ امرتسر میں ۲۲ / شاخیں اور ۷۶۵ / ممبران تھے۔ راولپنڈی شہر میں ۸ / شاخیں اور ۱۲۰۰ / ممبران تھے۔ فیروز پور میں ۶ / شاخیں اور ۲۵۵ / ممبران تھے۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں: ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری، ص: ۱۴۷)۔

۶۔ ہندو پریس: ملاپ، پرتاب اور ویر بھارت + مسلمان پریس: زمیندار، احسان، انقلاب۔

۷۔ علامہ اقبال کی تجویز پر جنوری ۱۹۳۷ء میں اسلامیہ کالج، لاہور کے اسٹاف روم میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پہلے عارضی انتخابات میں طالب علم حمید نظامی صدر چنے گئے (محمد اعظم چوہدری، ص: ۱۴۶)۔

۸۔ جلیل قریشی، تاریخ کا سفر (راولپنڈی: جولائی ۲۰۱۳ء)، ص: ۲۲۔

۹۔ اُس زمانے میں انگریزی ادویات والے ڈاکٹروں کے مقابلے میں حکیموں کی بھی بہت موجودگی تھی اور ان کے مصدقہ نسخے عام استعمال کیے جاتے تھے۔

۱۰۔ انگریز کے دور میں قانون اور قواعد پر اتنی سختی سے عمل ہوتا تھا کہ حکومت کی ساکھ اور عوامی اعتماد دونوں ہی انتہائی مضبوط اور پائیدار تھے۔ سرکاری قاعدے کے مطابق ایک روپے کا سکہ ایک تولہ خالص چاندی کا بنتا تھا۔ استعمال کرنے والے عوام جانتے تھے کہ حقیقت میں بھی ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ اس لیے سنار اپنے چھوٹے سے ترازو میں ایک تولے کا باٹ استعمال کرنے کی بجائے ایک روپے کا سکہ استعمال کرتے تھے یا روپوں کو پگھلا کر خالص چاندی کے زیورات بناتے تھے۔

۱۱۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک-- بھارت جنگوں میں حکومتِ پاکستان نے ملک کے دونوں حصوں میں اُس طرف انتہائی غفلت برتی۔ حالانکہ دونوں دفعہ فوجی ڈکٹیٹر ہمارے حاکم تھے۔

۱۲۔ اُس وقت جنگی طیاروں (fighters) کی تازہ ایجاد ابھی ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

۱۳۔ جہاں آج کل مری روڈ پر اسٹیڈیم اور زرعی یونیورسٹی ہیں۔

۱۴۔ پہلا اسمبلی ایریا سنگاپور تھا۔ جہاں مشرقِ بعید میں لڑنے کے لیے اتحادی فوجیں اکٹھی ہوتی تھیں۔

۱۵۔ ڈاکٹر کنیز یوسف کی انگریزی تصنیف *Towards A Tripolar World* میں مضمون بہ عنوان Geopolitical Aspects of Emergence of Pakistan، ص: ۵، ۱۹۷۵ء ایڈیشن (لاہور: طارق پبلشنگ ہاؤس، اُردو بازار، ۱۹۷۵ء)۔

۱۶۔ اس کانفرنس میں مخالفین کی طرف سے قائداعظم کو ۲۰ / کروڑ روپے نقد اور تاحیات ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ کی پیش کش کی گئی۔ بشرطے کہ وہ پاکستان کا مطالبہ واپس لے لیں۔ مگر قائداعظم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ہندوستان کے ۱۰ / کروڑ مسلمانوں کو ۲ روپے فی مسلمان کے حساب سے فروخت کرنے والا نہیں ہوں۔ (ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری، ص: ۱۴۲)۔

۱۷۔ کیپٹن شاہنواز خان، کیپٹن پی کے سہگل اور لفٹیننٹ جی ایس ڈھلون۔

۱۸۔ ایک منظم سیاسی جماعت کی طرف سے دو قومی نظریے کا پہلا باضابطہ اعلان تو ۱۹۴۰ء میں ہوا، مگر اس کی خاموش روح ہمیشہ سے ہزاروں علامتوں کی زبان سے ایک خاموش پکار دے رہی تھی۔ ان متعدد اداروں اور طور طریقوں کی شکل میں جو ہندو اور مسلمان اقوام کے لیے مخصوص تھے، مثلاً قومی اسکولوں، کالجوں اور لائبریریوں کے نام، دکانیں، سائن بورڈ، مخصوص طرزِ تخاطب، مسلم اور غیر مسلم آبادیوں کے نام (مسلم گنج، سعدی پارک، کرشن نگر، سنت نگر وغیرہ)۔ انھی کی ایک مثال نذر مسلم لائبریری تھی۔ یہ ایک کشادہ کمرے کی عمارت اور سامنے مری روڈ تک پھیلے ہوئے دالان پر مشتمل تھی۔ جہاں کسی رکنیت کے بغیر لوگ دن بھر میزوں پر بکھرے ہوئے روزانہ اخبارات پڑھتے رہتے تھے یا کمرے میں جا کر بچوں اور بڑوں کے رسالے، پیسہ اخبار کی کتابیں اور ادبی افسانوں کے مجموعے وغیرہ معمولی کرائے کے عوض لے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے مخیر لوگ اسی قسم کی سرگرمیوں پر خرچ کرتے تھے۔

دوقومی نظریہ

''دوقومی نظریے'' کی اصطلاح تو ماضیٔ قریب میں قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی سننے میں آئی۔ مگر اس اصطلاح کی روح صدیوں سے برِعظیم کی سرزمین پر ہر دم چلنے والی ہوا میں موجود تھی۔ میرے بچپن نے تو اس ہوا میں سانس لیا۔ اسے سونگھا، اس کے جھونکے سہے۔ اکا دُکا گرد باد دیکھے اور کئی دفعہ اس کا ذائقہ بھی ایسے چکھا جیسے مجبوری میں کڑوے بادام کھانے سے کوئی مفر نہ ہو۔ مگر جس طرح بادام کے ایک درخت پر کڑوے اور میٹھے بادام ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اسی طرح اس ہوا میں بھی دو قسم کے جھونکے تھے جو دو بنیادی حقیقتوں کو ظاہر کرتے تھے۔

پہلی میٹھی ... مگر سطحی ... حقیقت تو یہ تھی کہ شہروں میں بالعموم اور دیہات میں بالخصوص ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی افراد کے مابین بڑی اپنائیت، خیر سگالی اور ہمسائیگی کی فضا تھی، بلکہ بعض دفعہ تو بالکل برادرانہ تعلقات بھی ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں پر مبارک باد اور تہنیتی پیغام کا رواج عام تھا۔ عید، بقرعید، دیوالی، ہولی، دسہرہ اور راکھی جیسے تہواروں میں اکٹھی شرکت تو نہیں ہوتی تھی مگر احتراماً مبارک سلامت کا تبادلہ ضروری تھا۔ دیوالی کی مٹھائی، گوردواروں کا حلوہ (کڑاہ پرساد) اور عید کی سویاں اور چھوہارے ایک دوسرے کو ایسے بھیجے جاتے تھے جیسے دوسری قوم کے خوشگوار وجود کو مثبت انداز میں تسلیم کیا جائے۔ مذہبی تہواروں کے علاوہ انفرادی غمی خوشی یعنی ولادت، شادی اور فوتیدگی میں جزوی شرکت بھی عام تھی۔ کسی فرد پر مشکل وقت پڑتا تو اکثر اوقات غیر مذہب کے لوگوں کی طرف سے اس کی مدد کا انسانی فریضہ بھی ادا ہوتا رہتا تھا۔ قرب و جوار کے علاوہ اسکول اور کالج میں بھی میرے بڑے بھائیوں اور بہنوں کے حلقۂ احباب میں ہندو اور سکھ وغیرہ شامل تھے اور اکٹھے سیر کرنا یا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی عام تھا۔ محکمۂ تعلیم کے رفقائے کار سے جب ابا جان کا میل ملاپ ہوتا تھا تو کوٹ پتلون پہننے والے لوگوں میں سے یہ پہچاننا مشکل ہوتا تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان اور حفظِ مراتب کی حدود میں ان کے باتکلف اور بے تکلف رابطوں کی کئی مثالیں تھیں۔ ہمارے گرد و پیش اگر مختلف مذاہب ہر وقت نظر آتے تھے تو ان کے مابین باہمی انسانیت کا نظارہ بھی دیکھنے میں آتا تھا، بلکہ کئی دفعہ تو مذہب پر انسانیت حاوی ہو جاتی تھی۔ جیسے ۱۹۴۷ء کے خوں ریز فسادات کی بربریت میں کئی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں

نے ایک دوسرے کی مدد کی۔ ۱۹۴۴ء میں جب میں لاہور پہنچا تو اسکول میں دو لڑکوں والے ڈیسک پر میرے ساتھ والی کرسی پر ایک ہندو لڑکا بیٹھتا تھا، جس سے تعلیمی مقابلہ تو چلتا رہتا تھا کہ کسی مضمون میں کبھی وہ اوّل آ جاتا اور کبھی میں۔ مگر اس کے باوجود ہم دونوں اچھے دوست تھے۔ گو یہ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ہم نے اکٹھے مل کر کچھ کھایا پیا ہو۔ ملکی بٹوارے کے بعد ہم بھی ایسے بٹ گئے کہ ایک دوسرے کا پتا نہ چل سکا۔

دوسری کڑوی ... مگر بہت گہری ... حقیقت وہ تھی جو معاشرتی سطح سے نیچے چھپی رہتی تھی۔ مگر اکثر اوقات ڈولفن (dolphin) مچھلی کی طرح سطحِ سمندر سے اوپر فضائی چھلانگ لگا کر اپنی موجودگی ثابت کرتی رہتی تھی۔ اس حقیقت میں بعض دفعہ تو محض کسیلا پن ہوتا تھا۔ اتنا مبہم کہ منہ کا ذائقہ تو نہ بدلے مگر کچھ نہ کچھ محسوس ضرور ہو۔ مگر بعض دفعہ اتنی کڑواہٹ کہ نگلنا محال۔ ویسے تو ان دونوں کی پہچان یا شدت زمان و مکان اور انسان کے مطابق ہوتی تھی۔ مگر اس پوشیدہ سی کڑوی حقیقت کا کھلا اور برملا اظہار سارے برِعظیم کے ریلوے اسٹیشنوں اور بس کے اڈوں پر ہر دم اور ہر گھڑی ہوتا رہتا تھا۔ جیسے ہی کوئی ٹرین پلیٹ فارم، یا بس اپنے اڈے پر رکتی تو تھوڑی سی بخشیش کے عوض پانی پلانے والے کھڑکیوں میں جھانکنے لگتے اور ساتھ ساتھ ''ہندو پانی'' اور ''مسلمان پانی'' کی صدائیں بلند کرتے رہتے۔ یہ محض توجہ طلب صدا نہ ہوتی تھی بلکہ نسل در نسل گرجنے اور گونجنے والا اعلان تھا جو اس پوشیدہ کڑوی حقیقت کی گہرائی اور گیرائی کو پوری طرح اُجاگر اور مشتہر کرتا رہتا تھا کہ اس برِعظیم میں دو قومیں بستی ہیں جن میں سے کم از کم ایک قوم دوسری کو نہ تو پانی پلا سکتی ہے نہ اس کے ہاتھ سے خود پانی پی سکتی ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ پلید ہو جاتی ہے۔ پاکی پلیدی کا یہ خود پسندانہ زعم صدیوں سے برِعظیم کی فضاؤں میں تیر رہا تھا۔ گہری جڑوں والی اس پوشیدہ حقیقت کا واشگاف اظہار جب علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) اور قائداعظم نے قراردادِ پاکستان (۱۹۴۰ء) کے الفاظ میں ڈھالا تو حالاتِ حاضرہ نے اسے دوقومی نظریہ کہنا شروع کر دیا اور تاریخ نے یہ اصطلاح اُچک لی۔

ان دو قوموں کا آپس میں بیرونی اور سطحی میل ملاپ تو بہت تھا، مگر اصل اندرونی اور گہرا رشتہ (یا کسی بھی رشتے کی نفی) یہ تھا کہ اگر گرمی کی شدت یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے ریلوے اسٹیشن پر (یا کسی بھی اور جگہ پر) کوئی مسلمان کسی ''ہندو پانی'' والے سے پانی مانگ لیتا تو وہ اصرار کرتا کہ مسلمان یا تو اپنا گلاس پیش کرے، جس سے دور رہنے کی کوشش میں وہ ایک فٹ کی بلندی سے اسی گلاس میں پانی کی دھار گراتا۔ اگر گلاس نہ ہوتا تو کم متعصب ہندو اس کی اوک میں بلندی سے پانی

انڈیلتا، مگر زیادہ متعصب ہندو دو تین فٹ لمبے کھوکھلے بانس[1] کے ایک سرے میں پانی ڈالتا اور پینے والا مسلمان اس بانس کے دوسرے سرے سے منہ لگا کر پانی پیتا یا اوک میں لے کر پیاس بجھاتا۔ اپنے بچپن میں مجھے یہ منظر بارہا دکھائی دیا کرتا تھا۔ مگر میری کم فہمی مجھے یہ نہ بتا سکی کہ میں بھی ایک شودر یا اچھوت ہوں۔ چھوٹی عمر مگر بڑی اور پوری نحوست والا شودر۔

اپنے اس مرتبے کا احساس مجھے اُس دن ہوا جب میری بڑی ہمشیرہ نے مجھے ایک کتاب دے کر کہا کہ ابھی جا کر میری فلاں ہندو سہیلی کے گھر دے آؤ اور خود اس کے ہاتھ میں دینا تاکہ اسے فوری مل جائے، ورنہ گھر والے اِدھر اُدھر بھی رکھ سکتے ہیں اور وہ ڈھونڈتی رہے گی یا انتظار کرتی رہے گی۔ وہ لڑکی اکثر اوقات ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھی اور مجھ پر بڑی شفقت کیا کرتی تھی۔ اس لیے میں خوشی خوشی چل پڑا۔ وہاں پہنچا تو صحن سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ رسوئی (کچن یا باورچی خانہ) میں داخل ہو رہی ہے۔ جہاں دو خواتین اور بھی بیٹھی تھیں۔ چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا تاکہ کتاب اس کے حوالے کر سکوں۔ مگر میرے داخلے کے ساتھ ہی وہ دونوں عورتیں ''ہائے ہائے'' کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئیں اور وہ لڑکی مجھے تقریباً گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر لے آئی۔ میں نے کتاب آگے بڑھائی تو بڑی درشتی سے کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر مجھے کندھے سے دھکیلتی ہوئی ڈیوڑھی تک لائی۔ بڑی بے ساختگی سے بڑبڑائی ''کاکا اے کی کیتا ای'' (لڑکے یہ تم نے کیا کر دیا) اور گھر سے باہر جانے کا دروازہ کھول دیا۔

اس غیر متوقع طرزِ عمل پر بھونچکا سا ہو کر میں چند لمحے گھر کے باہر حیران و ششدر کھڑا رہا اور پھر بجھے ہوئے دل سے گھر کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچا تو دوسرا غیر متوقع واقعہ یہ ہوا کہ ہمدردی کے دو بول سننے کی بجائے مجھے والدہ سے ڈانٹ پڑنے لگی کہ تم ان کے باورچی خانے میں کیوں گھسے تھے۔ پھر بعد میں انھوں نے آرام سے سمجھایا کہ ہندوؤں کے باورچی خانے میں اگر کوئی مسلمان چلا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری رسوئی پلید ہو گئی ہے۔ وہ اس وقت تک پکنے والی یا پکائی ہوئی ہنڈیا اور خوراک کو پھینک دیتے ہیں۔ اگر شہروں کے گھر کا پکا فرش ہو تو خوب رگڑ رگڑ کر دھلائی کرتے ہیں اور اگر دیہات کے گھر کا کچا فرش ہو تو نئی مٹی، گائے کے گوبر اور پیشاب سے ازسرنو نئی لپائی کرتے ہیں اور اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق اس طرح رسوئی کو دوبارہ پاک بنا لیتے ہیں۔ تم تو اندر جھانک کر فوراً باہر آ گئے مگر ان کے سارے گھر کو اب بہت کام کرنا پڑے گا۔

میں حیرانی سے سوچتا ہی رہا کہ انسان پلید اور پیشاب پاک کیسے ہو سکتا ہے۔ بلکہ آج تک حیران ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو مجھے اپنی باقی زندگی ایک پلید انسان کے طور پر

بسر کرنا پڑتی، بشرطیکہ ہم ایسے ذی روح کو انسان کہہ سکیں۔

یہ واقعات یا حادثے میرے مینار کی پہلی اور دوسری منازل میں ہوتے رہے اور آج جب میں اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے نیچے جھانک رہا ہوں تو میری نظریں چھٹی اور ساتویں منزل میں اٹک جاتی ہیں جہاں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہندوستان کے ادیبوں کے ایک وفد کی اسلام آباد میں آمد کے مناظر ہیں۔ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کی ایک تقریب میں ہندوستانی وفد کے اراکین نے باری باری تقاریر کیں۔ مگر الگ الگ پیرائے میں سب بولنے والے ایک ہی بات پر زور دیتے رہے کہ پاکستان میں آ کر انھیں بہت خوشی ہوئی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی مٹی پر کھڑے ہیں۔ کیونکہ ہم دونوں اصل میں ایک ہی ہیں۔ چند تقاریر میں بار بار یہ بات سننے کے بعد میں نے ہاتھ اُٹھا کر بولنے کی اجازت چاہی اور عرض کی کہ ہماری مٹی آج بڑی مسرت سے اپنے ہمسائے کا خیر مقدم کر رہی ہے، مگر میں بصد ادب یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ایک نہیں بلکہ دو ہمسائے ہیں اور ہمیں مزید خوشی ہو گی اگر ہم اس ہمسائیگی کے رشتے کو خوش اسلوبی سے پروان چڑھاتے جائیں، تو ناخوشگوار ماضی کی طرف لوٹنے کی بجائے آئندہ خوشگوار مستقبل کی طرف اکٹھے مل کر چلیں گے۔

تقریب کے دوران کھانے کے وقفے میں ہمارے دو تین نوجوان پاکستانی ادیب میری اس تصحیح پر بہت معترض ہوئے کہ گھر آئے مہمانوں سے ایسی بات کرنے سے خیر سگالی کی فضا مجروح ہوتی ہے۔ ان سے تو میں نے اس وقت یہی کہا کہ خیر سگالی دو طرفہ ہوتی ہے اور ہمسائے کا مہمان بن کر اس کے گھر میں ملکیت اور شراکت جتانے سے بھی خیر سگالی مجروح ہوتی ہے۔ مگر دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ میں ان کی نوعمری کو اپنے مینار کی پہلی اور دوسری منازل کیسے دکھا سکتا ہوں یا انھیں باور کرا سکتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے میرے علاوہ سبھی مسلمان (بہ شمولیت قائداعظم اور علامہ اقبال) ان ہی منازل سے گزر رہے تھے۔ جن میں سے بعض نے تو اپنی تحریروں میں ایسے کئی واقعات سند کے طور پر درج کر دیے ہیں۔[2]

۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان سے قطع نظر اس برعظیم کی طویل تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ ماضی بعید سے بھی پرے قریباً ۳۵ رصدیاں پہلے آریاؤں کی آمد کے ساتھ ہی دو قومی نظریے نے جنم لے لیا تھا اور تب سے اب تک یہ اس سرزمین کی تاریخ کا لازمی حصہ اور اٹوٹ انگ رہا ہے۔ اس طویل دو قومی نظریے کے تحت ایک فریق تو ہمیشہ ہندو قوم رہی ہے۔ مگر دوسرے فریق یا قوم کا نام بدلتا رہا ہے۔ سب سے پہلے مرحلہ میں یہ دو فریق قابض آریائی اور مقامی کول دراوڑ تھے اور پہلے فریق (آریا) نے دوسرے فریق کو شودر قرار دے کر انسانیت سے خارج کر دیا تھا۔ دوسرے

مرحلے میں یہ دو فریق تھے۔ آریاؤں کی اولاد (ہندو) اور بدھ مت کے پیروکار۔ یہاں بھی پانچویں صدی عیسوی میں برہمنوں نے دوسرے فریق کا اس کے پیدائشی وطن سے نام و نشان ہی مٹا دیا۔ تیسرے مرحلے کے دو فریق ہندو اور مسلمان تھے جن میں سے اکثریتی فریق مسلمانوں کو اپنی ذات پات کی درجہ بندی میں شودر سے بھی نیچے کا درجہ دیتا تھا اور اچھوت نہیں بلکہ پلید سمجھتا تھا۔

ان تینوں مراحل میں ایک قدرِ مشترک یہ تھی کہ ہر دفعہ ہندو قوم دوسری ہم عصر قوم کو برابر تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ کول دراوڑ حقیر تھے۔ بدھ مت والے واجب القتل تھے اور مسلمان پلید تھے۔ مگر ہندو قوم ہر حالت میں افضل تھی اور یہی ان کا دھرم اور ایمان تھا۔ فریقین کی اس ناہمواری کو اگر الفاظ میں ڈھالا جائے تو دو قومی نظریہ بن جاتا ہے۔ اس لیے آج دو قومی نظریے میں کیڑے نکالنے والوں کو احساس ہونا چاہیے کہ یہ نظریہ قائداعظم کی ایجاد نہیں تھی بلکہ ہندوؤں کی خود ساختہ برتری کے زعم کی ایجاد تھی۔ قائداعظم نے تو بیسویں صدی میں ایک قدیم تاریخی حقیقت کو سادہ الفاظ میں بیان کیا تھا۔ جس کا ردِعمل بھی قدیم تاریخی انداز میں ظاہر ہوا کہ قراردادِ پاکستان کے فوراً بعد ہندو قوم نے اصرار کیا کہ برِعظیم کی اکائی ان کی مقدس گائے ماتا کی طرح ہے۔ جسے کاٹنا ایک مہاپاپ ہے۔ اس قوم کے قول و فعل کا یہ تضاد صدیوں سے ظاہر اور ثابت ہو رہا ہے کہ عملی طور پر وہ دوسری قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ مگر منہ سے یہی کہتے رہتے ہیں کہ ہم سب ایک ہیں۔ جس کی تاریخی تفسیر یہی نکلتی ہے کہ دوسری قوم کی شدھی (conversion) کر کے اسے اپنے اندر جذب کرنے کا ہر ممکن جائز و ناجائز ذریعہ اپناتے ہیں اور اس کو وہ ''ایک'' ہونا کہتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی میں نہ صرف ان کے اپنے دانشور نراد چوہدری نے اس طویل عمل کی تشریح اسی نقطۂ نظر سے کی ہے[3] بلکہ بیرونی مبصر بھی یہی کہتے ہیں[4] کہ ہندو قوم روایتی الفاظ کے بھی وہ معنی نہیں لیتی جو لغت میں درج ہیں، بلکہ اپنا نیا معنی یا مطلب نکالتی ہے۔

نراد چوہدری کی اس تشخیص سے صدیوں پہلے دوسرے لوگ بھی برِعظیم کی نبض شناسی کرتے رہے ہیں، جن میں سے سب سے نمایاں ابوریحان البیرونی (۹۷۳ء — ۱۰۴۸ء) ہے اس نے ہندوستان کی سرزمین پر رہ کر یہاں کے علوم سیکھے اور اپنے طویل مشاہدات کو کتاب الہند میں تحریر کیا۔ آج سے ایک ہزار برس پہلے قائداعظم سے منسوب دو قومی نظریہ البیرونی کی تحریر میں بھی جھلک رہا ہے اور اس کے مشاہدات قائداعظم کی اس تقریر کا حصہ لگتے ہیں جو انھوں نے قراردادِ پاکستان سے ایک دن پہلے لاہور میں کی تھی۔[5]

ہندو قوم کے متعلق البیرونی لکھتا ہے:

مسلمانوں کو یہ ملیچھ (ناپاک) کہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ مسلمانوں سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، قریب جانا، مل کر بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے۔ اگر کسی مجبوری کے تحت ہندوؤں کو مسلمانوں سے ہاتھ ملانا پڑ جائے تو اپنے ہاتھ پر رومال لپیٹ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دل میں جو نفرت کا لاوا پک رہا تھا یہ سب اس کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے، ذلیل و خوار کرنے، نفرت سے دور رکھنے اور قتل و غارت سے نیست و نابود کرنا زندگی کا جزو سمجھتے ہیں۔[6]

البیرونی کے قریباً دو سو برس بعد سلطان شہاب الدین غوری نے راجہ پرتھوی راج کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی جنگ و جدل بند کرانے کا واحد حل یہی ہے کہ دریائے جمنا کو حدِ فاصل بنا کر برِصغیر کو اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ مشرقی ہندوستان پر ہندوؤں اور مغربی ہندوستان پر مسلمانوں کا تصرف ہو، تاکہ دونوں قومیں امن و امان سے زندگی گزار سکیں۔[7]

شہاب الدین غوری کا یہ ''واحد حل'' قراردادِ پاکستان سے ۷۴۸ برس پہلے پیش کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کو قائداعظم کی غلط سوچ کا نتیجہ کہنے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ ساڑھے تین ہزار برسوں کے تناظر میں دو قوموں کے غیر متوازن رشتے کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں بار بار کیوں ہوتا رہا؟... آریا اور شودر ۱۵۰۰ ر برس ق م ... برہمن اور بدھ مت والے مرحوم: پانچویں صدی عیسوی ... البیرونی: گیارھویں صدی عیسوی ... شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج: بارھویں صدی ... دو قوموں کو ایک بنانے کے لئے شہنشاہ اکبر کا دینِ الٰہی اور انھیں دو ثابت کرنے کے لیے اورنگ زیب عالمگیر کا ردِعمل سولھویں اور سترھویں صدی ... علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد: ۱۹۳۰ء ... قائداعظم کی قراردادِ پاکستان: ۱۹۴۰ء ... قیامِ پاکستان: ۱۹۴۷ء

کسی حقیقت کو سچ ثابت کرنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہے؟... خصوصاً جب قدرت کے ارتقائی عمل میں کوہ ہمالہ کی طرح میرے وطن کے مینار کا اُبھار بھی نمودار ہو چکا ہے۔ ۶۷ ر برس بعد اس کی ساتویں منزل بن رہی ہے اور وہ خود ایک زندہ حقیقت بن چکا ہے۔

ہماری قومی قیادتوں میں اگر خلوص ہوتا، بصارت تیز اور بصیرت روشن ہوتی وہ قوم کو دانستہ جاہل نہ رکھتے اور پڑھنے والوں کے لیے تاریخ کا قتل نہ کرتے رہتے تو آج ہماری قوم وطن کے مینار کی سب سے اونچی منزل سے وہ سب کچھ دیکھ رہی ہوتی جو ہمارے آباء و اجداد، اُن کی پیش رو قومیں اور تاریخی حقائق ہمیشہ سے پکار پکار کر دکھاتے رہے ہیں۔ لیکن میرے آٹھ منزلہ مینار کی اونچائی سے مجھے یہ سب صاف دکھائی اور سنائی دے رہا ہے۔ کیونکہ پاکستان کی موجودہ نسل کے

برعکس میرے منھ میں ان کڑوے باداموں کی کڑواہٹ ابھی موجود ہے۔ جو ہند اور پاکستان کی گزشتہ اکائی میں تمام مسلمانوں کی مجبوری تھی۔ اس لیے میں ''ایک ہونے'' کے اصل معنی سمجھ رہا ہوں۔ جو کسی معیاری لغت والے معنی نہیں۔ بلکہ Neville Maxwell کی تشخیص کے مطابق وہ معنی ہیں جو ہندو ذہن صدیوں سے خود تراشا رہا ہے کہ ''ایک ہونے'' کا اصل ہدف مسلمانوں کی شدھی کر کے انھیں ہندو بنانا ہے اور ان کی دوئی کو ختم کر کے اپنی وحدت جتلانا ہے۔

اس ضمن میں میرے مینار کی مختلف منازل میں اٹکے ہوئے تجربات، مناظر اور مشاہدات کا ذکر تو مناسب مقام پر آئے گا۔ مگر فی الحال میں ایک تازہ ترین شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں، جو ۱۱ر دسمبر ۲۰۱۴ء کو بعض اخبارات کی سرخیاں اور بعض کالموں کا موضوع بن چکی ہے۔

برٹش میڈیا، بی بی سی (BBC) کے حوالے سے نوائے وقت (لاہور ایڈیشن) کے صفحہ ۳ کی جلی سرخی، ذیلی سرخی اور خبر کے متن کے مطابق ہندوستان میں آگرہ کی ایک کچی بستی میں ۲۰۰ر مسلمانوں کا مذہب تبدیل کر کے انھیں ''گھر واپسی'' کی تقریب میں ہندو بنایا گیا۔ اس تقریب کی تصاویر اخبارات میں بھی شائع ہوئیں اور ہندوستانی پارلیمنٹ میں بھی ان کی بازگشت سنی گئی۔ (گھر واپسی سے مراد اس پرانے مذہب کی طرف واپسی ہے جسے چھوڑ کر وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ اس طرح موجودہ مسلمانوں میں پرانا ہندو اسی طرح دریافت کیا جا رہا ہے جیسے بابری مسجد میں رام مندر دریافت ہوا تھا)۔

200 مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے پر بھارتی پارلیمنٹ میں ہنگامہ

روزنامہ نوائے وقت، لاہور: ۱۱ر دسمبر ۲۰۱۴ء

ایک ہونے یا کرنے کا یہ طریقِ کار ۱۵۰۰ ق م میں شروع ہوا اور ساڑھے تین ہزار برس میں ہوتے رہنے کے بعد اب اکیسویں صدی ۲۰۱۴ء تک جاری ہے۔ دنیا بھر کی لغات میں ''ایک'' کا مطلب چاہے کچھ بھی ہو... آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے۔ مگر برِعظیم کی اکثریتی قوم اس کے معنی صرف ''شدھی'' ہی بناتی ہے۔ اس لیے ان کے عالمِ تقریر کا اصل مدعا ایسے لوگوں سے عنقا ہی رہتا ہے جو اپنی تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے کی بجائے اپنے جغرافیے میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

جس بلندی سے میں نیچے جھانک رہا ہوں وہ میرے مینار کی آٹھویں اور وطن کے مینار کی چھٹی منزل ہے۔ یہاں سے دونوں میناروں کی تمام منازل نظر آ رہی ہیں اور چاروں طرف اُفق تا اُفق ساڑھے تین ہزار برس کی تاریخ کا پھیلاؤ دکھائی دے رہا ہے۔

وطن کے مینار سے ۱۱ر دسمبر ۲۰۱۴ء کی ''گھر واپسی'' کی ہندوستانی تقریب نظر تو آ رہی ہے مگر عجیب سی قومی بے حسی اور بے عملی کی دھند میں لپٹی ہوئی... اس کے مقابلے میں میرے مینار سے یہ ایسی صاف اور واضح نظر آ رہی ہے جیسے جلتے ہوئے مکان سے اُٹھنے والے سیاہ و سفید دھوئیں میں شعلوں کی زرد زبانیں اور منعکس روشنی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ وہاں کچھ ایسی تاریخوں کے شرارے بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں جن سے ہماری موجودہ نسل بے خبر ہے۔ اس لیے کہ وطن کے مینار سے انھیں دیکھنے کی کوشش ہی نہیں ہوتی۔

ان میں سے قریب ترین تاریخیں آج سے ۴۲ر برس پہلے کے ان دو برسوں میں بکھری ہوئی ہیں جب میں جنگی قیدی کے طور پر ہندوستان کی حراست میں تھا (۱۹۷۲ء — ۱۹۷۳ء)۔ تب سے میرے مینار کی چوتھی منزل میں کچھ حقائق آویزاں ہیں۔ کیمپ نمبر ۲۹ (VIP Cage) میں ہمیں تین انگریزی اخبار دیے جاتے تھے۔[8] اتوار والے دن ان میں سے ہر اخبار کے تین یا چار صفحات پر صرف ''ضرورتِ رشتہ'' قسم کے اشتہارات ہوتے تھے۔ اپنی بوجھل فراغت میں مصروفیت ڈھونڈنے کے لیے ہم پرانے محاورے تک بھی جانے کو تیار تھے کہ ''بیکار مباش کچھ کیا کر... کپڑے ہی پھاڑ کر سیا کر'' لیکن کپڑے تو ہمارے پاس دو ایک ہی تھے۔ اس لیے ہم دولہا دلھن کی تلاش میں نکلنے والے قافلے دیکھنے لگتے۔ جن کی گرد سے کچھ نئے موضوع برآمد ہو جاتے اور ہماری بار بار دُہرائی جانے والی تھکی ماندی گفتگو میں کچھ تازگی آ جاتی۔ ساتھ ہی خاردار تاروں کے تین حصاروں میں سے ہم اس معاشرے کے نادیدہ گوشوں میں بھی تاک جھانک کر سکتے تھے۔

دو برس کی مدت میں ہم نے دھیرے دھیرے محسوس کیا کہ روز بروز لڑکے اور لڑکیوں کی

طرف سے ان اشتہاروں میں اس وضاحت کا رجحان بتدریج بڑھتا جا رہا تھا کہ شادی کے لیے مذہب کی کوئی قید نہیں ہے۔ پھر انھی اخبارات میں چھپنے والے کالموں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان لڑکے اچھی ملازمت کے حصول کے لیے ہندو لڑکیوں سے شادی کرتے ہیں اور مسلمان لڑکیاں خوشحال خاوند اور آرام دہ زندگی کی تمنا میں ہندو لڑکوں سے شادی کر رہی ہیں۔ یعنی نئے جوڑوں کے محفوظ مستقبل کی یہی شرط تھی کہ ان میں سے ایک فریق ہندو ہو۔ اگر دونوں فریق مسلمان ہوں گے تو ان کی آئندہ خوشحالی مشکوک ہی رہے گی۔

ان دنوں ہمارے تبصرے اُس وقت کے مطابق ہوتے تھے۔ جب ہمارا علم یا تو اس شنید تک محدود تھا کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے فوراً بعد ہندوستان نے بڑی رازداری سے ایک وفد اس تحقیق کے لیے اسپین بھیجا تھا کہ وہاں آٹھ سو سالہ اسلامی حکومت کے بعد مسلمانوں کو کیسے ختم کیا گیا اور، یا ہم اس تاریخی حقیقت سے باخبر تھے کہ اسپین میں کئی مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو ختم کرنے میں ۱۱۷/ برس لگے تھے۔ چنانچہ اس وقت ہمارے تبصروں کی سمت یہ ہوتی تھی کہ گزشتہ پچیس برسوں میں آزاد ہندوستان کے معاشرتی رویے وہاں کے مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کو دھندلا کر رہے تھے اور آہستہ آہستہ اس کے کنارے بھی ٹوٹ رہے ہیں لیکن آج مزید بیالیس برس گزرنے کے بعد جب میرے علم میں ''گھر واپسی'' تقریب کا اضافہ ہوا ہے تو ان سب تاریخوں میں ایک سلسلہ وار ربط کا احساس ہو رہا ہے، کہ وہ دور تو درحقیقت آج کے اس دور کی دبے پاؤں چلنے والی تمہید تھی، جس میں مسلمانوں کی بتدریج تحلیل کی چاپ اب اونچی سنائی دینے لگی ہے۔ اسی لیے تاریخ کے اس بہاؤ کی سمت میرے مینار کی چوتھی اور آٹھویں منزل سے صاف دکھائی دے رہی ہے۔

اسی چاپ کی ایک اور آواز یہ تھی کہ اس زمانے میں ہمارے ایک جنگی قیدی ساتھی کو کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں بلایا گیا اور اس کے لندن میں مقیم بیٹے کا خط پڑھوایا گیا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ:

> میں جانتا ہوں آپ کو صرف پانچ روپے ماہوار قیدی الاؤنس ملنے کی وجہ سے بہت مالی پریشانی ہے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً بھیجی ہوئی چھوٹی چھوٹی رقوم کی شکل میں اب تک ۹۰/ پاؤنڈ بھیج چکا ہوں۔ مگر ہندوستانیوں نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں دیے۔ میری بے بسی اب کیا کر سکتی ہے۔ کیونکہ آپ دشمن کی قید میں ہیں... وغیرہ وغیرہ۔

خط پڑھوانے کے بعد اسے طویل لیکچر دیا گیا کہ آپ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہندوستان آپ کا دشمن نہیں ہے، بلکہ پورا دوست ہے اور دراصل ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ پھر اسے تاکید کی گئی کہ بیٹے کے نام ایسا ہی خط لکھ لائے۔ چنانچہ اس سے خط تو لکھوا لیا گیا مگر ۹۰/ پاؤنڈ میں سے ایک پیسہ

بھی نہ دیا گیا۔[9]

ہماری قید تو ۱۹۷۴ء میں ختم ہو گئی تھی۔ مگر اب ۲۰۱۴ء یہ احساس جگا رہا ہے کہ:

ع قید کو توڑ کے نکلا جب میں، اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے (آرزو)

اِنھی بگولوں کے تعاقب میں میری نظریں دونوں میناروں کے اردگرد تاریخی پھیلاؤ پر دوڑتی ہیں، تو وہاں ماضی کی ایک اور تاریخ کا گہرا رشتہ بھی چمک رہا ہے۔ یہ تاریخ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی ہے۔ جو وطن کے مینار کی کسی منزل سے واضح طور پر نظر نہیں آتی، کیونکہ یہ تاریخ کے قتل کی ادھوری کوشش میں اب گھائل سی ہو کر گمنامی میں پڑی کراہ رہی ہے۔ مگر اس کا مفصل ذکر قائداعظم محمد علی جناح کے ایک غیر ملکی سوانح نگار[10] نے بڑی تفصیل سے یوں کیا ہے۔

> اُس دن کے اجلاس میں محمد علی جناح نے اپنا روایتی لباس بدل ڈالا اور انگریزی سوٹوں کی بجائے پہلی دفعہ شیروانی زیب تن کی۔ اپنے ساتھی نواب محمد اسماعیل کے سر پر پہنی ہوئی کالی سمواری ٹوپی کو پسند کر کے اپنے سر پر آزمایا۔ پھر وہی ٹوپی پہن کر اجلاس سے خطاب کیا اور بعدازاں اسے جناح کیپ (Jinnah Cap) کے طور پر رائج کر کے مسلمانوں کی اس سماجی شناخت کو دوبارہ بحال کیا جو گاندھی اور نہرو کی سفید دو پلّی ٹوپی پہننے والے تسلیم کرنے سے منکر تھے۔ خصوصاً اُس زمانے میں جب خلافت کے خاتمے پر کمال اتاترک نے پھندنے دار سرخ ترکی ٹوپی پہننے پر پابندی لگا دی تھی اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایک نمایاں شناخت مجروح ہو رہی تھی۔
>
> اُس دن محمد علی جناح نے صرف لباس اور ٹوپی ہی نہیں بدلی بلکہ پانچ ہزار مسلمان عمائدین کے بھرے اجلاس میں اپنا ذہن بھی بدلنے کا اعلان کر دیا۔ اس کا موقع آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ تھا اور مقام لکھنؤ تھا، جس کا انتخاب مشیت نے یوں کیا تھا کہ اسی لکھنؤ میں ۲۱/ برس پہلے محمد علی جناح (جو اُس وقت کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے ممبر تھے) نے ۳۰/ دسمبر ۱۹۱۶ء کو اپنے صدارتی خطاب میں اعلان کیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ان کا ایمان ہے۔ اور ''لکھنؤ پیکٹ'' (pact) کا یہ اتحاد و اتفاق ہماری آزادی کی کنجی ہے، مگر آج اسی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے وہ اسی شہر میں کچھ اور ہی اعلان کر رہے تھے کہ کانگریس کی موجودہ قیادت کی تمام پالیسیاں صرف ہندو کے مفادات کی نگراں ہیں۔ اب تو سات اکثریتی صوبوں میں اپنی حکومتیں بنانے کے بعد ہندوؤں نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کا اقتدار ''رام راج'' میں بدل جاتا ہے، جس میں مسلمانوں کے لیے غیر مشروط غلامی کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے۔

جناح کے ذہن کی یہ تبدیلی اس طویل اور انتہائی ناخوشگوار کڑوے تجربے کا نتیجہ تھی کہ اپنی

جوانی کے ۲۸ / برس تک کانگریس کا ممبر رہنے اور ''ہندو مسلم اتحاد کا سفارت کار'' کہلانے کے باوجود وہ کانگریس سے مسلمانوں کے حقوق کے لیے آئینی تحفظات حاصل کرنے میں مسلسل ناکام ہوتے رہے اور اس دن تک ان پر ''ایک'' ہندوستانی قوم ہونے کے تمام مضمرات پورے طور پر آشکار ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے اس اجلاس میں جو ریزولیوشن منظور کیے گئے ان میں سے ایک کے ذریعے کانگریس کی مذمت کی گئی تھی کہ انھوں نے اپنی پارٹی کے سیاسی گیت ''بندے ماترم'' کو مسلمانوں پر ہندوستان کے قومی ترانے کی صورت میں زبردستی ٹھونسا۔'' دوسری قراردادوں میں تہیہ کیا گیا کہ ہندی کی بجائے اُردو کو ملک بھر میں مسلمانوں کی زبان کے طور پر آگے بڑھایا جائے گا اور یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں ایسی فیڈریشن (Federation) قائم کی جائے جس میں مسلمانوں کے حقوق اور مفادات آئین کے تحت محفوظ کیے گئے ہوں۔

یوں لگتا ہے کہ مشیت نے بھی اسی دن کا انتخاب کر کے اپنی آئندہ رضا کا عندیہ دے دیا۔ خلوص بھرے جذبات اور فکر و عمل کے نئے پیغام کی بھرپور یلغار سے محمد علی جناح اتنے نڈھال ہو گئے کہ ہفتے بھر کی کھانسی اور تیز بخار نے بڑی رازداری سے آئندہ کی ڈھکی چھپی تپ دق کی خاموش اطلاع کر دی۔

اڑھائی ماہ بعد کلکتہ میں طلباء سے خطاب میں قائداعظم نے کہا، ''میں نے لکھنؤ میں صرف خطرے کی گھنٹی بجائی ہے ... یہ گھنٹی ابھی بج رہی ہے، مگر مجھے فائر بریگیڈ کہیں نظر نہیں آتا ... خدا نے چاہا تو ہم اس آگ کو بجھا دیں گے۔''[۱۲]

دس برس بعد ۱۹۴۷ء میں یہ فائر بریگیڈ پاکستان کا پرچم لہراتے ہوئے پہنچ گیا۔ اسے ترتیب دیتے دیتے نحیف و نزار قائداعظم تو تیرہ ماہ بعد فوت ہو گئے۔ مگر بقایا عملے کی نااہلی کی وجہ سے یہ آگ اب بھی جل رہی ہے اور آج (۱۱ / دسمبر ۲۰۱۴ء) اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو ۷۷ / برس پیشتر محمد علی جناح کی دور رس نگاہ نے ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں دیکھ لیا تھا۔

میں سوچ رہا ہوں کہ ہندوستان نے تو اسپین کی اسلام دشمنی والی منزل کی طرف اپنا ۱۱۷ / برس لمبا سفر اپنی آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں شروع کیا تھا۔ مگر اس کی پیشگی خبر محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء میں ہی دے دی تھی۔ کیونکہ ان کی تاریخی فراست خوب جانتی تھی کہ مسلمان فوجیں ہندوستان اور اسپین میں ایک ہی برس میں داخل ہوئی تھیں (۷۱۱ء میں) اور جس مذہبی تعصب نے ان کا خاتمہ اسپین میں کیا تھا ویسا ہی مذہبی تعصب ہندوستان کی تاریخی فضا میں بھی رچا ہوا ہے۔

اسی ۱۱۷ / سالہ طویل سفر کی ایک اور پیشگی علامت ... ۱۹۴۵ء کی ایک شام جب مسلم لیگ

اور دو قومی نظریے کی اُڑان ذرا بلند ہو رہی تھی ... اپنے علاقے کے پارک میں ہم کئی لڑکے ہاکی کھیل رہے تھے ... ہندو، سکھ اور مسلمان ... کھیل میں پہلے اختلاف، پھر تکرار اور بعد ازاں ایک مسلمان اور ایک ہندو کھلاڑی کے مابین غصیلی دھکم پیل ... اچانک ہندو لڑکے نے اپنی ہاکی نچلی گولائی سے پکڑی۔ اس کے طویل دستے سے مخالف کی طرف نیزے کے انداز میں شست باندھی اور پھر تلوار کی طرح ہاکی کو چاروں طرف گھماتا ہوا پوری جارحیت سے حملہ آور ہو گیا۔ پہلی چوٹ پڑتے ہی مضروب کے سر سے خون جاری ہو گیا۔ پھر سب نے اکٹھی مداخلت کر کے انھیں علیحدہ کر دیا، مگر حملہ آور چیخ چیخ کر یہی للکارتا رہا کہ میں تو آج کل ٹریننگ لے رہا ہوں۔ تم میرا مقابلہ کیا کرو گے۔ اس وقت تو ہم سب ششدر رہے، مگر بعد کی چہ میگوئیوں سے پتا چلا کہ شہر میں بڑی بڑی حویلیوں کے اندر ہندوؤں کو رات کے وقت تلوار، نیزہ اور کمان سے تیر چلانے کی تربیت دی جاتی ہے، تاکہ ''مسلوں'' کا خاتمہ کیا جا سکے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ ایسی نیم عسکری ہندو تنظیموں سے (راشٹریہ سیوک سنگھ وغیرہ) جو بعد میں بہروپ بدلتے بدلتے آج ہندوستان کی برسرِ اقتدار پارٹی بھارتیا جنتا پارٹی (BJP) کا روپ دھار چکی ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ یہ تحریکیں بڑی رازداری سے اُس زمانے میں شروع کی گئی تھیں، جب خاکساروں کے لمبے دستے چپ راست کی صدا کے ساتھ ہندوستان بھر میں پریڈ کیا کرتے تھے۔ تب ان کے فکر و عمل کی اعلیٰ تربیت سے غیر مسلم پہلے تو مرعوب اور بعد میں خوف زدہ ہونے لگے، مگر یہ خوف اپنے جان و مال کے لیے نہیں تھا۔ ایک چوتھائی اقلیت سے تین چوتھائی اکثریت کے جان و مال بھلا کیسے غیر محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اصل خوف یہ تھا کہ دو قوموں کے غیر متوازن رشتے میں کہیں مسمار شدہ توازن بحال نہ ہو جائے اور صدیوں پرانے بندوبست میں کوئی ایسا خلل نہ پڑے جس سے ایک کم تر، حقیر اور پلید مخلوق دھرم والوں کی لگائی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے۔ گویا دو قومی نظریے کی یہ ایک منفی یا معکوس صورت تھی جو برعظیم کی فضا میں صدیوں سے رچی ہوئی تھی اور بظاہر چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات سے اس کی ہمہ وقت موجودگی ایسے ظاہر ہوتی رہتی تھی جیسے بے شمار ہلکے پھلکے تنکوں کے اُڑنے سے ہوا کی موجودگی اور رُخ کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔

مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے تعصب کی کئی کہانیاں میرے بڑے بہن بھائی اپنے اپنے تعلیمی اداروں سے اُٹھا لاتے اور ابا جان کے مسلمان دوستوں کی گفتگو میں یہ ذکر ہوتا رہتا کہ دفاتر میں مسلمانوں کی کارکردگی میں اور ترقی کی راہ میں کیسی کیسی رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ یہ بھی سنا کہ بعض ہندو حضرات ہندو فقیروں کو تو بھیک کی بجائے گالیاں دیتے تاکہ ان کی غیرت جاگ کر

انھیں بہتر انسان بنا سکے۔ مگر مسلمان فقیروں کو خوشی سے خیرات دیتے تا کہ وہ ہمیشہ کے لیے پختہ بھکاری ہی بنے رہیں۔[۱۳] زیادہ مثالوں کی تو یہاں گنجائش نہیں، مگر اپنی اس چھوٹی سی عمر میں ہی مجھے یہ احساس گھیرے رہتا تھا کہ جس ہوا میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ کچھ صاف نہیں ہے، بلکہ کسی حد تک مکدر اور مسموم ہے۔ غالباً اسی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے مجھے اُس شام ایک انجانی سی خوشی ہوئی، جب میں نے پہلی دفعہ قائداعظم کو دیکھا۔ حالانکہ میں اُس وقت تک ان کے ماضی سے ناواقف اور ان کے پیغام کی روح سے لاعلم تھا۔

پاکستان کی موجودہ نسل شاید ان باتوں کو نہ سمجھ سکے، کیونکہ انھوں نے نہ تو اُس محرومی کو دیکھا، سونگھا یا چکھا ہے اور نہ ہی اس سے چھٹکارے کی اُمید والی مسرت سے آگاہ ہیں، بلکہ وہ تو اس مذہبی اور معاشرتی زیردستی سے آشنا ہی نہیں ہیں، جس کے بوجھ تلے برِعظیم کے مسلمان اُس وقت کے ہندوستان میں پس رہے تھے۔ وہ آج کے ہندوستان میں بھی پس رہے ہیں، مگر دیکھی یا ان دیکھی مجبوریوں کی وجہ سے اظہار نہیں کر سکتے۔

میں نے ۱۹۴۴ء میں ساتویں جماعت پاس کی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں قائداعظم کشمیر سے واپسی پر پہلی دفعہ راولپنڈی آئے۔[۱۴] اُن دنوں شہر کی آخری حدود اصغر مال روڈ تک جاتی تھیں۔ ہمارے گھر کے سب لوگ اس صاف ستھری سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ جس کے دونوں طرف لوہے کے سادہ سے کھمبوں پر چمکتی ہوئی بجلیاں انتظامیہ کے حُسنِ انتظام (Good governance) کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اس علاقے میں اپنی کثرت کی وجہ سے ہندو سکھ تماشائی بھی بڑی تعداد میں جمع تھے۔ درمیانے سے حجم کا جلوس مری روڈ کی طرف جاتے ہوئے جب ہمارے سامنے سے گزرا تو ایک کار کی کپڑے والی چھت لپٹی ہوئی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے قائداعظم صاف نظر آ رہے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ جلوس میں کسی قسم کی ہلڑ بازی ہرگز نہ تھی۔ بلکہ ایک سنجیدہ سی روانی تھی اور ساتھ ساتھ ''قائداعظم زندہ باد'' اور ''مسلم لیگ زندہ باد'' کے نعرے تھے۔ جہاں جہاں سے کار گزرتی وہاں تماشائیوں میں سے چند جوشیلے مسلمان ان نعروں میں سنگت دیتے۔ مگر ہندو سکھ تماشائی خاموشی سے دیکھتے رہتے۔ یہ طرزِ عمل بھی دو قومی نظریے کی تصدیق تھی۔

اگلی شام کمپنی باغ (موجودہ لیاقت باغ) میں مسلم لیگ کے جلسے میں قائداعظم کی تقریر تھی جس میں چندسو افراد کا مجمع تھا۔ اس زمانے میں اسٹیج پر تین چار اور اسٹیج کے دو اطراف سو پچاس کرسیاں لگ جاتی تھیں اور سامنے کی جلسہ گاہ میں دریوں پر فرشی نشست ہوا کرتی تھی۔ میں کرسیوں

اور دریوں کے درمیان اسٹیج کے پاس ہی بڑے بھائی کے ساتھ کھڑا تھا اور تیس چالیس فٹ کے فاصلے سے قائداعظم کو تقریر کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تلاوتِ قرآن پاک کے بعد ایک نوجوان نے کچھ اشعار پڑھے۔[۱۵] پھر قائداعظم نے انگریزی میں تقریر کی۔ جس کا اُردو ترجمہ تقریر کے فوراً بعد کسی نے پڑھ کر سنایا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ ان کی آدھ گھنٹے کی انگریزی تقریر کے دوران حاضرین کی وہ اکثریت بھی سکتے کے عالم میں سنتی رہی جو انگریزی سے ناواقف تھی یا ان کا علم محدود تھا۔ نہ ہی ہندو سکھ سامعین میں سے کسی نے آوازہ کسا یا شور کیا۔ یہ غلام ہندوستان کی بالغ نظر سیاست کا سلجھا ہوا انداز تھا۔ اس کے برعکس آج کے آزاد پاکستان کی سیاست کے انداز جب دیکھتا ہوں تو ع

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال

چند ہی ماہ بعد ہم راولپنڈی سے لاہور منتقل ہو گئے اور فوراً ہی زمانہ قیامت کی چال چلنے لگا۔ اس طرح مشیت نے مجھے حالات کے مرکزی اکھاڑے کا قریبی شاہد بنا دیا اور میرے شعور کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر آگے بڑھانے لگی۔

میرا مینار دھیرے دھیرے وطن کے مینار کے ابتدائی اُبھار کی طرف سرکنے لگا...

قریب... زیادہ قریب... اور قریب تر۔

حواشی

۱۔ ''ہندو پانی'' کی صدا لگانے والے اکثر افراد ایسا بانس اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

۲۔ ایک ایسے ہی حوالے کے لیے دیکھیں پروفیسر احمد سعید کی کتاب دو قومی نظریہ...منہ بولتے زمینی حقائق جو ۲۰۰۶ء میں نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور نے شائع کی۔ اس کتاب میں ایسے ہی تجربوں سے گزرنے والوں کی تحریروں کا ذکر ہے۔ مثلاً ممتاز مفتی، شاہد احمد دہلوی، الطاف گوہر، شیخ عبداللہ، پروفیسر انور رومان، مشتاق احمد وجدی، چوہدری افضل حق اور دیگر حضرات (ص: ۳۰ سے ۴۰ تک)۔

۳۔ ص: ۹۳۔

۴۔ کچھ عرصہ ہندوستان میں تعینات ہونے والے انگریز مصنف Neville Maxwell کی کتاب *India's China War* ۱۹۷۰ء میں ہندوستان اور چین میں چھڑنے والی اس جنگ کے متعلق مصنف کا استدلال یہ ہے کہ محض الفاظ کی غلط تشریح کی بنا پر ہندوستان یہ جنگ چھیڑنے کا ذمے دار تھا۔

۵۔ ص: ۹۶۔

۶۔ پروفیسر احمد سعید، دو قومی نظریہ، ابتدائیے کا صفحہ xv۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ Statesman اور Times of India اور Hindustan Times۔

۹۔ تفصیلات کے لیے دیکھیں: مسعود مفتی، ہم نفس، دوسرا ایڈیشن (لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۵ء) ص: ۱۴۲۔

۱۰۔ اسٹینلے وولپرٹ، Jinnah of Pakistan ،1999ء ایڈیشن، (صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۳)۔

۱۱۔ ۱۸۸۵ء میں ایک بنگالی برہمن بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول آنند مانٹھ میں ایک گیت درج کیا تھا جو اس ناول سے بہت پہلے لکھا جا چکا تھا اور اس کی دُھن سر رابندر ناتھ ٹیگور نے ترتیب دی تھی۔ مگر مصنف نے ناول میں اس لیے شامل کیا تھا کہ وہ کالی دیوی اور درگا دیوی کا پرستار تھا۔ اس کے ناول کا ہندو ہیرو جب مرشد آباد کے مسلمان نواب کے خلاف بغاوت کرتا ہے تو اس کے فوجی یہی گیت گاتے ہیں۔ جو دراصل منظوم شکل میں کالی دیوی کے سامنے اُٹھائی ہوئی قسم ہے کہ وہ اس حلف کے ذریعے عہد کرتے ہیں کہ مسلمان بادشاہوں اور ان کے اثر کو برباد کر کے ہی دم لیں گے۔ ۱۹۰۵ء میں جب ہندو کانگریس نے بنگال کی تقسیم کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی (جس سے ۱۹۱۱ء میں یہ تقسیم ختم کر دی گئی) تو ناول کے اس گانے کو اپنی پارٹی کا ترانہ بنا لیا۔ ۱۹۳۷ء میں جب ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں اور وزارتیں قائم ہو گئیں تو انھوں نے یہ گیت ہندوستان کے قومی ترانے کے طور پر رائج کر دیا اور ہر صبح تمام تعلیمی اداروں میں گائے جانے پر اصرار کیا۔ چنانچہ ان علاقوں کی مسلمان اقلیت بہت رنجیدہ تھی۔

۱۲۔ اسٹینلے وولپرٹ، ص: ۱۵۳ تا ۱۵۴۔

۱۳۔ تفصیلات کے لیے دیکھیں: مسعود مفتی، ہم نفس، ص: ۱۴۳۔

۱۴۔ اس سے پہلے راولپنڈی میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں بہت محدود سی تھیں۔ کبھی کبھار اِکا دُکا جلسے مری روڈ پر اسلامیہ ہائی اسکول کے وسیع گراؤنڈ اور عمارت کے پُرشکوہ پس منظر میں ہوا کرتے تھے (اب تو بے ڈھنگی دیواروں نے وہ منظر ہی ختم کر دیا ہے) مگر قائداعظم کے دورے کے بعد یہاں کی مسلم لیگ میں بڑی توانائی اور سرگرمی آ گئی۔

۱۵۔ چند برس پیشتر ریٹائرڈ میجر صادق نسیم مجھے اپنی کتاب دینے آئے تو انھوں نے بتایا کہ اُس جلسے میں وہ اشعار انھوں نے پڑھے تھے۔ جو اُن کی اوائل عمر کی شاعری کی یادگار کاوش تھے۔ انھوں نے قائداعظم کے اس دورے کی دلچسپ تفاصیل بتائیں جن میں سے کچھ ان کی کتاب میں شامل ہیں: صادق نسیم، روشنی چراغوں کی (اسلام آباد: عکاس پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)۔

وہ تین برس

میں اس صدیوں پرانے شعر کا سُرور تو لے سکتا ہوں ؎

نہ بینی کہ چوں گُربہ عاجز شود
بر آرد بہ چنگال چشم پلنگ!

مگر میرا قلم اس تین سالہ اتھل پتھل کو گرفت میں نہیں لا سکتا، جب میں بلی کو اُٹھتے، غراتے، بال پھیلاتے اور حملہ آور ہوتے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی بچپن اور لڑکپن کی اُس خوردبین سے جو ہمارے رُوئیں رُوئیں کو چشمِ حیرت بنا دیتی ہے اور اسفنج کی طرح زندگی کو جذب کرتی ہے۔ قراردادِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے انتہائی مختصر وقت میں ہندوستانی معاشرے کی صدیوں پرانی، میٹھی اور سطحی حقیقت میں پہلے چار برس تو دراڑیں سی پڑتی رہیں۔ پھر لرزش سی ہوتی رہی۔ مگر اس کے بعد اگلے تین برس میں زلزلے اُٹھنے لگے اور ساتھ ہی پھٹتی ہوئی زمین کے نیچے صدیوں سے چھپی ہوئی گہری اور کڑوی حقیقت کا لاوا فواروں کی مانند باہر اُبلنے لگا۔

مشیت کے عجیب رنگ دیکھیں کہ ۱۹۰۵ء میں صرف ایک صوبہ بنگال کی تقسیم کے خلاف ہندو قوم نے ملک گیر کامیاب تحریک کے بعد وہ تقسیم تو ختم کرا دی، مگر اپنی اسی تحریک سے پورے ملک کی بتدریج تقسیم کا بیج بو دیا۔ جب ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی شکل میں مسلم قوم کا ردِعمل سامنے آیا۔ پھر مشیت وہ مالی تیار کرنے لگی جو اس بیج سے پھوٹنے والی نسل کی آبیاری کریں گے اور بالآخر پکی ہوئی فصل کاٹی جائے گی۔ محمد علی جناح نے ۱۹۰۴ء میں کانگریس میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے شمولیت کی۔ انھی دنوں ۱۹۰۵ء کے آس پاس پروفیسر آرنلڈ علامہ اقبال کو مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ شاعری سے توبہ کرنے کی بجائے اسے دوبارہ جاری کریں۔ اسی زمانے میں علامہ مشرقی گورنمنٹ کالج سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انگلستان جانے کی تیاری کرنے لگے اور ۱۹۰۷ء میں پانچ برس کے لیے وہاں چلے گئے۔ آئندہ بیس پچیس برسوں میں قوم کی بالعموم تربیت یا seasoning قدرت کے ایما پر ہوتی رہی اور ان تینوں افراد کی بالخصوص seasoning ہوتی رہی۔ جس میں قدرت ان تینوں کی موزونیت تراشتی رہی۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اندر مسلمانوں کے حقوق کا لاوا پکتا رہا۔ اقبال کی الہامی شاعری پکارتی رہی ؏

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

ہندو مسلم اتحاد کے سفارت کار جناح کی کانگریس سے مایوسی بڑھتی گئی اور علّامہ مشرقی مسلمانوں کی کردار سازی اور عسکری تنظیم کے ذریعے "جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا" کا درس دیتے رہے۔ مشیت کے زیرِ تربیت ان سب شاگردوں کی پروردہ بلّی مسلمان قوم تھی۔ جس نے سات برس کی گھات، غراہٹ اور حملے کے بعد بالآخر اکثریتی چیتے کے تعصب کی آنکھ پھوڑ دی۔

عاجز بلّی جیسی مسلمان قوم کا یہ حملہ تو برِعظیم کے طول و عرض میں ہر طرف ہو رہا تھا، مگر میں اسے لاہور کے مورچے سے دیکھ رہا تھا، جو اٹک سے قربِ دہلی تک پھیلے ہوئے وسیع صوبے کا مرکز تھا۔ اسی وسعت کے تناسب سے ہندو، سکھ اور مسلمانوں کے مابین محبت اور نفرت کے جوار بھاٹے اور ان کی لہریں بھی ویسی ہی وسیع، گہری اور ناقابلِ فہم تھیں۔

ایک لہر تو یہ تھی کہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہوئی ہے۔[۲] تو چند ہی ماہ بعد ۱۹۰۷ء میں مسلم لیگ کی شاخ پنجاب میں بھی قائم ہوگئی۔[۳] دوسری لہر یہ تھی کہ ۱۹۲۲ء میں جالندھر کے وکیل منشی رام نے شدھی تحریک شروع کر کے مسلمانوں کو "گھر واپسی" کے انداز میں دوبارہ ہندو بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس طرح وہ منشی رام سے سوامی شردھانند بن گئے۔ تیسری لہر یہ تھی کہ اگلے ہی برس ۱۹۲۳ء میں مذہبی اتحاد اور بھائی چارے کے لیے میاں فضل حسین اور چوہدری چھوٹو رام نے پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی (Punjab National Unionist Party) کی بنیاد رکھی، جو ہندو، سکھ اور مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی جماعت تھی اور عام طور پر انگریزی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔[۴] چوتھی لہر سکھوں کی تھی جو عموماً تو مسلمانوں کے قریب تھے۔[۵] مگر ان کے سیاسی لیڈر کانگریس کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے۔[۶] ایک طرف تو ان تینوں قوموں کے باہمی تعلقات میں ہمیشہ سیمابی سے اُتار چڑھاؤ کی کیفیت رہتی تھی۔ دوسری طرف انگریز گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی اور ایک برٹش مؤرخ[۷] کا اعتراف تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر ان کی سو سالہ پیش رفت اور قبضے میں سب سے زیادہ خونریز جنگیں پنجاب میں لڑی گئی تھیں۔[۸]

اپنے سو سالہ تجربے کی بنا پر برٹش انڈیا کی فوج میں اندرونی درجہ بندی اس طرح کی گئی تھی کہ نیپال کا گورکھا سب سے زیادہ جنگجو سمجھا جاتا تھا اور اس کے بعد PM یعنی پنجابی مسلمان تھا اور پنجابی سکھ تھے۔ غالباً انھی صفات کی وجہ سے ۱۹۴۷ء میں پنجاب کے فرقہ وارانہ فسادات انتہائی خوں ریز تھے اور پنجاب میں آبادی کی نقل مکانی انتہائی برق رفتار، خونبار اور خوفناک تھی۔ نقل مکانی یا

ہجرت تو برِعظیم کے دیگر علاقوں میں بھی ہوئی تھی مگر ہندوستانی پنجاب اور پاکستانی پنجاب میں اس کا رنگ دیگر تمام علاقوں سے مختلف ہی رہا اور یہی حال ہجرت کرنے والوں کے ادغام کا بھی تھا۔

اس پس منظر کی ضرورت اس لیے پڑی کہ کچھ ایسا ہی سبک رفتار مگر الجھا ہوا تاریخی طرزِ عمل ان تین برسوں میں بھی ظاہر ہوا۔ کہاں تو پچھلے چار برس میں پنجاب کی یونینسٹ حکومت ملک کے بٹوارے کی شدید مخالفت کر رہی تھی اور کہاں پنجابی عوام ان تین برسوں میں تیز آگ پر دھرے دودھ کی طرح اُبل اُبل پڑے۔

عوام کی اس منظم بیداری کا آغاز اسلامیہ کالج، لاہور سے ہوا، جہاں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران قائداعظم چھے مرتبہ آئے اور ایک کانووکیشن کی صدارت بھی کی۔ میں تو ان دنوں اسکول میں پڑھتا تھا، مگر میرے بڑے بھائی اسلامیہ کالج، لاہور میں پڑھتے تھے اور حفیظ کاردار، فضل محمود، خان محمد، شجاع الدین اور امتیاز وغیرہ کے ساتھ کرکٹ کے کھلاڑی تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پاکستان کی تحریک چلانے میں وہ کالج کتنا مستعد اور سرگرم تھا۔ وہ ہمیں حمید نظامی، سیّد قاسم رضوی اور آفتاب قرشی وغیرہ کی سرگرمیوں کے متعلق بڑے جوشیلے انداز میں بتایا کرتے تھے۔ یہ تینوں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی روح و رواں تھے، جس کا ہیڈکوارٹر یہی کالج تھا۔ اسی لیے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں UOTC (University Officers Training Corps)[۹] کے طلبا کو اپنی فوجی وردی میں بارود بھری رائفلیں اُٹھا کر کالج کی چھت پر اور اردگرد پہرہ دینا پڑا۔

وہ تین برس ایک جھکڑ اور طوفان کی طرح تھے۔ ہر راہ گیر کو الگ تھپیڑا... ہر جھونکے اور ریلے کی مختلف شدت ... ہر لمحے کی الگ افراتفری ... اور ہر راوی کا اپنا بیان ... ایسے طوفان کی اصل نوعیت تبھی معلوم ہوتی ہے جب انسان اس کے نرغے میں سے نکل جاتا ہے اور مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے۔ چنانچہ، آج میں جب اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے جھانک رہا ہوں تو بہت نیچے ... بہت دور ... میرے مینار کی دوسری منزل میں اس کے سارے مرغولے اور پیچ و تاب نظر آ رہے ہیں ... ایک پسپا ہوتی ہوئی پیٹھ کی طرح۔

قیامِ پاکستان کو ایک مہینہ گزر چکا ہے۔ میں اسلامیہ کالج کی فرسٹ ایئر کلاس میں داخلہ لے چکا ہوں۔ پروفیسر عبدالقیوم قریشی ہماری کلاس کو فزکس پڑھانے پہلے دن آئے ہیں، مگر تعارفی گفتگو میں ہی موضوع فزکس سے ہٹ کر حال ہی میں گزرے ہوئے طوفان کی یادوں میں گھس جاتا ہے۔ دو برس پہلے تک وہ اسی کالج کے طالب علم تھے۔ پھر ۱۹۴۶ء میں ان کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ منٹو پارک میں ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو وہ وہاں موجود تھے۔ چند برس بعد

قائداعظم کے ہاتھوں سے اپنی ڈگری وصول کی اور آج اسلامی دنیا کے سب سے بڑے نئے ملک کے پہلے تعلیمی برس کی پہلی کلاس لے رہے تھے۔ جیسے کسی نئی دنیا میں نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہوں۔

وہ ہمیں بتا رہے تھے کہ جب قائداعظم کے ذاتی فرمان پر پرنسپل عمر حیات ملک نے کالج کے تمام وسائل، اساتذہ کے پختہ ذہن اور طلباء کا گرم خون ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے معرکے میں جھونک دیے تو کالج کا گراؤنڈ ایک وسیع فوجی کیمپ کا نقشہ بن گیا، جہاں وہ خود مرکزی کرداروں کے دست راست بنے ہوئے تھے۔ تیس تیس طلباء اور دیگر شہری، رضاکاروں پر پاکستانی تبلیغ کے دستے ہر طرف ایسے بھیجے جاتے جیسے آب پاشی کا پانی نہر سے نکل کر راجباہوں، موگھوں اور نالیوں سے گزرتے ہوئے کھیتوں کے آخری سرے تک پہنچ جاتا ہے اور لوگوں کو احساس دلاتے کہ اگر مسلم لیگ ۱۹۴۵ء۔۱۹۴۶ء کے موسم سرما کے الیکشن جیت نہ سکی تو پاکستان کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔[10]

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن تو ۱۹۴۱ء میں ہی قراردادِ پاکستان کی حمایت میں فعال ہو چکی تھی۔ اسلامیہ کالج، لاہور" ہرچہ بادا باد کہتے ہوئے اس وقت دامے درمے سخنے میدانِ جنگ میں کودا جب ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے راستے بالکل الگ ہو گئے اور پرنسپل عمر حیات ملک کی سرپرستی میں سارا کالج جہاد کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گیا۔ انبالہ کے مسلم لیگی خاندان کے نوجوان طالب علم سیّد قاسم رضوی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بڑے فعال عہدیدار اور بڑے اچھے مقرر تھے۔"[12] وہ ڈائریکٹر جنرل مین پاور (D.G.Manpower) کہلاتے تھے۔ اسی طرح دیگر طلباء کے بھی مختلف عہدے تھے۔ ان کی منصوبہ بندی کے مطابق عام طلباء کے علاوہ پبلک سے دیگر رضاکار بھی دور دور دیہات میں بھیجے جاتے اور کالج کے وسائل کے مطابق مختلف پروفیسر بھی ان کی رہنمائی کرتے رہتے۔

اس عرق ریزی کے فوری نتائج برآمد ہونے لگے اور پنجاب کی مٹی میں مسلم لیگ کی جڑیں بڑی سرعت سے ہر طرف پھیلنے لگیں۔ عوامی ہلچل صوبائی یونینسٹ حکومت کا دبا ہوا ڈھکن اس طرح اُٹھا اُٹھا کر باہر نکلنے لگی جس طرح اُبلتی کیتلی کے ڈھکن پر بیٹھ جانے والے جیمز واٹ (James Watt) کو اسٹیم نے ہلا ہلا دیا تھا اور دخانی جہاز اور اسٹیم انجن ایجاد ہو گئے تھے۔ پھر یہ پاکستانی اسٹیم پھیلنے لگی اور پاکستان کے لیے نئے نئے نعرے ایجاد ہونے لگے۔ مگر مسجدوں کا امام ان نعروں میں شرکت نہ کرتا تھا۔ کیونکہ وہ قائداعظم کی مخالفت کو خدمت اسلام کہتا تھا۔ اسی لیے آخری حد تک ان پر کفر کے فتوے لگاتا رہا۔ بالآخر جب قیامِ پاکستان ایک نوشتۂ دیوار بن گیا تو ملّا نئے گھوڑے پر اپنی کاٹھی

ڈالنے کے لیے ۱۹۴۷ء میں تیار ہو گیا اور اس نئے نعرے کے ساتھ شامل ہو گیا کہ "پاکستان کا مطلب کیا ہے... لا الٰہ الا اللہ"... گو اس کلمے کی تشریح وہ اس انداز میں نہیں کرتا تھا جس انداز میں علامہ مشرقی، علامہ اقبال اور قائداعظم کرتے تھے... ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور ... اس طرح یہ نعرہ پاکستان کی جدوجہد کے بالکل آخری مرحلے میں بلند ہونے لگا۔

ملّا کی موقع شناسی سے بہت پہلے دیہات میں پاکستان کی حمایت میں اِکا دُکا جلسے شروع ہو چکے تھے۔ اب ان کی تعداد اور حجم دن بدن بڑھ رہے تھے اور ان کے اسٹیج پر تقریروں کے علاوہ مقامی شعرا بھی گل و بلبل اور زلف و رخسار کی مدح سرائی کے بجائے قومی اشعار سنا رہے تھے، پھر جب الیکشن کے لیے جوشیلے جلوس نکلنے لگے تو یہی اشعار ان کے نغمے بن گئے۔

پاکستان بن کے رہے گا یاد رکھو
کڈھے ہوئے حساب حِسابیاں نیں
چھیتی قافلہ منزل تے پہنچنا اے
چُک لے بُن قدم پنجابیاں نیں
وجے جندرے دلاں تے کھول دے گی
میاں لیگ دے ہتھ وِچ چابیاں نیں
عشق لہر تد لوگ حیران ہو سن
پُٹے قدم جدوں کامیابیاں نیں
(اُستاد عشق لہر)

بھانویں تھانیدار ڈراوے
اَکھیں کڈے تے دھمکاوے
بھانویں کھوے چالان کراں گا
جھوٹے کیساں وِچ دھراں گا
اوہنوں آکھیں چل اوئے جُھلے
تیتھوں ڈریے کیہڑی گَلّے
توں ایں ساڈا چوکیدار
پرچی لیگ نوں دئیں او یار
(ظہیر نیاز بیگی)

ان دنوں اخبار زمیندار دو قومی نظریے اور مطالبۂ پاکستان کی تبلیغ میں سارے منظر پر چھایا

ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خان کی شاعری کی فکاہیہ اور طنزیہ پھبتیاں اتنی مشہور ہو رہی تھیں کہ کئی لوگ ان کے نام کا سہارا لے کر اپنی تک بندی رائج کرنے لگے۔ ایسے تعلیمی اداروں میں جہاں ہندو مسلم اکٹھے پڑھتے تھے اور آپس میں سیاسی بحثیں کرتے تھے، وہاں مولانا ظفر علی کے فکاہیہ اشعار ایک لاجواب کرنے والی دلیل کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

ان دنوں ذرائع ترسیل کم کم تھے۔ ریڈیو ایسا ہوتا تھا کہ بڑے سے صندوق نما ڈبے میں بند شور میں سے بڑے جتن سے آواز ڈھونڈنا پڑتی تھی۔ یہ کسی کسی کے پاس ہی ہوتا تھا۔ ٹیلی ویژن کا نام ونشان تک نہ تھا۔ مگر پیغام رسانی کی اس کمی کی تلافی یکساں قسم کے معاشرے کی ہم مرکز اور ہم فطرت ساخت پوری طرح کر دیتی تھی۔

ان دنوں معاشرہ آج کے معاشرے کے بالکل برعکس تھا۔ معدودے چند کانونٹ (convent) اسکولوں کے علاوہ باقی ساری قوم کا ذریعۂ تعلیم ایک تھا اور ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آبادی پر مشتمل اُردو پڑھنے والوں کی مارکیٹ اتنی وسیع تھی کہ ہر گلی کوچے میں دکانداروں اور دیگر لوگوں نے آنہ لائبریریاں قائم کی ہوئی تھیں۔ جہاں سے بڑوں اور بچوں کے لیے کتابیں اور رسالے بڑے معمولی کرائے (عموماً ایک آنہ) پر مل جاتے تھے۔ اس یکساں تعلیمی بندوبست کی وجہ سے وہ معاشرہ نہ تو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا اور نہ ہی آج کی طرح تہ در تہ کلچر کا ایک ڈھیر تھا۔ بلکہ اوپر سے نیچے تک ہم شکل اور ہم رنگ تھا۔ طبقے تب بھی تھے مگر باہمی تانے بانے سے بنے ہوئے مضبوط کپڑے کی طرح۔

علاوہ ازیں اس وقت کی قیادت حصولِ مقصد کے لیے قوم کو متحد کرتی تھی۔ جب کہ آج کی قیادت دوامِ اقتدار کے لیے قوم کو تقسیم کرتی رہتی ہے۔ ان دنوں دفتروں میں انگریزی اور باقی زندگی میں مادری زبان کا دور دورہ تھا۔ اس لیے الفاظ، معانی اور مافی الضمیر کا ابلاغ فوری اور مکمل تھا۔ کیونکہ سب کی Wavelength ایک تھی۔ چنانچہ غلام ہندوستان کی غلام قوم کا سارا ذہن آزاد تھا اور آج کے آزاد پاکستان کی آزاد قوم کی طرح باہر والوں کا ذہنی غلام نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب شعلہ بیان مقرر جلسوں میں غیر منافقانہ اور پُرخلوص تقاریر کرتے تو ہر طبقے اور ہر سطح کے سامعین بیک وقت سوچتے کہ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس طرح دل کی اُمنگیں لہریں بن گئیں۔ لہریں مل کر دھارے بن گئے۔ دھارے مل کر طوفان بن گئے اور تین برس میں پنجاب کی کایا ہی پلٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب الیکشن ہوئے تو تمام

صوبائی اسمبلیوں میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی ۴۹۵ رنشستوں میں سے مسلم لیگ ۴۴۶ رنشستیں جیت گئی اور صوبہ پنجاب کی ۸۶ رمسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ ۷۹ رسیٹیں جیت گئی۔[۱۳] اس طرح پنجاب اسمبلی کے ۱۷۵ راراکین کے ایوان میں مسلم لیگ سب سے بڑی جماعت بن گئی۔ اصولی طور پر مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت ملنا چاہیے تھی۔ مگر انگریز گورنر اور پنڈت نہرو کی ملی بھگت سے سردار خضر حیات ٹوانہ کی یونینسٹ پارٹی نے کولیشن حکومت قائم کر لی۔

یہ بالکل ویسی ہی صورتِ حال تھی جیسی اسپین میں bullfighting کے لیے دانستہ پیدا کی جاتی ہے کہ غصے میں بھرے ہوئے بیل کو مزید اشتعال دلانے کے لیے سرخ کپڑا دکھایا جاتا ہے اور وہ مشتعل ہو کر حملہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے پنجاب بھر میں یونینسٹ حکومت گرانے کے لیے بھرپور تحریک شروع کر دی اور ایک دفعہ پھر اسلامیہ کالج، لاہور اُس کا مرکز اور ہراول دستہ بن گیا۔

یادش بخیر... اُس تحریک کے مناظر مجھے آج بھی اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے اُسی طرح نظر آ رہے ہیں جیسے میں ابھی ابھی ان میں شرکت کر کے گھر لوٹا ہوں اور جلوس کے فلک شگاف نعرے میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ صوبے بھر کے ہر گلی کوچے، گاؤں اور شہر میں خضر حیات ٹوانہ کے خلاف یہ تحریک ایسے جوش و جذبے سے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی، جس کی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ یم بہ یم، دریا بہ دریا، کُو بہ کُو... ہر طرف ایک ہی نعرے کا شور تھا ''خضری کھوتی... ہائے ہائے''... ہر جلوس میں گدھے پر خضر حیات کا پتلا بھی بٹھایا ہوتا۔ قریباً ہر روز لاہور کی سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے جلوس نظر آتے جو مضافات سے آ رہے ہوتے اور کسی مرکزی جگہ بڑے اجتماع میں شمولیت کے لیے پُرجوش نعرے لگاتے ہوئے رواں دواں ہوتے۔ عام طور پر یہ موچی دروازے کے باہر والے باغ میں یا اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں جا ملتے اور پھر ایک بڑا جلوس روانہ ہو جاتا۔ بعض دفعہ ایسے جلوس اتنے طویل ہوتے کہ پچھلا حصہ تو چوک لوہاری دروازے پر ہی ہوتا، مگر اگلا حصہ چوک چیئرنگ کراس میں اسمبلی ہال تک پہنچ چکا ہوتا۔

ایک دفعہ میں اپنے ماموں کے ساتھ بیڈن روڈ پر (مال روڈ کی طرف سے) داخل ہوا تو وہ ایک دم ٹھٹک گئے اور میرا ہاتھ پکڑے مجھے کھینچتے ہوئے ایک دکان کے اونچے تھڑے پر چڑھ گئے۔ میں نے حیرت سے پوچھا تو کہنے لگے، وہ سامنے جلوس آ رہا ہے۔ اتنے میں ساتھ والی عمارت کی پہلی منزل کی بالکونی میں کھڑے ایک دو لوگوں نے ہمیں سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے آواز دی کہ فوراً اوپر آ جاؤ۔ وہاں تم محفوظ نہیں ہو گے اور ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر بالکونی میں پہنچ گئے۔
اُس وقت تو مجھے یہ بھاگ دوڑ بے معنی سی لگی۔ مگر چند ہی منٹ بعد جب جلوس کا ہراول دستہ

اور پھر پورا ہُجم شروع ہوا تو میں انبوہِ کثیر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ گڑ کے ڈھیلے کے گرد چمٹی ہوئی چیونٹیوں کی موٹی تہ کی طرح لوگوں کا جمِ غفیر کسی دریا کا طوفان بن کر بہتا چلا آ رہا تھا یا پھر جیسے آتش فشاں پہاڑ سے اُبل کر بہنے والا سیال مادّہ ہو۔ نعرے... جھنڈے... گدھوں پر خضر حیات کے پتلے... ''خضری کھوتی'' کے اردگرد اجتماعی سینہ کوبی... ''مسلم لیگ زندہ باد'' اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے فلک شگاف نعرے گونجتے تو ہوا میں مکّے چلاتے ہوئے ہزاروں بازو کسی گھنی فصل کی طرح دم بھر کو اوپر اٹھ جاتے۔ کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی آگے، کبھی پیچھے... دکانوں کے تھڑوں پر کھڑے ہوئے تماشائی اور بازار میں کھڑی ہوئی سائیکلیں اس عوامی ریلے میں ایسے بہہ گئے جیسے سیلاب کا پانی دیواروں کے پاس کھڑے پودوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے تک انسانی سروں، کندھوں اور لہلہاتے بازوؤں کا یہ سیال مادّہ کسی لبریز نہر کی طرح بہتا رہا اور میں ششدر ہوتا رہا کہ لاہور میں اتنے لوگ کہاں سے آ گئے۔

مارچ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج، لاہور کے طلباء نے خضر وزارت کا علامتی جنازہ نکالا تو راستے میں دیال سنگھ کالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے مسلمان طلباء بھی شامل ہو گئے۔ نیلا گنبد گزرنے کے بعد گول باغ میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ پھر دفن کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کے راستوں سے گزرتے ہوئے یہ سول سیکریٹریٹ کی طرف چل پڑا، مگر جب سناتن دھرم کالج (موجودہ ایم اے او کالج) کے سامنے سے گزر رہا تھا تو وہاں کے طلباء نے تیزاب کی بوتلیں اور اینٹیں برسانی شروع کر دیں۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ مگر اسلامیہ کالج کا ایک طالب علم عبدالمالک شہید ہو گیا۔[۱۴] اس حادثے کے بعد اس تحریک نے سول نافرمانی کی شکل اختیار کر لی اور فرقہ وارانہ کشیدگی بھی بڑھنے لگی۔

سول نافرمانی ہوتی رہی... کبھی ہنگامے کی رونق بن کر... کبھی طوفان کا ریلا بن کر... اور کبھی قیامت کی چال چل کر۔

فروری ۱۹۴۷ء میں وزیرِاعظم انگلستان نے اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو اقتدار منتقل کر دیا جائے گا۔ یکم مارچ کو گول باغ، لاہور میں خواتین کے بڑے جلسے کے بعد قریباً دس ہزار خواتین کا جلوس پولیس کے سارے حصار توڑتا ہوا سول سیکریٹریٹ میں داخل ہو گیا اور ایک لڑکی (صغریٰ فاطمہ، جو بعد میں بیگم صغریٰ آفتاب بنی) نے چھت پر چڑھ کر یونین جیک اُتار کر مسلم لیگ کا پرچم لہرا دیا۔

اگلے دن نواب خضر حیات ٹوانہ کی یونینسٹ حکومت نے گورنر پنجاب کو یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ وہ مسلم لیگ کی وزارت بنانے کے لیے میدان خالی کر رہے ہیں۔

اب جلوسوں میں جشن کا سماں تھا اور نیا نعرہ یہ تھا ''تازہ خبر آئی اے خضر ساڈا بھائی اے'' ان نعروں سے ہندو اور سکھ مشتعل ہو گئے۔ ۳ر مارچ کو گورنر پنجاب نے استعفیٰ منظور کر لیا تو چار مارچ ۱۹۴۷ء کو سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی چیمبر کے سامنے والی سیڑھیوں پر کرپان لہراتے ہوئے اعلان کیا ''راج کرے گا خالصہ... آ کی رہے نہ کوئی'' یعنی اب یہاں سکھوں کا راج ہوگا اور کوئی مخالف زندہ نہ رہے گا اور اس کا فیصلہ کرپان کرے گی۔

اس کرپان کی چمک کی وجہ سے مسلم لیگ کی وزارت نہ بن سکی۔ کیونکہ اسی دن صوبے میں گورنر راج نافذ ہو گیا اور اُسی دن سے قیامِ پاکستان کے بعد تک (ستمبر ۱۹۴۷ء) سارا پنجاب انتہائی خوں ریز فسادات کی لپیٹ میں جاں کنی کا وقت گزارنے لگا۔ اب اٹک سے قربِ دہلی تک شعلے ہی شعلے تھے اور خون ہی خون تھا۔

بنگال اور بہار میں تو ہندو مسلم فسادات اگست ۱۹۴۶ء سے ہی جاری تھے اور بربریت کی انتہاؤں کو بھی پار کر رہے تھے۔ مگر جب یہ فسادات پنجاب تک آن پہنچے تو یہاں دو کی بجائے تین مذاہب کا جنون آپس میں ٹکرانے لگا۔ سکھوں کے تمام مقدس مقامات (امرتسر کا گولڈن ٹمپل، پنجہ صاحب اور ننکانہ صاحب) پنجاب میں تھے۔ اس لیے یہاں کے سات ماہ کے فسادات میں ویسی ہی مذہبی شدت سمٹ آئی، جیسی دو صدیوں پر محیط صلیبی جنگوں کے دوران وقتاً فوقتاً یروشلم کے معرکوں میں ہوتی تھی۔ آبادیوں پر مسلّح حملے، آگ کے زرد اور سرخ شعلے، کالے دھوئیں کے فلک بوس بادل، قتل و غارت اور خون خرابے تو سارے ہندوستان کو جہنم بنا رہے تھے لیکن پناہ گزینوں کے طویل قافلوں پر مسلّح حملے بہار اور پنجاب نے دیکھے اور یہ منظر صرف لاہور نے ہی دیکھا کہ مشرقی پنجاب سے مہاجروں کی ٹرین جب ریلوے اسٹیشن پر آ کر رُکی تو اُس میں سے اُترنے والا کوئی نہیں تھا اور ہر ڈبے میں خون میں نہائی ہوئی لاشیں بتا رہی تھیں کہ راستے میں جیتے جاگتے مسافروں پر کیا بیتی۔

ان ٹرینوں کی روانگی بھی کچھ کم المناک نہ تھی۔ ان میں سے بیشتر مسافر ایسے تھے جن کی بچی کھچی مغویہ عورتیں بعد میں غیر مسلموں کے گھروں میں تا عمر ان کی اولادوں کو جنم دیتی رہیں۔

یہ اچانک اور فوری ہجرت چند ہی دنوں میں مکمل ہو گئی تھی۔ پورا خاندان اور مکمل برادری تن من اور روح کے ساتھ مگر مال و منال کے بغیر۔ نہ کسی کا جزوی گھر بار اُدھر رہا۔ نہ کسی کا آدھا خاندان ادھر بسا رہا۔ اگر کچھ اُدھر رہ گیا تو یہ ان کی مغویہ عورتیں تھیں اور آبائی قبرستان تھے۔ باقی سب کچھ واہگہ سے اِدھر آ گیا۔ زندہ انسان بھی۔ لاشوں سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں بھی۔ زخمی، بیمار اور نڈھال قافلے بھی۔ حتیٰ کہ نسل در نسل یادیں بھی۔ جنھیں پالنے والا واہگہ کے اُس پار کوئی نہ

رہا۔ پنجاب کے مہاجروں کو یہ سہولت اور عشرت نہ ملی کہ وہ ہفتوں، مہینوں بلکہ برسوں بعد مناسب بندوبست کے ذریعے آرام سے ٹہلتے ہوئے پاکستان آتے رہتے۔ نہ ہی انھوں نے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے انداز میں قابض ہونے کے بعد مقامی لوگوں کی بزور اور بتدریج تحلیل کا آغاز کیا۔ اس کے برعکس وہ پاکستان میں ایسے مدغم ہو گئے جیسے پانی میں بتاشہ گھل جاتا ہے۔ چنانچہ آج ان میں سے کسی کے ماتھے پر مہاجر ہونے کی پرچھائیں بھی نہیں، جو ان کی علیحدہ شناخت بن سکے۔ نئی سرزمین میں وہ اسی کی مٹی کے ہم رنگ ہو گئے۔

۱۹۴۴ء میں وطن کے مینار کا اُبھار ۱۹۴۰ء کی نسبت زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔ اس سے اگلے تین برسوں کی بے کلی دراصل پیدائش کے دن پورے ہونے کی نوید تھی۔ اور وہ لرزہ خیز فسادات زچگی کے کربناک درد بن گئے تھے اور مشیت کی دایہ نے ۱۸۵۷ء کے بعد سے جو دیکھ بھال شروع کر دی تھی اس کے نتیجے میں قدرت کی ارتقائی قوتیں اب ایک نیا جنم دینے کو تھیں۔

اس نازک مرحلے پر میں اس شہر میں موجود تھا۔ جہاں برعظیم میں صدیوں تک پلنے والی تہذیبوں کی tectonic plates کے بالکل نئے کنارے گھڑے جانے تھے۔ ملک کی تقسیم تو اب نوشتۂ دیوار تھی۔ مگر پنجاب کی تقسیم کے بھی اب آثار پیدا ہو رہے تھے اور لاہور شہر کا ہر پتھر روڑا، لرز رہا تھا کہ آیا یہ شہر ہندوستان میں شامل ہوگا یا پاکستان میں۔ شاہی مسجد کی سیڑھیوں سے نظر آنے والا شاہی قلعے کا پُرشکوہ دروازہ انگریزی دور میں ہمیشہ بند ہی رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے لاہور کی فضاؤں میں یہ پیش گوئی تیرتی رہتی تھی کہ یہ دروازہ اس دن کھلے گا جس دن ملک میں مسلمانوں کی حکومت آئے گی۔ مگر اب اس پیش گوئی کی بجائے یہ وسوسے تیرنے لگے کہ کیا آئندہ یہ دروازہ عدلِ جہانگیر والی زنجیر کی کھنک سنے گا یا سکھا شاہی کے دور کی طرح شاہی مسجد کو شاہی گھوڑوں کا اصطبل بنا دیکھے گا۔

ہر گزرنے والے دن کے ساتھ یہ وسوسے آندھی اور جھکڑ بننے لگے۔ تخیل لرزاں رہنے لگا...
اور خوف ہر سانس کی بھاپ بننے لگا۔

۴ر مارچ کو اسمبلی ہال کے باہر کرپان لہرانے کے بعد لاہور کی ساری آبادیوں میں چھرا گھونپنے کی وارداتیں تیزی سے بڑھنے لگیں۔ تنگ گلی کوچے اگر چند منٹوں کے لیے بھی خالی رہتے تو ان میں سے یا تو کوئی لڑکھڑاتا ہوا زخمی مرد، عورت یا بچہ اپنے زخمی دھبے کو تھامتا ہوا برآمد ہو جاتا، یا اس کے فرش پر جان کنی کی حالت میں تڑپتا ہوا پایا جاتا۔ جب تنگ کوچے، پیچ در پیچ گلیاں یا کشادہ سڑکیں سنسان نہ بھی ہوتیں تو بھی ہر راہگیر، سائیکل سوار اور تانگے کی سواری کی کن انکھیاں دائیں بائیں ایسے تاکتی رہتیں جیسے وہ انسان نہ ہو بلکہ خوف کی حد تک محتاط پرندہ ہو۔ جو جان کو خطرے میں

ڈال کر دانے دنکے کی تلاش میں باہر نکلنے پر مجبور ہوا ہو۔

یہ تو دن کے احوال تھے۔ مگر راتوں کے تیور زیادہ برہم تھے۔ گھنے اندھیروں اور مکمل کرفیو میں نہ جانے کیسے اکا دُکا مکان یا دکان کو آگ لگ جاتی۔ شروع شروع میں تو فائر بریگیڈ کی گھنٹی کبھی سنائی دے جاتی تھی مگر وارداتیں بڑھنے لگیں تو شعلے سرخ تر، دھوئیں بلند تر اور گھنٹی بالکل عنقا ہونے لگی۔ اگلی شدت رات کے اندھیروں میں آبادیوں پر حملوں کی یورش تھی۔ مسلح اور منظم حملے، بارود بھرے ٹرک، بندوق بردار جیپ، دستی بموں کی بوچھاڑ اور ماچس کا آزادانہ استعمال چند ہی قیامت خیز لمحوں میں زندہ سلامت بستی کو جہنم زار بنا دیتے۔ کئی حملے کامیاب ہو جاتے اور کئی پولیس کی بروقت مداخلت یا مکینوں کی پہرہ داری کی وجہ سے ناکام رہتے۔

کرفیو میں جکڑی ہوئی راتیں سنسان سڑکوں اور گلیوں کو آسیب زدہ بنا دیتیں۔ مگر کسی تاریک اوٹ، کسی برآمدے کے کونے، کسی ادھ کھلے کواڑ میں سے کوئی نہ کوئی سایہ جھانک رہا ہوتا۔ کالجوں کے لڑکے، بازاروں کے غنڈے، مسجدوں کے مولوی اور تہجد گزار نمازی وقتاً فوقتاً پہرہ دینے کے لیے اپنی اپنی باری دیتے رہتے، بلکہ زیادہ مدافعت تو غنڈوں کے ہاتھ میں مرکوز تھی۔ ان تاریک سناٹوں میں حفاظتی سرسراہٹیں یوں سرکتی رہتیں جیسے تاریک ریگستان میں کیڑے مکوڑے ساکت رہتے ہوئے بھی متحرک ہی رہتے ہیں۔

کرفیو آرڈر (curfew order) بڑی باقاعدگی سے جاری ہوتا۔ سڑکیں، گلیاں سنسان ہو جاتیں، مگر پولیس اہلکاروں کی مذہبی جانب داریاں آنکھ بچا کر اس روزمرہ کرفیو کو ناکام بنا دیتیں۔ چپکے چپکے کسی واردات کو سہولت مل جاتی اور متوحش لوگوں کی پھٹی پھٹی آنکھیں گھروں کی چھتوں سے رنگ برنگے شعلوں اور لہراتے دھوئیں کے خوفناک رقص دیکھنے لگتیں۔ ان شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کا کوئی مذہب نہ تھا۔ مگر لاہور کی تینوں مذہبی قوموں میں سے ایک نہ ایک قوم اپنی چھتوں سے ہی ان حملہ آوروں پر تحسین کے ڈونگرے برسانے لگتیں۔ کبھی اللہ اکبر ... کبھی ست سری اکال اور کبھی ماتا کی جے کے بکھرے بکھرے نعرے اس بھیانک رقصِ شرر کو اور بھی خوفناک بنا دیتے۔ تب صبح کے اخبار سے پہلے ہی لوگوں کو پتا چل جاتا کہ کہاں حملہ ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔ کرفیو آرڈر صرف انسانوں کے لیے تھا کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ مگر آگ کے شعلوں اور مذہبی نعروں کو کھلی چھٹی تھی کہ جہاں چاہیں اور جس انداز میں چاہیں وہاں سر اٹھا لیں۔

ہندو متمول تھے۔ منظم تھے اور متعصب تھے۔ اس لیے وہ اپنی آبادیوں اور گلیوں کے گرد آہنی حصار کھڑے کر دیتے تھے۔ خاص طور پر شاہ عالمی گیٹ کے اندر کی انتہائی گنجان آبادی کو ایک

قلعے کی طرح محفوظ کرلیا گیا تھا۔ دروازے کے سامنے موٹی سلاخوں کا مضبوط دروازہ رات کو بند کر دیا جاتا تھا اور اس میں برقی رو چھوڑ دی جاتی تھی۔

مسلمان بے سروسامان بھی تھے اور غیر منظم بھی تھے۔ ان کا مقبول ہتھیار لکڑی کا تین چار فٹ لمبا سڈول سا ڈنڈا تھا جو ساری دنیا میں جنگ کے دوران خندقیں کھودنے کے لیے خاص طور پر کدال کے لیے بنایا گیا تھا اور اب جنگ کے بعد بازاروں میں سینکڑوں کی تعداد میں بک رہا تھا۔ اسی طرح سر پر پہننے والے لوہے کے خود (helmet) تھے جو موسمی پھل کی طرح دکانوں اور خوانچوں پر فروخت ہو رہے تھے۔[15] یہ خود سر کی ڈھال بن گئے۔ ڈنڈے ہاتھ کی تلوار بن گئے اور اقبال کا مصرع سینے کا ایمان بن گیا۔

ع... مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یہ صورتِ حال دو قومی نظریے کی حربی شکل تھی۔ مسلح ہندو کا اسلحہ جارحانہ اور مہلک تھا اور مسلح مسلمان کا ''اسلحہ'' محض ایک مدافعت بلکہ معذرت تھا۔ جیسا عدم توازن ان کی معاشرتی زندگی میں تھا۔ ویسا ہی عدم توازن اس خانہ جنگی میں بھی تھا۔ مسلمان آبادیوں پر حملے زیادہ منظم، برق رفتار اور تباہ کن تھے۔ یلغار میں بھی اور بروقت پسپائی میں بھی۔ مگر ہندو آبادیوں پر ہونے والے حملوں کی نوعیت محض اس یاددہانی کی طرح تھی کہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

سوائے اس نہتے حملے کے جو شاہ عالمی گیٹ کی مضبوط قلعہ بندی پر ہوا اور اس شدت سے ہوا کہ لاہور کی خانہ جنگی کا فیصلہ کن معرکہ بن گیا۔ اس طرح سارے شہر کی مختلف آبادیاں ان حملوں کی زد میں آتی رہیں۔ سرکلر روڈ کے مختلف حصے، سبزی منڈی، خواجہ دل محمد روڈ، راج گڑھ، راوی روڈ، مزنگ، اچھرہ، چوبرجی، ٹمپل روڈ، مغلپورہ اور شاہ عالمی گیٹ ... بس اتنا ہی تو لاہور تھا اُن دنوں۔[16] (ماڈل ٹاؤن بھی لاہور کے مضافات میں تھا) جو خود بھی فسادات سے لہولہان تھا اور پنجاب کے باقی سب علاقے بھی لہولہان تھے۔ مگر ان فسادات کی ڈھکی چھپی رمز یہ تھی کہ یہ ایک پرانی کہاوت ''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' کی سچائی بڑے عجب انداز میں ثابت کر رہے تھے۔ اپنی فرقہ واریت کی وجہ سے مسلمانوں کو ہمیشہ تقسیم کرنے والا مولوی ان دنوں مسلمانوں کی متحدہ شناخت بنا رہا تھا اور ہر معاشرے کا ہر دم راندہ ہوا غنڈہ مسلمانوں کی حفاظت کر رہا تھا۔

آج اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے جھانک رہا ہوں۔ تو اس کی دوسری منزل میں لاہور کا یہ میدانِ کارزار مجھے بالکل اسی طرح نظر آ رہا ہے جیسا اُس وقت تھا ... اس افراتفری کے عین بیچ میں ملک معراج دین بھی اسی طرح کھڑا ہے جیسے وہ اُس وقت مجھے پہلی دفعہ ملا تھا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ بہت پریشان ہیں۔ کیونکہ آپ کے پاس ایک ڈنڈے اور خود کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں ہے۔'' وہ اس تعارف میں میرے ایک ہم جماعت کا حوالہ دے رہا ہے۔

یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ مارچ ۱۹۴۷ء سے فسادات کے باوجود میرا میٹرک کا امتحان تو وقت پر ہو گیا تھا، مگر اب نتیجے کے اعلان میں تاخیر ہو رہی تھی۔ ہمارے والد صاحب لاہور سے باہر تعینات تھے، مگر ہم سب بہن بھائی اپنی تعلیم کی وجہ سے والدہ کے ساتھ لاہور میں مقیم تھے اور میں اس لیے پریشان تھا کہ ہماری والدہ بہت پریشان تھیں۔ نہ صرف شہر کے مذکورہ بالا حالات کی وجہ سے بلکہ باقی ملک سے آنے والی فسادات کی وحشت ناک خبروں کی وجہ سے بھی... ایسے میں ایک بالکل اجنبی ملک معراج دین میری مدد کرنے آیا تھا۔ اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھے ہوئے وہ قدرے جھک کر سرگوشی کر رہا تھا:

میں اس علاقے کا سپہ سالار تھا۔ ہماری تحریک تو اب مر چکی ہے۔[17] مگر ہمارے خاکسار ابھی زندہ ہیں اور ہر علاقے میں چاق چوبند ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ہم ہر وقت پہرے کی حالت میں ہیں اور لاہور میں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ برسوں کی پابندی کی وجہ سے ہمارے بیلچوں کو زنگ لگ چکا ہے۔ میرے پاس بھی کچھ پڑے ہیں۔ وہ میں آپ کو لا دوں گا اور یہ بھی سمجھا دوں گا کہ بیلچہ کتنا مفید ہتھیار ہے۔

تین دن بعد وہ واقعی دو بیلچے لے آیا۔ دھات والا حصہ زنگ سے اٹا ہوا۔ لکڑی کا دستہ بغیر کسی آب و تاب کے اور کندھے سے لٹکانے والی چمڑے کی پٹی ندارد۔ تھوڑی دیر وہ مجھے سمجھاتا رہا کہ کس طرح اسے ڈھال اور کس طرح تلوار کی طرح استعمال کر سکتے ہیں اور چلتے چلتے آنکھ مار کر پوچھنے لگا، ''آپ کے ہاں چاقو چھری تیز کرنے والا اپنی سرائن اُٹھائے گھومتا رہتا ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو سرگوشی میں بولا، ''بس تو اس سے بیلچے کا ایک سرا تیز کروا لیں۔ ایمان سے تلوار بن جائے گا تلوار!!''

پھر مجھے شکریے کا موقع دیے بغیر ہی تیزی سے مڑ کر چلا گیا۔

چند قدم جا کر رُکا... اور مڑ کر کہنے لگا، ''کسی اور کو بھی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیں۔''

پرانے اور خستہ بیلچے ہاتھوں میں تھامے میں سوچ رہا تھا کہ انھیں تو زنگ لگ گیا۔ مگر شکر ہے خاکساروں کی خدمتِ خلق کو زنگ نہیں لگ سکا۔

یہ تب کی سوچ تھی جب وطن کے مینار کا ذرا سا اُبھار تو تھا مگر وجود نہ تھا۔ لیکن آج اس کا وجود بھی ہے اور میں اس کی ساتویں منزل میں بھی کھڑا ہوں۔ تو منظر یہ ہے کہ اس مینار کی دو چار نچلی منزلیں تو درخشاں اور چمکیلی ہیں لیکن بعدازاں اوپر والی ہر منزل اپنی نچلی منزل سے زیادہ زنگ آلود

ہے۔ اتنی کہ قائداعظم کے پاکستان کا فلاحی تصور گہرے زنگ سے کھوکھلا ہو چکا ہے اور اس مینار میں اب وہ قائداعظم بھی کہیں نظر نہیں آ رہے جن کی باتیں میں نے راولپنڈی کے کمپنی باغ میں صرف چند گز کے فاصلے سے سنی تھیں۔ شاید میں کچھ اور بھی سوچتا۔ مگر میری سوچ کی اُڑان اب میرے اپنے مینار سے جا ٹکرائی اور وہ ہڑبڑا کر بولا ''کیا اسلامی تاریخ نہیں پڑھی؟ اس میں اُمتِ مسلمہ اپنے نامور لوگوں (heroes) سے اور ان کی معرکۃ آراء کامیابیوں سے اکثر اوقات یہی سلوک کرتی رہی ہے جو آج قائداعظم کے پاکستان سے کر رہی ہے اور تم بھی تو اپنی زندگی میں یہ المیہ دوسری بار دیکھ رہے ہو... کیا پہلی بار بھول گئے؟''

پہلی بار یاد کرنے کے لیے میں پھر اسی زنگ آلود بیلچے کے پاس پہنچ گیا۔

میرا اجنبی محسن، ملک معراج دین جا چکا تھا۔ رات کا کرفیو شروع ہو چکا تھا۔ سڑکیں گلیاں ویران تھیں۔ سونے کے لیے میں چھت پر چلا گیا اور بیلچہ چارپائی کے ساتھ ہی زمین پر رکھ دیا۔ اردگرد نگاہ دوڑائی تو دو چار مقامات پر آگ کے شعلے یا دھوئیں کے بادل دکھائی دیے۔ اِدھر اُدھر سے اِکا دُکا فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ لیٹا... تو اوپر تاریک آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے، مگر ان میں سے ایک ڈوبتے تارے کے آخری شرارے بھی تیزی سے نیچے گر رہے تھے۔ میں نظر بھر کر انھیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں تو تین ماہ پہلے ہی ایک ڈوبتے تارے کی گرتی ہوئی زندہ قوس کو دیکھ چکا تھا۔

یہ ڈوبتا تارہ علامہ مشرقی تھے ... جن کی قوس شاہی مسجد کے سامنے گر رہی تھی۔

اُمنڈتے ہوئے فسادات کی غارت گری میں موت و حیات کی بے یقینی اور قلب و ذہن کے اضطراب کے باوجود قومی اُفق کی یہ کرن دن بدن روشن تر ہو رہی تھی کہ پاکستان کی منزل اب قریب ہی ہے۔ اس لیے لوگوں کے سینوں میں ایک دبے گھٹے جوش کی شوں شوں اس انداز میں ہونے لگ گئی تھی، جیسے بند کیتلی کے اندر اُبال سے ذرا پہلے ہوتی ہے۔ اسی شوں شوں کے زیرِ اثر ہم تین بھائی اپنے ماموں کے ساتھ جمعہ کی نماز کے لیے شاہی مسجد پہنچ گئے۔ عام مولویوں کے برعکس مولانا غلام مرشد خطبے سے پہلے اپنی تقریر قرآن کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ پر کیا کرتے تھے۔ اس روز شاید وہ بھی اسی قسم کی شوں شوں سے سرشار تھے۔ اس لیے تقریر دل پذیر کا ہر لفظ کھل جا سم سم کی طرح دیدۂ دل وا کر رہا تھا۔ پھر نماز میں ان کی سحر آفریں تلاوت نے نمازیوں میں کوئی ایسا جذبہ جگا دیا کہ سلام پھیرتے ہی کسی نے نعرۂ تکبیر کی صدا لگائی اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے کے بعد ''لے کے رہیں گے ... پاکستان'' کا نعرہ بلند ہوا۔ ساتھ ہی لاؤڈ اسپیکر پر مولانا کی دعا سنائی دینے لگی اور

سب ہاتھ چہروں تک اُٹھ گئے۔

نماز تو جمعہ کی تھی، مگر لوگ مسجد سے ایسے باہر نکل رہے تھے جیسے عید کی نماز پڑھ کر خوش و خرم برآمد ہو رہے ہوں۔ کیونکہ ان دنوں وہ سب منزل سے قربت والی سرشاری سے مخمور تھے۔

سیڑھیوں سے اُترتے اُترتے میں اچانک ٹھٹک گیا۔ کسی نے اشارے سے بتایا کہ نیچے حضوری باغ میں علامہ اقبال کے مزار کے سامنے علامہ مشرقی خاکساروں سے خطاب کر رہے تھے۔

میں بھی بھاگ کر تماشائیوں میں گھس گیا۔

اپنی زندگی میں پہلی دفعہ میں علامہ مشرقی کو دیکھ رہا تھا۔ برعظیم کے اقلیتی مسلمانوں کو فکر و عمل کے ایسے منظم اور باکردار پیکر میں ڈھالنے والی وہ شخصیت جس کے خوف سے انگریزی سامراج لرز گیا تھا اور اکثریتی قوم خفیہ طور پر مقابلے کی تیاریاں کرنے لگی تھی۔ بڑے سلیقے سے ترشی ہوئی متناسب داڑھی والی اس بارعب شخصیت کی تصاویر میں نے بارہا دیکھی تھیں۔ مگر جس چہرے اور جسم کو میں آج دیکھ رہا تھا وہ اس پرانی شخصیت کے سائے سے بھی کم تر تھا۔ پُرعزم ڈھلتی عمر کا چہرہ۔ سیاہ و سفید چھدری ہوئی داڑھی۔ سیدھا تنا ہوا قد مگر قدرے لاغر جسم۔ آنکھیں تیز اور چمکیلی مگر پھر بھی کسی نامعلوم سی کیفیت کی کمی۔ یوں سمجھیے کہ پچھلے چھ برس کی رُوداد اُداس چہرے کے رُوئیں رُوئیں سے چھلک رہی تھی۔ دو برس کی قیدِ تنہائی ... ۸۰ روزہ فاقے (مرن برت) کے بعد رہائی، مگر مزید چار برس تک وطن سے دور مدراس کی پریذیڈنسی میں جلا وطنی۔ ایک بلاخیز متحرک تحریک کو اپاہج بنانے والی پابندیاں ... طوفانوں سے کھیلنے والے شخص کی ساحل پر پابجولانی ... ذاتی آدرش اور قومی آئیڈیل ازم کی جبری موت ... برے وقتوں کی یہ تمام سلوٹیں اس مسمار شدہ شخصیت میں بالکل عیاں تھیں۔ صرف اندازِ گفتگو کا طنطنہ باقی تھا مگر وہ بھی جسم کی ادھوری وردی سے بے جوڑ لگ رہا تھا۔ کیونکہ تحریک پر پابندیاں ابھی تک عائد تھیں اس لیے بولنے والے اور سننے والوں میں کسی کی قمیص خاکی اور کسی کی شلوار خاکی تھی۔ جیسے سابقہ کلف شدہ چست وردی کے کھنڈرات ہوں۔

مجھے معلوم نہیں میرے آنے سے پہلے وہ کیا کہہ چکے تھے۔ مگر اب وہ اپنے سامنے گھاس پر بیٹھے ہوئے پچیس تیس خاکساروں کو تاکید کر رہے تھے کہ حکومت آپ کی پریڈ پر پابندی لگا سکتی ہے، وردی، بیلچے اور عمل پر پابندی لگا سکتی ہے مگر آپ کے کردار پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتی۔ آپ کے خون سے خدمتِ خلق کے جذبے کو نہیں نکال سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ قانونی حدود کے اندر آدھی وردی پہنے رہیں گے۔ گھر کے اندر اکیلے پریڈ کرتے رہیں گے۔ گھر کے باہر بغیر بیلچے کے بھی خدمتِ خلق کرتے رہیں گے اور اپنے اعلیٰ اسلامی کردار سے لوگوں کو یاد دلاتے رہیں گے کہ خاکسار

کیا ہوتا ہے اور انھیں سکھاتے رہیں گے کہ قوم کی تعمیر کے لیے فکر و عمل کے ساتھ طبیعت کی خاکساری بھی ضروری ہے وغیرہ وغیرہ...

اس رنگ میں چند منٹ اور بولنے کے بعد انھوں نے بات ختم کی اور جانے کی اجازت مانگی۔

تب سارے خاکسار بھی ان کے ہمراہ حضوری باغ سے باہر جانے والے دروازے کی طرف چل دیے لیکن ابھی باہر نکلنے ہی کو تھے کہ تماشائیوں میں سے چند نوجوانوں نے نعرے لگائے ''پاگل ای اوئے... پاگل ای اوئے!''

بغیر کسی ردعمل کے وہ سب باہر نکل گئے تو چھے سات نوجوانوں نے ہنستے ہنستے قطار بنائی اور خاکساروں کے انداز میں پیریڈ کرنے لگے۔ مگر ان کا لیڈر ''چپ راست'' کی بجائے کہہ رہا تھا:
''پاگل... پاگل... پاگل... پاگل!''

اردگرد کھڑے لوگ ہنس ہنس کر تماشا دیکھ رہے تھے۔

واپسی پر ہم سب خاموشی سے چل رہے تھے... دلگیر اور رنجیدہ... تو میرے ماموں بے اختیار پکار اُٹھے، ''مولویوں نے علامہ مشرقی سے خوب بدلہ لیا ہے۔''

۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمے کے بعد بھی شمالی ہندوستان سے علامہ مشرقی کی جلاوطنی جاری رہی اور بالآخر اب انھیں واپسی کی اجازت ملی تھی۔[۱۸] مگر ان کی چند سالہ غیر موجودگی میں سیاسی منظرنامہ بالکل بدل چکا تھا اور جمعے کی تقریروں میں یہ جھوٹا پروپیگنڈا نہ صرف مسلسل جاری رہا تھا کہ قید کے دوران علامہ مشرقی پاگل ہو چکے ہیں[۱۹] بلکہ منبر و محراب کے جادو میں اسیر قوم اس تہمت پر مکمل ایمان لا چکی تھی اور علامہ مشرقی کے وہ تمام پمفلٹ بھول چکی تھی جو میرے بچپن میں شہر کے گلی کوچوں میں ''مولوی کا غلط مذہب... قیمت دو پیسے'' کی صدا کے ساتھ نہ صرف بیچے جاتے تھے بلکہ ایک سے دوسرے کو تحفے کے طور پر دیے جاتے تھے۔[۲۰]

میرے مینار کی آٹھویں منزل بہت اُونچی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں دوسری منزل سے ''پاگل... پاگل'' کی پھبتیاں سن رہا ہوں اور ساتھ ہی چھٹی منزل میں پڑھی ہوئی سندھ کی تاریخ کے اوراق کی پھڑپھڑاہٹ بھی سن رہا ہوں جس میں محمد بن قاسم سے بھی اسی انداز کے بدلے کا ذکر تھا۔[۲۱] جس انداز میں علامہ مشرقی سے لیا گیا۔

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تو سندھ حکومت کا راجہ داہر مقابلے میں مارا گیا اور اُس کی دو خوبصورت بیٹیوں کو محمد بن قاسم نے خلیفہ کے حرم کے لیے بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد انھوں

نے حرم میں یہ افواہ پھیلانا شروع کر دی کہ خلیفہ کے پاس بھیجے جانے سے پہلے وہ محمد بن قاسم کی ہوس پوری کر چکی ہیں۔ بالآخر یہ بات خلیفہ کے کان تک بھی جا پہنچی تو اس نے اپنی امانت میں خیانت قرار دیتے ہوئے حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر لیا جائے (جو اس وقت پورے سندھ اور ملتان کو فتح کر کے کشمیر تک پہنچ گیا تھا) خلیفۂ وقت سے بغاوت کی بجائے محمد بن قاسم نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ چنانچہ گرفتار کرنے والوں نے اسے گائے کی کھال میں لپیٹ کر خلیفہ کے پاس بھیج دیا۔ مگر راستے میں بند کھال کے اندر گرمی کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ تب لڑکیوں نے بتایا کہ محمد بن قاسم تو ان سے بہنوں جیسا سلوک کرتا رہا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے باپ راجہ داہر کی موت کا بدلہ لینے کے لیے جان بوجھ کر یہ غلط تاثر دیا تھا۔ روایت کے مطابق ان دونوں لڑکیوں کو زندہ دفن کروا دیا گیا۔

سندھ کے راجہ داہر کی اولاد اور ہند کی ملائیت کے طرزِ عمل کی مماثلت کو میں اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے دیکھ رہا ہوں۔ تو مجھے ایسی ہی روایات کا وسیع پھیلاؤ ایسے ہی نظر آ رہا ہے جیسے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے ہم زمین پر سڑکوں اور دریاؤں کے وسیع پھیلاؤ کو بیک وقت دیکھتے ہیں۔ اسی محسن کش روایت کی ایک اور مثال یہاں صرف اس لیے درج کی جاتی ہے کہ ان دونوں کا آغاز ایک ہی وقت میں ہوا۔

۷۱۱ء میں جب محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا تو اسی برس مسلمان فوجیں اسپین میں بھی داخل ہوئیں۔ مغربی ممالک کے مسلمان وائسرائے موسیٰ بن نصیر کے حکم پر پہلے تو طارق بن زیاد اپنی کشتیاں جلا کر ہسپانیہ کے ساحل پر اُترا اور اندرونِ ملک پیش قدمی شروع کر دی، مگر بعد ازاں موسیٰ بن نصیر بھی مزید فوج کے ساتھ اندلس پہنچ گیا۔ پورا ہسپانیہ مطیع ہو چکا تو اس نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت مانگی کہ اسے سارے یورپ اور قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا موقع دیا جائے۔ مگر خلیفہ نے اسے واپس بلا لیا۔ جس دن وہ دارالخلافے میں پہنچا اسی دن خلیفہ بن ولید کا انتقال ہو گیا اور اگلے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک (جو ولید کا چھوٹا بھائی تھا) نے پہلے تو اسے قید کر دیا اور پھر اس پر اتنا بھاری تاوان عائد کر دیا جس کی ادائیگی اس کی استطاعت سے باہر تھی۔[۲۲]

اپنے مینار کی آٹھویں منزل کی بلندی اب میرے لیے سوہانِ روح بنتی جا رہی ہے، جو مجھے آٹھویں صدی کا ماضی بعید، بیسویں صدی کا ماضی قریب اور عصر حاضر کی ''گھر واپسی تحریک'' کے مناظر بیک وقت دکھا رہی ہے اور میرے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھ جاتے ہیں کہ خدا کرے کہ ہسپانیہ اور ہند کی تاریخی مماثلت اور متوازی روایات اب یہیں پر ختم ہو جائیں۔

تاریخ مجھے دکھا رہی ہے:

۱۔ کھال میں لپٹے ہوئے محمد بن قاسم کی بے بس موت

۲۔ مفلس قیدی موسیٰ بن نصیر کا کرب اور

۳۔ کئی دیگر مسلمان مشاہیر کا المناک انجام...

اور میری زندگی مجھے دکھا رہی ہے:

۱۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پائلٹ ہیرو ایم ایم عالم سے حاکموں کی بدسلوکی

۲۔ عبدالستار ایدھی کی ہراسانی اور وطن سے عارضی فرار

۳۔ دونوں[23] پاکستانی نوبل لاریٹ کی ناقدری اور ان پر نکتہ چینی

۴۔ فتنۂ انکارِ پاکستان اور قائداعظم پر غلط سوچ کا الزام۔[24]

۵۔ علامہ اقبال کے بارے میں "اک بال" جیسی استہزائی پھبتیاں

۶۔ علامہ مشرقی پر پاگل پن کی کامیاب تہمت۔ مجھے ایک دفعہ پھر آلیور سیک[25] Oliver Sack یاد آ رہا ہے جو عمر کی آٹھویں دہائی کو چشم کشا گردانتا تھا۔

نہ معلوم کیوں؟ کھلی آنکھ تو بے کل ہی رہتی ہے۔ اتنی کہ دماغ کی بجائے آنکھ خود سوچنے لگتی ہے کہ اللہ کی بہترین اُمت ہونے کا دعویٰ کرنے والے اتنے محسن کش کیوں ہیں؟؟

سوچ کی یہ چنگاریاں تو آسمان پر ایک ڈوبتے تارے اور زمین پر ایک زنگ آلود بیلچے سے اُٹھی تھیں۔ لیکن اس کرفیو زدہ تاریک سناٹے میں خود ہی مدھم پڑنے لگیں۔ اور ہر چہار معلق تاروں کی جھلمل مجھے یہ نوید دینے لگی کہ پاکستان کی منزل اب قریب ہی ہے۔ نور کے ان چند قطروں کی طرح جو خون کی بارش میں بھی الگ چمک دے رہے ہوں۔

پنجاب میں دس لاکھ فوجی جنگ کے بعد حال ہی میں ریٹائر ہو کر اب اپنی سابقہ مہارت سے پانچ دریاؤں کو خون رنگ بنا چکے تھے۔ سابقہ انگریزی فوج کے تسلیم شدہ یک جان جنگجو پنجابی اب تین مختلف مذاہب کے جہادی بن کر آپس میں جنونی ٹکریں مار رہے تھے اور پوری عسکری منصوبہ بندی سے دیہات، شہروں، آبادیوں، قافلوں اور ٹرینوں پر خونخوار حملے کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ پانچوں دریاؤں میں صبح شام اکا دُکا بہتی ہوئی لاشیں پنج ندی کی طرف رواں ہوتی تھیں۔ دریائے جہلم اور بیاس والی لاشوں کے چہرے کی کن پٹیوں میں نصب شدہ کیلوں سے باندھی ہوئی پرچی پر موٹی چاک سے موٹے الفاظ میں لکھا ہوا تھا "ٹو پاکستان (To Pakistan)۔" امرتسر میں خالصہ کالج کے علاقے کے قریب سے پناہ گزینوں یا مہاجرین کی ٹرین گزرتی تو مسلح جتھے اسے روک کر اسی انداز

میں محاصرہ کر لیتے جیسے محلہ شریف پورہ میں پہلے محاصرہ اور پھر قتل عام ہوا تھا۔

جب پنجاب کے رُوئیں رُوئیں سے خون ٹپک رہا تھا اور بنگال اور بہار بھی لہولہان تھے۔ تو دو آوازیں سنائی دیں۔ ان میں سے ایک آواز تو قلم کی تھی اور دوسری آواز پاکستان کی تھی۔ پہلی آواز امریتا پریتم کے گہرے اور لامحدود کرب سے نکلی... جو صرف پنجاب کے لیے تھی:

اج آکھاں وارث شاہ نوں کِتوں قبراں وچوں بول

تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول!!

اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین

اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

اُٹھ دردمنداں دیا دردیا، تک آپڑاں پنجاب

اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب

دوسری آواز سارے ہندوستان کے لیے تھی۔ یہ ایک طویل سفر کے تھکے ماندے نحیف سے قائد کی تنبیہ تھی، مگر اپنی حکمت و دانش کی وجہ سے بڑی توانا تھی۔ قیامِ پاکستان سے صرف تین دن پہلے نئے ملک کی نئی قانون ساز اسمبلی سے خطاب میں قائداعظم نے کہا تھا کہ یہ نئی قوم اب پرانے اختلافات فراموش کر دے اور عقیدے اور ذات سے بالاتر ہو کر نیا وطن قائم کرے۔

اب آپ آزاد ہیں اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جا کر اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کریں۔ آپ کسی مذہب ذات یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں اس کا ریاست کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ سب ایک ریاست کے شہری اور مساوی حقوق کے مالک ہیں۔ یہ اصول مذہب، اعتقادات اور ذات پات کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ اگر ہم سب اس اصول کو اپنا معیار بنا لیں تو آپ دیکھیں گے جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی مفہوم میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے۔

ان دونوں آوازوں کی گونج تاریخ میں تو ابھی تک سنائی دیتی ہے۔ مگر ہماری تاریخ کو دانستہ قتل کرنے والے نہ تو پہلی آواز پر کان دھرتے ہیں نہ دوسری پر، تاکہ جناح کے اصل پاکستان کا صحیح رُخ اوجھل ہی رہے۔ منافقت کی یہ کہنہ روایت تو اس دن بھی پھنکاری تھی جب نئے دارالحکومت کراچی میں قائداعظم کی تقریر کے یہ حصے سنسر (censor) کر دیے گئے۔ مگر ڈان اخبار کے ایڈیٹر الطاف حسین کی بغاوت انھیں منظر عام پر لے آئی۔ یہ اخبار بھی تو وہ نیا ابتدائی شگوفہ تھا جو قائداعظم

نے خود اپنے ہاتھ سے لگایا اور مشرقی پاکستان کے ایک مالی (الطاف حسین، مدیر ڈان اخبار) کے سپرد کر دیا۔ وطن کے مینار کے ظہور سے صرف تین دن پہلے لگنے والی یہ پابندی (censorship) دراصل مشیت کا پہلا علامتی اشارہ تھا کہ نئی مملکت کے کس کونے کی مٹی کی کیسی تاثیر ہوگی۔ یعنی مغربی پاکستان میں تو لب بستگی کے کانٹے اُگیں گے لیکن مشرقی پاکستان میں لب کشائی کی ہریالی ہوگی۔

ان دنوں کی افراتفری میں تو ایسی علامتیں کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا، مگر اب یہ تاثیر واضح ہو چکی ہے۔

ان ہیجان خیز تین برسوں میں میرے حیران و پریشان لڑکپن نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پہلے ذہن بدلتے، پھر جذبات اُبلتے اور بالآخر بربریت اُچھلتے دیکھی۔ مجبور ہجرت، جبری جلاوطنی اور ناقابلِ یقین نقل مکانی دیکھی۔ اونچے نیچے شعلوں کے رقص دیکھے۔ موت کی حکمرانی میں زندگی کی ہراسانی دیکھی۔ میں ان مسافروں میں سے تو نہ تھا جن کے دریدہ جسم یا خون آلود جسم ہی منزل پر پہنچے۔ نہ میں کنویں میں چھلانگتی یا مغویہ عورتوں اور گم شدہ بچوں کا سوگوار عینی شاہد تھا نہ میرا بازو کٹا، نہ سر پھٹا، نہ طویل قافلوں کی آبلہ پائی بھگتی، مگر جب ایسے عزیزوں کی سواگت کرتا اور ایسے لوگوں کو ہسپتالوں، کیمپوں، ٹرکوں، تانگوں اور فٹ پاتھ پر صدموں سے نڈھال دیکھتا جن کے ساتھ حال ہی میں یہ ہوا تھا تو میرے اپنے جسم و جاں کا رُواں رُواں وہ سب کچھ محسوس کرنے لگتا جو کسی بھی ایسے انسان کے ساتھ کہیں بھی ہو رہا تھا۔ اس ہونی کا اپنا تو کوئی مذہب نہ تھا، مگر ہونی کے ہر شکار کا ایک نہ ایک مذہب ضرور تھا۔ اس لیے میرے دل میں خدا کی خدائی اور بندے کی عبودیت کے سارے رشتے اور تصورات کراہنے اور لڑکھڑانے لگ جاتے اور میرا ماؤف ذہن یہ سوچنے لگتا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ کیا اسے ہونے سے روکا نہیں جا سکتا تھا؟

اُس وقت میں نوعمر تھا۔ زمین کے قریب تھا۔ کوئی جواب اگر مل جاتا تو شاید میری سمجھ سے بالا بالا ہی رہتا لیکن آج جب میں اپنی زندگی کے مینار کی آٹھویں منزل میں ہوں اور آسمان کے قریب ہوں تو عالمِ بالا سے مرحوم قائداعظم کے جواب کی سرگوشی سن بھی رہا ہوں اور سمجھ بھی رہا ہوں۔

> قائداعظم کی سرگوشی بھی افسردہ ہے۔ ''اسے بالکل روکا جا سکتا تھا!'' ایک بھی گولی نہ چلتی۔ ایک بھی قطرۂ خون نہ گرتا۔ ایک بھی گھر نہ اُجڑتا۔ اگر کانگریس میری بات مان لیتی۔ جو میں ۲۸ برس تک اس کا حصہ بن کر سمجھاتا رہا، منت کرتا رہا، خوشامد کرتا رہا[۲۶] کہ ملک کے نئے آئین میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں نمائندگی دی جائے۔ اقلیتی قوم کا یہ جائز تقاضا اگر اکثریتی قوم مان لیتی تو برعظیم آج بھی یک جان و یک قالب ہوتا۔ بودی والے ہندو، داڑھی والے مسلمان اور جوڑے والے سکھ آج بھی

> ساتھ ساتھ رہ رہے ہوتے اور اس کے قریہ قریہ میں عید، بقرعید، ہولی، دیوالی پر سبھی کی باہمی مبارک سلامت حسبِ سابق ہوتی رہتی۔[۲۷]
>
> جیسے جیسے قائداعظم کی سرگوشی دور ہوتی جاتی مجھ پر روشن ہوتا جاتا کہ دوقومی نظریہ تب بھی ہوتا مگر وہ منفی کی بجائے مثبت ہوتا اور برعظیم کی سرزمین کے لیے زحمت کی بجائے رحمت بن جاتا۔[۲۸]

قائداعظم کی سرگوشی کی پہلی تائید ۱۹۸۵ء میں ہوئی جب عائشہ جلال نے اپنی کتاب میں تحریکِ پاکستان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ قائداعظم تو تقسیمِ ہند کے خلاف تھے۔ مگر کانگریس تقسیم ہند پر بضد تھی۔[۲۹]

اس سرگوشی کی دوسری تائید حال ہی میں ہوئی ہے۔ جب زود پشیماں پنڈت نہرو کی پشیمانی ان کے اس خط سے آشکار ہوئی جو انھوں نے نواب بھوپال کو جولائی ۱۹۴۸ء میں (یعنی قائداعظم کی وفات سے دو ماہ پہلے) لکھا اور کہا کہ:

> میں تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سے معاملات میں ہم قصوروار ہیں ... دراصل ہم ملک کا بٹوارہ صرف اس لیے چاہتے تھے کہ ہمارے خیال میں ایک عارضی سے درد و کرب کے بعد ہم بالآخر امن کی چھاؤں میں بیٹھ سکیں گے، مگر یوں لگتا ہے کہ شاید ہمارا یہ فیصلہ بالکل غلط تھا، کیونکہ اس بٹوارے کے عملی نتائج اتنے ہولناک نکلے ہیں کہ ذہن کہتا ہے کہ کوئی بھی اور حل اس تقسیم سے یقیناً بہتر ہوتا۔[۳۰]

کاش قائداعظم کی یہ سرگوشی اور پنڈت نہرو کا اقبالِ جرم وہ پاکستانی بھی سن سکتے جن کا اصرار ہے کہ قائداعظم کی غلط سوچ کی وجہ سے برعظیم کو تقسیم کے المیے سے دوچار ہونا پڑا۔[۳۱]

وہ سرگوشی تو بالآخر گم ہوگئی، مگر اس کے بھرپور تاثر نے مجھے ایک دفعہ پھر اپنے مینار کی دوسری منزل میں لا پٹخا۔ جہاں کانگریس کی ہٹ دھرمی اور تعصب کے منطقی نتائج برآمد ہو رہے تھے اور بربریت کے طوفانوں اور زلزلوں نے ایسی قیامت برپا کر رکھی تھی، جو میرے قلم کی گرفت سے بہت دور ہے اور میرے الفاظ کا افلاس میرے عاجز قلم کا منہ چڑا رہا ہے۔ ان تین ہیجان خیز برسوں کے بعد ایک غضبناک طوفان کے سرکش گرداب اب گنگا جمنا اور پنج ند کی زمین کو اس طرح شق کر رہے تھے کہ وطن کے انبار کے نیچے سے وطن کا مینار سر نکالنے کو تیار ہو گیا۔

مگر اس معجزے سے پہلے میں ان طوفانوں میں اُڑنے والے تنکوں میں سے چند تنکے آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ جو میرے قلم کی رواں سیاہی سے چپک گئے تھے۔[۳۲]

پہلا تنکا... مشرقی پنجاب سے امنڈنے والے خونیں سیلاب سے لاہور ذہنی طور پر تو شل ہو گیا، مگر جسمانی اور جذباتی طور پر بے حد متحرک ہو گیا۔ والٹن کیمپ میں ایک بالکل نئی دنیا اُبھر آئی

تھی۔ جہاں پناہ گیروں کے اژدحام میں منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کا بھی نزول ہو رہا تھا۔ مگر وہ عام چلن نہ تھا۔ اس کے برعکس مخیر اور خدا ترس اہلِ دل بھی اسی کیمپ میں پناہ گزینوں کے واری صدقے ہو رہے تھے۔ باقی شہر لاہور میں اکثر کنبے اپنے لٹے پٹے عزیزوں کی آمد کی وجہ سے کئی کئی گنا پھیل گئے تھے اور ان کے گھروں کے کونوں کھدروں میں بھی بقول ضمیر جعفری وہ انسانوں کی بجائے بٹیرے بن کر رہنے لگے تھے[۳۳] اور جب تک پکے ٹھکانے کی کوئی سبیل نہ بن گئی وہ ایسے ہی انسانی گٹھڑیوں کا ڈھیر بنے رہے۔ گلیوں، سڑکوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں میں ہر جگہ لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے۔ زندہ، زخمی یا مردہ ... آنکھیں خالی خالی، ماتھے پریشان، ہاتھ بے صبرے، پاؤں نڈھال، ذہن مستقبل میں بھٹکا ہوا اور تدبیر کسی تقدیر کا دامن پکڑنے کو بے تاب۔ بڑے بڑے خوددار محض سوالی بن کر رہ گئے اور بڑے بڑے پتھر دلوں میں سے ہمدردی کے چشمے پھوٹ پڑے۔

ایک دن صبح کے وقت پاکستان ٹائمز میں اپیل دیکھی کہ میو (Mayo) ہسپتال زخمی لوگوں اور دیگر مریضوں سے اٹا اٹ ہے۔ ناکافی عملہ بے بس ہوتا جا رہا ہے۔ دردمند رضا کاروں کی فوری ضرورت ہے۔ گھنٹہ بھر گھر میں مشورے ہوتے رہے۔ بالآخر قرعہ دو بچوں کے نام پڑا۔ عجلت بھری تیاری کے بعد میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ (جو کالج میں پڑھتے تھے) دن کے گیارہ بجے ہسپتال پہنچا تو یوں لگا جیسے ہسپتال نہ ہو، مویشیوں کی منڈی ہو۔ جس میں ہر طرف بے ترتیب جسم ہی جسم متحرک ہوں۔ کمرے، برآمدے، باغیچے بلکہ جہاں تہاں گز بھر زمیں بھی تھی مریضوں یا ان کے لواحقین سے چھلک رہے تھے۔ چارپائیوں، فرشی بستروں اور چٹائیوں پر پڑے ہوئے مریض۔ تیز تیز چلتے ڈاکٹر، نرسیں اور تیماردار۔ ضروری سامان کے ڈھیر، ہم دونوں بھائی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک دفتر سے دوسرے دفتر جاتے رہے۔ کسی ڈاکٹر سے پوچھا، کسی نرس سے۔ مگر وہاں کسے فرصت تھی کہ دو لڑکوں کی رہنمائی کرتا۔ بالآخر تھک ہار کر اپنے آپ کو فالتو سمجھتے ہوئے واپس آنے لگے۔ تو کسی نے بتایا کہ ہم واقعی فالتو تھے۔ کیونکہ صبح ہی صبح مقامی خاکساروں کے علاوہ سب اطراف سے دیگر لوگ اتنی بڑی تعداد میں پہنچ گئے تھے کہ مناسب تعداد میں رضا کاروں کے محتاط انتخاب کے بعد باقی سب کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔

واپسی پر میرے بڑے بھائی کہنے لگے، ''علامہ مشرقی ساری قوم کو خدمتِ خلق کی جو تربیت دیتے رہے یوں لگتا ہے کہ وہ ضائع نہیں گئی۔''

دوسرا تنکا... مشرقی پنجاب کے مہاجروں نے اگر ایک طرف خدمتِ خلق کے جذبے کو جوش

دلا دیا تو دوسری طرف قومی غیرت کو بھی قصاص پر اُکسا دیا اور چند نہتے نوجوانوں نے شاہ عالمی دروازے کی ناقابلِ تسخیر قلعہ بندی کو حیرت انگیز انداز میں تہس نہس کر دیا۔ اونچی پرانی عمارتوں، تنگ گلیوں اور انتہائی گنجان آبادی والے اس دروازے کے سامنے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا بڑا دروازہ بنایا گیا تھا۔ جو رات کو بند کر دیا جاتا اور اُس میں برقی رو چھوڑ دی جاتی۔ مگر درجن بھر نوجوانوں نے لنگوٹ باندھ کر جسم پر کالی مالش کر لی اور بدرو (sewerage) کی نالیوں میں سے اندر گھس گئے۔ ان کے پاس صرف پٹرول، مٹی کا تیل اور ماچس تھی اور وہ بازار کے دونوں طرف نالیوں میں اس طرح رینگ رہے تھے کہ دو اڑھائی فٹ اوپر دکانوں کے سامنے والے لکڑی کے تختے ان پر چھت جیسے اوٹ بنا رہے تھے۔ اندر جا کر وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد ایک ٹولی ان چھت نما تختوں پر نیچے سے پٹرول یا تیل چھڑکتی جاتی تھی اور چند قدم پیچھے آنے والا شخص دیا سلائی سے آگ لگاتا جاتا تھا۔ بعد کی اخباری خبروں کے مطابق یہ ٹولیاں مرکزی بازار اور کئی گلیوں میں ایک سو سے زیادہ جگہ آگ لگانے میں کامیاب ہو گئیں اور سیکڑوں برس پرانی عمارتوں کی خشک لکڑی سے کئی دن تک اتنے بلند شعلے نکلتے رہے کہ لاہور شہر کے وسیع خطے کی کئی راتیں روشن ہی رہیں اور سلگتے دھوئیں کئی ہفتوں تک جابجا ظاہر ہوتے رہے۔ بعد ازاں دھوئیں سے جھلسے ہوئے بدرنگ ملبے کے پہاڑ نما ڈھیر بن گئے اور ایک وسیع رقبے پر کئی ماہ تک اس تاریخی ناسور سے عبرتیں رِستی رہیں۔

تیسرا تنکا... نہ معلوم اس کی وجہ کیا تھی[۳۴] مگر لاہور کے غیر مسلموں کا غالب گمان یہی تھا کہ لاہور ہندوستان کا حصہ بنے گا۔ اس لیے جب مشرقی پنجاب سے جوق در جوق مسلم مہاجرین اس شہر میں اُمنڈے آتے تھے تب بھی لاہور سے غیر مسلموں کا انخلاء کہیں نظر نہ آتا تھا لیکن یومِ آزادی سے چند روز پہلے شاہ عالمی گیٹ پر کامیاب حملہ ہوا تو وہاں کی آبادی کے بیشتر لوگ ہندوستان جانے لگے لیکن جب آزادی کے بعد تیسرے روز ۱۷؍اگست کو ریڈکلف ایوارڈ (Radcliffe Award) کا اعلان ہوا اور لاہور پاکستان سے جڑا رہا تو فوراً ہی غیر مسلموں سے لدے ہوئے ٹرکوں کا لامتناہی سلسلہ کئی دن تک واہگہ بارڈر کی طرف جاری رہا۔ فیروزپور روڈ، مزنگ روڈ، کوئنز روڈ، ٹمپل روڈ اور لارنس روڈ پر بیٹھی، کھڑی اور لٹکتی ہوئی سواریوں سے چھلکتے ہوئے ٹرکوں کی لمبی قطاریں کسی ریلوے ٹرین کے انداز میں کئی دن تک چلتی نظر آتی رہیں۔

ایک دن میں گنگا رام ہسپتال کے قریب ٹمپل روڈ اور مزنگ روڈ کے چوراہے سے گزر رہا تھا تو یہ دیکھ کر رک گیا کہ ملک معراج دین سڑک کے قریباً بیچ میں کھڑا بازو ہلا ہلا کر ان ٹرکوں میں سے

کسی ایک کو روکنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مگر وہ ہارن دے کر اسے سامنے سے ہٹا دیتے تھے اور نظر انداز کرتے ہوئے چلتے جاتے تھے۔

کئی دفعہ کی کوشش کے بعد ایک ٹرک رُکا تو ملک معراج دین ڈرائیور سے کچھ باتیں کرتا رہا۔ پھر ٹرک چل پڑا تو وہ چند قدم اس کے ساتھ بھاگ کر کچھ کہتا رہا۔ مگر ڈرائیور انکار میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھتا گیا اور ملک معراج دین اپنی جگہ پر واپس آ کر پھر ویسی ہی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

فسادات اور قتل و غارت کے شدید تناؤ والے ماحول سے یہ منظر کچھ ایسا بے جوڑ سا لگا کہ عدم مطابقت نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور میں تھوڑی دور کھڑا حیرت سے دیکھنے لگا۔

کافی دیر ہو گئی۔ کیونکہ ٹرک اوّل تو رُکتے ہی نہ تھے اور چند ایک جو رکے، ان کے ڈرائیور انکار میں سر ہلاتے آگے نکل جاتے اور ملک معراج دین کو بے نیل و مرام چھوڑ جاتے۔

بالآخر ایک ٹرک رکا... درخواست سن کر نفی میں سر تو اس نے بھی ہلایا، مگر مزید اصرار سن کر پہلے تو سوچنے لگا۔ پھر مڑ کر ٹرک کی سواریوں سے مشورہ کرنے لگا اور بالآخر راضی ہوتا دکھائی دیا۔ ملک معراج دین کا چہرہ چمک اُٹھا۔ پیچھے مڑ کر اس نے کسی کو اشارہ کیا۔ تو فٹ پاتھ پر کھمبے کے پاس کھڑی ایک برقع پوش عورت ہمک کر آگے بڑھی... ڈرائیور سے کچھ بات کی... پھر ایک دم اپنا برقع اُتار کر ملک معراج دین کی طرف پھینکا... اس کا ہاتھ اُٹھا کر چوما... اپنی آنکھوں سے لگایا... اور ٹرک کی پچھلی طرف کو بھاگی... کئی لوگوں نے جھک کر اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور ان کے سہارے وہ لٹکتی، ڈولتی ہوئی ٹرک میں سوار ہو گئی۔

فوراً ہی بڑی پُرشور گھوں گھوں سے روانگی ہو گئی۔

ملک معراج دین فٹ پاتھ پر ہٹ کر برقع تہہ کر رہا تھا تو میں نے اسے جا لیا۔ پہلے تو اس نے یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی کہ ایک سواری رہ گئی تھی۔ اسے ان کے حوالے کرنے آیا تھا۔ مگر جب میرے سوالات اور برقعے کا ذکر جاری رہا۔ تو اس نے جھجک سے رک رک کر بتایا کہ یہ ایک ہندو طوائف تھی۔ قافلے منظم کرنے والے کچھ متعصب قسم کے لوگ تھے۔ اس لیے اس طوائف کو دانستہ ہیرا منڈی میں چھوڑ گئے تھے۔ کیونکہ اس عورت نے چند برس پیشتر پولیس، خاکسار تصادم میں کئی خاکساروں کو پناہ دے کر ان کی جان بچائی تھی اور زخمیوں کی بھی مدد کی تھی۔ اب وہ اِدھر اُدھر بے آسرا سی گھروں میں چھپ کر کوئی سبیل تلاش کر رہی تھی۔ ملک معراج دین کو پتا چلا تو یہ جا کر اسے اپنے گھر لے آیا۔ گاؤں سے آئی رشتے دار مشہور کر کے اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ رکھا اور

آج موقع ملنے پر اسے ہندوستان روانہ کر دیا۔

''شکر ہے خدا کا!'' وہ آسمان کی طرف سر اُٹھا کر بولا'' کہ وہ حفاظت سے روانہ ہو گئی ہے۔''

تنکے اور بھی بہت ہیں... حیوانیت سے خون رنگ بھی اور انسانیت کی سنہری دمک والے بھی... یہ سب لایعنیت کے طوفانی بگولوں کی بے سمتی میں جابجا اُڑ رہے تھے۔ مگر ان سب کو پکڑنے کے لیے ''پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی'' (غالب)... جب ایسے دل کم کم ہوں تو داستانِ الم کو مختصر ہی رہنا چاہیے۔ شاید یہی اختصار فسادات کی ساری داستان کو اُس ایک فقرے میں سمو دیتا ہے جو جالندھر کے نامہ نگار آئن موریس (Ian Morace) نے لندن ٹائمز کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''پنجاب کا قتل عام دوسری جنگِ عظیم سے زیادہ ہولناک تھا۔'' (۲۴ راگست ۱۹۴۷ء)۔

میرا مینار اب لرز رہا ہے۔ کیونکہ تحریک پاکستان اب ختم ہونے کو ہے... اور وطن کا مینار سطح زمین سے اُوپر اُبھرنے کو ہے۔

میں اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے جھانک رہا ہوں اور دوسری منزل کے اس روح پرور مرحلے کو نظر بھر کے دیکھنا چاہ رہا ہوں، مگر پیاسی آنکھوں کی تسکین نہیں ہو پاتی۔ کیونکہ برعظیم کے ہر علاقے کے مسلمانوں کی مکمل یک جہتی کا یہ آخری نظارہ ہے۔ ایسی یک جہتی پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ ان علاقوں کے لوگ بھی جو آج پاکستان کا حصہ ہیں اور ان علاقوں کے لوگ بھی جو پہلے دن سے جانتے تھے کہ وہ پاکستان کا حصہ نہیں بنیں گے۔ وہ سبھی مل کر یکساں طور پر سرگرم رہے کہ کول، دراوڑ اور بدھوں کی سرزمین میں ہندی مسلمانوں کا تہذیبی مینار نصب کر کے رہیں گے۔

ان سب کی سرگرمی کے عوامی ریلے ہر اسمبلی میں مسلم لیگی نمائندوں کا چناؤ کرتے رہے۔ پھر جون کا پارٹیشن پلان (Partition Plan) اور جولائی کے قانونِ آزادی (IndianIndependence Act) کے تحت بنگال، پنجاب اور سندھ کی اسمبلیوں نے پاکستان میں شمولیت کے لیے ووٹ دیے۔ صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت پر اسلامیہ کالج، پشاور کے طلباء کا جذبۂ جہاد حاوی رہا اور وہاں کے عوام نے جولائی کے ریفرنڈم میں پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ آسام کے ریفرنڈم سے سلہٹ میں بھی پاکستان بن گیا اور بالآخر بلوچستان کی ریاستوں نے نہ صرف خود پاکستان سے الحاق کیا، بلکہ شاہی جرگے نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ ان سب کی مشترکہ کوشش نے نئے وطن کی بنیادیں بھر دیں۔

اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے میں ہندی مسلمانوں کی یہ عظیم مشترکہ کاوش بار بار دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ آج کوئی فرد، گروہ یا علاقہ یہ دعویٰ کرنے کے قابل نہیں رہا کہ پاکستان اس

نے بنایا ہے یا پاکستان بنانے میں اس کا حصہ زیادہ ہے یا کسی علاقے کا حصہ نہیں ہے یا کم ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں لاہور کا دوسرا منظر بھی دیکھ رہا ہوں کہ دردناک اور خون آلود صبح صادق میں ماہِ رمضان المبارک شروع ہو چکا ہے۔ جولائی — اگست کی گرم فضا میں اٹھارہ گھنٹے کے طویل روزے کی پیاس کے علاوہ ہزاروں اور پریشانیاں تیر رہی ہیں۔ فسادات کی وحشت ناک خبریں، آبادیوں پر حملے کے خطرے، کرفیو زدہ راتوں میں رینگتی پہرہ داری، چھرے گھونپنے کی خاموش وارداتیں، مہلک خدشات کے جھکڑ کہ لاہور کے ماتھے پر تلک لگے گا یا ہلال اُبھرے گا، والٹن کیمپ سے اُٹھنے والی آہ و فغاں، فسادزدہ علاقوں میں پھنسے ہوئے عزیزوں کے لیے تشویش، بیم و رجا کی ہر صورت، فکر و تردد کی ہر افسردہ کروٹ...

اس مکمل انتشار و سرگردانی میں طلوعِ پاکستان اور جمعۃ الوداع تاریخ کے چوراہے میں اپنے انوکھے ملاپ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

برطانوی وزیراعظم نے اعلان کیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء میں ہندوستان چھوڑ دے گا اور اس پروگرام کی تکمیل کے لیے نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) مارچ ۱۹۴۷ء میں دہلی پہنچ گئے لیکن ہندو مسلم فسادات کے پھیلاؤ، شدت اور نوعیت سے انھیں اندازہ ہو گیا، انگریزی حکومت کے لیے حالات پر قابو پانا دن بہ دن مشکل ہوتا جائے گا۔ اس لیے انھوں نے برطانیہ کی حکومت کو آمادہ کر لیا کہ مزید انتظار کے بغیر ہندوستان فوراً چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو پارٹیشن پلان (Partition Plan) کے اعلان میں دونوں نئی مملکتوں کو انتقالِ اقتدار کے لیے ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کا دن مقرر ہوا۔ اس طرح دو سو برس کے دوران برعظیم پر بتدریج پھیلنے والی انگریزی سلطنت کی بساط اب صرف ۷۲ر دنوں میں سمٹی جا رہی تھی۔

مشہور ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ چنانچہ اس عجلت میں انتہائی افراتفری پھیلنے لگ گئی۔ فسادات مزید بے لگام ہوتے گئے۔ انھیں روکنے میں انگریزی حکومت غلاموں کے لیے تو دن بہ دن غیر مؤثر بلکہ غیر سنجیدہ ہونے لگی، مگر حاکموں کے تحفظ میں زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مؤثر ہونے لگی۔ چنانچہ غلام رعایا کے تو لاکھوں کروڑوں لوگ خون میں نہا گئے۔ قبر والی یا بغیر قبر والی موت مرے۔ نقل مکانی اور جلاوطنی میں نڈھال ہوئے اور سارا برعظیم میدانِ حشر بنتا گیا۔ مگر وفادار غلام ملازموں کی جاں نثاری کو مرحبا کہیے کہ چالاک سفید فام حاکم کا کوئی فرد زخمی تک نہ ہوا اور سبھی بخیر و عافیت انگلستان پہنچ گئے۔[35]

۷ر اگست ۱۹۴۷ء کو نئی مجوزہ مملکت کے گورنر جنرل قائداعظم نئے دارالحکومت کراچی میں

ماری پور کے ایئرپورٹ پر اُترے۔ ۱۳ر اگست کو وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی کراچی پہنچ گئے اور اگلے دن انھوں نے سندھ اسمبلی بلڈنگ میں نئی قانون ساز اسمبلی کے سامنے نئی مملکتِ پاکستان کے قیام کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا۔ بعدازاں وائسرائے اور پاکستانی گورنر جنرل کا شاہی جلوس (State Drive In) نئے ملک کے گورنر جنرل ہاؤس تک گیا۔ حالانکہ انگریزی حکومت کی خفیہ پولیس نے اس جلوس کی مخالفت کی تھی اور ان کی مہیا کردہ اطلاعات کی وجہ سے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن بہت پریشان تھے کہ جب جلوس الفنسٹن اسٹریٹ میں ہندوؤں کی دکانوں کے سامنے سے گزرے گا تو دستی بموں کے حملے سے قائداعظم کو قتل کر دیا جائے گا۔ مگر پاکستان کے اصرار پر جلوس شروع ہوا۔ مقررہ راستے سے گزر گیا، مگر حملہ نہ ہوا اور بعد کی اطلاعات نے خفیہ پولیس کی خبر کی تصدیق کر دی۔ جب پتا چلا کہ جس شخص نے پہلا بم مار کر حملے کا آغاز کرنا تھا، وہ سکھ تھا اور ان دنوں کی مذہبی جنگ میں بھرپور حصہ لیتا رہا تھا، مگر عین اُس وقت بالکل حوصلہ ہار گیا اور قائداعظم بخیر و عافیت گزر گئے۔

جب کراچی میں اس سرکاری اعلان کے بعد یہ جلوس دھیرے دھیرے رواں تھا تو لاہور میں ۱۴ر اگست کا وہ دن بہت بے چینی اور اضطراب کے عالم میں گزر رہا تھا، کیونکہ افواہوں کی بھرمار تھی کہ ریڈکلف ایوارڈ تیار تو ہو گیا ہے مگر اس کے اعلان کے بعد کے ممکنہ ردِعمل کو سنبھالنے کی ذمے داری انگریزی حکومت خود نہیں لینا چاہتی۔ اس لیے اس کا اعلان دونوں نئی مملکتوں کے قیام کے بعد ہو گا۔ یہ غلط نہ تھا۔ بلکہ سرکاری مشوروں کے بعد کا فیصلہ تھا۔ مگر افواہیں یہ تھیں کہ لاہور ہندوستان میں شامل ہو گا۔

۱۴ر اگست کا سورج غروب ہوا تو بے چین سی افطاری شروع ہو گئی اور رمضان المبارک کی ستائیسویں رات کا نزول ہونے لگا۔ پھر کرفیو کی تاریک ویرانی سارے شہر پر چھانے لگی۔ لاہور میں مسلمان چہروں پر عجیب سی پریشان مسکراہٹیں تھیں۔ حصولِ منزل کی خوشی مسکراہٹ بن کر اُبھر رہی تھی، مگر کئی اقسام کی گہری تشویش کی پیلاہٹ بھی تھی کہ ہندو اور انگریز کی ملی بھگت کی وجہ سے نہ معلوم اگلا لمحہ کیسا ہو گا... کوئی حملہ، کوئی حادثہ یا کوئی اور غیرمعمولی رکاوٹ وہ روایتی کالی بلی نہ بن جائے جو راستہ کاٹ جائے تو سفر رُک جاتے ہیں۔ خوش بختیاں واپس پلٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ بے صبری ہمیں آگے دھکیلتی تو وسوسے اور خدشات ہمیں پیچھے کھینچتے۔

گھڑی کی ٹک ٹک اب پاکستان کے آنے والے قدموں کی چاپ بن کر سنائی دے رہی تھی۔ فضا میں سناٹا طاری تھا۔ دلوں میں ملے جلے جذبات ہمک رہے تھے۔ چاروں طرف

اندھیرے میں طرح طرح کی پریشانیاں ناچتی نظر آتی تھیں۔ اُوپر سے رات اُتر رہی تھی۔ نیچے دلوں میں تلاطم برپا تھا... لیکن وقت تو مٹھی میں بھری ریت ہوتی ہے جو روکے نہیں رُکتی... ٹک ٹک ٹک...

ایک دم سنسناتی ہوئی گولیاں اس ٹک ٹک اور سناٹے کے پرخچے اُڑانے لگیں... لوگ ہڑبڑا اُٹھے... شور ہی شور... ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟''

آوازیں... نعرے... چیخ و پکار... ان سب سے اندازہ ہونے لگا کہ ٹمپل روڈ پر سکھوں کے گوردوارے ''ساتویں بادشاہی'' پر مسلمانوں نے بھرپور حملہ کر دیا ہے۔

گوردوارے میں گھمسان کا رن... اندھیرے میں تاحدِ ساعت چھتوں سے تین مذاہب کے نعرے... پولیس کی سیٹیاں... لہراتے ہوئے دھوئیں کا پہلا خاموش اُبھار... لال پیلے شعلوں کا ظہور... اُونچی چھتوں والے ہمسایوں کی حیرت اور بے یقینی سے لبریز تماش بینی... وقفے وقفے سے گوردوارے کی سوختہ چھتوں[36] کے گرنے کی دھمک... اور ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکی کے آگ سے روشن دامن میں شرر اور اُڑتی گرد کا بھیانک رقص... کون سی آزادی اور کون سے پاکستان کے خوابوں کی تعبیر؟... ہم سب کی جذباتی اور ذہنی اُڑانوں کو کڑوے زمینی حقائق نے کھینچ کر ایک دفعہ پھر زمین پر لا پٹخا... لاہور کی ساری آبادی کا ہر فرد سہم گیا... نہ معلوم اب کس طرف سے کس انداز میں جوابی حملہ ہوگا؟ کون بچے گا؟ کون مارا جائے گا؟... کیا پتا ہمیں پاکستان کا طلوع دیکھنا نصیب ہوگا یا نہیں... اگلا لمحہ کیسا ہوگا؟ ... یا خدا!!... مگر انسان پریشان ہو یا نہ ہو۔ خدا کی خدائی کی رفتار کبھی نہیں رُکتی... ٹک ٹک ٹک...

ساڑھے گیارہ بج گئے۔ نعرے خاموش ہو چکے تھے۔ شعلوں کی بلندی لڑکھڑانے لگ گئی تھی۔ دھوئیں کے لہرانے کو نظرانداز کیا جا سکتا تھا... سب لوگ گھر کے ریڈیو کے گرد جمع ہونے لگے۔ گھروں کی چھتوں پر، مسہریوں کے اندر یا باہر اور پہرے دینے والوں کی اوٹ میں... جن کے پاس ریڈیو نہیں تھے ان کی انسان دوستی میں دوسروں نے اپنے ریڈیو کی آواز بلند ترین کر دی۔ پھر نظریں بھی گھڑیوں پر جم گئیں۔

آدھی رات کی نیّے[37] اور خصوصی نشریات سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کا مخصوص تمہیدی الاپ کا وائلن (violin) شروع ہوگیا... اس خوبصورت الاپ کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو کو دیا ہوا قدرت کا دوسرا تحفہ ابھی خاموش تھا... یہ مصطفیٰ علی ہمدانی کی باوقار آواز تھی۔[38]

عین رات بارہ بجے یہ آواز صدائے جبرئیلؑ کی طرح سارے تاریک سکوت پر چھا گئی۔

''پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس!''

یہ ایک بالکل نئی قسم کا انوکھا سا اعلان تھا... کانوں کے لیے اتنا اجنبی کہ روح میں جذب ہوتے ہوتے رات کا سکوت بھی کسی نئی حیرت میں جم کر گہرا سناٹا بن گیا... دو سیکنڈ لمبا سناٹا... اس وقفے کے بعد یہ آواز دوبارہ اُبھری۔

''یہ ریڈیو پاکستان ہے!''

اب یہ سناٹا ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔ ہر مسلمان کی چھت، لان، برآمدے، کونے سے ملے جلے کئی فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ مگر فوراً ہی خود بخود رُک بھی گئے۔ جیسے باجماعت نماز کے آغاز میں اقامت رُکتے ہی عبادت کی خاموشی شروع ہو جاتی ہے... پھر ساری مسلمان قوم اُسی محویت سے ریڈیو سننے لگی۔ جیسے کوئی گہری عبادت میں ڈوبا ہوتا ہے۔

سورۂ فتح کی ایمان افروز تلاوت... مولانا ظفر علی خاں کی نعت ''توحید کے ترانے کی تانیں اُڑائے جائے۔'' قائداعظم کی مختصر مگر انتہائی گھن گرج والی تقریر... غالباً ایک گھنٹے تک خصوصی نشریات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

پاکستان حقیقت بن گیا تھا اور وطن کا مینار برعظیم کی سرزمین کی کلغی بن کر لہرانے لگا۔

آسمان پر علامہ اقبال کی روح کی سرشاری میں ان کے قومی ترانے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' نے اتنے زور سے انگڑائی لی کہ تڑخ گیا... اب گھڑی کی ہر ٹک ٹک کے ساتھ ہندوستان سرک سرک دور جانے لگا اور پاکستان کا نیا شگوفہ لحظہ بہ لحظہ کھلنے لگا۔ ع

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

پاکستان کے اپنے سفر کا آغاز بڑے عجب انداز میں ہوا۔ کامیابی کی مسکراہٹ کے نمایاں ڈمپل (dimple)، مگر آنسوؤں سے بھرے ہوئے۔ کبھی بھیگی آنکھوں سے خدا کے شکر میں دونوں ہاتھ اُٹھ جاتے اور کبھی بھاری دل سے دونوں ہاتھ اُٹھ کر فریاد کرنے لگتے۔ مسائل کا ہجوم مگر ''ہمت مرداں مددِ خدا'' کا یقین محکم۔ پہلی رحمت یہ ہوئی کہ تین دن تک لاہور کے مستقبل کے بارے جو خدشات افواہوں کی چھلانگیں مار رہے تھے وہ سترہ تاریخ کو ریڈ کلف ایوارڈ کے آتے ہی دم توڑ گئے، کیونکہ لاہور سر تا پاؤں تک پاکستان کا حصہ تھا، مگر ساتھ ہی ضلع گورداسپور اور ضلع فیروز پور کے مسلم علاقوں کو بھارت میں شامل کر کے نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کی سازش نے ہمارے سینے میں خنجر چبھو دیا تھا، جس سے ہر طرف پژمردگی پھیل گئی تھی۔

جیسے جیسے نئے وطن کی خوشی بڑھنے لگی ویسے ویسے یہ پژمردگی بھی بڑھنے لگی۔ کیونکہ کبھی حیلوں

بہانوں اور کبھی سینہ زوری سے ہندوستان ہمارے وہ اثاثے روکنے لگا، جو بٹوارے میں ہمیں ملے تھے۔ پارٹیشن ایگریمنٹ (Partition Agreement) کے تحت پاکستان کو دفاعی سامان کی تین سو اسپیشل ٹرینیں بھیجی جانی تھیں لیکن صرف تین پہنچ سکیں۔ جن میں کئی پیٹیوں میں اسلحہ کے بجائے اینٹیں بھری ہوئی تھیں۔ اسی طرح خزانے کی رقم کے ۲۰ رکروڑ روپے دینے کے بعد ہندوستان نے بقایا ۵۵ رکروڑ ہضم کر لیے۔ نئے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خود بھی اسے بین الاقوامی غبن قرار دیا تھا۔ مگر نہرو اور سردار پٹیل یہ رقم دینے کو تیار نہ ہوئے تا کہ اسلحے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کشمیر کی جنگ میں استعمال نہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ بھی ہندوستان ایسے متعدد حربے مسلسل آزما رہا تھا، جن سے پاکستان کو شروع ہی میں ناکام ریاست بنا دیا جائے۔ اسی لیے وہ ہر اُس چیز کو روکتا رہا جس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔

۱۵ راگست کو جمعۃ الوداع تھا۔ اُس روز پاکستان کی سرزمین سے یونین جیک غائب ہو چکا تھا اور اس کی بجائے پاکستان کا سفید و سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ انگریزی حکومت کا آخری کام یہ تھا کہ سرکاری ملازموں کو اگست کے پہلے نصف حصے کی تنخواہ ادا کر دی گئی۔ پھر ''گاڈ سیو دی کنگ'' (God Save the King) والا کنگ ہمارے لیے مر گیا۔

پندرہ دن بعد انھی سرکاری ملازموں کو اگست کے دوسرے نصف حصے کی تنخواہ حکومت پاکستان کی طرف سے دی گئی۔ تو سابقہ انگریزی کرنسی پر ہی ''سلطنت خداداد پاکستان'' چھپا ہوا تھا۔ وصولی کے بعد خرچ کرنے کی بجائے لوگ اسی چھپائی کو چوم رہے تھے، آنکھوں سے لگا رہے تھے اور عید کے گزر جانے کے باوجود بچوں کو دوبارہ عیدی کے طور پر دے رہے تھے۔

پاکستان کے شروع کے دن ایسے ہی تھے کہ ع

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہر طرف جذبے اور ہمت کے تو ڈھیر تھے۔ سینے میں، دل میں، ہونٹوں پر، دعاؤں میں اور جسمانی حرکات و سکنات میں مگر اس سے آگے کچھ بھی نہ تھا۔ بے سروسامانی، افراتفری، لبالب بھرے ہوئے رفیوجی کیمپ (refugee camp) اور ہسپتال۔ خون آلود پیادہ یا قافلوں کی یلغار۔ محاصروں اور حملوں کی مار سے بچی کھچی اسپیشل ٹرینیں۔ غالب ہندو عملے کے انخلاء کی وجہ سے دفتروں میں گنے چنے لوگ، بینک خالی یا بند اور ہر طرف چھائے ہوئے ہندوؤں کے جانے کے بعد ناکافی انتظامی ڈھانچہ پہاڑ جیسے مسائل کو ناتواں سر اور کندھوں پر اُٹھانے کی کوشش میں شدت سے ہانپتا ہوا۔ ایسی بے چارگی کے عالم میں ہر توقع قائداعظم کی قیادت اور انگریز کی تربیت یافتہ بیوروکریسی

میں اٹک جاتی تھی اور وہ دونوں ان توقعات پر پورے بھی اُترے اور دونوں کی عالی ہمتی نے نئی سرزمین پر معجزے بھی دکھانے شروع کر دیے۔

چوٹی پر قائداعظم تھے۔ جن کی ذات سے ساری انتظامی سیڑھیوں کے اُوپر والے کنارے ٹکے ہوئے تھے، مگر یہ سیڑھیاں بھی بانس کی اس لمبی سیڑھی کی طرح تھیں، جن کے قدم دھرنے والے کئی بانس غائب تھے اور ان کی جگہ کندھے کا سہارا دینے والے بھی معدودے چند ہی تھے۔ ایسی بکھری ہوئی قاش بہ قاش بیوروکریسی کا ہر پرزہ اب ایک تخلیقی قسم کے جنون سے سرگرم عمل ہو گیا۔ چنانچہ سرکاری عمارتوں کے برآمدوں میں میز کرسی کی بجائے سامان کی خالی پیٹیوں اور اسٹولوں پر بیٹھ کر کام ہونے لگا۔ لان میں درختوں کے نیچے دریوں پر دفتر جم گئے۔ نئے کاغذ کی کمی کی وجہ سے پرانے کاغذی پرزوں اور بعض دفاتر میں انگریز کے چھوڑے ہوئے خالی ٹائلٹ پیپر (toilet paper) کے رول (roll) پر رف قسم کے اندراج ہونے لگے۔ پیپر پن (paper pin) کی کمی ہو گئی تو گلی کے بچوں کی مدد سے جمع کیے گئے کیکر کے کانٹوں سے کاغذات نتھی ہونے لگے۔ اسی طرح سرخ روشنائی کی کمی دور کرنے کے لیے جنگلی پودوں مثلاً تھور (cactus) کی سرخ ڈوڈی (پھل) میں قلم ڈبوئے جانے لگے۔ گویا ہر طرف ایک تخلیقی سوچ تھی۔ جذبہ تھا۔ خلوص تھا۔ ہمت اور دیانتداری تھی۔ جس کی وجہ سے نچلے عملے کی سوچ اور حب الوطنی سونا اُگلنے لگی۔ افسروں کی پیشانیوں سے فوری فیصلوں کی بارش ہونے لگی اور ان پر عملدرآمد کے لیے کارندوں کی سائیکلیں تیز تر دوڑنے لگیں۔

حواشی

۱۔ کیا تو نے یہ نہیں دیکھا کہ جب بلّی عاجز آ جاتی ہے تو وہ اپنے پنجے سے چیتے کی آنکھ نکال لیتی ہے۔

۲۔ اس اجلاس کی صدارت نواب وقار الملک مشتاق حسین نے کی۔ قرارداد نواب سلیم اللہ خان نے پیش کی جس کی حمایت حکیم اجمل خان اور مولانا ظفر علی خان نے کی اور سر محمد شفیع کی تجویز پر اس تنظیم کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔

۳۔ میاں محمد شاہ دین بیرسٹر اس کے صدر اور سر محمد شفیع بیرسٹر جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔

۴۔ ۱۹۴۰ء میں جب قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو ۱۹۳۷ء سے پنجاب میں اسی پارٹی کی حکومت تھی۔ ملک کے بٹوارے کی مخالفت میں یہ جماعت اتنی سرگرم ہوئی کہ ۱۹۴۲ء میں قائداعظم نے اس کے لیڈر سر سکندر حیات کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے فارغ کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں سکندر — جناح پیکٹ کے بعد کئی مسلمان بیک وقت مسلم لیگ اور یونینسٹ (Unionist) پارٹی کے ممبر تھے۔

۵۔ سکھوں کی مذہبی کتاب ''گرنتھ صاحب'' میں بابا فرید الدین شکر گنج کے ۳۹؍ دوہے شامل ہیں۔ یہ دوہے گورو نانک دیو نے فرید کے سجادہ نشین شیخ ابراہیم سے حاصل کر کے خود شامل کیے تھے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کے حوالے سے اس کا ذکر ڈاکٹر فقیر محمد نے اپنی کتاب میں کیا ہے: پنجابی زبان و ادب کی تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ص: ۶۵ تا ۶۶۔

۶۔ وجہ یہ بیان کی جاتی تھی کہ مغلیہ دور میں ان کے دو مذہبی گرو قتل کر دیے گئے تھے۔ گرو بابا ارجن دیو شہنشاہ جہانگیر کے دور میں (۱۶۰۶ء) اور گرو تیغ بہادر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں (۱۶۷۵ء)۔ یہ دونوں بغاوت کے الزام میں مارے گئے۔

۷۔ G.B. Malleson *Indian Mutiny* (۱۸۹۱ء)۔

۸۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس کے زمانے سے پیدا ہونے والے سماجی اور معاشرتی اثرات کی طرف مورخوں نے ابھی تک اتنی توجہ نہیں دی، جتنی ضرورت ہے تاکہ مفروضات، تعصبات اور جذبات سے بالاتر ہو کر ان حالات کا معروضی جائزہ لیا جائے جن میں تین ہندوستانی اقوام (ڈوبتے ہوئے دہلی دربار اور اودھ کے مخصوص تہذیبی رنگ کے شکست خوردہ مسلمان، ڈوبتے ہوئے تختِ لاہور کے شکست خوردہ سکھ، اور نئے انگریز حاکموں کی آمد سے نئے مواقع کے متلاشی ہندو) اور ایک بیرونی قابض قوم کے مابین سیاسی، فوجی، قومی اور جذباتی کشمکش کی کئی شکلیں تھیں۔ ۱۸۰۱ء کے معاہدے کے بعد سے ریاست اودھ میں انگریزی فوج کی علامتی موجودگی بتدریج بڑھتی رہی۔ آخری نواب واجد علی شاہ امورِ سلطنت سے لاپروا بھی تھا اور شمشیر و سناں کی بجائے طاؤس و رباب کا بھی دلدادہ تھا۔ اس لیے ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے بغیر کسی لڑائی کے ریاست پر قبضہ کر لیا اور الزام یہ لگایا کہ ریاست کا نظم و نسق بالکل ابتر تھا، جس کی وجہ سے یہ قبضہ عوامی مفاد میں ضروری تھا۔
منشی پریم چند نے اس حقیقت کو اپنے افسانے ''شطرنج کے کھلاڑی'' میں ادبی شکل دی اور ہندوستان کے ڈائریکٹر ستیاجیت رے (Satyajit Ray) نے اس پر مشہور اُردو فلم بنائی۔
اس سے پہلے ۱۸۴۹ء میں اودھ والوں کی مدد سے سکھوں کو شکست دے کر پہلے تو انگریز نے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر اسی مخاصمت کو ہوا دیتے ہوئے آٹھ برس بعد پنجاب کے سکھوں کو میرٹھ سے اُٹھنے والی بغاوت (غدر یا جنگِ آزادی) پر قابو پانے کے لیے استعمال کیا۔ حالانکہ یہ بغاوت پنجاب میں بھی پھیل چکی تھی۔ پھر فوراً ہی اودھ کے علاقے سے اسٹاف کو پنجاب میں تعینات کر دیا گیا، کیونکہ پنجاب کی سرزمین پر حال ہی کی خوں ریز جنگوں کی یاد ابھی انگریز کے ذہن میں تازہ تھی۔ اسی لیے جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر مکمل قابو پانے (۱۸۵۹ء) کے بعد انگریز نے ہندوستان پر بھرپور تہذیبی یلغار شروع کی تو فارسی کی بجائے اُردو اس طرح رائج کی گئی کہ انتظامیہ، عدلیہ اور تعلیم کی اعلیٰ سطح پر تو فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ مگر نچلی سطح پر ورنیکلر (vernacular) یعنی مقامی زبان نے لے لی۔ اس طرح سندھ میں سندھی اور صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) میں پشتو رائج ہو گئی۔ مگر پنجاب میں پنجابی کی بجائے اُردو رائج کی گئی۔ اس میں دیگر وجوہات (مسلمانوں کی پنجابی میں موثر اسکرپٹ کی کمی، سکھوں کی گورمکھی کی اپنی تنگ دامنی، اور مسلمانوں میں دیوناگری اور گورمکھی کی غیر مقبولیت) کے ساتھ فاتح قوم کی یہ رعونت بھی شامل تھی کہ مفتوح جنگجو کلچر کی بیخ کنی کی جائے۔ دراصل یہ مشیت کا پہلا قدم تھا کہ ایک صدی

بعد نئے ملک کی قومی زبان بنانے کے لیے ابھی سے اُردو کی seasoning شروع کر دی جائے اور اسے مزید وسعت دی جائے۔ اگلے قدم تھے ۱۹۰۶ء، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء۔ مولانا حالی کے مطابق نہ صرف یہ کہ پنجاب کے اسکولوں میں اُردو کی کتابیں وغیرہ مفت مہیا کی جاتی تھیں، بلکہ یو پی سے اتنے اساتذہ کو پنجاب میں تبدیل کیا گیا کہ یو پی (پہلے Upper Provinces پھر United Provinces اور اب اُتر پردیش) کے اسکولوں میں اساتذہ کی کمی ہو گئی۔ پطرس نے اسی حقیقت کو اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں ''پنجاب پر اہلِ زبان کا حملہ'' سے تعبیر کیا ہے۔

۹۔ میرے علم کے مطابق انگریزوں نے یہ اسکیم دوسری جنگِ عظیم میں شروع کی تھی، تاکہ عسکری ضروریات کے مطابق نیم تربیت یافتہ افسروں کی بڑی جمعیت بروقت موجود رہے اور وہ فوری طور پر فوج میں بھرتی کی جا سکے، تاکہ مختصر ترین وقت میں باقی ماندہ تربیت مکمل کر کے فوراً ہی میدانِ جنگ کا رُخ کر سکے۔ اس اسکیم کے تحت ہر کالج کی ہر کلاس میں سے چند لڑکے ''طالب علم افسر'' بھرتی کر لیے جاتے۔ جو باقی طلباء کے ساتھ روزانہ ڈرل میں شامل نہیں ہوتے تھے، بلکہ مکمل فوجی وردی میں علیحدہ پریڈ، عسکری قواعد اور ہتھیار چلانا سیکھتے تھے۔ میں نے بھی شامل ہونے کی کوشش کی تھی، مگر عینک کی وجہ سے منتخب نہ ہو سکا۔

۱۰۔ پروفیسر عبدالقیوم قریشی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر بن کر ریٹائر ہوئے اور اپنی یادوں کا تاثراتی مجموعہ رختِ سفر (رجسٹرار اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۲۰۰۲ء) کے عنوان سے شائع کیا۔

۱۱۔ ان دنوں صرف اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ ہوتا تھا۔

۱۲۔ وہ بعد میں سول سروس میں منتخب ہو گئے اور بہت قابل افسر ثابت ہوئے۔ مجھے بھی ان کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔

۱۳۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ صرف دو سیٹیں حاصل کر سکی تھی۔

۱۴۔ گوجرانوالہ کا عبدالمالک سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اسے پاکستان کا شہیدِ اوّل کہا گیا اور اس کی قبر میانی صاحب کے قبرستان میں غازی علم دین کی قبر کے پاس بنائی گئی۔

۱۵۔ فوجوں کو سپلائی ہونے والا جنگی سامان اب کئی شکلوں میں ہر چھوٹے بڑے بازار میں بڑی بہتات میں مل رہا تھا۔ پیراشوٹ کے کپڑے، مچھردانیاں، کھانے کے برتن، انڈوں کا خشک پاؤڈر، آلو اور دیگر سبزیوں کے چھوٹے چھوٹے خشک شدہ (dehydrated) ٹکڑے۔ فل بوٹ اور بہت سی دیگر اشیا جن میں کھانا گرم کرنے کے لیے کیمیائی ایندھن کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بھی ہوتی تھیں۔

۱۶۔ یہ مقامی روح والا سودیشی لاہور تھا۔ اس کے علاوہ سول لائنز اور کینٹ کا علاقہ سرکاری روح والا بدیشی لاہور تھا۔ باقی سب بستیوں کا اضافہ قیامِ پاکستان کے بعد ہوا۔ سمن آباد، گلبرگ، شادباغ، مسلم ٹاؤن وغیرہ پہلے مارشل لا سے پہلے اور ڈیفنس سوسائٹیاں مارشل لا کے بعد تعمیر ہونے لگیں۔

۱۷۔ علامہ مشرقی نے ۲؍ جولائی ۱۹۴۷ء کو خاکسار تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا، کیونکہ اس کے پروگرام کے مطابق دہلی میں ۳؍ لاکھ خاکسار اکٹھے نہ ہو سکے تھے۔

۱۸۔ اس وقت خاکسار تحریک کے خاتمے کا اعلان نہیں ہوا تھا۔

۱۹۔ ص: ۱۰۸۔

۲۰۔ ص: ۵۸۔

۲۱۔ محمد بن قاسم کی موت کے متعلق دو روایات ہیں۔ زیر نظر روایت چچ نامہ (سندھی میں چچ نامو) یا "تاریخ ہند و سندھ" سے لی گئی ہے۔ عربی میں لکھی ہوئی اس کتاب کا مصنف قاضی اسماعیل تھا۔ جسے محمد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے بعد الور کا پہلا قاضی مقرر کیا تھا۔ بعدازاں اس کا ترجمہ فارسی اور پھر انگریزی میں ہوا۔ سندھ پر عربوں کے قبضے کے بارے میں مشہور مورخ فرشتہ کے علاوہ دیگر مورخوں نے بھی چچ نامہ سے استفادہ کیا ہے۔

۲۲۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی، تاریخِ اسلام، (کراچی: نفیس اکیڈمی)۔

۲۳۔ ڈاکٹر عبدالسلام اور ملالہ یوسف زئی۔

۲۴۔ ص: ۹۰۔

۲۵۔ ص: ژ۔

۲۶۔ لندن میں دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (۱۹۳۱ء) کے کچھ عرصے بعد قائداعظم کے الفاظ یہ تھے:

At that time I knew no pride and used to beg from the Congress. I worked so incessantly to bring about a rapprochement that a newspaper remarked that Mr. Jinnah is never tired of the Hindu-Muslim unity. But I received the shock of my life at the meeting of the Round Table Conference. In the face of danger, the Hindu sentiment, the Hindu mind, the Hindu attitude, led me to the conclusion that there was no hope of unity. I felt very pessimistic about my country. The position was most unfortunate... I felt disappointed and so depressed that I decided to settle down in London.

اس کے بعد سخت مایوسی کے عالم میں قائداعظم ہندوستان کی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور لندن میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ مگر چار برس بعد علامہ اقبال کی ترغیب پر ہندوستان واپس آئے اور مسلم لیگ کی باگ ڈور سنبھال کر تنظیم نو کرنے لگے۔

(Ref: *Meet Mr Jinnah* by A.A.Rauf مطبوعہ ۱۹۴۴ء محمد اشرف (لاہور)، ص: ۶۹ تا ۷۰۔

۲۷۔ ص: ۱۱۲۔

۲۸۔ ص: ۱۱۶۔

۲۹۔ عائشہ جلال کی تصنیف *Jinnah: The Sole Spokesman* (کیمبرج: ۱۹۸۵ء)، ص: ۲۶۲۔

۳۰۔ جسونت سنگھ مختلف وقتوں میں ہندوستان کے وزیر دفاع، وزیر خزانہ اور وزیر خارجہ رہے ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں ان کی کتاب بہ عنوان *India at Risk* دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے صفحہ ۱۷ پر یہ خط شامل ہے اور مصنف کا عمومی تبصرہ تو یوں ہے کہ، "یہ اقبالِ جرم نہرو کی انسانی بڑائی مگر سیاسی کوتاہ نظری کی دلیل ہے۔" (ص: ۱۸)۔ مگر خصوصی فیصلہ یہ ہے کہ، "یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے ۱۹۴۷ء تک کانگریسی لیڈروں کے طرزِ عمل میں سیاسی بصیرت، دور اندیشی اور نیک نیتی والی مقصدی لگن کی انتہائی کمی پائی جاتی ہے۔" (ص: ۱۷)۔ ستم تو یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں اس اقبالِ جرم کے باوجود ہندوستان کشمیر سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا اور

مسلمانوں کے معاملے میں سابقہ ہٹ دھرمی سے وہی تاریخی غلطی دُہرا رہا تھا جس سے توبہ کرنے کا احساس اس خط سے جھلکتا ہے۔

۳۱۔ ص: ۹۰ تا ۹۱۔

۳۲۔ اُس زمانے میں قلم دوات (یا فونٹین پین) سے لکھا جاتا تھا۔ کیونکہ بال پوائنٹ قلم ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا اور جب ایجاد ہوا تو کافی عرصے تک بینکوں، عدالتوں اور ادبی رسالوں کے لیے اس کے استعمال کی اجازت نہ تھی۔

۳۳۔ لکڑی کی نصف ہَٹ میں بسیرا ہے آج کل فدوی بشر نہیں ہے بٹیرا ہے آج کل (ضمیر جعفری)

۳۴۔ بعض مورخین اس گمانِ غالب کے ڈانڈے ایک طرف تو پنڈت نہرو کی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی بیگم سے بے تکلفانہ دوستی سے ملاتے ہیں اور دوسری طرف ریڈ کلف پر وائسرائے کے اسٹاف آفیسر وی پی مینن (V.P.Menon) کے اثر سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان دونوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضلع گورداسپور کا مسلم اکثریت والا ضلع ہندوستان میں شامل کر کے انھیں کشمیر میں راستہ دے دیا گیا اور ضلع فیروز پور میں دو مسلم اکثریت والی تحصیلیں فیروز پور ہیڈ ورکس سمیت ہندوستان کو دے دی گئیں، جن کی وجہ سے ہماری نہروں کا کنٹرول ہندوستان کے ہاتھ میں آ گیا۔

۳۵۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لندن ٹائمز نے لکھا کہ پچھلے ایک ماہ کے دوران قتل ہونے والے ہندوستانیوں کی تعداد ان مرنے والوں سے کہیں زیادہ تھی جو پچھلے پچاس برس میں ہندو مسلم فسادات کے دوران مارے جاتے رہے۔ ان کے علاوہ لاکھوں کروڑوں لوگ بے گھر اور جلاوطن ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی آبادی کی اس عظیم نقل مکانی کے مقابلے میں جنگِ عظیم میں یورپ کی ساری نقل مکانی بالکل ہیچ ہو جاتی ہے۔

۳۶۔ ابھی کنکریٹ کی چھتیں کم کم تھیں۔ خصوصاً پرانی عمارتوں میں تو بالکل نہیں تھیں۔ لکڑی کے بھاری شہتیروں اور نسبتاً پتلی کڑیوں پر مٹی کی چھتیں ہوا کرتی تھیں۔

۳۷۔ ان دنوں ریڈیو کی نشریات دو دو تین گھنٹوں کے لیے صبح، دوپہر اور شام ہوا کرتی تھیں۔ شام کی نشریات کا پروگرام قریباً چھے بجے سے رات دس بجے کے قریب تک جاری رہتا تھا۔

۳۸۔ انگریزی حکومت اپنے کارندوں کو ٹھونک بجا کر بالکل میرٹ (merit) کے لحاظ سے چنا کرتی تھی، اس لیے ان کے ہر محکمے میں ایسے بیش قیمت تحفے قدرت کی طرف سے مستقل طور پر موجود رہتے تھے۔

قائدِاعظم کے پاکستان کا برتر نظام

قائدِ اعظم کا پاکستان

اُن دنوں کا پاکستان مجھے ایک معجزہ لگتا تھا اور معجزے کا تجزیہ کبھی نہیں کیا جاتا۔ ویسے بھی میری عمر ابھی تجزیے کے قابل نہ تھی۔ مگر آج جب میں اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے وطن کے مینار کی پہلی منزل دیکھتا ہوں تو بہت کچھ نظر آتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قائداعظم کا پاکستان تھا۔ جس کے خدو خال وہ ہردم اپنے قول وفعل سے قوم پر واضح کر رہے تھے... دوسری بات یہ ہے کہ قائداعظم کے پاکستان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ اس کے بعد جرنیلوں اور وڈیروں کا پاکستان بن گیا۔

آج میرے مینار سے قائداعظم کا پاکستان یوں نظر آ رہا ہے کہ ایک نومولود پاکستان ننھے بچے کی طرح زمین پر گھسٹتے گھسٹتے آگے بڑھ رہا تھا، جسے صحیح قدم اُٹھانے اور صحیح راہ پر ڈالنے کے لیے ایک محتاط آیا بڑی صبر آزما کوشش کر رہی تھی۔ یہ آیہ مشرقی پاکستان میں دوصدیوں اور مغربی پاکستان میں ایک صدی کی تربیت یافتہ تھی اور ہر محکمے کے سرکاری ملازموں کی شکل میں ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ انگریز کی ان باقیات میں سے تھی جس کی گڈ گورننس (Good governance) کی کڑی تربیت[1] نے ایک تہائی دنیا پر پھیلی ہوئی برٹش ایمپائر کو مجتمع، یک جان اور یک رنگ بنا رکھا تھا۔ یہ قانون کی سدھائی ہوئی تھی۔ ضابطے کی پلی ہوئی تھی اور اپنے چلن میں ڈسپلن کی پابند تھی۔

اس آیا کی نگرانی قائداعظم خود کر رہے تھے۔ اس آئینی اور قانونی نظر سے جواُن کی بیرسٹری کی طالب علمی کے زمانے میں ہاؤس آف کامنز (House of Commons) کی گیلری سے امورِ سلطنت پر بحثیں سننے سے پیدا ہوئی تھی، عدالتوں میں پروان چڑھی تھی، وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل (Legislative Council) میں جوبن پر آئی تھی اور قانون کی بالادستی پر ویسا ہی ایمان رکھتی تھی، جیسا اپنے مذہب اسلام پر۔ کیونکہ قانون کی بالادستی اور جمہوریت کو وہ اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ سمجھتے تھے۔[2] جس کی مثال رسولِ کریم ﷺ کی ریاست مدینہ اور خلافت راشدہ کی وہ پالیسیاں تھیں جو حقوق العباد اور سوشل جسٹس (social justice) کے بنیادی تقاضے پورے کرتی تھیں اور انھیں رسولِ اکرم ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع کی پوری تائید حاصل تھی۔

وہ جمہوری اور آئینی نظر رکھنے والے قائداعظم اس وقت وطن کے مینار کی پہلی منزل میں اس

تربیت یافتہ آیا کو کیا ہدایات دے رہے تھے؟ ان سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ۲۸۱ر صفحے کی وہ کتاب دیکھ لیں۔ جو حکومتِ پاکستان کے محکمۂ اطلاعات نے ۱۹۸۹ء میں انگریزی زبان میں شائع کی۔[۳] بطور گورنر جنرل ۱۳ر ماہ کی قلیل زندگی میں انھوں نے نو مرتبہ سول اور فوجی سرکاری ملازمین کو سمجھایا[۴] کہ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ریاست کے ملازم ہیں اور کسی ایک مخصوص حکومت کے ملازمین ہرگز نہیں ہیں۔ انھیں اپنا فرض مکمل غیر جانبداری سے نبھانا چاہیے اور یہ فرض صرف قانون اور قواعد کا نفاذ ہے، جس کے لیے ریاست انھیں اور اُن کی ملازمت کو پورا قانونی اور آئینی تحفظ دیتی ہے اور دیتی رہے گی۔ اس لیے انھیں کسی بھی سیاسی مداخلت کے دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی یا حکومت انھیں اس راہ سے ہٹاتی ہے تو وہ پاکستان کی خدمت نہیں کر رہی۔ بلکہ وطنِ عزیز کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

آئین، قانون اور ضابطے کے پابند سیاستدان محمد علی جناح جب پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے تو انھوں نے صرف نصیحتیں ہی نہیں کیں بلکہ خود بھی ان پر عمل کرتے رہے۔ ان کے اے ڈی سی (ADC) کیپٹن گل حسن (جو بعد میں فوج کے کمانڈر اِن چیف بنے) کی کتاب کے حوالے سے بتایا جاتا ہے کہ گورنر جنرل کا ہر شام کا معمول تھا کہ وہ مس فاطمہ جناح کے ساتھ تفریح کے لیے ملیر جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ راستے میں سڑک پر ریلوے لائن کا پھاٹک بند تھا۔ تو اے ڈی سی نے آگے بڑھ کر اسے کھلوا دیا۔ قائداعظم نے اسے ناپسند کرتے ہوئے اپنے اے ڈی سی کو ڈانٹا۔ پھاٹک حسبِ سابق دوبارہ بند کروایا اور پھر گورنر جنرل اپنے وقت پر پھاٹک کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔[۵]

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو پارٹیشن پلان کا جب اعلان ہوا تو اس سے پہلے قائداعظم کو ان کے معالج بڑی رازداری سے بتا چکے تھے کہ تپ دق کی وجہ سے ان کے پھیپھڑے اتنے ضعیف ہو چکے ہیں کہ شاید اب وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ پلان پر عمل درآمد کرنے کے لیے جب نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے چارج سنبھالا تو پنڈت نہرو کی طرف ان کے جھکاؤ کے پیشِ نظر قائداعظم نے انھیں آزاد ہندو پاکستان کی دونوں dominions کا مشترکہ گورنر جنرل ماننے سے انکار کر دیا، جس پر وہ سخت ناراض ہوئے۔ بلکہ قائداعظم سے بدکلامی بھی کی۔[۶] یوں لگتا ہے کہ اپنی زندگی کی طویل جدوجہد کے بعد اپنے معالج کی بات سن کر قائداعظم اپنی بقایا زندگی میں اقتدار حاصل کر کے پاکستان کو اُس راستے پر ڈالنا چاہتے تھے۔ جو ان کے تصور کا پاکستان تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا کتاب میں ان کی تقاریر اور بیانات دراصل ملک کے اس آئین کا ڈھانچہ پیش کرتے ہیں، جسے آئین کے مطابق دستور ساز اسمبلی کو تیار کرنا تھا۔ اس لیے یہ تقاریر انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ جو

اُس وقت کی گئیں۔ جب انھیں پتا تھا کہ موت ان کے در پر دستک دے رہی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ان کے الوداعی پیغامات تھے۔ اور رسولِ اکرم ﷺ کی اس سنت پر عمل کر رہے تھے کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں مسلم اُمہ کے لیے حقوق العباد کا تعین ہوا اور دین کے مکمل ہونے کی نوید ملی۔ غالباً اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے قائداعظم اپنے الوداعی الفاظ میں یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ تحریکِ پاکستان اس دن مکمل ہو جائے گی۔ جب ان خطوط پر آئین بنا لیا جائے گا۔

ہماری تاریخ کا قتلِ عمد کرنے والے سچ کو تو ہم تک پہنچنے نہیں دیتے۔ مگر قانون کا بنیادی اصول ہے کہ افراد جھوٹ بول سکتے ہیں، مگر حالات کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ انھی حالات کی عمومی شہادت اور قائداعظم کے زیارت سے کراچی تک کے آخری سفر کی خصوصی شہادت ہمیں بتاتی ہیں کہ قائداعظم اُس وقت کی پاکستانی حکومت کے ''تغافل کا شکار رہے''[۸] مزید حالات سے یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نواب زادہ لیاقت علی خان سمیت سب نواب زادوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا ذہن پاکستان کے اُس تصور کا بالکل حامی نہیں تھا جو قائداعظم کی تیرہ ماہ کی تقاریر سے اُبھر رہا تھا۔ اسی لیے قائداعظم بتدریج ان کے تغافل کا شکار ہونے لگے۔[۹] اور ان کی وفات کے بعد باقی سب مل کر آئین سازی کی راہ میں دانستہ رکاوٹیں ڈالتے رہے۔ پہلے سات برسوں کے دوران آئین ساز اسمبلی نے ۱۱۶ر دنوں پر مشتمل (نصف برس سے بھی کم) صرف پندرہ اجلاس منعقد کیے جن میں اوسط حاضری ۷۳ر سے ۵۶ر ممبران کی ہوتی تھی۔[۱۰] اس میں بھی تحقیق کی ضرورت ہے کہ کیا حاضرین میں زیادہ تعداد مشرقی پاکستان کی طرف سے تھی یا اس میں دونوں حصوں کا تقابل تھا۔

یہ سب سمجھنے کے لیے دو میناروں کی بلندی پر چڑھنا اور پھر اوپر سے جھانک کر مجموعی نظارہ کرنا ضروری ہے، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ قائداعظم کے پاکستان کو قائداعظم کے اپنے ہاتھ سے پہلے چھین کر اور پھر کھلونے کی طرح زمین پر پھینک کر توڑنے والے اب قائداعظم کو ہی کیوں مطعون کر رہے ہیں۔ کہ آج قوم جناح کی غلط سوچ کے غلط نتائج کی وجہ سے پریشان ہے اور اگر برِعظیم تقسیم نہ ہوتا تو ہر طرف امن و امان کی فضا میں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوتیں۔ اسی لیے جب آج کے پاکستانی لکھاری خلوصِ دل سے بھی موجودہ قومی حالات پر اظہارِ تاسّف کرتے ہیں تو ہندوستانی حلقے بڑی چالاکی اور حکمت سے ان کی مختلف انداز میں تشریح کرتے ہوئے اسے ''پارٹیشن کا پچھتاوا'' کہہ کر بھرپور داد دیتے ہیں۔ حالانکہ آج کی نسل کے لکھاریوں کو تاریخ کے قتلِ عمد کی وجہ سے اندازہ ہی نہیں کہ ہم کیوں بھٹک رہے ہیں۔ اسی لیے میں ان کو دونوں میناروں پر قدم قدم چڑھنے کی دعوت دے رہا ہوں۔

میں اپنے مینار کی بلندی سے وطن کے مینار کی پہلی منزل میں جھانکتا ہوں تو یہ روح پرور منظر دیکھتا ہوں کہ قائداعظم کی تقاریر کی مکمل تعمیل کم و بیش ہر سرکاری ملازم کر رہا ہے۔ عمودی طور پر اوپر سے نیچے اور اُفقی طور پر ایک محکمے سے دوسرے محکمے تک۔ اور میں اس طرزِ عمل کو بہت قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ میرا سارا خاندان سرکاری ملازمین کا خاندان تھا، جس میں دور دور تک نہ کوئی وڈیرا تھا نہ جاگیردار۔ محکمۂ تعلیم میں نسبتاً زیادہ" مگر باقی سب سول اور فوجی محکموں میں بھی ان کی کافی موجودگی تھی۔ ان سب کے سرکاری اور غیرسرکاری چلن کو وسیع سلطنت کے منتظم انگریز نے غیر جانبداری، خودداری، دیانتداری اور فرض شناسی کے جس آئینی اور قانونی قالب میں ڈھالا تھا،[۱۲] قائداعظم اسی کو جاری رکھنے کی نہ صرف تلقین کر رہے تھے، بلکہ اس میں یہ اضافہ بھی کر رہے تھے کہ عوام پر حکومت کی بجائے عوام کی خدمت کے چلن کو اپنا لیں۔ خوش قسمتی سے علّامہ مشرقی کی تربیت میں مسلمان قوم دس برس تک عوامی خدمت کو روح کی آواز اور جسم کا اوڑھنا بچھونا بنا چکی تھی۔[۱۳] اس لیے پاکستان بنا تو قائداعظم کے ہر فرمان پر سرکاری ملازموں نے آمنا و صدقنا کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھسٹ گھسٹ کر چلنے والے نومولود پاکستان کا بچپن انتہائی مختصر بلکہ محض علامتی ہی رہا۔ پھر یہ کھیرے توری کی طرح چھلانگیں مار مار کر بڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیرت انگیز ترقی کر گیا۔ مگر ہماری عمداً قتل کردہ تاریخ اس دور کی جھلک بھی نہیں دکھاتی۔

سیاسی میدان کا منظرنامہ قدرے مختلف تھا۔

اُس وقت کے صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) میں ۱۵ / اگست کو ڈاکٹر خان صاحب کی زیرِ قیادت کانگریس کی وزارت تھی۔ قائداعظم کی تقریر اور پالیسی کے مطابق اگر وہ پرانے اختلافات بھلا کر نئی مملکت پاکستان میں تعمیری کردار ادا کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو یہ وزارت جاری رہتی، مگر ان کی تمام کابینہ نے پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ صوبے کے ریفرنڈم میں عوام نے بھاری اکثریت سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ دیا تھا۔ تب ۲۳ / اگست کو گورنر نے ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کر دیا اور خان عبدالقیوم خان وزیرِاعلیٰ بن گئے۔

پنجاب میں چیف منسٹر افتخار حسین خان نواب ممدوٹ اور وزیرِ خزانہ میاں ممتاز دولتانہ کے باہمی جھگڑوں میں ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا جال بچھنے لگا۔ تو قائداعظم نے اپریل ۱۹۴۸ء میں خان آف ممدوٹ، دولتانہ اور وزیرِ مال سردار شوکت حیات خان کو سمجھانے کے لیے کراچی بلایا، مگر انھیں ایسی ناکامی ہوئی کہ بے حد مایوسی میں انھوں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیے۔[۱۴] پھر یہ

جھگڑا اتنا بڑھا کہ قائداعظم کی وفات کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ۱۹۴۹ء میں پنجاب وزارت کو برطرف کر کے گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔

سندھ کے حالات بھی پنجاب کی طرح تھے۔ وزارت مسلم لیگ کی تھی۔ چیف منسٹر محمد ایوب کھوڑو تھے، مگر گورنر سندھ غلام حسین ہدایت اللہ سے ان کے تعلقات از حد کشیدہ تھے اور اپنے دو وزیروں (پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور) سے کھلی جنگ تھی۔ اس لیے اپریل ۱۹۴۸ء میں گورنر نے سندھ وزارت برطرف کر دی۔

مشرقی پاکستان اور بلوچستان کے حالات مجموعی طور پر ٹھیک ہی تھے۔ مشرقی پاکستان میں اُردو بنگالی کا جھگڑا قائداعظم کی زندگی میں ان کی ذات کی وجہ سے دبا دبا ہی رہا۔ بلوچستان میں خان آف قلات نے آزاد مملکت قائم کرنے کی ناکام سی کوشش کی لیکن مارچ ۱۹۴۸ء تک بلوچستان کی تمام ریاستوں نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کر لیا اور مجموعی حالات درست رہے۔

تین صوبوں کے سیاسی منظرنامے کی ابتری سے ہمیں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ پاکستانی صوبوں کے سیاستدانوں کی قسمت نے ۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء کے الیکشن میں اچانک یاوری کی تھی اور خلافِ توقع اسمبلیوں میں جا کر وہ گویا عالمِ بالا میں پہنچ گئے تھے، لیکن اس سے پہلے انگریزی دور میں ان میں سے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ضلعی افسران[۱۵] کے دفاتر کے طواف کر کے حکومتی مراعات کے طلبگار ہوا کرتے تھے۔ انگریز کے جانے کے بعد جب وہ اسمبلیوں میں جا بیٹھے تو انھیں ضلعی دفاتر اتنے نیچے اور درمیانی فاصلہ اتنا چکرا دینے والا لگا کہ ان کے لیے متوازن سوچ اور متوازن چال رکھنا محال ہو گیا۔ اس چھوٹے پرندے کی طرح جو بزرگ پرندوں سے اُڑنے کی تربیت لینے کی بجائے اچانک اُونچی ہوا میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ تب وہ پہلے تو غیرمتوازن پھڑپھڑاہٹ کی لوٹنیاں کھاتا رہتا ہے۔ اس کے بعد پہلے ناہموار پرواز اور بالآخر اچھی اُڑان کے قابل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نو برس کی پھڑپھڑاہٹ، ناہمواریوں اور لوٹنیوں کے بعد ہمارے سیاستدان بھی بالآخر سنبھل گئے اور انھوں نے ۱۹۵۶ء میں ملک کا آئین تیار کر لیا۔

اس ساری صورتِ حال کا اہم پہلو یہ تھا کہ سیاسی منظرنامے کی ناہموار ہچکیاں اُوپر ہی اُوپر تھیں اور یہ ہلچل نیچے عام شہری تک نہیں پہنچ رہی تھی، جیسے آسمان پر بادلوں کی گرج چمک تو ہو، مگر نیچے زمین پر بارش نہ ہو۔ چنانچہ، زمین پر قائداعظم کی آواز پر لبیک کہنے والے سرکاری ملازمین انگریزی دور کی کڑی تربیت کے مطابق اپنی پوری قابلیت، عقیدت اور خلوص سے نئے ملک کو آگے چلاتے رہے اور وطن کے مینار کی پہلی منزل روشن سے روشن تر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ۲۳ / مارچ ۱۹۵۶ء

کو ساری منزل چکاچوند ہوگئی۔ جب اسلامک ری پبلک کا پہلا آئین نافذ ہوگیا اور گڈ گورننس کی روایت نے مضبوط جڑ پکڑ لی۔ (لیکن اصل پودے کا ظہور اس آئین کے تحت پہلے الیکشن کے بعد ہونا تھا)۔ علاوہ ازیں پہلی قانون ساز اسمبلی کے ۱۹۵۴ء کے فیصلے کے مطابق اُردو اور بنگالی دونوں ہی قومی زبانیں تسلیم کر لی گئیں اور آئین میں یہ احتیاط برتی گئی کہ گزشتہ ۹ ر برسوں میں قوم جس قسم کے آئینی بحرانوں سے دوچار ہوتی رہی، ان کا اعادہ نہ ہو سکے۔

اس قسم کی زوردار ابتدا سے پاکستان کی زندگی کا سفر شروع ہوا۔ اور فوراً ہی پاکستانی تاریخ کے سنہری دور کا بھی آغاز ہوگیا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری مسخ شدہ تاریخ اوپر والی گرج چمک کا تو نقارہ بجاتی رہتی ہے، مگر زمین پر بچھی ہوئی سرخ انتظامی بانات اور سنہری دور کا دانستہ ذکر تک نہیں کرتی، کیونکہ ہماری تاریخ ایسے اُلجھائی جارہی ہے کہ، ''غلط رہنماؤں کے گرد مقدس ہالہ بنا کر پیش کر دیا جائے اور قومی رہنماؤں کی جدوجہد مشکوک بنادی جائے۔''[۱۶]

اصل حالات پر پردہ ڈال کر من پسند لیڈروں کے گرد مقدس ہالہ بنانے کی دانستہ کوشش میں ہماری تاریخ کو جس طرح توڑا مروڑا گیا ہے، اور اب بھی ایسا ہی کیا جارہا ہے، اس سے قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی نسل یہ سمجھنے لگی ہے کہ پاکستان ہمیشہ سے ہی ایسا تھا، جیسا آج کل ہے، کہ قانون شروع سے ہی بے بس رہا ہے۔ سینہ زوری کی بالادستی پہلے دن سے ہے۔ ذاتی مفادات ہمیشہ سے قومی مفادات کو روندتے رہے ہیں اور ہماری تاریخ محض سازشی ''مک مُکا'' کا ایک تسلسل ہے۔ اس طرح اُن کی نظر میں پاکستان کا قیام ہی ایک ناگوار سا تاریخی حادثہ بنتا جارہا ہے۔ خصوصاً ان افراد کی نظر میں جو اپنی تعلیم کی تمام سیڑھیاں انگلش میڈیم اداروں میں چڑھتے چڑھتے بالآخر اپنی مادری و قومی زبان اور سماجی و تاریخی ورثے سے بتدریج اجنبی ہوتے جاتے ہیں اور بڑی آسانی سے ہندوستانی پروپیگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ قائداعظم کی سوچ غلط تھی اور پاکستان کا قیام غلط تھا۔ اس طرح ہمارے مورّخوں کی دانستہ جانبداری ان سے ایک نادانستہ گناہ کروا رہی ہے کہ وہ ہمارے نوجوانوں کی سوچوں میں گرہیں اور گنجلک ڈال رہے ہیں۔

یہی گناہ ریاستی سطح پر بھی اس طرح ہو رہا ہے کہ کوئی غیر جانبدار ادارہ بالکل معروضی انداز میں وطن کی تاریخ مرتب نہیں کرتا۔ میں نے ماضی میں پاکستان ہسٹری کمیشن کے دو سربراہوں سے مختلف اوقات میں پوچھا کہ کیا یہ کمیشن یا کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ ہماری تاریخ کا ریکارڈ رکھ رہا ہے، تو ان دونوں کا جواب نفی میں تھا کہ نہ تو ہسٹری کمیشن یہ کام خود کر رہا ہے اور نہ ہی اس کی زیرِ نگرانی کوئی اور ادارہ اس طرف توجہ دے رہا ہے۔ اس وجہ سے مفاد پرستوں کے لیے آسان ہو جاتا ہے

کہ دیو قامت اصل قومی رہنماؤں کو شکوک کی دھند میں مبہم بناتے جائیں اور حسبِ منشا کوتاہ قد افراد کے گرد سونے چاندی کے ورق لگا کر مصنوعی چمک پیدا کرتے جائیں۔ ایسی صورتِ حال میں لازم ہو جاتا ہے کہ ہم دیگر ایسے معتبر شہریوں کی گواہی پر بھی غور کریں جنھوں نے نہ صرف پاکستان کا سنہری زمانہ دیکھا ہو، بلکہ اس کی تعمیر میں بھی بھرپور کردار ادا کیا ہو۔

ریٹائرڈ وفاقی سیکریٹری مختار مسعود کو اپنی ملازمت کے اوائل میں بطور افسر مہمانداری مس فاطمہ جناح کے ساتھ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) سے لاہور تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کا تذکرہ وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔[۱۷]

> مس جناح نے راستے میں بہت سی باتیں کیں اور یہ اکثر صاف اور کھری باتیں تھیں۔ مس جناح نے بتایا کہ قائداعظم نے لیاقت علی خاں کی سوجھ بوجھ پر لیاقت — ڈیسائی پیکٹ[۱۸] کے بعد کبھی بھروسا نہ کیا اور اگر وقت اور واقعات کی رفتار اتنی تیز نہ ہوتی تو وہ ضرور کسی اور شخص کو ان کی جگہ دے دیتے۔ محترمہ نے یہ بھی کہا کہ ہیکٹر بولیتھو کو قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے، تاکہ وہ لیاقت علی خاں کے کام کو بڑھا کر پیش کرے۔ جب ہیکٹر بولیتھو کی کتاب اس گفتگو کے چار سال بعد چھپ کر آئی تو میں نے اس کی ایک جلد خاص طور پر کراچی سے منگوائی اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مس فاطمہ جناح کے خدشات بالکل درست تھے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ بڑی حد تک جولائی ۱۹۳۲ء میں اُس روز ہوگیا تھا، جب لیاقت علی خاں ہیمپسٹیڈ ہیتھ گئے، تاکہ جلاوطن جناح سے گفتگو کریں۔[۱۹] یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں بیگم رعنا لیاقت کے ذکر کے ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ قائداعظم اپنے خط میں لیاقت علی خاں کو لکھا کرتے تھے کہ میرا دل تم دونوں کے ساتھ ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کتاب کے پانچویں باب میں بیگم لیاقت کی زبانی اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا گیا ہے کہ اگر قائداعظم کو حالات فرصت دیتے تو وہ لیاقت علی خاں کو علیحدہ کر دیتے۔ بیگم لیاقت اس مفروضے کو مہمل قرار دیتی ہیں۔ ممکن ہے یہ سچ ہو مگر مجھے بولیتھو کی ساری کتاب ہی مہمل معلوم ہونے لگی۔

ہمارے اصل قومی رہنما کے کردار کے متعلق یہ تو ایک سرکاری شخص کی گواہی تھی، مگر ایک غیر سرکاری مشاہدہ بھی اس رہنما کی عظمت کا ایسا ہی رُخ دکھاتا ہے۔ حال ہی میں ایک بزرگ صحافی نے اپنی جوانی میں قائداعظم سے رابطوں کی مختصر سی یادداشت شائع کی ہے۔[۲۰] ڈیرہ دون کی انڈین ملٹری اکیڈمی میں تربیت کے بعد ایم اے زبیری برٹش انڈیا کے سینسر یونٹ (Censor Unit) میں تعینات تھے اور خفیہ طور پر وہ تمام خطوط پڑھتے تھے جو حکومتِ ہند میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ہندوستانی ممبروں کو لکھے جاتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے ایک ہندو ممبر کے

نام لکھا ہوا خط پڑھا جس میں راشٹریہ سیوک سنگھ (RSS) کے آئندہ پروگرام کی تفصیلات تھیں کہ وہ کس طرح صوبہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو ختم کریں گے۔ زبیری صاحب نے اس خط کی نقل تیار کر لی[۲۱] کسی طریقے سے قائداعظم کو بھجوادی۔

۱۹۴۵ء میں کسی وجہ سے زبیری صاحب نے اپنی ملازمت چھوڑ دی اور فراغت کے زمانے میں قائداعظم سے ملے۔ لیکن گفتگو میں جب اس خط کا ذکر ہوا تو کسی خوشی کا اظہار کرنے کی بجائے قائداعظم سخت ناراض ہوئے کہ حساس قسم کی ملازمت میں زبیری صاحب نے سرکاری امور پر رازداری کے حلف کی خلاف ورزی کیوں کی۔ آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی ہدایت کے بعد موضوع بدلا تو گفتگو کے دوران انھیں زبیری صاحب کی فراغت کا پتا چلا۔ تب قائداعظم نے انھیں ڈان اخبار کے دفتر میں بھیج دیا، جہاں انھیں زیرِ تربیت سب ایڈیٹر رکھ لیا گیا۔ اُس وقت وہاں پانچ افراد کا عملہ کام کر رہا تھا۔ جن میں سے دو ہندو، ایک عیسائی اور ایک مسلمان تھا۔ اس لیے قائداعظم چاہتے تھے کہ مسلمان نوجوان صحافت کی عملی تربیت حاصل کر کے اس اخبار کو کلی طور پر سنبھال لیں۔

برعظیم کے مسلمانوں کے حقوق کے لیے طویل اور پُرخلوص جدوجہد کرنے والے اصل قومی لیڈر کی ذات کے گرد تاریخ عالم نے تو ایک مقدس ہالہ اسی وقت بنا دیا تھا جب کرفیو زدہ رات کی ویران تاریکی میں مصطفیٰ علی ہمدانی کی ندا اُبھری تھی، ''پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس۔'' پھر یہ ندا برسوں بعد اسٹینلے وولپرٹ (Stanley Wolpert) کے قلم سے یوں ڈھل گئی کہ ''بہت کم افراد تاریخ کا رُخ بدل سکے ہیں۔ ان سے بھی کم لوگ دنیا کا نقشہ بدل سکے ہیں۔ اور شاید ایک آدھ ہی فرد اپنی ملت کو وطن (Nation State) دے سکا ہے۔ مگر محمد علی جناح نے یہ تینوں کام کر دکھائے۔[۲۲]'' بعد ازاں اس مقدس ہالے کی تقدیس ان تقاریر کی وجہ سے مزید بڑھ گئی، جو گورنر جنرل پاکستان نے اپنی زندگی کے آخری تیرہ ماہ میں قوم کو صحیح راہ دکھانے کے لیے کی تھیں اور تمام سرکاری ملازمین نے اُس وقت لبیک کہتے ہوئے مختصر ترین وقت میں نئے وطن کو اپنے سنہری زمانے میں لا کھڑا کیا تھا۔ اُس زمانے کا آنکھوں دیکھا حال بتانے سے پہلے میں کچھ کتابوں کی سند پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پاکستان کے معاشی مسائل کے متعلق ماہرِ اقتصادیات ایس اکبر زیدی کی کتاب[۲۳] اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی۔ اس میں پاکستان کے پہلے چند برسوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔[۲۴] ''پاکستان کی پیدائش کے وقت امریکہ کے باا‌ثر ہفت روزہ *The Times* کا ۱۹۴۷ء میں تبصرہ یہ تھا کہ یہ نیا ملک اقتصادی تباہی اور بربادی کا ملبہ ہے، جو ہمیشہ معاشرتی بدامنی سے دوچار رہے گا۔'' (ص: ۸۴)

اس نئے ملک کے متعلق دنیا میں جو تاثر پایا جاتا تھا اس کو ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر Gustav Papanek نے اپنی تحریر میں یوں سمویا تھا:

برٹش انڈیا کی تقسیم سے خسارے کا سودا بن کر اُبھرنے والے پاکستان کے متعلق غالب خیال یہی ہے کہ اقتصادی لحاظ سے یہ ایک عجیب الخلقت غیر فطری خطۂ زمین ہے۔ جو دنیا کے غریب ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں نہ تو کوئی قابلِ ذکر انڈسٹری ہے، نہ کوئی صنعتی خام مال پایا جاتا ہے اور نہ ہی کسی نمایاں صنعتی یا تجارتی گروپ کی موجودگی ہے۔ اس وقت یہ باور کرنا مشکل ہے کہ صنعت کاری کا عمل اس کی آبادی کے پھیلاؤ کی رفتار پر حاوی ہو سکے گا، بلکہ زیادہ امکان یہی ہے کہ سیاسی اور معاشی طور پر یہ ملک افراتفری سے ہی دوچار رہے گا۔ (ص: ۸۴)

دنیا والوں کا یہ تاثر کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا اور پاکستانی اہلِ نظر کو خود بھی احساس تھا کہ غالب کی طرح ان کے گھر میں بوریہ بھی نہ تھا۔ اسی لیے اُس وقت کی بیوروکریسی اور حکومتِ پاکستان نے اپریل ۱۹۴۸ء میں جب پہلی صنعتی پالیسی بنائی تو اس میں قوم و ملک کی تہی دامنی کو ان الفاظ میں تسلیم کیا گیا تھا۔

پاکستان کے معاشی منظرنامے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہمارے پاس قدرتی وسائل تو وافر ہیں، مگر ساتھ ہی صنعت و حرفت کا قحط بھی ہے۔ اس وقت پٹ سن کی عالمی پیداوار کا ۷۵ فی صد حصہ پاکستان میں اُگایا جاتا ہے، مگر ہمارے ہاں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہیں ہے۔[۲۵] ہمارے ہاں اعلیٰ قسم کی روئی کی پندرہ لاکھ گانٹھیں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر انھیں مناسب طریقے سے استعمال کرنے کے لیے کپڑوں کے کارخانے ناپید ہیں۔[۲۶] اسی طرح ہمارے ہاں جانوروں کی کھالیں، اون، تمباکو اور گنے جیسی خام اشیاء بڑے پیمانے پر دستیاب ہیں اور پٹرولیم سمیت دیگر معدنی وسائل بھی موجود ہیں۔ مگر ہم انھیں بروئے کار نہیں لا سکتے۔ اس لیے ہمیں ایسی پالیسی وضع کرنا پڑے گی جس میں ان وسائل کا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ (ص: ۸۵)

پھر جب یہ پالیسی بن گئی اور ملک کی بیوروکریسی پورے خلوص اور محنت سے دامے درمے سخنے اس پر عمل پیرا ہوئی تو جیسے آسمان سے معجزے اُترنے لگے۔ اکبر زیدی کے الفاظ میں:

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۸ء کے دوران متحدہ پاکستان میں صنعت کی شرح نمو اتنی تیزی سے بڑھنے لگی کہ اُس زمانے میں دنیا کے کسی ملک میں بھی اس رفتار سے نہیں بڑھ رہی تھی۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک بھاری صنعتوں کی شرحِ نمو ۶ء۲۳ فی صدی سالانہ کے حساب سے چھلانگیں مارتی آگے بڑھی اور اس کے بعد ۱۹۶۰ء تک ۳ء۹ فیصدی سالانہ کی تیز رفتاری سے جاری رہی۔ اس طرح ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پاکستان کی بھاری صنعتوں نے ایک حیرت انگیز عجوبے کے طور پر ترقی کی۔ مقامِ حیرت یہ تھا کہ اسی دوران مغربی

پاکستان میں کم وبیش ۷۰ لاکھ[۲۷] مہاجروں کی آبادکاری کا کام بھی بڑی کامیابی سے ہو رہا تھا، حالانکہ ہمارے اثاثے روکنے کے علاوہ ہندوستان ہر ممکن طریقے سے ہماری راہ میں روڑے بھی اٹکا رہا تھا اور حیدر آباد اور جونا گڑھ پر حملوں کے بعد پاکستانی قوم خوفزدہ تھی کہ ہندوستان ہمارے ملک پر حملہ کی کوشش نہ کرے... ہمیں نہ تو صنعت کاری کا کوئی تجربہ تھا نہ ملک میں کوئی صنعتی بنیاد تھی اور نہ ہی صنعتی استعداد والے کارکن دستیاب تھے۔ (ص: ۸۴)

اس کتاب کے مصنف کے مطابق پاکستانی معاشیات کا پہلا مرحلہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک تھا۔ جس میں مستقبل کے لیے تمام پالیسیوں اور اصولوں کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ (حالانکہ حکومتیں بار بار تبدیل ہو رہی تھیں۔ مگر یہ بنیادیں بیوروکریسی بنا رہی تھی)۔ پھر اُس دور کی بنیادوں پر ہی اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ جسے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک نئے ملٹری حاکم مگر پرانی بیوروکریسی نے آگے بڑھایا۔ ان دونوں مراحل کے تسلسل کی وجہ سے ہی ۱۹۶۰ء کی دہائی میں دنیا والے نہ صرف پاکستان کی ترقی پر انگشت بدنداں تھے، بلکہ ترقی پذیر ملکوں کے لیے پاکستان کو نمونے کا ملک (Model for Developing Countries) قرار دیتے تھے۔ اکبر زیدی کے الفاظ میں:

چند برس میں ہی اس کایا پلٹ نے مغربی دنیا کے ان نجومیوں کے دانت کھٹے کر دیے، جنھیں پاکستان کے مستقبل میں صرف تباہی اور بربادی ہی نظر آتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے درمیان ان کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کی ترقی ایسے سنگ میل کی طرف بڑھ رہی ہے جو ابھی تک دنیا میں صرف ایک گنجان آباد ملک امریکہ نے عبور کیا ہے۔ (ص: ۸۴)

یہ عالمی تحسین اگرچہ دوسرے مرحلے کے درمیان سنی گئی، مگر دنیا بھر کے اقتصادی ماہرین اس تحسین کا زیادہ حصہ پہلے مرحلے کے حق میں ڈالتے ہیں یعنی پہلے مارشل لاء سے پہلے کی دہائی۔

مزید تائید کے لیے ایک اور کتاب کی مثال۔ ورلڈ بینک میں سینٹرل ایشیا کے چیف پرویز حسن اپنی کتاب[۲۸] میں لکھتے ہیں:

پاکستان کی توانا بیوروکریسی نے ملک کے ابتدائی برسوں میں معاشی ترقی کی صحیح سمت قائم کی... اور بڑی تیزی سے ملک میں صنعت کاری کے عمل کو رواں کیا۔ جس کے لیے ملک کے فنڈز کا صحیح استعمال کرنے کے علاوہ بیرونی اداروں سے بھی قرضے لیے اور مؤثر ادارے قائم کر کے ملک کا صنعتی ڈھانچہ کھڑا کر دیا۔ (ص: ۲) ۔ یہ ابتدائی زمانہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک جاری رہا۔ جنرل ایوب جب اقتدار میں آئے تو اس سے پہلے کے برسوں میں سیاسی خلفشار تو بہت رہا، مگر سرکاری ملازموں کی فراست اور لگن سے کئی ریاستی ادارے قائم ہو گئے تھے۔ دفاعی طاقت مضبوط ہو گئی تھی۔ صنعتی سرمایہ کاری کے لیے بندرگاہوں، مواصلات اور بجلی کے شعبوں

میں مناسب ڈھانچہ تشکیل پا گیا تھا، مگر سب سے نمایاں کارکردگی تیزی سے صنعتیں قائم کرنے میں نظر آئی۔ (ص: ۹۳) پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن (PIDC) جیسا ادارہ ۱۹۴۹ء میں قائم ہو چکا تھا اور پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن ۱۹۵۷ (PICIC)ء میں قائم ہو چکی تھی۔ (ص: ۱۲۸)

حیف در حیف یہ ہے کہ ہماری موجودہ تاریخ پہلے مرحلے میں پاکستان کی ترقی اور بیوروکریسی کی کامیاب منصوبہ بندی کا ذکر تک نہیں کرتی۔ حالانکہ دنیا والوں کو یہ دور نہیں بھولا۔

اس کا اندازہ مجھے ۱۹۸۵ء کے آس پاس ہوا۔ جب میں کچھ عرصے کے لیے ایشین ڈیویلپمنٹ بینک (Asian Development Bank) فلپائن میں عاریتاً (on deputation) کام کرتا تھا۔ تب مختلف ایشیائی ممالک کی حکومتوں سے میرا واسطہ پڑتا رہتا تھا، جن کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے یہ بینک قرضے فراہم کرتا تھا۔ ان دنوں ملائشیا میرے چارج میں تھا۔ اور میں اکیلا یا چار پانچ افراد پر مشتمل بینک مشن کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا اور ملائشیا کی دن دگنی رات چوگنی ترقی کا عینی شاہد تھا، جس کی وجہ سے کوالالمپور اب ترقی یافتہ ماڈرن شہر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ یہ ملک اب ڈاکٹر مہاتیر محمد کی قیادت میں "East Look" کا نعرہ لگاتے ہوئے یورپ اور امریکا کا منھ چڑانے کے قابل ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ انھی دنوں برطانوی وزیر اعظم مسز تھیچر (Mrs. Thatcher) نے ملائشیا کا سرکاری دورہ کیا، تو مہاتیر نے سرکاری طعام کے دوران تقریر کے دوران برطانیہ کی استحصالی پالیسیوں کی سخت مذمت کی۔

جس واقعے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس دن ہمارا بینک مشن (Mission) وہاں کی پلاننگ منسٹری کے سربراہ سے میٹنگ کر رہا تھا۔ ہمارے ممبران میں سے ایک جاپانی، ایک امریکن، ایک جرمن اور میں اکیلا پاکستانی تھا۔ طویل میٹنگ ختم ہوئی اور ہم کمرے سے باہر نکلنے لگے تو ہمارے میزبان نے مجھے اشارہ کر کے روک لیا۔ جب سب باہر چلے گئے تو انھوں نے مزید چائے کا آرڈر دے کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر کرسی پر بیٹھتے ہی کہنے لگے۔ "For God sake tell me what has gone wrong with Pakistan?" (''خدا کے لیے مجھے سمجھاؤ کہ پاکستان کو کیا ہو گیا ہے؟'')۔

یہ تیسرے مارشل لاء میں جنرل ضیاء کا زمانہ تھا۔ ہمارا ملک چودہ برس پہلے دو ٹکڑے ہو چکا تھا اور ہماری حاکمیت (governance) کا یہ حال تھا کہ بنگلہ دیش کے حالات اب پاکستان کے حالات سے بہتر شمار ہونے لگے تھے۔ ہم دونوں کچھ دیر تک پاکستان کے متعلق بات چیت کرتے رہے تو میں نے ان سے پوچھا کہ پاکستان کے حالات سے انھیں یہ آگہی اور دلچسپی کیسے پیدا ہوئی۔

انھوں نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور پھر تاسف بھرے انداز میں کہنے لگے:

آپ ہماری منسٹری میں گھوم کر دیکھیں تو مجھ سمیت ہر شعبے کے انچارج وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شروع میں پاکستان کے پلاننگ کمیشن سے تربیت حاصل کی تھی۔ اب اسی تربیت کی وجہ سے (انھوں نے کھڑکی سے نظر آنے والی کوالالمپور کی فلک بوس عمارتوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا) ہم اپنے ملک کو یہاں تک لا سکے ہیں۔

... اور وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔

مجھے ان کی بات پر فوراً یقین آ گیا، کیونکہ میں وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کی تازہ اور کھلی فضا میں سانس لیتے لیتے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کی تھی اور اب زندگی کی دوڑ میں شریک ہو کر یہ جان چکا تھا کہ ہماری قوم کو ۱۹۵۸ء سے پہلے کے سنہری زمانے سے اس لیے بے خبر رکھا جاتا ہے کہ ۱۹۵۸ء کے بعد والی شخصیتوں کے گرد مصنوعی طور پر مقدس ہالے بنائے جائیں اور پھر انھیں ہمیشہ کے لیے قائم رکھا جائے۔ یہ مہم اتنی کامیاب رہی ہے کہ میں آج کل کے نوجوانوں کے سامنے جب پاکستان کے پہلے اور سنہری زمانے کا ذکر کرتا ہوں تو ان کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کروٹیں لینے لگتی ہے، کیونکہ ان کے ذہنوں میں یہ تصور کنڈلی مارے بیٹھا ہے کہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ہماری قوم کا زوال شروع ہو گیا تھا۔

ایسے تصورات کی تردید میں جب میں انھیں بتاتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک ہماری قومی ترقی کا گراف تیزی سے اوپر جا رہا تھا، مگر جیسے جیسے امورِ مملکت میں سے عوام بے دخل ہوتے گئے اور بیوروکریسی کا کردار بدلا جانے لگا تو اس گراف کا رُخ نیچے کی طرف مڑتا گیا، تو ان کی اختلافی خاموشی سے مجھے بھی خاموش ہونا پڑتا ہے۔

یادش بخیر! پاکستان کے اُس سنہری دور میں میری کالج کی زمینی اور بنیادی تعلیم۔ پھر یونیورسٹی کی ذہنی پرواز۔ بعدازاں دو برس تک بطور کالج لیکچرر مزید علم شناسی اور میرا احساسِ کم مائیگی۔ پھر ۱۹۵۸ء میں زمانے کا نیا سیاسی موڑ اور آج اڑسٹھ برس بعد وطن کے مینار کی آٹھویں منزل میں لاٹھی بغیر اندھے والی گم گشتگی۔ جس میں وہ زمانہ ایسے یاد آتا رہتا ہے جیسے قریباً ڈیڑھ ہزار برس کی اسلامی تاریخ میں پہلے اٹھائیس برس کی خلافتِ راشدہ کا زمانہ آج ایک ناقابلِ حصول آئیڈیل کے طور پر یاد آتا رہتا ہے۔ کہنے کو تو اس کے بعد کا زمانہ بھی ہماری ترقی کا دور تھا، بلکہ نصاب کی کتابوں کے مطابق زیادہ ترقی والا اور زیادہ چمک والا دور تھا (بعض لحاظ سے واقعی ایسا ہی تھا) مگر اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا جو سنہری دور میں تو تھا، مگر اس کے بعد نہیں تھا اور آج تک واپس نہیں لوٹا۔

اس ''کچھ اور'' کی سند کتابوں میں تو کم کم ملتی ہے، اور جو تھوڑی بہت ہے وہ تجاہل و تغافل کی

اوٹ میں پنہاں ہے۔ اس لیے یہ ادھوری سند صرف اُس ماحول کی جزئیات ہی مہیا کر سکتی ہے، جس ماحول میں اُن دنوں کا پاکستانی شہری سینہ بھر بھر کر سانس لے رہا تھا۔ ایسے صحت مند سانسوں کے زیر و بم کو دیکھنا بھی آج کے پاکستانی شہری کے نصیب میں نہیں ہے۔

اُس دور کو پہلا شرف تو حاصل یہ تھا کہ قوم ایسی منقسم نہ تھی کہ ہمیں خودفریبی کے انداز میں ''ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں'' جیسے ترانے کی لوری دینے کی ضرورت پڑتی۔ بلکہ ہم واقعی ایک تھے ... قوم ایک ... ذہن ایک ... تعمیرِ وطن کی تڑپ ایک ... اور آنے والے کل کا روشن تصور ایک ... مشرقی پاکستان میں اُردو بنگالی کی ابتدائی کشمکش کے باوجود ہم ایک تھے اور مغربی پاکستان میں پنجاب کی سیاست کی احمدی مخالف تحریک کے باوجود ہم ایک تھے۔ جس کی وجہ سے وہ تحریک ناکام ہو گئی۔ ان تنازعوں کے بارے میں غالب گمان یہی تھا کہ جلد یا بدیر ان کا قابلِ قبول حل نکل آئے گا۔ اس لیے کہ ان دنوں تمام مسائل کا حل قومی اسمبلی میں بحث مباحثے کے ذریعے تلاش کیا جاتا تھا۔ ہر قومی مسئلے پر یہ بحثیں بے دریغ ہوتی تھیں اور کھلم کھلا اخبارات کی زینت بن جاتی تھیں۔ ان میں خارجی امور (جیسے بین الاقوامی اتحادوں میں شمولیت) کے مسائل بھی شامل تھے اور ملک کے اندرونی مسائل بھی شامل ہوتے تھے۔ بولنے والے کسی پوشیدہ قوت کے دباؤ کے بغیر اپنی اپنی پارٹی کی پالیسی کے مطابق بولتے تھے اور آج کی طرح اپنی مرضی کے خلاف ووٹ دے کر پچھتاتے یا روتے نہیں تھے،[۲۹] جو بلاشبہ مگرمچھ کے آنسو ہیں۔

وہ زمانہ ٹیکنالوجی کے سیلاب سے پہلے کا دور تھا۔ جب ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کا ظہور ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے قومی اسمبلی کی ان تقاریر کی بازگشت اور گونج تو نہیں سنی جا سکتی۔ مگر اسمبلی کے کتابی ریکارڈ میں یہ تقاریر آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ جن سے واضح ہو سکتا ہے کہ قومی اسمبلی فی الحقیقت اُس دور میں قوم کا دماغ تھی۔ جس کی سوچوں کے متعلق اخبارات میں کھلی بحث ہوتی رہتی تھی اور مزید سوچیں جنم لیتی رہتی تھیں۔ اُن دنوں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حالاتِ حاضرہ کے بڑے مسائل[۳۰] سے ساری اسمبلیاں آج کی اسمبلیوں کی طرح نظر چراتی رہیں۔ جسم و جاں بچاتی رہیں اور ان کی بجائے ٹیلی ویژن (اُس وقت کا ریڈیو) پر درجن بھر غیر نمائندگان سطحی بحثوں یا جھوٹ کے پلندوں یا الزام تراشی سے قوم کو مسلسل بے وقوف بناتے جائیں اور ساتھ ہی حکومتیں اپنی قومی ذمے داریوں سے بھی دستبردار ہوتی رہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہماری اسمبلیوں میں مشرقی پاکستان کے ممبران ایسی صورتِ حال پیدا ہی نہیں ہونے دیتے۔ اگر اب بھی وہ اہم حصہ ہمارے ساتھ ہوتا تو ان کی وجہ سے ہماری اسمبلیوں میں ہر قومی مسئلے پر دھواں دھار بحث اور عمیق غور و خوض ہو رہا ہوتا، کیونکہ ان کے مقررین

ہمیشہ اسی انداز میں تقاریر کرتے رہتے تھے کہ ؏

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اس کی واضح مثال وہ تقاریر تھیں جو ۱۹۵۴ء کے آس پاس Seato اور Cento[31] میں شمولیت کے وقت کی گئیں۔ یہ قومی فکر و عمل کے اس توازن کو ظاہر کرتی تھیں جو مشرقی پاکستان کی وجہ سے قائم تھا۔ چنانچہ خیال تھا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں غالب آبادی والے بنگالیوں کے ایثار کی وجہ سے ترازو کے دونوں پلڑوں نے اوپر والی ڈنڈی کو جو ہموار سطح بخشی تھی، وہ دونوں حصوں کو ہم قدم اور ہم نوالہ رکھے گی اور یہی اس سنہری زمانے کا مقامِ عروج تھا، مگر اس سوچ کو آزمانے کا موقع ہی نہ ملا۔[32]

اس دور کی دوسری صفت یہ تھی کہ ریاست کی شکل و صورت اور جسم و جاں صحیح و سالم تھے۔ مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اور پریس کے چاروں ستون اُس ابتدائی عمر میں اپنا اپنا بھاری بوجھ خود اُٹھانے میں کوشاں تھے۔ جس کی وجہ قانون کی عملداری تھی اور حُسنِ انتظام (good governance) کی سمت عوامی بہبود کی طرف تھی۔ سرکاری دفاتر، تعلیم اور صحت کے ادارے اپنا اپنا کام اُسی طرح چلا رہے تھے جس طرح انگریزی دور کا حُسنِ انتظام تھا۔ یعنی ریاستی جسم میں سر کا کام سر ہی کرتا تھا۔ ہاتھ کا کام ہاتھ ہی کرتا تھا اور ٹانگ کے علاوہ پاؤں بلکہ ہر چھوٹی بڑی اُنگلی بھی اسی طریقے سے حرکت کرتی تھی جس کے لیے وہ ڈیزائن ہوتی تھی، اس لیے وطن کی جسامت میں وحدت الوجود قسم کی ہم آہنگی تھی اور ابتدائی نمود میں وہی توازن تھا جو قدرت نے ریاست کے ہزار پائے کو عطا کیا ہوا ہے کہ پانی کی لہر جیسی استقامت اور لچک سے ہر قسم کی ناہمواریوں پر سے اچھی ریاست بے دریغ آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے اور اُس کا رُواں رُواں اپنی متعین حرکت سے پورے جسم کو متحرک رکھتا ہے۔ ریاستی اجزا میں یہ تناسب اور باہمی موزونیت اُس دور کے بعد کبھی نظر نہیں آئی۔

اس کی واضح مثال لاہور میں پہلا یومِ آزادی تھا۔ جب قائداعظم کی نحیف ذات اپنی زندگی کے آخری مہینے میں داخل ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ زندگی بھر آئین و قانون پر عمل اور اصرار کی وجہ سے اب بھی پاکستان کے ریاستی تناسب کی ضامن تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یومِ آزادی کے پروگرام کے مطابق پاکستانی فوج کی پہلی یادگار پیریڈ لاہور کینٹ سے برآمد ہوئی اور پیدل مارچ کرتی ہوئی اسمبلی چیمبرز کے سامنے پہنچی، جہاں پنجاب کے گورنر یا چیف منسٹر کو سلامی دی گئی۔ پھر مال روڈ پر پیدل مارچ کرتی ہوئی گول باغ میں پہنچ کر ختم ہو گئی۔ اس تمام روٹ کے دو رویہ پاکستانی شہری قطار اندر قطار پیریڈ دیکھنے موجود تھے۔ بلکہ مال روڈ پر تو کئی کاروباری مراکز اور بڑی دکانوں

نے اپنے اخراجات سے عمارت سے سڑک کے فٹ پاتھ تک کرائے کی کرسیوں کی چار چھ قطاریں لگوا دی تھیں، جن پر خواتین بچے اور بزرگ بیٹھے تھے۔ اُن دنوں اِکا دُکا کے علاوہ باقی سب خواتین پردہ کرتی تھیں اس لیے معمر عورتوں کے سفید سادہ برقعوں اور دیگر خواتین کے دُہرے سیاہ برقعوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماع صبح کی تازگی اور پھیکی پیلی دھوپ میں شطرنج کے سیاہ و سفید تختے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ لوگوں کا جوش و خروش، عسکری مارچ کے انتظار میں نظروں کی بے تابی اور چہروں پر خوشی کی تمتماہٹ دیدنی تھی، لیکن اس کے باوجود تماشائیوں کے دوطرفہ ہجوم کے درمیان اِکا دُکا پولیس والوں کی موجودگی میں سڑک بالکل خالی تھی۔ تاکہ پریڈ کا راستہ صاف رہے۔ پھر جب چاق چوبند فوجی دستے یکے بعد دیگرے نپے تلے پُرعزم قدموں سے مارچ کرتے ہوئے گزرنے لگے، جن میں وقفے وقفے سے کئی بینڈ سریلی دُھنیں الاپتے چل رہے تھے تو ''پاکستان زندہ باد'' اور ''پاکستانی فوج زندہ باد'' کے نعرے جوش و جذبے سے ہمکتے ہوئے لوگوں کو دیوانہ بنا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف بھی، عمارتوں کی کھڑکیوں میں بھی، اور چھتوں کی بلندیوں پر بھی۔ جیسے ساری فضا میں خوشیوں کی پھوار پڑ رہی ہو۔ اُس دم جمعۃ الوداع کو قائم ہونے والا وہ ملک اپنی مشکوک زندگی کا پہلا سال مکمل کر کے ہندوستان کی عملی کوششوں اور دیگر ممالک کی پیش گوئیوں کو جھٹلا رہا تھا کہ چند ہی ہفتوں یا مہینوں بعد پاکستانی قوم ہاتھ جوڑتے ہوئے ہندوستان سے دوبارہ الحاق کی درخواست لے کر آئے گی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل تو بارہا اس کا اظہار بھی کر چکے تھے، بلکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن تو اپنے کاغذات میں یہاں تک لکھ چکے تھے کہ نئی قوم کو ایک چھت کی ضرورت تھی۔ جس کے لیے ہم انھیں پکا مکان یا ٹین کی کوٹھڑی بنا کر دے سکتے تھے۔ مگر ہم نے ان کے لیے ایک عارضی خیمہ کھڑا کر دیا ہے۔

اُس دن مال روڈ پر پاکستان کی نئی آزاد ریاست کے تمام عناصر بالکل خالص اور صحیح تناسب میں موجود تھے۔ جائے وقوعہ بلاشرکتِ غیرے وطن کی سرزمین تھی۔ شہریوں کے پاؤں تلے کی مٹی ان کی قومی ملکیت تھی۔ لاہور کینٹ، اسمبلی چیمبرز اور مال روڈ کے کاروباری مراکز قومی تقسیم کار کے مظاہر تھے۔ وہاں جمع ہجوم ایک ریاستی ادارے کے باوردی افراد کا اس لیے والہانہ استقبال کر رہا تھا کہ اس وردی کی رُو سے انھیں نئی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت سونپی گئی تھی۔ ان کی طرف سے اسمبلی ہال کے سامنے حکومتی نمائندے اس لیے سلامی لے رہے تھے کہ یہ رائج الوقت آئین کی تقدیس تھی۔ اور ہجوم پر خوشیوں کی پھوار اس حُسنِ انتظام (Good governance) کے اُفق سے پڑ رہی تھی، جو اب بٹوارے کی افراتفری اور غارت گری کی جگہ لے چکا تھا اور اگلے چند برسوں تک

قائم رہنے والا تھا۔

اس منظرنامے کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اس کے تار و پود سراسر خلوص سے بنے ہوئے تھے اور آج کے ایسے مناظر کی طرح نہ تھا، جن کی بُنائی اور بناوٹ میں ریاکاری اور منافقت کے تار حاوی ہوتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ اُس یادگار وقت میں ریاست ایک بڑے کارخانے کی طرح پوری تیزی اور ہمواری سے کام کر رہی تھی جس کا ہر اہم اور حقیر پرزہ اپنا کام پوری شد و مد سے کر رہا تھا اور شہریوں کے لیے امن و آشتی کی زندگی اور حاکموں کے لیے حسنِ انتظام یا گڈ گورننس کے مختلف ٹکڑوں کی صنعت کاری کر رہا تھا۔ اس سنہری زمانے کا طرۂ امتیاز یہی تھا کہ اس کے عطا کردہ سکون و اطمینان نے میرے اندر سے عدم تحفظ کی اس لہر کو بالکل ختم کر دیا تھا جس نے میرے بچپن کو ہندو اکثریت کے خوف میں جکڑا ہوا تھا۔[۳۳] چنانچہ وہ پورا دور ہی نئے وطن کے لیے عافیت کا ایسا سائبان تھا جس کے نیچے: ع

ہر روز روزِ عید تھا ہر شب شبِ برات

آج میں دونوں میناروں کی ساتویں اور آٹھویں منازل سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہوں اور ریاستی عناصر میں وہی پرانا توازن، ریاستی ترتیب اور اشتراکِ عمل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر ہمہ وقت عافیت والی پہلی منزل کے ڈیزائن میں بعد کی متعدد و مسلسل تبدیلیوں اور بے ترتیبی کی وجہ سے اب وطن کے مینار کی ساتویں منزل کا ڈیزائن اتنا بدل گیا ہے کہ مجھے انور مسعود کے وہ اشعار یاد آ رہے ہیں، جن کا اطلاق انسانی جسم اور ریاستی جسم پر ایک جیسا ہوتا ہے۔

نک جے متھے اُتے ہوندا
کن جے دھونڑ دے پچھے ہوندے
اکھاں ہوندیاں موڈھے تے
وکھی وچ اِک پوشل ہوندی
نہوں جے گٹے اُتے ہوندے
گوڈے دی تھاں پسلی ہوندی
پسلی دی تھاں گوڈا ہوندا
بندہ کیڈا کوجا ہوندا

ترجمہ: اگر (انسانی جسم میں یہ تبدیلیاں ہو جاتیں کہ) ناک ماتھے پر لگی ہوتی۔ کان گردن کے پیچھے ہو جاتے۔ آنکھیں کندھے پر لگ جاتیں۔ پہلو میں سے دم نکل رہی ہوتی۔ پسلی گھٹنے کی جگہ آ جاتی اور گھٹنا اپنی

جگہ سے ہٹ کر پسلی کے مقام پر پہنچ جاتا۔ تو (ان ترامیم کے بعد خدا کا) بندہ کتنا بدنما اور بدصورت ہو جاتا۔

اُس دور کا سنہرا پن اس میں تھا کہ وطن کے مینار کی پہلی منزل تو خدا کے بندے جیسی متوازن، متناسب اور حسین تھی لیکن پھر اس میں ان اشعار جیسی ترامیم ہونے لگیں اور عرصۂ دراز تک ہوتی رہیں۔ اس لیے آج جب میں اس کی ساتویں منزل میں داخل ہوتا ہوں تو یہ انور مسعود کے ترمیم شدہ ''کوجے بندے'' جیسی ایک ''کوجی منزل'' بن چکی ہے، جس کی وجہ سے باہر والے اس مینار کو ''ناکام ریاست'' گردانتے ہیں اور اندر والے دل ہی دل میں باہر جانے کی خواہش کو پالتے رہتے ہیں۔

اس سنہری دور کی تیسری صفت اُس وقت کے پاکستانیوں کے مثبت اور خلق دوست رویے تھے، جو پچھلی نصف صدی کے سیاسی تناظر کی کشید تھے۔ پہلے غلاموں میں یہ احساس جاگا کہ ایاز قدرِ خود بہ شناس... پھر انگریزی سامراج کے خلاف ہم خیال ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے لگے۔ پھر ان کے کندھوں سے کندھے ملنے لگے اور سیاسی تحریکیں نمودار ہونے لگیں۔ ان کے راستے گو الگ الگ ہی رہے، مگر منزل سب کی ایک تھی۔ اخلاص، شوقِ منزل، نیک نیتی اور راستی کا زادِ راہ بھی ایک جیسا تھا۔ اس لیے ان میں حریت پسندی تو تھی، مگر شخصیت پرستی نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ہر سیاسی پارٹی کو اپنا الگ مگر واضح طریق کار وضع کرنا پڑتا تھا جو ہر قوم کی اپنی مخصوص اخلاقیات کے مطابق ہوتا تھا۔ اسی لیے سب کے سیاسی وتیروں میں اُجلے دامن اور حسنِ عمل کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ سب اختلافی سیاسی وتیرے بھی باہم مل کر ایک رنگ برنگی قوسِ قزح کی طرح ایک ہی رخ چلتے تھے۔

سب سے شوخ مگر اعلیٰ ارفع اور وسیع پروگرام تو علامہ مشرقی کا تھا جس کا ہدف آزادی سے بھی آگے جا کر ایک مردِ مومن وضع کرنا تھا، جو حقوق العباد کے ذریعے حقوق اللہ کی تکمیل و تعمیل کر سکے، اس لیے وہ انتہائی عرق ریزی سے دس پندرہ برس تک قوم کو خدمتِ خلق اور اعلیٰ کردار کی منظم تربیت دے کر معاشرے کی اصلاح کرتے رہے۔[۳۴]

ان کے علاوہ دیگر مسلم اور غیر مسلم قیادت میں اگر علامہ مشرقی جیسے اوصاف نہیں بھی تھے تو بھی ان کی غالب اکثریت کا کردار صاف ستھرا ہوتا تھا جو انھیں زندگی سے زیادہ قدآور بنا دیتا تھا۔ مسلمان قیادت میں مولانا ابوالکلام آزاد، عطاء اللہ شاہ بخاری، خان عبدالغفار خان، نواب بہادر یار جنگ، فضل الحق، خواجہ نظام الدین، مولانا حسرت موہانی، علی برادران اور کئی دوسروں نے اپنی پارٹیوں کو جس قسم کی بے لوث اور بے ریا قیادت مہیا کی وہ ایک درخشاں کہکشاں کی مانند تھی، جس کا

ہر ستارہ اپنی مخصوص چمک رکھتا تھا۔ پھر جب محمد علی جناح جیسا ماہِ کامل اپنی آئینی اور جمہوری ضوفشانی سے سارے سیاسی آسمان پر چھا گیا تو نصف صدی کی اس صحت مند قیادت کے اس گلدستے سے پاکستان کی نئی ریاست کو جو رویّے ورثے میں ملے، وہ انسانی اور اخلاقی قدروں سے معمور تھے اور وطن کے مینار کی پہلی منزل ان سے مہک رہی تھی۔

آج وطن کے مینار کی ساتویں منزل میں راج کرنے والے قبضہ گروپوں کو میں سمجھا ہی نہیں سکتا کہ وہ جذبہ کتنے مثبت رویّوں کا حاصل جمع تھا۔ جس کے تحت مشرقی پنجاب سے چشمِ زدن میں نکالے ہوئے بدحال مہاجروں میں سے ایک نہیں بلکہ بہت سے ایسے تھے جنھوں نے پاکستان پہنچ کر ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں میں سے کچھ بھی الاٹ نہیں کروایا۔ کیونکہ ان کے پاس اس نئے وطن میں اب بھی خدا کا دیا ہوا کچھ بچ گیا تھا اور وہ اپنے جائز اور قانونی حق سے ایسے بدقسمتوں کے لیے دستبردار ہو گئے تھے جن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

اسی طرح آج قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والی حکومتوں، تاجروں، ڈاکٹروں،[۳۵] وکیلوں اور کارندوں کو میں کیسے سمجھا سکتا ہوں کہ اُن دنوں معمولی تنخواہوں[۳۶] اور محدود قوتِ خرید والی قوم سے صرف جائز منافع کمانے کے مثبت رویّے نے پورے معاشرے کو کتنا خوش حال اور خوش باش بنا رکھا تھا، جس میں لالچ بدنام اور قناعت نیک نام تھی۔

اسی طرح آج کل کے تعلیمی اداروں کو سونے کی کان بنا لینے والوں کو میں کیسے سمجھا سکتا ہوں کہ اُن دنوں تعلیم اتنی سستی تھی کہ زیادہ عیال دار باپ بھی سارے بچوں کے تعلیمی اخراجات سے کبھی پریشان نہ ہوتے تھے اور نہ ہی اسے اپنے لیے بوجھ سمجھتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اکثر اسکولوں اور کالجوں نے ہندوستان سے آنے والے ہر قسم کے مہاجروں کے بچوں کی نصف یا پوری فیس معاف کی ہوئی تھی۔

آج وطن کے مینار کی ساتویں منزل میں گلیوں، سڑکوں، چوراہوں، دیواروں اور کھمبوں پر قرآنی آیات اور خدا کے اسمائے صفت آویزاں ہیں۔ مگر گھروں میں ٹیلی ویژن اسکرین پر کروڑوں، اربوں روپے کی کرپشن کی خبریں سامری کے سونے کے بچھڑے[۳۷] کی طرح چمکتی رہتی ہیں۔ نہ معلوم میں کس ادارے کو سمجھا کر قائل کر سکتا ہوں کہ ایک واقفِ راز کی کتاب کے دو اقتباسات بھی کسی مناسب جگہ پر آویزاں کر دینے چاہییں۔ (لوحِ ایام: مختار مسعود)

پہلا اقتباس بمطابق ۱۹۴۸ء (ص: ۳۷۹)

قائد اعظم کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ دبلے پتلے بوڑھے اور بیمار تھے۔ مرض الموت میں جسمانی کمزوری بہت

بڑھ گئی۔ زیارت میں قیام کے دنوں میں ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے ان کی حالت زیادہ تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو دو باورچی کپور تھلہ برادرز کے نام سے مشہور ہیں، انھیں زیارت بھیجا جائے کیونکہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائد اعظم کو مرغوب ہے۔ کپور تھلہ کے باورچی بھائیوں کی تلاش ہوئی۔ وہ لاہور چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے۔ لائل پور سے زیارت پہنچے۔ کھانا پکایا۔ اس روز قائد اعظم نے چند لقمے شوق سے کھائے۔ کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کو بلایا۔ کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی۔ وجہ بتائی گئی۔ وہ ناخوش ہوئے۔ چیک بک منگائی، باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا۔ اس رقم کا چیک کاٹا، رقم سرکاری خزانے میں جمع کرائی۔ باورچی رخصت کیے اور کہا، یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا (سرکاری خرچ پر) فراہم کرے۔

دوسرا اقتباس بمطابق ۱۹۵۵ء (ص: ۳۷۶، ۳۷۷)

بازرگانی کھانے کا ذکر سن کر بی اے قریشی اچھے دنوں کو یاد کرنے لگے۔ انڈین سول سروس کے کل ہند مقابلے کے امتحان میں مقامی باشندوں کو حصہ لینے کی اجازت ملنے کے وقت سے لے کر قیامِ پاکستان تک صرف دو مسلمان اُمیدوار اوّل آئے تھے۔ ایک حافظ عبدالمجید اور دوسرے بی اے قریشی۔ قریشی صاحب کہنے لگے، ہم نے آزادی کے فوراً بعد بڑا کٹھن وقت گزارا ہے۔ عام آدمی نے بڑی قربانی دی، رہنما بااصول اور ثابت قدم رہے۔ افسر اور عملہ قومی دولت کی حفاظت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ پاکستان چند دن بھی نہ چل سکے گا، انھیں بڑا تعجب اور بڑی مایوسی ہوئی۔ تحریکِ پاکستان کے وہ مخالف جو اعداد و شمار کی بنا پر پاکستان کو بے اساس معاشی اکائی سمجھتے تھے، انھیں اس جذبے اور ولولے کا اندازہ ہی نہ تھا جو اس ملک کے حصول اور پہلے چند برسوں کے تمام مسائل اور مشکلات پر حاوی ہونے کا باعث بنا۔ آپ نے ایرانی وزیر اعظم کی دعوتِ شیراز کا ذکر کیا ہے، میں بھی آپ کو ایک دعوت کا حال سناتا ہوں۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ چودھری محمد علی وزیر اعظم تھے۔ کراچی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ میں بھی اس میں شامل ہوا۔ میٹنگ کے بعد وزیر اعظم نے چار پانچ افسروں سے کہا کہ وہ رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ ہم پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم میں عام سے صوفے، قالین اور چند چھوٹی میزوں کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ دیواروں پر کوئی تصویر نہ تھی۔ میزوں پر آرائش کا کوئی سامان نہ تھا۔ شیشے کا ایک شوکیس کونے میں رکھا ہوا تھا مگر بالکل خالی۔ سجاوٹ کی خاطر نہ کوئی چیز وہاں موجود تھی نہ کسی کو اس کا خیال یا فکر تھی۔ وزیر اعظم ان باتوں سے بے خبر اور بے نیاز تھے۔ اُس زمانے کی ترجیحات ہی کچھ اور تھیں۔ دیر تک ملک کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے میں تاخیر ہو گئی۔ وزیر اعظم گفتگو کے دوران دو ایک بار اُٹھ کر

اندر گئے۔ مگر دیر تھی کہ ہوتی چلی گئی۔ ایک بار وہ باورچی خانے کا چکر لگا کر آئے اور کہنے لگے۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کو کھانے کے لیے کچھ انتظار اور کرنا پڑے گا۔ رضیہ بیگم کا خیال ہے کہ وہ ایک ماہر کک ہیں۔ میری دانست میں وہ اتنی ماہر بھی نہیں جتنا ان کا خیال ہے۔ ایک سرکاری باورچی ہے مگر وہ اس پر بالکل بھروسا نہیں کرتیں۔ سارا کام خود کرنا چاہتی ہیں۔ اتنے میں بیگم محمد علی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اُلجھے ہوئے بالوں کو پلو سے ڈھکتے ہوئے اور آٹے ہوئے ہاتھوں کو صاف کرتے۔ آؤ بھراؤ (بھائیو) کھانا تیار ہے۔ شوق اور محنت سے بنایا ہوا گھریلو کھانا تھا۔

لیکن اگر یہ اقتباسات آویزاں کر بھی دیے جائیں تو کیا ایوانِ اقتدار کے موجودہ مکین انھیں سمجھ سکیں گے؟ خصوصاً جب سال ۲۰۱۵ء — ۲۰۱۶ء کے منظور شدہ بجٹ میں ایک خطیر رقم صرف اس لیے رکھی گئی ہے کہ اس مالی سال کے دوران وزیراعظم جب بھی بیرون ملک جائیں تو وہ ہر روز ۴۶ رلاکھ روپے خرچ کر سکیں۔[۳۸] یہ اس ملک کے سربراہ کے لیے یومیہ سرکاری سفر خرچ ہے۔ جہاں روز افزوں جاہل آبادی کی تعلیم کے لیے اسکول نہیں ہیں۔ جہاں ۲۰۱۵ء میں شدید گرمی سے ہزاروں کی تعداد میں مرنے والوں کے لیے نہ کافی ہسپتال ہیں نہ پانی ہے، نہ بجلی ہے اور نہ ہی اکیلی قبر ہے۔ جہاں بچے کیڑوں مکوڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ پھر غربت کی وجہ سے کبھی بازار میں بکتے ہیں، کبھی والدین کی معیت میں اجتماعی خودکشی کرتے ہیں، کبھی مدرسوں میں خودکش ہتھیار بنتے ہیں اور بالآخر کبھی قبر کے بغیر اور کبھی اجتماعی قبر میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ جیسے حال ہی میں گرمی کی شدید لہر کے دوران کراچی میں ہوا۔

ایک قیادت کے رویوں نے انتہائی مشکل وقت میں وطن کے مینار کی سنہری منزل تعمیر کر دی۔ دیگر قائدین کے رویوں سے اسی مینار کی دیگر ہر منزل اپنی نچلی منزل سے زیادہ ''کوجی'' ہوتی گئی۔ نتائج تو ان رویوں اور ان منزلوں کی تفاوت کے متعلق یہ کہتے ہیں: ''چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔'' مگر ہماری تاریخ کی کتابیں کچھ اور ہی کہتی ہیں۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے وطن کے مینار کی سب منازل بھی دیکھی ہیں۔ وطن کی تاریخ بھی پڑھی ہے اور اب اپنے مینار کی بلندی سے جھانک کر ان سب کا فضائی جائزہ اور باہمی موازنہ بھی کر سکتا ہوں۔ اور تاریخ کا قتلِ عمد بھی دیکھ سکتا ہوں۔

وطن کے مینار کی ساتویں منزل میں موجودہ زندگی کا موازنہ جب میں پہلی منزل والی پرانی زندگی سے کرتا ہوں تو میری تنہائیاں بول اُٹھتی ہیں:

اکثر شبِ تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے

بنتے ہیں شمعِ زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر

شبِ تنہائی نہ بھی ہو تو دن کی روشنی میں بھی آج کی تشویش زدہ سہمی ہوئی زندگی کا ہر قدم اُس پرانی پُرسکون زندگی کا گم شدہ نقشِ پا ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔ اکثر مایوسی کے عالم میں دونوں میناروں سے نیچے جھانکتا ہوں تو وطن کی پہلی منزل کسی پہاڑ کی چوٹی سے دکھائی دینے والی سرسبز وادی کی طرح پھیلی ہوئی لگتی ہے۔ ندی نالے چشمے جھرنے، سڑکیں، پگڈنڈیاں، رنگا رنگ کھیتوں کا پھیلاؤ، جابجا سرسبز درختوں کا اُبھار۔ پرندوں کی اونچی نیچی پروازیں اور راہگیروں اور گاڑیوں کی موہوم حرکات۔ میں اس کے پتے پتے اور بوٹے بوٹے کی عکاسی تو نہیں کر سکتا مگر باغ سارا خود ہی بتا رہا ہے کہ اس کی مجموعی ہریالی نے ایک نوزائیدہ قوم کو کیسے سرشار رکھا تھا۔ اس سرشاری کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

یہ مثال پاکستان ریلوے کی ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے بھی یہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں مواصلات کا بہت مقبول اور مؤثر ذریعہ تھی، مگر قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اسے نئے ملک کی ضروریات کے مطابق بہت بہتر اور مزید مقبول بنا دیا گیا۔ سب سے پہلے تو ریلوے نے یہ مشکل مرحلہ بطریقِ احسن عبور کیا کہ ہندوستان نے کوئلے کی سپلائی بند کر دی۔ تو متبادل انتظام ہونے تک لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو انجن میں جھونکا گیا۔ اس کے بعد پچاس کی دہائی کے شروع میں جرمنی اور فرانس سے ماڈرن ایئر کنڈیشنڈ کوچز (coaches) کی خریداری ہوئی۔ لاہور اور کراچی کے درمیان ۲۶ رگھنٹے والے سفر کو ۱۹ رگھنٹے تک کم کرنے والی تیز گام کا اجرا ہوا۔ اور چار مقامات (پشاور، راولپنڈی، لاہور، ملتان) کے درمیان دو بوگیوں والی چار ریل کاروں کی دن میں دو دفعہ دوڑ شروع ہوئی۔ ان اقدامات نے پاکستان ریلوے کو یورپ کی ریلوں سے موازنے کے قابل بنا دیا۔ ان گاڑیوں میں جدید طرز کی ڈائننگ کار (dining car) کے علاوہ باقی تمام سہولتیں اور معاونین کی خدمات بھی بڑی چابک دستی سے دستیاب تھیں۔ ۱۹۵۹ء میں میرے انگلستان میں قیام کے دوران ایک انگریز افسر نے مجھے کہا تھا کہ، آپ کے ملک میں تو ریلوے کی رولز رائس (Rolls Royce) چلتی ہے۔ اُن دنوں وقت کی پابندی ریلوے کا طرۂ امتیاز تھا۔ اسی لیے گوجرانوالہ اور سیالکوٹ سے چلنے والی بابو ٹرین وہاں رہائش پذیر سرکاری ملازمین کو لاہور کے دفاتر میں عین وقت پر پہنچاتی تھی اور چھٹی کے اوقات کے فوراً بعد انھیں واپس لے جاتی تھی۔ ریلوے کے متعدد ورکشاپوں اور تربیت یافتہ مستعد عملے کی وجہ سے گاڑیوں کی مرمت اور صفائی قابلِ رشک رہتی تھی۔ لائن کلیئر کے لیے انجن

کی کوک، گارڈ کے ہاتھ کی جھنڈی اور منہ کی سیٹی کے علاوہ سڑکوں پر عین وقت پر پابندی سے کھلنے اور بند ہونے والے پھاٹک اس ادارے کی رگ رگ میں رچے ہوئے نظم و ضبط کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

ریاست کے جسم کی شریانوں میں دوڑنے والے تازہ خون کی طرح ریل گاڑیاں نہ صرف ہر وقت دوڑتی رہتی تھیں بلکہ ان کا جال بھی تیزی سے پھیل رہا تھا اور اس کی مال گاڑیاں مشینری کی نقل و حمل سے تیز صنعت کاری میں مدد کر رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے چار پانچ برس میں ہی لاہور اور گجرات کے درمیان جرنیلی سڑک کے دونوں طرف بجلی کے پنکھوں کی فیکٹریاں جا بجا کھڑی ہونے لگیں۔ سیالکوٹ میں کٹلری (cutlery)، کھیلوں کے سامان اور پنسل بنانے کے کام ہونے لگے اور لائل پور میں دھاگے اور کپڑے کے کاروبار زور پکڑنے لگے۔ کراچی کے گرد و نواح کے بارے میں بھی ہم ایسی ہی خبریں سنتے تھے۔

ریلوے کے دیوہیکل محکمے کا سالانہ بجٹ اپنی علیحدہ شناخت کے ساتھ قومی اسمبلی میں قومی بجٹ کے ساتھ ہی پیش کیا جاتا اور طویل چھان پھٹک والی بحث کے بعد منظور ہوتا۔ قدیم داستانوں کے انداز میں اس دیو کی جان جس چھوٹے سے طوطے میں تھی اسے ریلوے ٹائم ٹیبل (Time Table) کہا جاتا تھا۔ دو اڑھائی سو صفحات کے حجم اور آٹھ آنے کی مالیت کی یہ کتاب نہ صرف گاڑیوں کے اوقات کی مفصل اطلاعات بہم پہنچاتی تھی بلکہ شہریوں سے اس محکمے کا شفاف رشتہ بھی قائم کرتی تھی۔ اس میں محکمانہ کارکردگی کے جملہ قواعد و ضوابط کا واضح اندراج ہوتا تھا مع متعلقہ دفاتر یا افسروں کے رابطے کے، تاکہ ناقص کارکردگی کے متعلق فوراً شکایت کی جا سکے۔ ساتھ ہی مسافروں کے جملہ حقوق کا بہت تفصیل سے اندراج ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ ڈائننگ کار یا ریل کے ڈبے کی کھڑکی سے ٹرے میں خریدے ہوئے کھانے میں ٹھنڈے پانی سمیت کیا شامل ہوگا اور اگر وہ نہ ہو تو کس طرح فوری شکایت سے ازالہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ کتابچہ لوگوں کے ہاتھ میں احتساب کا ایک چھوٹا سا تازیانہ بھی دے دیتا تھا۔

ریلوے کا مذکورہ بالا بندوبست تو قیامِ پاکستان سے پہلے انگریز حاکموں کا قائم کردہ تھا، مگر اس کے قد و قامت کا تعین ان کے اپنے استعماری قبضے کی ضروریات کے مطابق ہوتا تھا۔ جب پاکستان بنا تو ریلوے کی بیوروکریسی اسے ایک آزاد اور ترقی پذیر ملک کے شایانِ شان بنانے پر تل گئی اور چند ہی برسوں میں حُسنِ صورت اور حُسنِ انتظام میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ اسی آزمودہ طریق کار سے، جس نے وسیع برٹش ایمپائر کو تین صدیوں کا ثبات اور استحکام دیا تھا کہ ہر محکمہ قواعد و ضوابط

کی ایک چھوٹی سی کتاب کو اپنا ایمان بنا لیتا تھا اور اس پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ ریلوے ٹائم ٹیبل بھی ایسی ہی کتاب تھی۔ جس کی اصل اہمیت سے میں ان دنوں تو لاعلم تھا۔ مگر چند برس بعد جب میں مزید تعلیم اور سول سروس کی ٹریننگ کے لیے انگلستان گیا اور وہاں مختلف محکموں کی کارکردگی دیکھی[۳۹]، تو اس قسم کے کتابچے کی حکمت سمجھ آئی اور پھر کیمبرج یونیورسٹی میں کرسٹفر اینڈرسن[۴۰] سے تبادلہ خیالات کے بعد احساس ہوا کہ یہ کتابچہ تو برٹش ایمپائر میں گڈ گورننس (Good governance) کی کنجی ہے۔ واپسی پر جب پاکستان کے سرکاری محکموں میں کام کیا تو دیکھا کہ ہر دفتر میں انگریزی دور کی تیار شدہ رہنما کتاب (manual) موجود ہوتی تھی جس میں دفتری کام، قواعد و ضوابط اور نگرانی کے متعلق ہر چھوٹی بڑی ہدایت بڑی تفصیل سے درج ہوتی تھی، حتیٰ کہ مختلف علاقوں کے بدلتے موسموں میں اوقاتِ کار، گرمیوں میں پنکھے چلانے یا سردیوں میں انگیٹھی جلانے کی تاریخوں کا بھی اندراج ہوتا تھا۔

قواعد و ضوابط کی چھوٹی سی کتاب، اس کے ہر حرف کی تعمیل اور پھر انحراف پر کڑی گرفت ... یہ چھوٹی سی سوئی تھی، جس پر برٹش ایمپائر کا بڑا سا لٹو تین سو برس تک بڑے توازن سے گھومتا رہا اور جب پاکستان ریلوے نے بھی نئے ملک میں اس سابقہ توازن کو برقرار رکھا اور رفتار کو مہمیز دی تو اس کا لاہور کے شہریوں سے ایک عجیب سا تعلق پیدا ہو گیا۔

قیامِ پاکستان کے وقت چھاؤنی اور سول لائنز کے علاوہ لاہور اندرونِ شہر، راوی روڈ اور محصول لگانے والی مزنگ چنگی کے اردگرد پھیلی ہوئی اچھرہ کی چھدری سی آبادی پر مشتمل تھا اور نندہ بس سروس کے تین روٹ سارے لاہور میں پہنچا دیتے تھے۔ ان دنوں شہریوں کے لیے شام کی سیرگاہیں صرف دو تھیں۔ لارنس گارڈن اور مال روڈ۔ مگر شروع کے چند ہی برسوں میں ایک تیسرا مقام بھی اگر سیرگاہ نہیں تو تفریح گاہ ضرور بن گیا۔ یہ مقام لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ اور ۴ تھے، جن کی اونچی خوبصورت چھت ہر موسم کے لیے بڑی مؤثر چھتری تھی۔ اُس زمانے میں وزیراعظم، گورنر جملہ حکومتی اکابرین اور سرکاری عہدیدار اپنے منصبی فرائض کے پابند ہونے کی وجہ سے بڑی باقاعدگی سے سرکاری دورے کرتے تھے اور زیادہ سفر بذریعہ ریل کرتے تھے۔ ان کے پروٹوکول کے مطابق دو چار سپاہی تو نظر آ جاتے تھے مگر نہ تو لوگوں کے راستے بند کرنے والی ڈنڈا بردار پولیس ہوتی تھی اور نہ ہی وڈیروں کے بندوق بردار محافظ ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ دونوں پلیٹ فارم بہت صاف ستھرے اور بارونق ہوتے تھے۔ خصوصاً شام کے بعد تو روشن قمقمے جیسے دن کو واپس بلا لاتے تھے۔ اس لیے چند لوگ اپنی کاروں میں، زیادہ لوگ تانگوں میں اور کئی منچلے پیدل ہی بیوی

بچوں کے ساتھ وہاں پہنچ جاتے۔ بچے مفت اور بڑے دو آنے کے پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر اندر جاتے۔ دو چار چکر لگا کر گاڑیوں کے آنے جانے کی رونق دیکھتے اور پھر ان دونوں پلیٹ فارموں پر صاف ستھرے اسٹالوں یا دو ایک ریستورانوں یا ریلوے کے اپنے ڈائننگ ہال میں مشروبات، چائے کافی چاٹ مسالہ وغیرہ کے شغل میں لگ جاتے۔ یا بک اسٹال کے وسیع دامن سے ملک کے تمام اخباروں، ادبی، غیر ادبی یا فلمی اور دیگر رسالوں میں سے اپنی پسند کی خریداری کرنے لگتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی اس تفریح سے اسٹیشن کی رونق اور کاروبار بھی بڑھ جاتے اور ریلوے پولیس کی الگ شناخت بھی قائم رہتی۔

یہاں ایک محکمے کی مثال اس لیے ذرا تفصیل سے دی گئی ہے تاکہ اس حقیقت کا اندازہ ہو سکے کہ متعلقہ تفصیلات کے ردّوبدل کے ساتھ ہر محکمہ اسی طرح کی تحسین کا مستحق تھا۔ کیونکہ ہر ایک کا اپنا کتابچہ تھا اور ان کے جملہ اہلکار برٹش دور کی تربیت کی وجہ سے اس کے پابند تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی سرکاری اور نجی زندگی میں اس طرزِ عمل کے بھی پابند تھے جو گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز (Govt. Servants Conduct Rules) کے ذریعے انھیں باکردار اور باعمل بناتا تھا اور خوب سے خوب تر کی تلاش ان کی عادت بن جاتی تھی۔[41] چنانچہ ان کی شہرت بھی دیانتداری کی ہوتی تھی اور وہ دیانت دار ہوتے بھی تھے۔[42]

ان سب کا حاصل جمع اُس سنہری دور کی گڈ گورننس (Good governance) تھی، جو دراصل انگریزی دور کے حُسنِ انتظام کا ہی تسلسل تھا۔ چنانچہ ان دنوں جو غرض مند بھی متعلقہ دفتر سے رابطہ کر لیتا اس کی دادرسی بغیر سفارش یا تعلقات کے ہو جاتی تھی۔ ملازمت کے خواہش مند سیدھے ایمپلائی منٹ ایکسچینج (employment exchange) چلے جاتے تھے اور اپنی تعلیمی استعداد کے مطابق کھڑے کھڑے دو چار ایسے دفاتر میں انٹرویو کے پروانے حاصل کر لیتے تھے جہاں اسامیاں خالی ہوتی تھیں۔ اس لیے بے روزگار لوگوں کو تلاشِ معاش کے لیے کسی سیاسی وسیلے یا سرکاری دلاّل کی ضرورت نہ تھی۔ رشوت لینا یا دینا اتنا برا سمجھا جاتا تھا کہ والدین راہ چلتے لوگوں کی طرف ڈھکا چھپا اشارہ کر کے اپنے بچوں سے سرگوشی کرتے تھے کہ یہ شخص رشوت لیتا ہے، تم اس کے بچوں سے دور ہی رہنا۔ معاشرے کے اس مجموعی رویے کی وجہ سے محکمہ پی ڈبلیو ڈی (Public Works Department) میں ٹھیکیدار کا بل ادا کرنے میں پانچ فیصد تک اور محکمۂ مال میں پٹواری کی معمولی نذر نیاز کے علاوہ رشوت کا کہیں نام نہ سنا جاتا تھا، مگر اس پر بھی جسٹس کیانی نے اپنی ایک تقریر میں یوں پھبتی کسی تھی کہ ڈکشنری میں پی ڈبلیو ڈی (PWD) کو مؤنث دکھایا گیا ہے، جس پر میں نے خدا

کا شکر ادا کیا کہ اگر یہ مذکر ہوتے تو نہ معلوم کیا ہو جاتا۔

پاکستان ریلوے نے تو انگریز کے تعمیر کردہ پرانے گھر کو نیا روپ دیا تھا، مگر دیگر کئی اداروں نے تو قیامِ پاکستان کے بعد جنم لیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے قومی اور بین الاقوامی اُفق پر اپنا نام پیدا کر لیا۔ تین ڈکوٹا طیاروں پر مشتمل اورینٹ ایئرویز (Orient Airways) کو جب پاکستان ایئر لائنز (Pakistan Airlines) بنا کر اس میں نئی روح پھونکی گئی تو پہلے تو پی آئی اے (PIA) کے اپنے نام کا ڈنکا بجا، پھر یہ ایمریٹس ایئر لائن (Emirates Airlines) مالٹا ایئر لائن (Malta Airline) اور دیگر ممالک کی ہوائی کمپنیاں بنانے میں مدد اور تربیت دینے لگی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے واحد مسلمان بینک آسٹریلشیا بینک (Australasia Bank) سے قائداعظم نے تعاون شروع کر دیا تھا۔ نیا وطن ملا تو اس بینک نے بینکاری کے شعبے کی ایسی رہنمائی کی (نئے قائم شدہ پاکستان اسٹیٹ بینک کے علاوہ) کہ تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف کئی بینک جگمگا اُٹھے، بلکہ ہمارے بینکاروں کے لیے دوسرے ممالک سے بھی درخواستیں آنے لگیں۔

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن (Pakistan Atomic Energy Commission) ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا تو اچھے نمبروں میں ایم ایس سی (MSc) کرنے والے لڑکوں کو درجنوں کی تعداد میں وظیفے دے کر پی ایچ ڈی (PhD) کے لیے دنیا بھر کی نامور یونیورسٹیوں میں بھیجنے لگا اور واپسی پر انھی کی کوششوں نے ہمارے ملک کو ایٹم بم سے مسلح کر کے ہندوستان کے خوف سے آزاد کیا۔

آزادی کے بعد جنم لینے والے لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ (Lahore Improvement Trust) کا پہلا کارنامہ یہ تھا کہ تباہ شدہ شاہ عالمی گیٹ کے ملبے کے پہاڑ صاف کروائے۔ پھر اُن دنوں کے طرزِ تعمیر کے جدید تقاضوں کے مطابق نیا شاہ عالم بازار تعمیر کروایا جو حد درجہ کشادہ اور روشن تھا۔ پھر یہ ادارہ سمن آباد، گلبرگ، شاد باغ، شادمان اور دیگر نئی آبادیوں کے ترقیاتی منصوبوں کو عملی شکل دینے لگا۔ اسی طرح تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (Thal Development Authority) قائم ہوا تو تھوڑے ہی عرصے میں تھل کے تپتے صحراؤں میں گلزارِ ابراہیم کی طرح ایک نیا شہر جوہر آباد بسا دیا۔

قوم کی روایتی منافقت سے دامن چھڑا کر اگر ہم صدقِ دلی سے جائزہ لیں تو وطن کے مینار کی پہلی منزل میں چمکنے والے ستاروں کی فہرست طویل ہوتی جائے گی۔ ہمارے تعلیمی اداروں کا جال تو زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا، مگر ملک کے زیادہ تر پرائمری اسکولوں میں ٹاٹ پر بیٹھنے والے طالب علموں کے اساتذہ کی کارکردگی اتنی شاندار ہوتی تھی کہ جھنگ کے علاقے سے نوبل لاریٹ (Noble Laureate) ڈاکٹر عبدالسلام اُبھر کر دنیا پر چھا گئے اور دیگر طلبا غیر ممالک کی معیاری

یونیورسٹیوں میں نام پیدا کرتے رہے۔

آج کا ... ادارہ واپڈا (Wapda) جب ۱۹۵۵ء کے آس پاس قائم ہوا تو اس کی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر عالمی بینک (World Bank) اسے حکومت پاکستان کی گارنٹی کے بغیر بھی قرضہ دینے پر آمادہ تھا۔

ان کے علاوہ پہلے چند برسوں میں ہی متعدد مالیاتی ادارے قائم ہوئے جن کے بوئے ہوئے بیج اور بعد کی آبیاری سے یہ صدر ایوب کے زمانے سے پہلے ہی فعال ادارے بن چکے تھے۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں قائم ہونے والا ادارہ PIFC[۴۳] بعدازاں ۱۹۶۱ء میں روپ بدل کر IDBP[۴۴] بن گیا۔ PIDC[۴۵] قائم کرنے کا قانون تو ۱۹۵۰ء میں منظور ہو گیا تھا۔ مگر ادارہ ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا۔ اسی طرح حکومت نے HBFC[۴۶] بھی ۱۹۵۲ء میں قائم کر لی اور PICIC[۴۷] کی بنیاد ۱۹۵۷ء میں پڑی۔ مزید برآں ۱۹۵۲ء میں قائم ہونے والے دو ادارے[۴۸] ۱۹۶۱ء آپس میں مدغم ہو کر Agriculture Development Bank بن گئے۔ جو بعدازاں ۲۰۰۲ء زرعی ترقیاتی بینک کے نام سے مشہور ہوا۔ اگر یہ تمام ادارے پہلے مارشل سے بہت پہلے قائم ہو کر اپنی ساکھ نہ بنا چکے ہوتے تو صدر ایوب کے زمانے کی صنعتی ترقی کی کوئی صورت نہ بن سکتی۔

اب اُس سنہری دور کی آخری بات ... کہ اس میں پاکستانی شہری کی عام زندگی کیسی تھی۔ جس نے ۱۹۴۷ء میں بربریت کی انتہا، ملک، شہر، قریہ بلکہ گھر اور کنبے کی بھی شکست و ریخت، بے مثال نقل مکانی اور جلاوطنی، خون کے فوارے اور آگ کے جہنم دیکھے تھے ... کیا یہ بوجھل تھی؟ قابلِ برداشت تھی؟؟ لطف و انبساط سے خالی تھی؟؟

اس سوال کا جواب نہ تو کوئی کتاب دے سکتی ہے نہ قیاس۔ فقط وہ چشمِ حیراں دے سکتی ہے جس نے خود وہ زندگی دیکھی تھی۔ طوفان میں ڈبکیاں کھا کر یا ساحل پر دل پکڑ کر۔ اور اس کا حیران کن جواب یہ ہے کہ حصولِ منزل نے ایک ایسے ساوی احساسِ تحفظ کو جنم دے دیا تھا کہ ناقابلِ برداشت مجبوریوں سے کامیاب پنجہ آزمائی شروع ہو گئی۔ پہاڑوں جیسے ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی بوجھ جلد ہی ہلکے ہونے لگے۔ لطف و انبساط کی لہریں نہ سہی مگر کہیں نہ کہیں سے اُمیدوں کی کرنیں پھوٹنے لگیں اور زندگی کے روندے ہوئے لوگ جلد ہی زندگی کے ہم قدم ہونے لگے۔ اس میں جہاں ہندوؤں کے جانے کے بعد مواقع کی فراوانی کا حصہ تھا وہاں مقامی نظم و نسق اور بیوروکریسی کی اہلیت اور مثبت رویّوں کا بھی نمایاں حصہ تھا۔ جو ہر غرض مند کو ایسے سہارا دیتی تھی جیسے کسی تیراک کو نیچے سے پانی کی لہر اُچھال دیتی ہے۔ مغربی پنجاب اور دیگر علاقوں سے آنے والے مہاجرین کے لیے شروع میں

بلاشبہ زندگی مشکل تھی مگر سبھی لوگ ہمدرد تھے۔ ماحول سازگار تھا اور صبر و استقامت میں خدا مددگار تھا۔ اس لیے بتدریج مشکلیں ایسے آسان ہونے لگیں جیسے پتھریلے موڑوں اور چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی سر پٹختی پہاڑی ندی دھیرے دھیرے ہموار میدان میں اُتر کر سکون سے بہنے لگتی ہے۔

اُن دنوں سیاسی ذائقہ اس حد تک تو کڑوا ہو رہا تھا کہ ترقی پسند تحریک پر پابندیاں لگ گئیں۔ میکارتھی ازم نے بائیں بازو کو مروڑنا شروع کر دیا اور اسمبلیوں میں وڈیرے سیاستدانوں کی محاذ آرائی نظر آنے لگی۔ مگر اس کڑوے پن کے علاوہ باقی معاشرہ اپنی تشکیل خود کر رہا تھا اور اپنی مرضی سے کر رہا تھا۔ پاکستانی شہری کی انفرادی سوچ یا ذہنی اور عملی پیش قدمی (initiative) میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ذاتی زندگی میں فکر و عمل کی یہ آزادی اُس دور کا مخصوص لطف و انبساط تھا۔ ایک محلول کی طرح سارے معاشرے میں گھلا ہوا اور اسے شیریں بناتا ہوا۔ جس طرح برعظیم کی تقسیم کی اکھاڑ پچھاڑ کے بعد لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق نئی زندگیاں تراشنے میں آزاد تھے اسی طرح پاکستانی شہری اپنی نئی سوچوں کی تراش یا پرانی سوچوں کی تکرار میں آزاد تھے۔ دوسروں کی طرف سے کوئی دخل اندازی نہ تو آنکھ سے ہوتی تھی نہ زبان سے اور نہ ہاتھ سے۔ چنانچہ معاشرہ اس طرح آزادی سے بدلنے لگا جس طرح فضا میں اُڑنے والا پرندہ اپنا رُخ اپنی مرضی سے بدلتا رہتا ہے۔

یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس زمانے میں تقریباً سبھی خواتین برقع پہنتی تھیں معمر خواتین سفید سادہ برقع اور دیگر خواتین کالا دُہرا برقع۔ مگر جلد ہی یہ منظر یوں بدلنے لگا کہ کہ سڑک پر تین اکٹھی راہ گیر خواتین میں سے ایک کا سفید سادہ برقع ہوتا تھا دوسری کا کالا اور تیسری نوجوان لڑکی بغیر برقع کے ہوتی تھی۔ پھر منظر یوں بدلا کہ وہ نوجوان لڑکی سائیکل پر کالج یا یونیورسٹی جانے لگی۔ جہاں کا اپنا منظر نامہ مخلوط تعلیم (co-education) کی وجہ سے تیزی سے بدل رہا تھا۔ پہلے تو کلاس میں لڑکیاں ایک اسکرین کے پیچھے بیٹھتی تھیں۔ پھر وہ بھی ختم ہونے لگے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور میں ہماری ایم اے (انگریزی) کی کلاس میں چھے لڑکیاں (جن میں مستقبل کی مصنفہ جمیلہ ہاشمی بھی شامل تھی) اور دس لڑکے لمبی میز کے آر پار بغیر اسکرین کے بیٹھتے تھے، مگر پشاور یونیورسٹی سے ایک ایم اے (انگریزی) کا ہی طالب علم کسی سے ملنے آیا، تو اس نے بتایا کہ اُس کی کلاس میں چند لڑکیاں اور وہ اکیلا لڑکا ہے۔ اس لیے لڑکیاں تو کلاس روم میں کھلم کھلا بیٹھتی ہیں، مگر اسے ایک طرف اسکرین کے پیچھے بیٹھنا پڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے ایسے سب اسکرین غائب ہو گئے۔ مگر خوش آئند بات یہ تھی کہ یہ ملک گیر تبدیلی کسی کے حکم، ترغیب یا تجویز کے مطابق نہیں تھی۔[۴۹] بلکہ تمام خاندانوں کی اپنی اپنی اکیلی اور آزاد سوچ سے جنم لے رہی تھی۔ یہ الگ المیہ ہے کہ

۱۹۵۸ء میں سیاست نے ایسی کروٹ بدلی کہ دھیرے دھیرے سنہری زمانہ بھی غائب ہونے لگا اور انفرادی سوچیں دُھندلی پڑنے لگیں۔ کیونکہ اقتدار کا پروپیگنڈا اب انھیں گدلا کرنے لگا تھا۔

اُس زمانے میں مولوی بھی تھے۔ ملائیت بھی تھی۔ مسجدیں بھی تھیں، داتا دربار بھی تھا۔ دیگر آستانوں پر قوالیاں بھی تھیں۔ اسلام بھی تھا۔ پھر بھی معاشرتی تبدیلی کی تیز ہوا میں برقع ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اُڑ گیا۔ ان سب کے متوازی ہر شہر کے چند چوراہوں پر شراب کی دکانیں بھی تھیں۔ فوج کے ہر میس (mess) میں چند لوگ اس کے رسیا ہوتے تھے۔ بڑے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں سب کے لیے دستیاب تھی۔ کلبوں میں نئے سال کے ڈانس ہوتے تھے۔ ان دو متوازی زندگیوں میں کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ کسی کو کسی سے خطرہ تھا۔ نہ خود اسلام خطرے میں تھا اور نہ ہی اسلام کی طرف سے کسی اور کو خطرہ تھا۔ اس لیے مسجدوں سے اذانیں اور گرجوں سے گھنٹے کی آوازیں صاف طور پر سنی جا سکتی تھیں۔ پینے والے پیتے تھے (جن کی تعداد بہت ہی کم تھی) اور عبادت کرنے والے عبادت کرتے تھے (جن کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی) اور ایسے بھی تھے جو نہ پیتے تھے نہ عبادت کرتے تھے۔ کیونکہ شراب پینا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ مگر حرام نہ تھا اور عبادت کرنا بہت اچھا سمجھا جاتا تھا مگر لازمی نہ تھا۔ کوئی اپنے آپ کو فرشتہ اور دوسرے کو شیطان نہیں سمجھتا تھا بلکہ سبھی ایک دوسرے کو انسان سمجھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ آج کے پاکستانی شہری کی نسبت بہت بہتر انسان تھے۔ اس لیے کہ وہ خود بھی جیتے تھے، اور دوسروں کو بھی جینے دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کسی دوسرے شخص کی بجائے ہم صرف قانون اور خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اچھائی اور برائی ہم وجود ہرگز نہ تھیں، مگر ہم عصر ضرور تھیں، انسانی فطرت کی پڑیا میں لپٹی ہوئی رنگا رنگ زندگی کی طرح۔

فطرت سے اس ہم آہنگی کی وجہ سے جمالیات کی اپنی اٹھان تھی۔ لاہور میں میو اسکول آف آرٹس تھا۔ شاکر علی تھے۔ آنہ مولکہ احمد تھیں۔ پرانے وطن کی یادوں کو دل سے لگائے نئے وطن کی گلیوں میں راتوں کو مشقِ سخن کرنے والے ناصر کاظمی اور انتظار حسین تھے۔ وطنیت اور آئیڈیالوجی کے گنجلک کھولنے والے فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ دلوں میں جھانکنے والے اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری تھے۔ ادب کے تاج محل بنانے والے محمد طفیل تھے۔ موسیقی میں نور جہاں اور فریدہ خانم تھیں۔

نوجوانوں کی زندگی بھی پُرشور آبشار کی طرح تھی۔ اپنی علیحدہ شفق کے ساتھ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زندگی ہمک رہی تھی۔ وہاں سے کُل پاکستان مباحثے، مشاعرے اور کھیلوں کے مقابلے اب ہر جگہ پھیلنے لگے تھے، جن کی بدولت حفیظ کاردار، فضل محمود اور خان محمد وغیرہ کا پورا دبِ اکبر

آسمان پر روشن تھا۔

ایسی ہمہ گیر زندگی کے پھیلاؤ نے قوم کو جو وسعتِ نظری دی تھی اُس کی تشریح کے لیے اُس زمانے کی تبلیغ اور آج کی تبلیغ کا موازنہ ضروری ہے۔ جس سے عوام کی قوتِ برداشت کا بھی موازنہ ہو جاتا ہے۔ پچاس کی دہائی میں مسعود کھدر پوش[50] نے تبلیغ شروع کی کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے عربی کی بجائے مادری زبان کا استعمال ضروری ہے۔ اپنے کافی ہم نوا پیدا کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں لاہور کے لارنس گارڈن میں پنجابی زبان میں نماز ادا کیے جانے کا اعلان ہونے لگا۔ مقررہ وقت پر کافی لوگ وہاں پہنچے اور جماعت کی صف بندی ہو گئی۔ مسعود خود امامت کرنے لگے لیکن جب ہاتھ اُٹھاتے ہوئے انھوں نے تکبیر کہی ''اللہ سب توں وڈا اے'' تو چند مولوی لپکے کہ امام کو ہٹا کر خود عربی میں نماز پڑھائیں۔ وہ تو نہ ہو سکا اور نماز درہم برہم ہو گئی۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ صرف اتنا ہی ہوا۔ اس کے علاوہ اور کوئی مار دھاڑ نہ ہوئی، تلوار نہ نکلی، گولی نہ چلی۔ کسی کو کافر کہہ کر واجب القتل قرار نہیں دیا گیا۔ بعدازاں مسعود کھدر پوش اسی شہر کی گلیوں سڑکوں پر گھومتے رہے اور ۱۹۶۶ء میں لائل پور کے چناب کلب کی ایک محفل میں انھوں نے ہنستے ہوئے خود یہ واقعہ ہمیں سنایا۔

میری بھولی بسری یادوں کے یہ چند قطرے ہی آج میرے قلم سے ٹپک سکے ہیں۔ بہت کچھ اُس وقت بھی میری نظر سے اوجھل رہا اور بہت کچھ بھول چکا ہوں۔ مگر میں یہ نہیں بھول سکتا کہ پاکستان کے سنہری زمانے میں زندگی اپنے ہر رنگ کے بھرپور چھینٹے اس سرزمین پر اس فیاضی سے مار رہی تھی کہ اُس وقت کا پاکستانی شہری ذہنی اور جذباتی طور پر انسانیت کی سرشاری سے مخمور تھا۔ فطرت کے قریب تھا اور خدا کی عطا کردہ پوری زندگی کے پھیلاؤ سے آشنا ہو رہا تھا۔

ہمارے نوآموز سیاست دان بھی ایک دوسرے کے گریبان چاک کرنے کے بعد امورِ مملکت سے آشنا ہو رہے تھے اور مشرقی پاکستان کی اکثریت کے ایثار کے بعد برابری کے فارمولے پر اتفاق کر کے ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ کر چکے تھے۔ اب اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک پاکستان تھوڑے ہی عرصے میں نام پیدا کر کے مزید اونچی اُڑان کے لیے نئے آئین کے تحت الیکشن کی تیاری کرنے لگا۔

پھر سب کچھ بدلنے لگ گیا۔

کیوں؟؟؟

اس کے لیے ہمیں ایک دفعہ پھر ۱۹۴۷ء سے آغاز کرنا ہوگا۔

حواشی

۱۔ ص: ۱۸ تا ۱۹۔

۲۔ کراچی بار ایسوسی ایشن میں عید میلادالنبی ﷺ کے موقع پر قائداعظم کا خطاب، ص: ۱۲۵۔ قائداعظم کی تقاریر

۳۔ *Quaid e Azam M A Jinnah Speeches As Governor General of Pakistan: 1947-1948*

۴۔ صفحات ۲۶۴، ۲۳۵، ۲۳۱، ۲۲۹، ۲۲۷، ۱۹۸، ۱۴۳، ۴۷ گورنر جنرل کی تقاریر ۱۹۴۷ء۔۱۹۴۸ء۔

۵۔ جلیل قریشی، تاریخ کا سفر: پاکستان کہانی، (راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، ۲۰۱۳ء) ص: ۵۳۔

۶۔ چوہدری محمد علی، سابق وزیراعظم پاکستان کی تصنیف *Emergence of Pakistan*، ص: ۱۷۷۔

۷۔ خورشید کمال عزیز کی کتاب *The Murder of History* کا ص: ۲۱۱، حاشیہ نمبر ۱۵۔

۸۔ جلیل صدیقی، تاریخ کا سفر، ص: ۵۳۔

۹۔ خورشید کمال عزیز نے اپنی کتاب (*The Murder of History*) میں قائداعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خان کے انتہائی کشیدہ تعلقات پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ (اس پر اگر مزید ریسرچ ہو سکے تو ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے) صفحات ۶ سے ۸ پر وہ لکھتے ہیں کہ انگریزوں اور کانگریس سے بڑی عجلت والی گفت و شنید کے نازک مراحل میں (۱۹۴۵ء کے بعد) قائداعظم یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ مسلم لیگ میں اندرونی نفاق ہے۔ اس لیے وہ خاموشی سے لیاقت علی خان کو برداشت کرتے رہے۔ اسی لیے جولائی ۱۹۴۷ء میں قائداعظم نے بھوپال کے نواب محمد حمید اللہ خان کو پاکستان میں آ کر وزارتِ عظمیٰ سنبھالنے کی پیشکش کی، مگر ان کی ذاتی مجبوریاں حائل ہو گئیں۔ تب حالات کی عجلت میں مجبوراً نواب زادہ لیاقت علی خان کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ قائداعظم سے ان کے کشیدہ تعلقات پر مزید روشنی محترمہ فاطمہ جناح نے ڈالی، جن کی کتاب *My Brother* کا ٹائپ شدہ مسودہ مرکزی حکومت کے پاس قائداعظم کے کاغذات (Quaid-e-Azam Papers) میں محفوظ ہے۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔

۱۰۔ حسن ظہیر *The Separation of East Pakistan* (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء) ص: xix۔

۱۱۔ میرے بچپن اور دوسری جنگ عظیم کے شروع سے میرے والد ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے بعد میں ڈپٹی ڈویژنل انسپکٹر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ باقی عزیزوں میں پرنسپل، پروفیسر، ہیڈ ماسٹر اور اسکول ٹیچر شامل تھے۔

۱۲۔ ص: ۴، ۵، ۲۶، ۲۷۔

۱۳۔ ص: ۵۱۔

۱۴۔ چوہدری محمد علی سابق وزیراعظم پاکستان کی تصنیف *Emergence of Pakistan*، ص: ۳۶۷۔

۱۵۔ ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (SP)، ایگزیکٹو انجینئر (XEN) ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز۔ ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر اور دیگر محکموں کے ضلعی افسران۔ کیونکہ ''ضلع'' انگریز کے انتظامی ڈھانچے کی بنیادی اکائی (basic unit) کہلاتا تھا۔

۱۶۔ عائشہ مسعود، کشمیر ۲۰۱۴ء، (لاہور: الفیصل، اُردو بازار) ص: ۲۱۔

۱۷۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، (النور، تیسرا ایڈیشن، جنوری ۱۹۷۴ء) ص: ۲۳۴۔

۱۸۔ خورشید کمال عزیز اپنی کتاب *The Murder of History* کے ص ۶ پر لیاقت ڈیسائی پیکٹ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

۱۹۴۵ء میں نواب زادہ لیاقت علی خان نے کانگریس کو آمادہ کر لیا کہ عمر رسیدہ اور قریب المرگ قائداعظم سے گفت و شنید کی بجائے وہ لیاقت علی خان سے رابطہ رکھیں۔ چنانچہ اس رابطے کے نتیجے میں کانگریس کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خان کے مابین قائداعظم سے بالا بالا یہ معاہدہ کیا گیا۔ جس میں آئندہ کی آئینی جدوجہد میں مسلم لیگ کو ایک قابلِ اعتراض عمل کا پابند کیا گیا تھا۔ اخبارات میں خبر چھپنے پر جب قائداعظم کو اس معاہدے کا پتا چلا تو وہ سخت ناراض ہوئے۔ معاہدے کو کالعدم قرار دیا۔ لیاقت علی خان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے اسٹاف کو حکم دیا کہ اگر وہ ملنے آئیں تو انھیں گھر میں داخل نہ ہونے دیں۔ اس خبر کے راوی سید شریف الدین پیرزادہ تھے۔ جو ان دنوں بمبئی میں قائداعظم کے آنریری پرائیویٹ سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

۱۹۔ اصل حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں قائداعظم متحدہ ہندوستان کی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن چلے گئے تھے۔ Stanley Wolpert کے مطابق (ص: ۱۲۵) محمد علی جناح لندن میں مستقل قیام کا ارادہ کر چکے تھے اور اپنی بہن اور بیٹی کو ساتھ رکھنے کے لیے لندن میں رہائشی مکان تلاش کر رہے تھے۔ ساتھ ہی قانون کی پریکٹس کرنے اور برٹش پارلیمنٹ کا الیکشن لڑنے کے لیے کئی اقدامات کر رہے تھے۔ اسی لیے وہ Fabian Society کے ممبر بھی بن رہے تھے، تاکہ لیبر پارٹی سے رابطہ رہے۔ تب تک وہ پریوی کونسل کے مقدمات میں اچھا نام پیدا کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں ۱۹۳۳ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی صدارت کی دعوت بھی رد کر چکے تھے۔ ایسے میں لیاقت علی خان اور ان کی نئی نویلی دلہن رعنا لیاقت علی خان اپنے ہنی مون (honeymoon) کے لیے لندن پہنچے اور ایک پارٹی میں ملاقات کے بعد محمد علی جناح نے ان دونوں کو Hampstead میں کھانے پر بلایا، جہاں ان دونوں نے بیگم شاہنواز اور دوسرے لوگوں کی تائید کی، جو محمد علی جناح کو ہندوستان واپسی کی ترغیب دے رہے تھے۔ پھر جب مسٹر جناح ۱۹۳۴ء میں بمبئی آئے تو بھی انھوں نے Hampstead میں اپنا ٹھکانا اور دفتر جاری رکھا۔ دریں اثنا ۱۹۳۲ء میں ایک طالب علم چوہدری رحمت علی نے اپنے تین ساتھی طلباء کے ساتھ مل کر *Now or Never* کے عنوان سے ایک پمفلٹ جاری کیا جو علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کی بنیاد پر پاکستان کا خیال پیش کرتا تھا۔ مگر ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس سے ظاہر ہو کہ قائداعظم کو اس تجویز کا علم تھا۔ گو ایسی شہادت مل جاتی ہے کہ چوہدری رحمت علی نے محمد علی جناح سے ملنے کی کئی دفعہ کوشش کی۔ مگر مسٹر جناح انکار کرتے رہے۔ (صفحات ۱۲۵ تا ۱۳۳)۔

۲۰۔ قائداعظم کی ہدایت پر ایم اے زبیری صاحب دسمبر ۱۹۴۵ء سے دسمبر ۱۹۶۴ء تک ڈان اخبار سے وابستہ رہے۔ پھر ۱۹۶۵ء میں انھوں نے نیا اخبار (*Business Recorder*) جاری کیا۔ ان کی چند یادیں اب اسی اخبار کی ۲۷/اپریل ۲۰۱۵ء کی اشاعت میں شامل ہوئیں۔

۲۱۔ ان دنوں فوٹو کاپی کا تصور ہی نہیں تھا اور ہر نقل ہاتھ سے یا ٹائپ رائٹر پر تیار کی جاتی تھی۔

۲۲۔ ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والی کتاب کا پہلا فقرہ، جناح آف پاکستان، (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس) تمہید، ص: vii۔

۲۳۔ ایس اکبر زیدی، *Issues in Pakistan's Economy*۔

۲۴۔ انگریزی سے ترجمہ۔

۲۵۔ اُس وقت پٹ سن کے سارے کارخانے ہندوستان میں تھے۔

۲۶۔ پاکستان میں کپڑے کے پہلے کارخانے (ولیکا ٹیکسٹائل مل Valika Textile Mill) کا افتتاح ۲۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو خود قائداعظم نے کیا۔ اس کا متن تقاریر کے مجموعے کے صفحہ ۷۱ پر درج ہے۔

۲۷۔ یہ تعداد مغربی پاکستان کی آبادی کا پانچواں حصہ تھی۔

۲۸۔ پرویز حسن، *Pakistan's Economy at Crossroads* (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء)۔

۲۹۔ ۲۰۱۵ء میں فوجی عدالتوں کے قیام پر ووٹ ڈالنے کے بعد قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے رضا ربانی اور دیگر ممبران کی بے بسی اور پچھتاوے کے جو مناظر دیکھے گئے وہ اُن دنوں بعید از تصور تھے۔

۳۰۔ مثلاً آج کی دہشت گردی، کرپشن، ہر دم بڑھتی ہوئی غربت اور آبادی۔ پہاڑوں جیسے معاشی اسکینڈل، امن وامان کی ہر دم اُڑنے والی دھجیاں، تعلیمی اداروں کی کھلی لوٹ، سرکاری ہسپتالوں کی دانستہ بیخ کنی وغیرہ۔

۳۱۔ South East Asia Treaty Organisation اور Central Treaty Organisation جن کے ذریعے پاکستان امریکہ کے حلقۂ اثر میں داخل ہو گیا۔

۳۲۔ آبادی کی اکثریت کے باوجود بنگال نے برابری (parity) کا فارمولا قبول کیا۔

۳۳۔ ص: ۱۱۴۔

۳۴۔ ص: ۵۱۔

۳۵۔ ان دنوں پرائیویٹ ڈاکٹر کے کلینک میں فیس ۴ یا ۵ روپے ہوتی تھی اور گھر پر آ کر دیکھنے کی فیس قریباً ۷ یا ۸ روپے تھی۔ بہت پائے کے ڈاکٹر کی کلینک کی فیس ۱۶ روپے تھی اور صرف خال خال ڈاکٹر ایسے تھے جو "۳۲ روپے والے ڈاکٹر" کے طور پر جانے جاتے تھے لیکن دراصل وہ انگلستان سے اعلیٰ ڈگری یافتہ ڈاکٹر ہوتے تھے۔

۳۶۔ اُن دنوں کلاس اوّل گزیٹڈ آفیسر کی تنخواہ ۳۵۰ روپے اور کلاس دوم گزیٹڈ آفیسر کی تنخواہ ۲۵۰ روپے ہوتی تھی اور دونوں کو مزید ۴۸ روپے مہنگائی الاؤنس وغیرہ ملا کرتے تھے۔ ان تنخواہوں میں وہ باعزت زندگی بسر کرتے تھے اور بچوں کی تعلیم اور شادیاں مکمل کر سکتے تھے۔

۳۷۔ سورۃ البقرہ، آیت ۵۴؛ سورۂ طٰہٰ، آیت ۸۸۔

۳۸۔ روزنامہ *The News* مورخہ ۲۸ جون ۲۰۱۵ء، ص: ۶، ڈاکٹر فرخ سلیم کا تجزیہ بہ عنوان "Power"۔

۳۹۔ ص: ۱۶۔

۴۰۔ ص: ۲۱۔

۴۱۔ ان رولز کی روح یہ تھی کہ ہر سرکاری ملازم ریاستی کارخانے کا ایسا پرزہ ہے جو اپنی انفرادی کارکردگی سے پورے ریاستی نظام کو چلاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے غیر اہم پرزے بھی اپنی حقیر چال سے بڑے بڑے اہم پرزوں کو چلانے میں مدد دیتے ہیں اور یہ سب مل کر ریاستی کارخانے کو ہمہ وقت ہموار انداز میں چلاتے ہیں۔ کسی بھی حقیر یا اہم پرزے کی لڑکھڑاہٹ سے شہریوں کا حکومت سے اعتماد اُٹھنے لگتا ہے۔ اس کا ایک ہی حل یہ ہے کہ سرکاری ملازموں کا دفتر میں اور گھر میں طرزِ عمل ایسا ہو کہ لوگ اس کی غیر جانبداری اور منصفانہ روش کی وجہ سے دادرسی کے لیے اس کے پاس آنے میں عافیت محسوس کریں۔

ان رولز کا جسم یہ تھا کہ سرکاری رقم بہت سخت قواعد کے مطابق خرچ کی جائے۔ سرکاری ملازم غبن یا رشوت کو حرام سمجھے۔ اپنی عملداری میں غیر جانبدار رہنے کے لیے کسی شخص سے کھانے یا دیگر مراعات کی دعوت قبول نہ کرے۔ اپنے ماتحتوں کے طرزِ عمل پر کڑی نگرانی کے لیے باقاعدگی سے قواعد کے مطابق دورے کرتا رہے، جن کے لیے اسے مناسب سفر خرچ دیا جاتا تھا اور اگر وہ فرضی دورے دکھا کر غلط سفر خرچ حاصل کرے تو جرم ثابت ہونے پر اس کی نوعیت کے مطابق ملازمت سے برطرفی تک کی سزا ہو سکتی تھی۔ ۲۴ برس کے بعد کی عمر میں کسی کو سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی تھی اور ریٹائر ہونے کے بعد کسی کی ملازمت میں توسیع نہیں ہو سکتی تھی... وغیرہ وغیرہ... سالانہ رپورٹوں میں ہر افسر اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کے متعلق بالکل معروضی انداز میں رپورٹ دیتا تھا جس کی بنیاد پر آئندہ ترقی یا تنزلی ہوتی تھی۔

پاکستان کے سنہرے دور میں بیوروکریسی بڑی سختی سے ان رولز پر کاربند رہی، اسی لیے پاکستان ترقی کرتا رہا۔ حالانکہ یہی دور نو آموز وڈیرے سیاستدانوں کی تربیتی سرپٹول کا بھی تھا۔

۴۲۔ اُس زمانے کے سرکاری ملازم کی رہائش کا اندازہ اس خط سے لگایئے جو ایک سینئر سی ایس پی افسر نے اپنی بیگم کو مئی ۱۹۵۸ء میں لکھا "...میں جب سے یہاں آیا ہوں برابر مکان کی تلاش میں ہوں۔ گلبرگ (لاہور) میں کوئی بھی مکان جو ذرا معقول ہو، پانچ سو روپے ماہانہ سے کم کرائے میں نہیں ملتا۔ گلبرگ کے لیے سرکاری طور پر منظور شدہ الاؤنس ۳۰۰ روپے ماہانہ بالکل ناکافی ہے۔ آج ایک مکان دیکھا ہے... مالک مکان غالباً ۵۰۰ روپے ماہانہ مانگے گا.... ایسی صورت میں اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ حدِ استحقاق سے زیادہ کرایہ اپنے پاس سے دے دیں۔ تب بھی ۲۰۰ روپے اپنے پاس سے دینے پڑیں گے۔ ۱۳۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ میں سے ۵۰ روپے ماہانہ انکم ٹیکس کے کٹتے ہیں۔ ۱۰۰ روپے ماہانہ جی پی فنڈ کے کٹتے ہیں۔ ۳۰۰ روپے والدین کو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر ۲۰۰ روپے مکان کا کرایہ دینا پڑا تو گھر کے لیے صرف ۶۵۰ روپے ماہانہ بچیں گے۔ جس میں بجلی، پانی، موٹر کار، ملازمین کھانا پینا دینا دلانا سب کرنا ہو گا... ہمیں کافی تنگی ترشی سے گزارہ کرنا ہو گا۔ پھر بینک کے قرضے کی ادائیگی اور بیمے کے پریمیم کی ادائیگی کے لیے بھی رقوم پس انداز کرنا ہوں گی۔" (عرفان امتیازی کی کتاب کچھ نہ دوانے کام کیا، ص: ۷۶، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ء)۔ میں اس میں یہ اضافہ کر دوں کہ یہ صرف امتیازی صاحب کی کہانی نہیں ہے بلکہ ہم سب کی کہانی ہے۔ میری، میرے دوستوں کی اور رفقائے کار کی بھی۔

۴۳۔ Pakistan Industrial Finance Corporation۔

۴۴۔ Industrial Development Bank of Pakistan۔

۴۵۔ Pakistan Industrial Development Corporation۔

۴۶۔ House Building Finance Corporation۔

۴۷۔ Pakistan Industrial Credit and Investment Corporation۔

۴۸۔ Agriculture Bank of Pakistan اور Agriculture Development Finance Corporation۔

۴۹۔ جس طرح آج کل حجاب کے لیے ہر طرح کی ترغیب دی جاتی ہے۔

۵۰۔ لاہور کے محمد مسعود خان (۱۹۱۶ء ۔ ۱۹۸۵ء) نے ۱۹۳۷ء میں لا کالج، لاہور میں ایل ایل بی (LLB) کے امتحان میں گزشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیے اور ۱۹۴۱ء میں انڈین سول سروس (ICS) میں شامل ہو کر تربیتی تعلیم اور ٹریننگ کے لیے اوکسفرڈ یونیورسٹی (انگلستان) چلے گئے۔ واپسی پر بمبئی پریذیڈنسی میں احمد نگر کے علاقے میں تعینات ہوئے۔ تو وہ کوٹ پتلون اور ہیٹ پہننے والے، پائپ پینے والے اور ڈنر جیکٹ پہن کر کھانا کھانے والے صاحب بہادر تھے۔ کچھ عرصہ بعد انھیں انتہائی پس ماندہ بھیل (Bheel) قبیلے کی بہبود کا کام دیا گیا۔ دو برس کے دوران انھوں نے نہ صرف اس قبیلے والوں کو سود خور ہندو بنیوں کے چنگل سے آزاد کرا دیا اور ان کی زبان اور کلچر کو زندہ کیا، بلکہ اپنے پروگرام کی کامیابی کے لیے خود بھی ان کے رنگ میں رنگے گئے۔ انگریزی لباس ترک کر کے ان کا لباس پہنا۔ ان کی زبان بولی اور ''مسعود بھگوان'' کہلائے۔

سندھ کا علاقہ بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کیے جانے کے بعد انھیں ۱۹۴۶ء میں ضلع نواب شاہ کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں قائداعظم نے اس علاقے میں ہاری مزارعوں کی حالت زار کا جائزہ لینے کے لیے ایک انکوائری کمیٹی مقرر کی، تو آخری رپورٹ میں محمد مسعود خان نے ہاریوں کی حمایت میں ایسا تاریخی اختلافی نوٹ لکھا کہ یہ ''مسعود ہاری'' کہلانے لگے۔ یہ رپورٹ ۱۹۴۹ء میں حکومت کو پیش کی گئی، تو قائداعظم فوت ہو چکے تھے، اس لیے اس رپورٹ کو منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اس کے بعد یہ ایسی خوئے بد بن گئی کہ تقریباً سبھی اہم رپورٹوں کو آج تک چھپایا جاتا رہا ہے۔

پس نظری

ماضی میں غالب نے کہا تھا ع

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

زمانہ ہمیشہ کہتا ہے کہ ایسی مضمر خرابی تعمیری دور میں نظر نہیں آتی۔ آج ان دونوں میناروں کی بلندی سے میرے ساتھ غالب اور زمانہ بھی نچلی منزلوں کی طرف جھانک رہے ہیں۔ جہاں سے پاکستان کی تعمیر میں مضمر خرابی آج ہمیں بالکل واضح طور پر نظر آ رہی ہے۔ جو قیام پاکستان کے وقت موجود تو تھی... لیکن نظر نہیں آتی تھی۔

ہم تینوں دیکھ رہے ہیں... پہچان رہے ہیں... مگر اس خرابی کو بیان کرنے کے لیے مجھے تو کوئی مناسب لفظ نہیں مل رہا اور غالب کی طرف سے بھی کوئی مدد نہیں مل رہی۔ کیونکہ انھوں نے پاکستان کا قیام نہیں دیکھا تھا۔ جب یہ خرابی گھات لگانے والی بلّی کی طرح سمٹتی، سرکتی، کھسکتی ہوئی مناسب وقت پر جست لگانے کو تیار ہو رہی تھی۔ اگر وہ دیکھ لیتے تو کوئی نئی اصطلاح یا نادر تشبیہ اُبل پڑتی... اسی طرح زمانہ بھی کوئی لفظ نہیں بتا رہا۔ کیونکہ یہ صرف دیکھتا ہے بولتا نہیں ہے۔ مگر ایسے خاموش رہتا ہے کہ ع

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری (اقبال)

یہی خاموش بے زبانی ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی ''میں'' اور ''انا'' کے کئی روپ ہیں۔ خودنگری، خود آگاہی، خود اعتمادی، خودداری، خودی، خود ستائی، خود پسندی، خودنمائی، خود پرستی، خود غرضی، خود فریبی، خود بدولتی اور خود پروری۔ یہ روپ مزید پھیلیں تو ناصحانہ، غاصبانہ اور آمرانہ پن... شدت بڑھے تو لالچ، ہوس، ظلم، جبر و تشدد اور قتل و غارت تک پہنچ جائیں۔

لالچ اور ہوس کے لیے تو پوری کائنات بھی ایک نوالے سے کم تر ہے۔ اس لیے یہ چھوٹی سی ''میں'' جب پھیلنے پہ آتی ہے تو بحرِ بیکراں سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔

انا کے یہ تمام روپ زندگی ہمیں وقتاً فوقتاً دکھاتی رہتی ہے، مگر پاکستان کی تعمیر میں جو خرابی مضمر ہے وہ انا کا ایسا ملغوبہ تھا جو کبھی دیکھا نہ سنا۔ کیونکہ اس میں ''انا'' کے کئی روپ بیک وقت اور بہ رضا و رغبت سما گئے تھے۔ کچھ مقامی، کچھ درآمد شدہ، کچھ تاریخی اور کچھ وقتی، مگر سبھی دانستہ اور سوچے

سمجھے منصوبوں کے مطابق ایسے یک جان ہو گئے کہ چند لوگوں کی انا پوری قوم کو پاتال کی طرف دھکیلنے لگی۔

ویسے تو یہ پوشیدہ خرابی ایک ہی تھی، مگر اس کی ایک سے زیادہ شکلیں تھیں۔ دو ... تین ... چار ... یا زیادہ؟ ان سے میری نسل کے شہریوں کا واسطہ پڑتا رہا۔ اس لیے ضروری ہے کہ آج کے نوجوان قاری سے ان کا تعارف کروایا جائے کیونکہ ہماری تاریخ نے انھیں زیادہ تر بے خبر ہی رکھا ہے۔

پہلی شکل کے خدوخال ۱۸۵۷ء سے اُبھرنے لگے تھے۔ جب گنتی کے چند لوگوں نے ڈانواں ڈول مغلیہ سلطنت سے غداری کر کے انگریز غاصبوں کی مدد کی۔ ان کے ساتھ مل کر مہلک وار کرتے ہوئے مغلیہ سلطنت کو قبر میں اُتارا۔ برِعظیم میں انگریزی راج قائم کروایا اور انعام و اکرام میں جاگیریں اور دیگر مراعات حاصل کر کے اس چھتری کے نیچے قریباً ایک سو برس تک اپنے ہم وطنوں پر ایک ادھورا اور مستعار مگر ظالمانہ راج کرتے رہے۔ برٹش حکومت کے سرکاری ریکارڈ میں ان سب کی رُوداد موجود ہے۔[1] اس میں سے صرف ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں میرزا الٰہی بخش کی ہمارے ساتھ (انگریزوں سے) مکمل وفاداری بہت مفید اور بار آور تھی۔ (دہلی کے محاصرے کے دودن) وہ ہمہ وقت شہر کے اندر موجود رہا اور باغیوں کی نقل و حرکت کے متعلق ہمیں اہم اطلاعات بہم پہنچاتا رہا۔ اس نے خاص طور پر اُس وقت ہماری حکمتِ عملی کو کامیاب کروایا جب شہر کے بالمقابل دریائے جمنا کے اُوپر کشتیوں کا پل توڑنے میں اس نے ہماری فوج کی مدد کی۔ جس کے نتیجے میں باغیوں کو مشرق سے ملنے والی کمک اور رسد بند ہوگئی۔ بعدازاں اس کی وجہ سے شہنشاہِ دہلی نے بلا مقابلہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا اور کرنل ہڈسن شہزادگان خضر سلطان اور ابوبکر کو گرفتار کر سکا۔ جس کی وجہ سے بغاوت مکمل طور پر دم توڑ گئی۔ کیونکہ باغیوں سے نہ صرف شہنشاہ کی قیادت چھن گئی بلکہ موروثی قیادت کی گنجائش بھی ختم ہوگئی...

... بغاوت ختم ہونے کے بعد میرزا الٰہی بخش کے طرزِ عمل کی گہری تحقیق کی گئی اور اس کی مکمل وفاداری ثابت ہونے پر انگریزی حکومت کی طرف سے اسے نوازا گیا۔ اپنی اولاد سمیت اسے فوری طور پر مبلغ ۲۲۸۳۰ روپے کی سالانہ پنشن کا موروثی حق دار بنایا گیا۔ ... ۱۸۶۱ء میں میرزا کو انفرادی طور پر پانچ ہزار روپے سالانہ کی مستقل جاگیر عطا کی اور اس کے خاندان کو دہلی اور میرٹھ کے اضلاع میں کئی گاؤں دیہات کے لگان کا حقِ ملکیت عطا کیا جس سے انھیں ۲۲۲۶ روپے کی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دہلی میں محاصرے کے دوران میرزا الٰہی بخش کی جائیداد کے نقصان کے عوض مبلغ ۱۴۱۷۰۳ روپے بطور معاوضہ دیے گئے ... ۱۸۷۲ء میں اسے حکومتِ ہند کی طرف سے مبلغ ۳۵۰۰۰ روپے قرضہ دیا گیا، جس کا نصف حصہ بعد میں

میرزا کی خدمات کے عوض معاف کر دیا گیا... انھی خدمات کے عوض ۱۸۷۷ء میں اس کی سالانہ پنشن میں مبلغ ۲۲۵۰ روپے کا اضافہ کر دیا گیا...

میرزا الٰہی بخش ۱۸۷۷ء میں فوت ہو گیا اور اُس کے بڑے بیٹے سلیمان شاہ کو انگریزی حکومت کی طرف سے وارث تسلیم کرلیا گیا۔ وہ بھی ۱۸۹۰ء میں مرگیا اور اُس برس میرزا ثریا جاہ کو اپنے بڑے بھائی کی جگہ مغلوں کا اعلیٰ نمائندہ تسلیم کرلیا گیا۔ ... جس کی وجہ سے وہ دیوانی عدالتوں میں حاضری سے مستثنیٰ ہے۔ ساتھ ہی اُسے آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر بھی بنا دیا گیا۔ وہ دہلی جامع مسجد، فتح پوری مسجد اور اینگلو عربک ہائی اسکول کی مجالسِ انتظامیہ کا ممبر بھی ہے... وہ حاجی اور حافظ قرآن ہے...

مقامی مددگاروں کے بارے میں ایسا ہی ریکارڈ برٹش انڈیا کے ہر صوبے میں موجود ہے۔

جس کی بنیاد پر پاکستان مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی[2] اس نتیجے پر پہنچی کہ، ''مغربی پاکستان کے نمایاں اور بڑے زمیندار خاندانوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس کا شجرۂ نسب ۱۸۵۷ء سے پہلے کے زمانے تک جاتا ہو۔ وہ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی جاگیریں اور زمینداری کلّی طور پر انگریزی راج کی نوازشات کا عطیہ ہیں۔''

ایسے ہی خاندانوں کے ویسے ہی ورثا قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک تمام پاکستانی حکومتوں میں شامل رہے ہیں، اور اپنے ڈھب کی آمرانہ سیاسی پارٹیوں کے مطلق العنان لیڈر بنے رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ۱۹۴۵ء تک ان کی اکثریت کانگریس پارٹی میں شامل رہی لیکن جب کانگریس نے فیصلہ کیا کہ آزادی کے فوراً بعد وہ جاگیرداری نظام ختم کر دے گی تو انھوں نے مسلم لیگ کی طرف رجوع کیا۔ قائداعظم کی سیاسی فراست نے انھیں اس لیے خوش آمدید کہا کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کر کے پاکستان کی جنگ جیتنے کے لیے انھیں عددی اکثریت کی اشد ضرورت تھی۔ انھوں نے یہ جنگ جیت بھی لی لیکن اجل نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ ان سب کی صحیح خطوط پر سیاسی تربیت کر سکتے اور ان کے دل و دماغ جیت سکتے۔ اس لیے یہ وڈیرے وہی رہے، جو گزشتہ ایک صدی میں ان کی تین چار پشتیں رہی تھیں کہ غیروں کے مفاد میں اپنوں کا خون چوس چوس کر مچھروں کی طرح موٹے بھی ہوتے رہیں اور اپنی توصیف میں ہر وقت بھن بھن بھی کرتے رہیں۔ چنانچہ، پاکستان کے روزِ اوّل سے ہی جب مغربی پاکستان کی تمام صوبائی اسمبلیوں میں ان جاگیرداروں کا غلبہ تھا اور قومی اسمبلی میں مغربی پاکستان کی نشستوں پر بھی ان کا مضبوط گروپ قابض تھا۔ تو وطن کی تعمیر میں خرابی کی ایک یقینی صورت اپنا اصل روپ... یعنی عوام دشمن سرشت... چھپائے مضمر ہوگئی۔

وطن کی تعمیر میں مضمر خرابی کی دوسری شکل کو خود صدر ایوب نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا تھا[۳] کہ ہندوؤں کے جانے کے بعد پاکستانی فوج میں خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے ترقیوں کی تیز رفتاری نے:

فوجی افسروں کی توقعات کو غلط طور پر بڑھا دیا تھا۔ بڑے بڑے سمجھدار جنرل اور بریگیڈیئر اپنے آپ کو نپولین بونا پارٹ سمجھنے لگے تھے اور وہ بھی ایک تشنہ اور ناخوش بونا پارٹ کے طور پر ... میں تو ہمیشہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر ہمیں پاکستان کی آزادی نہ ملتی تو میں محض بریگیڈیئر بننے پر ہی اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتا... مگر آزادی کے بعد فوج کے اُونچے مناصب اتنے سستے ہو چکے تھے کہ فوجیوں میں انوکھی ترنگ اور اقتدار کی ہوس پیدا ہو رہی تھی۔

اسی طرح اُس زمانے میں امریکہ کے اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ George McGhee کا بھی کہنا تھا کہ، ''راولپنڈی سازش کیس کی جڑیں فوج کے سینئر افسران کی جاہ طلبی سے نکلی تھیں۔''

اس پوشیدہ خرابی کی صرف چند جھلکیاں درج ذیل ہیں:

(الف) راولپنڈی سازش کیس والے میجر جنرل اکبر خان کے متعلق ایئر مارشل اصغر خان لکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے موقع پر ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعزاز میں تقریب منعقد کی، تو فوج، ایئر فورس اور بحریہ کے افسران کو بھی مدعو کیا گیا۔ اکبر خان کی تجویز پر ہم دونوں چل کر قائداعظم کے پاس گئے تو اکبر خان نے فوج میں برٹش افسروں کی موجودگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ، ہمیں آزادی ملنے اور پاکستان کے قیام پر خوشی تو بہت ہوئی ہے مگر کسی نئے بندوبست کے متعلق ہماری توقعات پوری نہیں ہوئیں اور یوں لگتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام ابھی تک قائم ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اب اپنے لوگوں کی صلاحیتوں کے متعلق تبدیلی لائیں۔ اس پر قائداعظم نے اکبر خان کو گھور کر دیکھا اور اپنی اُنگلی اُٹھا کر ڈانٹتے ہوئے کہا، ''تم ایک فوجی افسر ہو اور تمھارا کوئی حق نہیں کہ حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کرو۔ بہتر ہوگا اگر تم اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر پوری توجہ دیتے رہو۔''[۴]

(ب) ۱۴ رجون ۱۹۴۸ء کو قائداعظم بطور گورنر جنرل اسٹاف کالج، کوئٹہ گئے، تو تقریب شروع ہونے سے پہلے فوجی افسران کے ساتھ گھل مل کر گفتگو کرتے رہے۔ اس گفتگو میں انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اس کا اندازہ تب ہوا جب وہ تقریب کے آخر میں تقریر کرنے اُٹھے۔ تو اپنے تحریری متن سے انحراف کرتے ہوئے کہنے لگے:

میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اس بات کی ضرورت اس لیے پڑی کہ میں نے ایک دو بڑے سینئر افسران سے گفتگو کے دوران محسوس کیا کہ وہ اس حلف کی روح کو نہیں سمجھتے جو فوج میں شامل ہوتے وقت اُٹھایا جاتا ہے ... اس لیے مناسب یہی ہے کہ میں آپ کی یاد دہانی کے لیے اس حلف کی عبارت پڑھ کر سناؤں۔

(پھر انھوں نے اس فقرے سمیت حلف کی مکمل عبارت سنائی):

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلف اُٹھاتا ہوں کہ پاکستان اور پاکستان کے آئین کا وفادار رہوں گا...) جیسے میں نے ابھی کہا تھا کہ اصل حقیقت الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کی روح ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پاکستان کے اس آئین کا مطالعہ کریں جو آج کل پاکستان میں نافذ ہے۔...مزید برآں یاد رکھیں کہ حاکمیت کا منبع حکومتِ پاکستان کا انتظامی سربراہ ہوتا ہے جو آج کل گورنر جنرل ہے اور آپ کو جو کمانڈ یا حکم بھی آئے گا وہ گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر نہیں آ سکتا...[۵]

اپنی زندگی کے آخری تیرہ ماہ میں وہ اپنی تقاریر میں پاکستان کے سرکاری ملازمین کو جو ہدایات دیتے رہے، اس پر لبیک کہتے ہوئے سویلین سرکاری ملازمین تو پاکستان کو سنہری زمانے میں لے گئے، مگر بعد کے حالات سے اندازہ ہوا کہ قائداعظم کی اسٹاف کالج میں تقریر بالکل بے اثر ہی رہی اور باوردی سننے والوں نے بعد ازاں اپنے ہاتھوں سے قائداعظم کے پاکستان اور سنہری زمانے کا خاتمہ کر ڈالا۔

(پ) ۱۹۴۹ء میں قائداعظم فوت ہو چکے تھے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ابھی ۲ ر برس بھی مکمل نہ ہوئے تھے اور حکومت بڑی پامردی سے ان مشکلات سے نبرد آزما ہو رہی تھی جو ہندوستان ہمارے لیے پیدا کر رہا تھا۔ مہاجرین کے جمِ غفیر کی آبادکاری سے پیدا ہونے والی مشکلات ان کے علاوہ تھیں۔ مگر خدا معلوم بریگیڈیئر اکبر خان (بعد کے میجر جنرل) کس طرح اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ سویلین حکومت ''نااہل اور بددیانت'' ہے۔ اس لیے اسے برطرف کر کے فوج کو اقتدار سنبھال لینا چاہیے۔ صدر ایوب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں[۶] کہ ۱۹۵۱ء میں جب راولپنڈی سازش کیس میں میجر جنرل اکبر خان کی گرفتاری کے وقت اس کے کاغذات قبضے میں لیے گئے تو ان میں اکبر خان کے یہ خیالات ۱۹۴۹ء کے حوالے سے درج تھے۔ حسن ظہیر نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ، جب اکبر خان ابھی بریگیڈیئر ہی تھے تو یہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے متحرک ہو چکے تھے۔[۷] مگر خدا نے ان کی کوششیں سال بھر کے لیے معطل کر دیں، جب انھیں لندن میں تربیتی کورس کے لیے وظیفہ مل گیا۔ واپسی پر ترقی پا کر وہ میجر جنرل ہو گئے اور جب جنوری ۱۹۵۱ء میں جنرل ایوب خان کمانڈر ان

چیف بنے تو اکبر خان ان کے چیف آف اسٹاف مقرر ہو گئے۔ ۲۳ رفروری کو جنرل اکبر
کے گھر میں ہونے والی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ تین اور چار مارچ کی درمیانی شب کو جب
وزیراعظم لیاقت علی خان راولپنڈی آئیں تو انھیں کابینہ سمیت گرفتار کر کے حکومت پر قبضہ کر
لیا جائے۔[8] لیکن راز افشا ہونے پر پہلے گرفتاریاں ہوئیں۔ پھر مقدمہ چلا اور کچھ لوگوں کو
سزائیں ہوگئیں۔

(ت) اسی برس وزیراعظم لیاقت علی خان راولپنڈی کے جلسۂ عام میں شہید ہو گئے۔ مگر آج تک
قاتلوں کا سراغ نہیں مل سکا۔ شاید حقیقت چھپانے ہی میں کوئی مصلحت تھی۔ مگر اس کی وجہ
سے دوسرے جاگیردار سیاستدان بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے فوج کے قریب ہو
گئے اور ۱۹۵۴ء میں کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان کو وزیرِ دفاع بھی بنا دیا گیا۔ ان
دونوں حیثیتوں سے وہ وردی سمیت مرکزی کابینہ کے ہر اجلاس میں شریک ہونے لگے۔[9]
جمہوری ممالک کی تاریخ میں یہ ایک غیر معمولی عمل تھا جس کی مثال ملنا محال تھی۔ اس صورتِ
حال کی وجہ سے زمینی حقائق میں یہ بنیادی تبدیلی آ گئی کہ اب تک جاگیردار سیاستدان
انگریز کی مائی باپ جیسی سرپرستی ختم ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو غیر محفوظ بلکہ یتیم سمجھتے تھے
لیکن اب ان کی چارپشتی غلامانہ سرشت کو فوجی قوت کی طاقتور سرپرستی مل گئی۔ اسی طرح
ناکام راولپنڈی سازش کے پوشیدہ کرداروں کو آئندہ کے لیے قدم جمانے کے لیے
جاگیرداروں کی سیاسی بے ساکھیاں مل گئیں اور مستقبل میں مضبوط اور توانا درخت بننے والے
''فوجی وڈیرہ محور'' کی بنیاد پڑ گئی... پاکستان کی تعمیر میں مضمر خرابی کی یہ دوسری شکل تھی۔

اس پوشیدہ خرابی کی تیسری شکل مُلّائیت یا خود ساختہ علمائے کرام کی تھی جو مذہب کے نام پر
ہر نئی تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں، تاکہ خدا کے نام پر ان کی اپنی خدائی کی گرفت ڈھیلی نہ پڑ
جائے۔ پھر اگر ان کی مخالفت کے باوجود کبھی کوئی تبدیلی آ ہی جاتی ہے تو وہ کسی نہ کسی جتن سے اس
پر اپنے ایجاد کردہ اسلام کی کاٹھی ڈال کر پھر سے سوار ہو جاتے ہیں۔ تقریباً چھے سو برس پہلے اجتہاد کا
دروازہ بند کرنے کے بعد وہ بڑی مہارت سے مسلم اُمّہ پر مسلسل سواری کر رہے ہیں اور تانگے کے
گھوڑے کی طرح آدھی آنکھیں ڈھانک کر اُس کی نظری وسعت سمیٹ دیتے ہیں۔ برِعظیم ہند میں
بھی وہ یہی کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی شکستِ فاش کے بعد جب بھی مسلمانوں نے اپنی بہتری کی
کوئی کوشش کی، علماء نے اس کی مخالفت کی۔ ۱۹۰۶ء کے بعد مسلم لیگ نے اپنا الگ راستہ تلاش کیا،
تو زیادہ تر علماء کانگریس کے ساتھ رہے اور دیوبند سے جاری ہونے والے فتوے کی رُو سے مسلم

لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیا گیا۔ اسی طرح ہر مسلمان مصلح پر کفر کے فتوے لگتے
رہے۔ سرسید، علامہ مشرقی، علامہ اقبال اور محمد علی جناح، سبھی کو انھوں نے کافر بنا ڈالا۔ پھر جیسے جیسے
تحریکِ پاکستان زور پکڑتی گئی، جمعیت علمائے ہند کی مخالفت بھی بڑھتی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں قائداعظم
نے مولانا مودودی کو پیغام بھیجا کہ پاکستان کے لیے اس فیصلہ کن مرحلے پر ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں
وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ مسلم لیگ کے حق میں ووٹ ڈالیں تو مولانا نے اُسے غیر اسلامی مطالبہ
کہتے ہوئے رد کر ڈالا۔ مجموعی صورتِ حال یہ تھی کہ سبھی قابلِ ذکر علماء کی اکثریت پاکستان کی مخالفت کر
رہی تھی لیکن اس کے باوجود ۱۹۴۶ء کے آخر میں جب قیامِ پاکستان نوشتۂ دیوار بن گیا تو علماء نے نیا
نعرہ رائج کر دیا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا ہے لا الٰہ الا اللہ۔'' مگر ان کے نعرے والے کلمہ کا مطلب وہ
نہیں تھا جو علامہ مشرقی، علامہ اقبال اور قائداعظم کی لغت میں تھا یا جس کی روح قرآن مجید میں تھی۔

پاکستان بن گیا تو نئی قوم کی اکثریت ایسی تھی جس کی کڑی اخلاقی تربیت چند برس پیشتر علامہ
مشرقی نے کی تھی۔ نئے ملک کی سربراہی قائداعظم کے پاس تھی، جن کی جمہوری، آئینی، قانونی اور
اخلاقی تربیت انگلستان کے جمہوری اور آئینی اداروں میں ہوئی تھی، اور نئے ملک میں بیوروکریسی کی
تربیت انگریز کی پرانی گڈ گورننس نے کی تھی۔ چنانچہ، یہ ایک یکسر نئی دنیا تھی جس میں جمعیت علمائے
ہند (پاکستان) یا کسی انفرادی مولوی کی کوئی آواز نہ تھی۔ اس لیے پرانی شاطر مُلّائیت روایتی اونٹ
کی طرح نئے خیمے میں اپنی گردن گھسانے کی کوشش کرتی رہی اور بالآخر وزیراعظم لیاقت علی خان کی
وساطت سے دو برس بعد کامیاب ہوگئی۔ جب دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد منظور کر کے اللہ
کی حاکمیت کا سائبان تان لیا۔ اس پر مولانا حسرت موہانی نے جو اُس وقت کہا اس کی تشریح آج
وطن کے مینار کی تمام منزلوں میں بکھری پڑی ہے۔

گیارہ حج کرنے والے فقیر منش مُنّخی سے مولانا حسرت موہانی ایک بڑے سیاستدان اور
بڑے شاعر تھے جنھیں رئیس المتغزلین بھی کہا گیا۔ وہ برعظیم کی تقسیم کے حامی اور نقیب بھی تھے۔
پاکستان بنا تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی آواز کو تقویت دینے کے لیے وہیں رہ
گئے اور ہندوستانی پارلیمنٹ میں گرجتے رہے۔ صرف ایک دفعہ رسّی میں لپٹے ہوئے بستر اور ایک
لوٹے کے ساتھ پاکستان آئے تو گورنر جنرل قائداعظم کے ہاں قیام کیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد
قراردادِ مقاصد منظور ہونے پر ان کا تاسف بھرا تبصرہ یہ تھا کہ:

اللہ کی حاکمیت کا تصور خارجیوں کا نعرہ ہے۔ خارجی قبائلی لوگ تھے اور کوئی خودکار ریاستی ڈھانچہ قائم نہ کرنا
چاہتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی سرداریاں قائم رکھنے کے لیے اللہ کی حاکمیت کا سہارا لیتے تھے۔ اب آج کے

زمانے میں جب آپ اس ارفع نظریے کو ریاستی ڈھانچے کا راہنما اصول بناتے ہیں تو بے ایمانی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ارفع نظریہ زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔ اسے کسی ریاستی آئین کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ آئین زمان و مکان کا پابند ہوتا ہے اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ محمد علی جناح زندہ ہوتے تو اس کی نوبت کبھی نہ آتی۔ لیاقت علی خان زمینداروں اور مولویوں کی مدد سے حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ پاکستان کے عوام کے حق میں حاکمیت کو تسلیم کرتے تو پھر وہ استحصالی طبقوں کو بچا نہیں سکتے تھے اور اب اس میں مولوی ان کو مذہبی جواز پیش کر دیں گے۔"[10]

اللہ کی حاکمیت کے نام پر وطن کے مینار میں آج جس قسم کی عملی حاکمیت نظر آ تی رہی ہے اس میں خدا کے خوف کا شائبہ تک نہیں۔ بلکہ اس مولوی کا زیادہ خوف ہے جس کی فرقہ بندی مساجد میں سجدہ ریز نمازیوں کو گولیوں سے بھون دیتی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قراردادِ مقاصد کا اصل محرک خدا کی اطاعت یا اسلام کی محبت نہ تھی، بلکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اور علمائے کرام کی سیاسی مصلحتیں تھیں۔ جو وقت نے اور وطن کے مینار نے صاف ظاہر کر دی ہیں کہ تمام نواب زادوں، جاگیرداروں اور مولویوں کی طرح لیاقت علی خان بھی ویسا جمہوری اور عوام دوست پاکستان نہیں چاہتے تھے جیسا پاکستان گورنر جنرل محمد علی جناح کی تیرہ ماہ کی تقاریر سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے خدوخال دیکھ کر لیاقت حکومت قائداعظم سے تغافل برتنے لگی تھی اور ساتھ ہی آئین بنانے میں تساہل سے کام لینے لگی تھی، تاکہ بعض ہندوستانی علاقوں سے مزید پناہ گزینوں کی مسلسل آمد سے ان کا اپنا حلقۂ اثر بڑھتا رہے۔ چنانچہ، انھوں نے علمائے کرام سے مل کر برعظیم کی سیاسی تاریخ کا پرانا حربہ استعمال کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر سیاست کو مذہب کا لبادہ پہنا دیا۔ اس لبادے کا نمونہ انھوں نے ہندوستان سے حاصل کیا تھا اور تھوڑی سی قطع برید کر کے اسے مشرف بہ اسلام کر دیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔[11]

اپنی آئین سازی کے ابتدائی مراحل کو تیز کرنے کے لیے ہندوستان نے ۲۲ رجنوری ۱۹۴۷ء کو Objective Resolution (قراردادِ مقاصد) منظور کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر کی سربراہی میں ہندوستانی آئین کا مسوّدہ بنانے کے لیے کمیٹی بنائی گئی، جس کا تیار کردہ ڈھانچہ نومبر ۱۹۴۹ء میں منظور ہوا اور ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کا آئین نافذ ہو گیا۔

اس کے برعکس قائداعظم کی وفات کے بعد ۱۲ رمارچ ۱۹۴۹ء کو جو قراردادِ مقاصد پاکستان میں منظور ہوئی وہ آئین سازی کے عمل میں مزید التوا کرنے کے لیے ایک تاخیری حربہ اور سیاسی بہانہ تھا، جس کے بعض حصے لفظ بہ لفظ ہندوستانی ریزولیشن سے لے کر دیگر حصوں میں اسلام اور اللہ

کی حاکمیت کا متن شامل کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے بعد ہمارے زمینی حاکموں نے خدا کو فراموش اور خوفِ خدا کو ملک بدر کر دیا تھا۔ پھر کئی برس بعد اُس وقت پوری منافقت سے گلے لگایا، جب جنرل ضیاء الحق نے ایک دفعہ پھر اپنی سیاست کی پیوندکاری مذہب سے کر دی اور ایسی خوفناک حاکمیت کو رائج کیا کہ ہماری مسجدوں کے فرش پر گرنے والا معصوموں کا خون اُس وقت تو دھو دیا گیا مگر اس کی بوباس اور مہک آج تک باقی ہے۔

ہمارے وطن کی تعمیر میں مضمر خرابی کی تیسری شکل یہی تھی کہ آئین بنانے میں دانستہ تاخیر کے لیے وڈیرے اور مولوی مذہب کا استحصالی استعمال پوری بے شرمی سے کر رہے تھے اور اسلام کے نام پر عوام کے منہ بند کر رہے تھے۔

پاکستان کی تعمیر میں مضمر خرابی کی چوتھی شکل یہ تھی کہ انگریزی دور میں برعظیم کے طول و عرض میں چاند کی طرح چمکنے والی اُردو زبان جب پاکستان کی قومی زبان بنی تو اسے علاقائی گرہن لگنے لگے۔

برعظیم کی شمال مغربی سرحد کے پہاڑوں کو عبور کر کے آنے والے متعدد فوجی لشکروں کا لسانی اختلاط جب آج کے پاکستانی علاقوں کی قدیم علاقائی زبانوں سے مسلسل جاری رہا تو اُردو زبان یہیں پیدا ہوئی۔ ادھر ہی بچپن گزرا۔ پھر اس کا لڑکپن اور جوانی برعظیم کے کئی دریاؤں اور ثقافتی منطقوں کی حدود پھلانگتے گزرے اور بالآخر یہ شمالی اور وسطی ہندوستان کو پھلانگتی ہوئی رنگون (سابقہ برما اور موجودہ میانمار) تک پھیل گئی۔ برٹش حکومت نے جب انتہائی عجلت میں برعظیم کا بٹوارہ کیا تو اسی عجلت میں یہ پاکستان کی واحد قومی زبان بن گئی۔ مگر مشرقی پاکستان کے منفی ردِعمل کے بعد ۱۹۵۶ء کے آئین میں برابری کے فارمولے سے بنگالی کی ساتھی قومی زبان ہو گئی۔ بعدازاں دنیا کے فاصلے سکڑے اور تلاشِ معاش والے لوگ ہر طرف پھیلے۔ تو برعظیم کے گلی کوچوں میں بھانت بھانت کے لشکریوں کے رابطے کی یہ زبان اب عالمی فضاؤں میں تیرنے لگی۔ اس رنگا رنگ بوقلمونی، وسعت اور لچک کی وجہ سے یہ ہماری قومی زبان بننے کی حق دار ٹھہری۔

پاکستان بنا تو پرندوں کی طرح ہوا میں اٹکھیلیاں کرنے والی اس زبان کو کچھ لوگ اپنے علاقائی پنجرے میں بند کرنے کی کوشش کرنے لگے، تاکہ وہ اس پر اپنی بلاشرکتِ غیرے ملکیت کا دعویٰ کر سکیں۔ پھر یہ دعویٰ اس خواہش بلکہ مہم میں بدل گیا کہ کسی طرح کئی رنگوں والی پاکستانی قوم کو بھی اس یک رنگے پنجرے میں گھسیڑ دیا جائے۔ جس میں ایک مقامی لب و لہجے کے لیے خود پسندی اور خود تحسین کی سہانی خوشبو تھی۔ جو انھیں باہر کی ہر لسانی خوشبو سے بہتر لگتی تھی۔ خود ساختہ برتری کے اس تصور کے خلاف دھیما دھیما ردِعمل ملک کے تمام علاقوں میں اس طرح پکتا رہا کہ قومی زبان کی

قومی سالمیت میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ آج دونوں میناروں کی بلندی سے صاف نظر آ رہا ہے کہ کب کب اور کہاں کہاں ترخ پڑی۔

چند برس پہلے کی دراڑ قابلِ ذکر ہے۔ جب اسلام آباد میں ہونے والی ایک اُردو کانفرنس میں چند مقررین نے اُردو زبان کے ساتھ ساتھ ''اُردو کلچر'' کا ذکر تواتر سے کیا، تو بعد میں احمد فراز نے میڈیا کو بیان دیتے ہوئے احتجاج کیا کہ ان کی وابستگی اگر ایک طرف قومی زبان سے ہے تو دوسری طرف اپنی مادری زبان والے علاقے کی ثقافت سے بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس لیے قومی زبان کے بہانے میرے علاقے پر کوئی بدیسی ثقافتی رنگ نہ چڑھایا جائے۔

ایسی ہی آوازیں اور اطراف سے بھی اُٹھتی رہتی ہیں۔ عائشہ جلال نے لکھا کہ، اُردو بولنے والے یہ چاہتے تھے کہ ہجرت اور جان و مال کی قربانی کی وجہ سے انھیں نئی ریاست میں ہمیشہ افضل اور مقدم درجے پر رہنے کا حق مل جاتا ہے۔[12] (حالانکہ ان سے کہیں زیادہ ابتر، خون آلود اور ہولناک ہجرت مشرقی پنجاب سے ہوئی تھی)

اسی طرح ڈاکٹر عائشہ صدیقہ نے اپنے کالم میں لکھا ہے:[13]

> میری دانست میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ غیر اُردو بولنے والے افراد کی ایک پوری نسل کی جس طرح تضحیک کی گئی ہے اور انھیں بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ اپنے غیر شائستہ لہجے کی وجہ سے وہ اُجڈ اور گنوار ہیں۔ اس ناروا رویے کی وجہ سے لوگ اُردو کے ساتھ اُنس پیدا کرنے اور اُسے اپنی زبان سمجھنے میں ناکام رہے۔ آج اُردو مختلف زبانیں بولنے والے گروہوں میں ابلاغ کا ذریعہ تو ہے لیکن یہ قومی زبان نہیں ہے... شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ان افراد کی سیاست کا شکار ہو گئی، جن کا دعویٰ ہے کہ ان کی زبان ہے۔

کالم میں تو یہ تذکرہ بھی ہے کہ اسی قسم کی ثقافتی جانبداری سے اب اُردو ادب کا وسیع اُفق چند علاقائی ناموں تک محدود کر کے بہت سکیڑا جا رہا ہے، مگر ان شکایات سے قطع نظر میں اس وسیع تر المیے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی تعمیر میں مضمر یہ ایسی خرابی تھی جس نے ہمارے وطن کو ماڈرن ہسٹری کی غالباً واحد مثال بنا دیا ہے۔ جہاں قومی زبان پر علاقائی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش میں وطن کی ملکی وحدت مضمحل اور مجروح ہوتی رہتی ہے۔ یہ رجحانات وطن کی پیدائش کے ساتھ ہی نظر آنے لگے تھے۔ پھر ان کے تسلسل نے بالآخر بوری بند لاشوں کی سیاست کو جنم دیا اور وطن کے مینار کی اوپر والی منزلوں میں خون کے دھبے پڑتے گئے اور پھیلتے گئے۔

پاکستان کی تعمیر میں مضمر خرابی کی پانچویں شکل گنتی کے لحاظ سے تو آخیر میں بیان ہو رہی ہے۔ مگر وطن کو نقصان پہنچانے میں اسے اوّلیت حاصل ہے۔ اس کی نشان دہی تو عرصہ پہلے فیض احمد

فیض کے اس مصرعے سے ہو چکی تھی ع

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

مگر مال و منال میں خدائی بانٹ کی ناہمواری کی طرح اس معاملے میں بھی قدرت نے لب کی آزادی کی توفیق مغربی پاکستان کو کم کم اور مشرقی پاکستان کو وافر عطا کی تھی۔ انھوں نے اس نعمت کا استعمال بھی بڑی خود اعتمادی سے کیا۔ چنانچہ وہاں کی لب کشائی اور یہاں کی لب بستگی کی وجہ سے ایسی صورتِ حال پیدا ہونے لگی جیسے بیل گاڑی کے دونوں پہیوں کی چال میں ہم آہنگی نہ ہو۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ گاڑی کی کوچوانی بھی مذکورہ بالا چاروں خرابیوں کے قبضے میں آ گئی تو پہیوں کی چال میں توازن پیدا کرنے کی بجائے ان کی مصلحتوں نے دانستہ پتھروں اور گھاٹیوں والا راستہ چن لیا۔ جس سے ایک طرف والا پہیہ الگ ہونے کے نہ صرف حالات پیدا ہو گئے بلکہ اسی طرح وہ الگ ہو بھی گیا۔[14]

باقی ماندہ مغربی پاکستان اب پورا پاکستان تھا۔ مگر لب کھول کر بولنے کی آزادی کے معاملے میں وہ حسبِ سابق ایک رضا کار گونگا ہی رہا۔ اسی لیے قتیل شفائی نے طعنہ دیا ؎

قتیل اُس سا زمانے میں منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

لیکن شاعر کا تو طعنہ بھی علامتی ہوتا ہے۔ اس میں نثری اظہار کی براہِ راست شدت کہاں۔ جو دنیا والوں کی بے رحم غیر شاعرانہ زبان میں ہوتی ہے اور جس کا تجربہ مجھے ایک جان لیوا طعنے کی صورت میں ہوا۔

جنرل مشرف کا دورِ حکومت تھا۔ میں کچھ عرصہ کے لیے امریکہ میں اپنے بیٹے کے پاس مقیم تھا، تو اس کا سفید فام امریکی دوست اپنے بیوی بچوں سمیت دو چار روز کے لیے اس کا مہمان ہوا۔ اس سنگت کے دوران میری اس سے متفرق قسم کی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ جب ایک دن اس نے بتایا کہ وہ پاکستان کے متعلق بہت کچھ پڑھتا رہا ہے اور عمومی طور پر ہمارے حالات سے باخبر ہے، مگر یہ نہیں سمجھ سکتا کہ پاکستان کے حالات میں زلزلوں جیسے مدو جزر کی وجہ کیا ہے؟ میں نے اس سے ہندوستان کی دشمنی اور دیگر طاقتوں کی بیرونی مداخلت کا ذکر کیا۔ ساتھ ساتھ اندرونی طور پر مُلّا، ملٹری ڈکٹیٹر اور وڈیروں کے اتحادِ ثلاثہ کے بارے میں بتایا کہ ان کی ملی بھگت کس طرح جمہوریت کا راستہ روکتی ہے۔ انسانی حقوق روندتی ہے۔ قوم کو دانستہ تعلیم سے محروم رکھتی ہے، اور مسلسل ریشہ دوانیوں سے حکومتوں کو گرا کر اور لوگوں کو تقسیم کر کے اپنے اقتدار کو قائم رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہنے لگا کہ

درونِ در اگر ترتیب اور مضبوطی نہ ہوں تو بیرونی مداخلت ہوتی رہے گی اس لیے آپ ہندوستان کو یا دوسروں کو مطعون نہیں کر سکتے، لیکن اندرونی حالات کے متعلق سوال و جواب کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ بالآخر وہ کہنے لگا کہ اگر آپ کے لیڈر نصف صدی سے قوم کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے رہے ہیں اور آپ پھر بھی انھیں اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ انسانوں سے کم تر درجے کی مخلوق ہیں :

(This looks like the conduct of a sub-human specie!)

آج دونوں میناروں کی چوٹیوں سے میں نیچے کی تمام منازل میں جھانک رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اپنی اعلانیہ بیزاری کے باوجود ہم ''بول کے لب آزاد ہیں تیرے'' پر عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بلکہ انھی ناقابلِ اعتماد حاکموں کو ووٹ دے کر بار بار منتخب کرتے رہتے ہیں، یا بغیر ووٹ کے بار بار قبضے کرنے والوں کا استقبال مٹھائیاں بانٹ کر کرتے رہتے ہیں۔ میں ذہن میں گنتی شروع کرتا ہوں۔ ایک پارٹی کی دو باریاں، دوسری کی تین باریاں، فوجی ڈکٹیٹروں کی چار باریاں، دیگر موقع پرست پارٹیوں کی ہر حکومت کے ساتھ متعدد باریاں اور طالع آزما افراد کی پارٹیاں یا حکومتیں بدلنے کی اتنی باریاں کہ گنتی اُلجھ جاتی ہے۔ مزید برآں اقتدار میں آئے بغیر بھی مُلّائیت کی گرفت اقتدار والوں سے اتنی بہتر ہے کہ ہم انھیں دین کے رکھوالے اور ایمان کے محافظ سمجھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ؏

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

میری گنتی رک جاتی ہے ... میں اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکتا۔ کیونکہ اس امریکی کے الفاظ میری ہر سوچ کا راستہ روک دیتے ہیں۔

پہلے صرف میرا مینار تھا۔ ذرا اوپر اُٹھا تو وطن کا مینار ظاہر ہونے لگا۔ پھر جیسے جیسے دونوں مینار اوپر اُٹھتے گئے، وطن کی تعمیر میں مضمر خرابی کی یہ پانچ شکلیں مجھے اپنے مینار سے نظر آتی رہیں۔ ممکن ہے دیگر شہریوں نے کچھ اور شکلیں بھی دیکھی ہوں لیکن تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شکلیں جتنی بھی ہوں۔ خرابی ایک ہی تھی، جسے صرف دو الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے ''میری ذات۔'' اس کی عملی شکل ''میری مرضی'' تھی، جو تمام انسانی، اخلاقی، آئینی اور قانونی حدود کو توڑ سکتی تھی۔ انانیت کی یہ چھلانگیں بظاہر تو اپنی ذات کے لیے تھیں مگر ہر چھلانگ میں دوسروں کی ذات روندی جاتی تھی اور ان کے حقوق پامال کیے جاتے تھے۔

پاکستان قائم ہوا تو اپنی ذات کی توسیع کے خواہشمندوں نے مختلف لبادے اوڑھ لیے اور

مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ مثلاً انگریزی سامراج کے خدمت گار وڈیروں نے ''خاندانی'' لوگوں کا چولا پہن لیا۔ صدر ایوب کے بیان کردہ جاہ طلب بونا پارٹ ''اصلاحی چوغہ'' زیب تن کرنے لگے۔ مُلّائیت نے مذہب کی عبا پہن لی اور منبر و محراب میں سج گئی اور مغلیہ دربار کے انحطاط کی باقیات نے ''تہذیب'' کی چادر اوڑھ لی۔ جب تک انگریز کی تربیت یافتہ بیوروکریسی کا چلن قائداعظم کی تقاریر کے مطابق رہا اور قواعد و قانون کا پابند رہا، وطن کا مینار بلند تر اور مضبوط تر ہوتا رہا اور اس پوشیدہ خرابی کی تمام اشکال بھی زیرِ زمین پانی کی طرح ڈھکی چھپی رہیں۔ مگر انگریز نے دو صدیوں کے دوران برِ عظیم کی سرزمین پر ریاستی نظام کے تراشیدہ پتھروں کا جو مضبوط فرش بنایا تھا اسے توڑ کر یہ سطحِ زمین پر آنے کو بے تاب ہوتی رہیں۔

ذات پروری کی اس بے تابی کی معاونت مسلم اُمّہ کے اس عنصر نے بھی کی، جسے علامہ اقبال نے ''پانچ صدیوں کا جمود'' قرار دیا تھا۔ (اب یہ چھ صدیاں ہو رہی ہیں)۔

اسلامی تاریخ کے پہلے اڑھائی سو برس میں چاروں فقہیں مرتب ہو چکی تھیں۔ دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مسلم علماء میں یہ سوچ پیدا ہونے لگی کہ اب تک کی وضاحتوں اور تشریحات کے بعد شریعہ کے خدوخال اتنے واضح ہو چکے ہیں کہ مزید سوچ بچار سے پرہیز کرنا چاہیے، تاکہ مستقبل میں تفرقہ بازی کے امکانات ختم ہو جائیں۔ اتفاق اور اختلاف بھری طویل بحثوں کے بعد تیرھویں صدی عیسوی میں اجتہاد کا دروازہ قریباً پوری طرح بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لیے سوچ، سوال اور تحقیق ممنوع ہو گئی اور مزید اجتہاد کی بجائے سابقہ مجتہدین کی تقلید پر اصرار ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے الہامی قرآن اور رسولِ خدا ﷺ کی عملی سنّت پر انسان کی بنائی فقہ حاوی ہونے لگی۔ ہر فقہ کا مولوی منہ زور ہو گیا اور اپنے فرقے کو اُس اسلام سے افضل قرار دینے لگا جس کا خلاصہ رسولِ کریم ﷺ نے حجۃ الوداع والے خطبے میں سنایا تھا۔ پھر فرقہ پرستی ایسا مذہبی اور جذباتی جنون بنتی گئی کہ مخالف فرقے والوں کے قتل سے عاقبت سنورنے لگی اور ثواب ملنے لگا ؎

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے، روایتوں سے مجھے
(ذوق)

''قتل'' اور ''ثواب'' کے اس سہولت کار بندھن (marriage of convenience) سے جو عجیب و غریب اولاد پیدا ہوئی وہ کئی غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویّوں پر مشتمل تھی۔ انھی میں سے ایک رویّہ یہ بھی تھا کہ ''میری فقہ''، ''میرا فرقہ'' اور ''میرا عقیدہ'' اصل اسلام ہے۔ اس لیے میں کسی اور

فرقے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ اسی خود پسندی سے ''میری ذات'' اُبھری۔ جو دوسرے کی ذات کو مکمل طور پر نظرانداز کرتی تھی۔ اس طرح ''میری ذات'' کا پھیلاؤ اور ''میری مرضی'' کی اوّلیت گزشتہ چھے صدیوں میں مسلمانوں کے کردار اور نفسیات کا حصہ بنتی گئی۔

میرے مینار کی نچلی منازل میں مجھے اسلام کے کئی روپ نظر آئے تھے، جو عمل کی بجائے عبادت پر اس قدر زور دیتے تھے کہ یہ میری ذات کے تصور کو دن بدن زیادہ مضبوط کرتے گئے کیونکہ عبادت صرف اپنی ہی ذات کی شفاعت چاہتی ہے اور خدمتِ خلق یا حقوق العباد سے بالکل مختلف بلکہ اُلٹ ہے، جو دوسروں کی ذات اور ضروریات پر نظر رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنی ذات کا پجاری گرد و پیش کے تغیرات کا ادراک نہیں رکھتا، جس کی وجہ سے تقلیدی سوچ والی ذات گرفتہ مسلم اُمہ زندگی سے دور ہٹتی گئی اور نہ صرف سولھویں صدی عیسوی کے مذہبی انقلاب (reformation) اور علمی انقلاب (rennaisance) سے بے خبر رہی، بلکہ بعد میں ظہور پذیر ہونے والی اور دوسرے کی ذات کو پہچاننے والی جمہوریت سے بھی نابلد رہی۔

اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے بعد افراد کی سوچ مفلوج، سوالات خاموش اور کرید کند ہو گئی۔ اَفَلاَ تَتَفَکَّرُونَ والی مسلم اُمہ کا تخیّل بانجھ ہو گیا اور یہ اب ذہنی اور نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے۔ جس کے اندر انسانی صلاحیتوں کا گلا گھٹنے سے ایک موہوم سی خفگی اور ہتک کا غبار چھایا رہتا ہے۔ اسی لیے یہ لاشعوری طور پر حالتِ موجود (status quo) سے ناراض ہی رہتی ہے۔ غالباً اسی دبے دبے غصے کی وجہ سے مسلمانوں میں دوسری اقوام کی نسبت غداری کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی غداری ''میری ذات'' ہی کا شاخسانہ ہے کہ ذاتی مفادات قومی مفادات پر غالب آ جاتے ہیں۔ شرقِ اوسط (مشرقِ وسطیٰ) کی ساری تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں کے مطلق العنان مسلم بادشاہ اپنے ذاتی اور موروثی اقتدار کو بچانے کے لیے قومی مفاد غیروں کے تابع رکھتے ہیں اور اپنی قوم کو تعلیم، اختیارات، انسانی حقوق، انصاف اور جمہوریت سے دانستہ محروم رکھتے ہیں، تاکہ ان کی آنکھیں نہ کھل جائیں۔ اسی لیے ان پر ''غدارِ قوم بادشاہ'' کی پھبتی کسی جاتی ہے۔

قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا اطلاق صرف اُن ممالک پر ہوتا ہے، جہاں صرف مسلمانوں کی خالص آبادی ہے اور ان ممالک پر نہیں ہوتا جن میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام کی بھی قابلِ ذکر آبادی ہوتی ہے۔ جیسے ملائشیا، انڈونیشیا اور ۱۹۴۷ء سے پہلے کا برِعظیم ہند۔ کیونکہ وہاں دو قوموں کی باہمی مسابقت کی وجہ سے سوچوں اور طرزِ عمل میں توازن رہتا ہے، لیکن جیسے ہی ۱۹۴۷ء میں تقریباً خالص مسلم آبادی والا سب سے بڑا اسلامی ملک بنا تو اُمہ کے پچھلے سو سالہ

پرانے نفسیاتی مرض نے بھی ادھر کا رُخ کر لیا اور ہماری تعمیر میں مضمر خرابی کی مختلف شکلیں موقع ملتے ہی مطلق العنانی اور ذات پروری کے اس چلن کی طرف لپک پڑیں جو شرقِ اوسط کے خالص مسلم ممالک میں تو عرصے سے رائج تھا، مگر برِعظیم میں انگریز کی قانونی عملداری کی وجہ سے ہماری سرحدوں سے باہر ہی رہتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے سنہری زمانے میں ہم قانون پروری کے اس مقام سے آگے نکل چکے تھے، جہاں انگریز نے ہمیں چھوڑا تھا، لیکن پھر یہ پوشیدہ خرابی ہمیں پیچھے کی طرف دھکیلنے لگی۔ جہاں قانون کی بجائے ذات کی بالادستی تھی۔ اس کی تخریبی جبلّت خوب جانتی تھی کہ انگریز کے ریاستی نظام سے تراشے ہوئے پتھروں کے مضبوط فرش کو توڑے بغیر یہ مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔

مقصد کا تعین ہو چکا تو حصولِ مقصد کی طرف پہلا قدم یہی تھا کہ اس بیوروکریسی کا کردار بدل دیا جائے، جو پاکستان کے سنہری دور میں قانون، قواعد اور ضابطے کی حد بندی سے ان کی ذات کی توسیع کے راستے بند کرتی رہی... لیکن مجبوری یہ تھی کہ کوئی ریاست بیوروکریسی کے بغیر اپنا اندرونی یا عالمی انتظام نہیں چلا سکتی۔ اس لیے پہلے قدم کا تقاضا یہی ٹھہرا کہ بیوروکریسی کی ریڑھ کی ہڈی میں سے قانونی مہرہ نکال دیا جائے اور آئینی ہڈی توڑ دی جائے، تاکہ وہ زندہ تو رہے مگر خود بدولت اور خود پرور حاکموں کے سامنے ہمیشہ جھکی ہی رہے اور اُوپر سے ''میری مرضی'' کے مطابق جو صدا سنے، اس پر عمل کرتی رہے ۔

کس طرح یقین آئے کہ اس ذہن نے اِک روز
دانستہ روا رکھے تھے تخریب کے آداب!
(مصطفیٰ زیدی)

حواشی

۱۔ Chiefs and Families of note in the Punjab یہ کتاب دو افراد نے ۱۹۰۹ء میں پرانے ریکارڈ پر نظرثانی کر کے تصنیف کی۔ ان میں سے ایک تو انڈین سول سروس کے H.D. Craik تھے اور دوسرے برٹش آرمی کے Major W.L.Conran تھے۔ بعد ازاں ۱۹۹۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے یہ کتاب برائے فروخت شائع کر دی۔

۲۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان مسلم لیگ نے پانچ رُکنی زرعی کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر میاں ممتاز دولتانہ تھے اور اراکین میں شامل تھے، بیگم شاہ نواز، خان عبدالقیوم خان، قاضی محمد عیسیٰ اور حاجی علی اکبر۔

۳۔ Friends not Masters، از محمد ایوب خان، ۱۹۶۷ء میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی۔ یہاں اس کے ۲۰۱۵ء ایڈیشن کا ص: ۱۵۴ اور اس کا پیرا ۲۱ زیرِ نظر ہے۔

۴۔ روزنامہ The News ص: ۱۹، عنوان Pages from History، اقتباس حسن ظہیر کی کتاب The Rawalpindi Conspiracy 1951 (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء)۔

۵۔ Speeches and Statements of Quaid e Azam 1947-48، ص: ۲۶۴۔

۶۔ Friends not Masters، ص: ۵۴، ۲۰۱۵ء ایڈیشن۔

۷۔ حسن ظہیر، The Separation of East Pakistan، (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس) ص: ۶۱۔

۸۔ ان حالات کی شہادت کی بنا پر یہ سوال بھی اکثر پوچھا گیا ہے کہ کیا صدر ایوب واقعی اس سازش سے لاعلم تھے یا یہ ان کے اشارے پر ہو رہا تھا، مگر جس قوم کے رویّوں میں ریسرچ دشمنی غالب اور خوشامد ہو، وہاں ایسے سوالوں کے جواب دانستہ نہیں ڈھونڈے جاتے۔

۹۔ انھی دنوں (۱۹۵۴ء) میں جنرل ایوب نے لندن کے ایک ہوٹل میں پاکستان کے آئندہ طرزِ حکومت کا خاکہ تیار کیا ہے... صدارتی نظامِ حکومت، ایک ایوان کی پارلیمنٹ، براہِ راست کی بجائے بالواسطہ انتخابات، بنیادی جمہوریت کا نظام مغربی پاکستان ایک متحدہ صوبہ (One Unit) جس میں پنجاب کی نمائندگی ۵۰ فیصد سے کم کر کے ۴۰ فیصد کر دی جائے گی۔ عدلیہ کے ساتھ ساتھ جرگہ سسٹم کا اجرا۔ سرکاری ملازمین کے طرزِ عمل کے لیے نئی قسم کے رولز۔ مصر (Egypt) کی طرح کی زرعی اصلاحات۔ وغیرہ Friends not Masters۔ صفحات ۲۰۹ سے ۲۱۸ تک)۔ ۱۹۵۸ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد ۱۹۵۴ء والے خاکے پر ہی عمل کیا گیا۔

۱۰۔ جلیل قریشی، تاریخ کا سفر، ص: ۲۰۔

۱۱۔ روزنامہ The News مورخہ ۶ را گست ۲۰۱۵ء، ص: ۹۔ آئین پاکستان کی اٹھارویں اور اکیسویں ترامیم پہ پاکستان سپریم کورٹ کے فیصلے میں جسٹس ثاقب نثار کا اختلافی نوٹ۔ اخبار کا عنوان Pak Objective Resolution Borrowed from India۔

۱۲۔ عائشہ جلال، The Struggle For Pakistan (ہارورڈ یونیورسٹی پریس) ص: ۱۴۹۔

۱۳۔ روزنامہ دنیا میں ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کا کالم بہ عنوان ''اُردو ہے جس کا نام'' مورخہ ۲۹ رمئی ۲۰۱۵ء۔

۱۴۔ تفصیلات کے لیے مسعود مفتی کی چار کتابیں (i) چہرے اور مہرے (ii) ہم نفس (iii) لمحے (iv) ریزے۔ (حاشیہ نمبر ۸، ص: ۲۱۸ بھی دیکھیں)

قائدِ اعظم کے پاکستان کا انہدام

ڈھلان

وطن کے مینار کی پہلی منزل تعمیر ہو چکی تھی، جس میں ۱۹۵۶ء کا آئین بھی نافذ ہو چکا تھا اور اس کے تحت وطن میں پہلے قومی الیکشن کی تیاریاں بھی جاری تھیں۔

میرے مینار کی تیسری منزل زیرِ تعمیر تھی۔ میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور میں زندگی کے چوراہے پر اپنے آئندہ راستے کے تعین پر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

زمانے کی صراحی سے وقت قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ کیلنڈر کی ہر تاریخ آج کو ماضی میں دھکیل دیتی تھی اور آنے والے کل کو اپنی طرف کھینچ کر آج بنا دیتی تھی۔

جب یہ گنتی ۱۹۵۸ء تک پہنچی تو دونوں میناروں میں حالات نے بیک وقت ایک نئی کروٹ بدلی۔ وطن کے مینار میں ایک دھماکے کے ساتھ جنرل ایوب خان تخت نشین ہو گئے اور میں خاموشی سے اپنے مینار سے چل کر وطن کے مینار کی سول سروس (Civil Service) میں شامل ہو گیا۔ وہ چوٹی پر بیٹھ کر ریاست کی صدارت کرنے لگے۔ میں نیچے سے ریاستی بیوروکریسی کی پہلی سیڑھی چڑھنے لگا۔ ہمارا باہمی فاصلہ تو ناقابلِ عبور تھا، مگر حسنِ انتظام (Good governance) کے موضوع پر اکٹھا ذکر ناگزیر ہے۔ اس لیے بھی کہ تخت سے پھیلائے ہوئے ریاستی تاروں کا انتظامی ارتعاش بالآخر مجھ تک پہنچ جاتا تھا، لیکن میں ایک گم نام زیرِ تربیت کارکن تھا۔ اور ان کا نام نامی ہر طرف چمک رہا تھا۔ اس نام پر مٹھائیاں بانٹی جا رہی تھیں۔ سرکاری میڈیا انھیں نجات دہندہ قرار دے رہا تھا اور زیادہ تر لوگ اسی رو میں بہہ رہے تھے، مگر کہیں کہیں قدرے مختلف مگر محتاط تبصرے بھی سننے میں آ جاتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی کے ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ایک بزرگ پروفیسر کلاس میں داخل ہوئے، تو طلباء نے ان سے سیاست کی نئی کروٹ کے بارے میں رہنمائی چاہی۔ وہ چند برس پہلے لاہور میں مارشل لا کا نفاذ دیکھ چکے تھے اور انھیں بہت کچھ یاد تھا۔ اس لیے وہ اس موضوع سے بچنے کی کوشش کرنے لگے، مگر جب طلباء نے اصرار کیا۔ تو کہنے لگے، ''جب تم میری عمر کو پہنچو گے اور تمھارے پوتے مڈل یا ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھیں گے، تو ان کے پرچے میں یہ سوال پوچھا جائے گا کہ پہلے، تیسرے اور پانچویں مارشل لا کی خوبیوں کا موازنہ کرو اور مضمون لکھو۔''

طلباء کچھ نہ سمجھے... کسی نے ہاتھ کھڑا کیا، ''سر! اس کا مطلب کیا ہوا؟''

پروفیسر نے کہا، "میں آج کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں۔ آپ کو سمجھا نہیں سکوں گا اور نہ ہی آپ سمجھ سکیں گے۔ لیکن جب آپ میری عمر کو پہنچیں گے تو اس وقت مجھ سے کہیں زیادہ سمجھ چکے ہوں گے۔"
سینہ بہ سینہ اور زیرِ لب چلتی چلتی یہ پہیلی مجھ تک بھی آن پہنچی۔ میں بھی کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھ سکا... مگر جتنا سمجھا اُس پر بھی یقین نہ آیا۔ میں ان پروفیسر صاحب کو جانتا نہ تھا اور نہ ہی ان کے نام سے واقف تھا... لیکن جیسے جیسے میں دونوں میناروں پر چڑھتا گیا تو یہ بات وقتاً فوقتاً مجھے یاد آتی رہی اور اس کے معنی بھی واضح ہوتے گئے۔

آج میں اپنے مینار کی آٹھویں اور وطن کے مینار کی ساتویں منزل سے جھانک رہا ہوں۔ تو یوں لگتا ہے کہ دونوں میناروں کے اردگرد ساری فضا میں اُس بے نام پروفیسر کے یہ الفاظ اس طرح اُڑ رہے ہیں کہ وہ سنائی تو نہیں دیتے مگر دکھائی ضرور دیتے ہیں۔

دونوں میناروں کے گرد تواتر سے اُڑتے ہوئے یہ الفاظ تعداد میں تھوڑے تھے، مگر بقولِ غالب "گنجینۂ معنی کا طلسم" رکھتے تھے۔ اس طلسم کو وا کرنے کی کنجی اُس تاریخی شعور میں تھی جس نے ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر کو ظاہر کے باطن میں جھانکنے والی کمیاب نظر عطا کی تھی۔ ع

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی (اقبال)

وطن کے مینار کی تعمیر میں مضمر پانچ خرابیوں میں سے ابھی پہلی خرابی نے اپنا پہلا ہی قدم اُٹھایا تھا، تو اُس جہاں بین نے بھانپ لیا تھا کہ ہوا کا آئندہ رُخ کیا ہوگا۔ گو اُس دم ان کے یا کسی اور کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ بالآخر ان پانچوں خرابیوں کا مشترکہ رُخ بتدریج ایک ہی طرف ہوتا جائے گا، اُس طرف جدھر پاکستانی شہری نہیں رہتا۔ بلکہ مخصوص مفادات بستے ہیں۔ تب پاکستانی پرچم کا سبزہ وطن کی پوری سرزمین پر یکساں ہمواری سے نہیں اُگے گا، بلکہ خاص خاص کیاریوں اور گملوں میں نمو پائے گا۔

آج تاریخ کی پس نظری یا دونوں میناروں کی بلندی سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ صدر ایوب خان کا زمانہ گو بڑی ترقیاتی چمک دمک والا تھا، مگر درد کی جو فصل آج ہمارا معاشرہ کاٹ رہا ہے، اس کے تمام تر کڑوے بیج دانستہ طور پر اُسی زمانے میں بوئے گئے تھے۔ ان سے جو کونپلیں پھوٹیں ان کی آبیاری آنے والی حکومتیں بھی کڑوے پانی سے ہی کرتی رہیں۔ تب فصل پہلے کڑوی اور پھر زہریلی ہوتی گئی۔

یہ کاشت اس حد تک دانستہ تھی کہ وقتی چمک دمک پیدا کی جائے تا کہ قلیل المیعادی ناپائیدار فوائد حاصل ہوں اور گروہی اقتدار کو دوام ملے، مگر حاکموں کی کوتاہ نظری اس نبردگی یا کٹاؤ کے عمل کا آغاز نہ دیکھ سکی۔ جسے انگریزی میں dent اور پنجابی میں چب پڑنا کہتے ہیں۔ وطن کے مینار کے اس

ابتدائی بچے پن کا حکومتِ وقت کو نہ تو فوری ادراک تھا اور نہ دوررس نتائج کا احساس تھا۔ اس لیے کہ ان کی تربیت اور تجربہ یہ تھا کہ توڑ پھوڑ سے رکاوٹوں کو گرا کر دیارِ غیر کو فتح کیسے کیا جاتا ہے، اور یہ نہیں تھا کہ اس ملبے سے نیا شہر کیسے اُٹھایا جائے یا اس میں ہمکتی زندگی کیسے کھٹری کی جائے اور اس کے امن و امان میں نئی لہریں یا نئی سوچیں کیسے پیدا کی جائیں۔

وطن کے مینار کی تعمیر اب بھی بڑے شد و مد سے جاری تھی، مگر اس میں کہیں کہیں پڑنے والے چب ابھی کسی کو بھی نظر نہ آتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ ہوا تھا... دو ماہ بعد دسمبر میں میری ملازمت شروع ہوئی اور محکمانہ تربیت کا آغاز ہو گیا۔

اس دفعہ قریباً چار ہزار اُمیدوار اعلیٰ ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحان[1] میں شریک ہوئے تھے، اور صوبائی کوٹا (quota) کے مطابق ڈیڑھ سو کے قریب کامیاب ہو کر ٹریننگ لینے لگے۔ فارن سروس (Foreign Service) کے تین پروبیشنرز (probationers) بیرون ملک (Fletcher School of Diplomacy) میں سفارتی تربیت کے لیے روانہ ہو گئے۔ مجھ سمیت دو درجن کے قریب پروبیشنرز دیوانی و فوجداری قانون — مال گزاری (revenue) اور امورِ عامہ (Public Administration) کی خصوصی تربیت کے لیے لاہور میں سول سروس اکیڈمی (Civil Service Academy) میں داخل ہو گئے۔ درجن بھر پولیس والے پروبیشنرز مشرقی پاکستان میں واقع پولیس سروس اکیڈمی میں چلے گئے۔ پوسٹل سروس اور کنٹونمنٹ سروس والے بھی اپنے تربیتی اداروں میں پہنچ گئے اور باقی سب لاہور میں فنانس اکیڈمی میں داخل ہو گئے۔ جہاں مختلف گروپوں کے لیے انکم ٹیکس، کسٹم (custom)، آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ (account audit) اور ملٹری اکاؤنٹس وغیرہ کی خصوصی تربیت کا بندوبست تھا۔ یہ بڑی حد تک برٹش دور کے تربیتی بندوبست کا تسلسل تھا۔

ہمارے گروپ کا پروگرام یہ تھا کہ لاہور میں چھ ماہ کی کلاسوں کے بعد چار ماہ کے لیے مشرقی پاکستان میں ضلعی انتظامیہ کا عملی حصہ بننے کے لیے جانا تھا۔ اس کے بعد انگلستان میں مزید تعلیم اور عملی تربیت تھی، جہاں اوکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے ہر کالج میں صرف ایک لڑکے کا داخلہ ہونا تھا، جہاں وہ تعلیمی سال کے دوران عام طلباء کے ساتھ مزید تعلیم حاصل کرے گا پھر چھٹیوں کے دوران اور تعلیمی سال کے اختتام پر سارے پاکستانی پروبیشنرز کا پورا گروپ برٹش گورنمنٹ کے مختلف محکموں کی عملی کارکردگی سیکھے گا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب آئی سی ایس (Indian Civil Service) میں ہندوستانیوں کی شمولیت کی اجازت دی گئی اور مقابلے کا امتحان

شروع کیا گیا تو اسی وقت سے انگلستان کی دو بڑی یونیورسٹیوں میں مزید تعلیم کے ساتھ ساتھ برٹش گورنمنٹ کے محکموں میں تربیت کا یہی بندوبست چلا آ رہا تھا، جو قیامِ پاکستان کے بعد بھی جاری رکھا گیا[2] اور اسی کے تحت تربیت حاصل کرنے والے پاکستانی بیوروکریٹ اپنے وطن کو سنہری زمانے میں لے گئے تھے۔ پاکستان کے علاوہ برٹش ایمپائر کے باقی نوآزاد ممالک بھی اسی بندوبست کے تحت تربیت حاصل کرتے تھے اور ان سب کے اخراجات برٹش کامن ویلتھ آفس[3] برداشت کرتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں برٹش راج کے خاتمے کے بعد سارے انگریز آئی سی ایس (ICS) افسران واپس انگلستان چلے گئے تھے، مگر حکومتِ پاکستان نے بعض حساس مناصب کے لیے صرف چند ایک کو عارضی معاہدے (on contract) پر محدود مدت کے لیے مامور کر لیا تھا۔[4] انھی میں سول سروس اکیڈمی کے ڈائریکٹر Mr Geoffrey Burgess بھی شامل تھے اور یہ ان کی مدتِ ملازمت کا آخری برس تھا۔

اکیڈمی میں ہمارا پہلا دن... اُس دن کی پہلی کلاس... مسٹر برجیس (Burgess) بڑے دھیمے انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ کلاس کا سامنا کر کے کڑی نظر سے ہر چہرے کو پڑھا... اور صاف ستھرے شائستہ لہجے میں ایک فقرہ بول کر خاموش ہو گئے۔

''حضرات! میں آپ کو اس اکیڈمی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ مگر مجھے آپ کے ملک کے متعلق ایک تشویش لاحق ہو گئی ہے!''

اب وہ خاموش... ہم سب حیران... بلکہ دم بخود کہ یہ کس قسم کا سواگت ہے... لحہ بھر کے لیے میں نے سوچا کہ وہ مارشل لاء کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔

''آپ سب کی تعداد ۲۳ ہے۔'' انھوں نے دوبارہ بات شروع کی:

آپ سب کے کوائف سے میں دیکھ رہا تھا کہ آپ میں سے ۱۸ / افراد پچھلے دو برس سے کسی نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ مقابلے کے امتحان کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس دوران آپ... اور دیگر اساتذہ جنھوں نے امتحان تو دیا مگر یہاں تک نہیں پہنچ سکے... اپنا تدریسی فرض پوری یکسوئی سے نہیں نبھا رہے تھے... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہا ہے اور جاری رہے گا... اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آپ کے تعلیمی اداروں کے طلباء اپنے اساتذہ کی پوری توجہ سے محروم رہتے جا رہے ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ... جس ملک میں اُستاد اپنے پیشے سے مطمئن نہیں، اور اُسے چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہتا ہے، اُس ملک کے مستقبل کے متعلق تشویش پیدا ہو جاتی ہے... اب یہ آپ کی حکومتوں کا فرض ہے کہ اساتذہ کو ایسی مراعات دیں کہ وہ اپنے پیشے کو دوسرے پیشوں پر ترجیح دیں۔

چند لمحے خاموش رہ کر انھوں نے بات جاری رکھی... خاص یورپی انداز میں کہ کم سے کم براہِ راست الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہی جائے... ان کی گفتگو میں پسماندہ معاشروں کی منافقانہ خطابت کا شائبہ تک نہ تھا کہ وہ باتیں کہتے رہیں، جن پر عمل کرنے کا امکان یا ارادہ ہی نہ ہو۔ روانی سے بولتے بولتے وہ رُکے... پھر الفاظ تول تول کر بولے:

آپ... اور دوسرے ڈیڑھ سو کے قریب لوگ... جو اعلیٰ ملازمتوں کے لیے چنے گئے ہیں... ان سب کے لیے پہلا، درمیانہ اور آخری سبق ایک ہی ہے... کہ آپ کو اس اعلیٰ ملازمت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر آپ اپنی کارکردگی سے ہر وقت ثابت نہ کر سکیں کہ... آپ... واقعی... اعلیٰ... ہیں۔

باقی لیکچر اس کے متعلق تھا کہ آپ اپنا اعلیٰ ہونا کیسے ثابت کر سکتے ہیں...

اوّلاً قانون اور قواعد پر کڑے عمل سے اور فکر و عمل کی پوری دیانتداری سے... ثانیاً مکمل غیر جانبداری اور انصاف سے۔ جو کیا بھی جائے اور ہوتا ہوا نظر بھی آئے... اور ثالثاً غلط کاروں اور ایسے مفاد پرستوں سے محفوظ فاصلہ رکھنے سے... جن کے ذاتی یا گروہی مفادات اس علاقے سے وابستہ ہوں، جہاں آپ تعینات ہیں۔

یہ وہی باتیں تھیں جو قائداعظم اپنی زندگی کے آخری تیرہ ماہ میں بطور گورنر جنرل کرتے رہے اور بیوروکریسی پورے خلوص سے ان پر عمل کرتی رہی۔ قائداعظم نے یہ باتیں انگلستان میں رہ کر وہاں کے تعلیمی اداروں اور پارلیمنٹ کے مباحثوں سے سیکھی تھیں اور اب ہماری تربیت پر مامور ایک ایسا انگریز ہمیں وہ کچھ سکھا رہا تھا، جو عمر بھر اس وسیع سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کی ایک مضبوط کڑی رہا تھا۔ حسنِ انتظام کے بنیادی اصولوں کا یہ نمونہ نہ صرف ماضی بعید میں خلافتِ راشدہ کے زمانے میں آزمایا جا چکا تھا بلکہ اب ماضی قریب میں بھی ایک تہائی کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی برطانوی سلطنت میں دُہرایا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ گزشتہ گیارہ برسوں میں پاکستان کی نئی سرزمین کو بھی سرفراز کر چکا تھا۔ ساتھ ہی کرسٹفر اینڈرسن بھی اس کی مزید تائید کر چکا تھا۔

پاکستان کی زندگی کے گیارھویں برس تک یہی باتیں ان تمام اداروں میں سکھائی جاتی رہی تھیں، جن میں کسی بھی سطح کے سرکاری ملازم تربیت حاصل کرتے رہے تھے اور اس شد و مد سے سکھائی جاتی تھیں، جیسے ان کے بغیر انتظامیہ کا تصور ہی ممکن نہ ہو۔ ٹریننگ کے بعد وطن کا انتظامی نظام بھی اُسی شد و مد سے ان پر عمل کرواتا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پیدائش کے بعد اپنے بچپن میں ہی پاکستان حُسنِ انتظام کی نئی بلندیوں تک جا پہنچا تھا۔

میں آج اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے نیچے جھانکتا ہوں، تو اس کی تیسری منزل ابھی تک ان رہنما اصولوں سے منور ہے، جو ملازمت کے پہلے دن کی پہلی کلاس میں ہمیں ایسے سمجھائے گئے

جیسے وہ انتظامیہ کا مذہب اور ایمان ہو۔ پھر مشرقی پاکستان میں اور بعدازاں انگلستان کے تربیتی دور میں بھی یہی اصول بڑے واعظانہ انداز میں ہم پر انڈیلے جاتے رہے۔ بعدازاں ان کی روح کو ''گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز'' (Govt. Servants Conduct Rules) میں سمو کر ہمیں تاعمر ایک عبادت کا پابند کر دیا گیا تھا، جس کی سزا اور جزا اگلی دنیا میں نہ تھی بلکہ فوری طور پر حاضر ملازمت میں ملتی رہتی تھی۔ میرے مینار کی یہ منزل صرف روشن ہی نہیں، بلکہ اس روشنی میں ایسی اُٹھان ہے جو پو پھٹتے مشرقی اُفق پر ہوتی ہے۔

اس روشنی میں مجھے ایک کتاب کے صفحات پھڑپھڑاتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ صدر ایوب کی خود نوشت سوانح ہے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ باوردی ڈیفنس منسٹر بن چکے ہیں اور لندن کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر پاکستان کے آئندہ طرزِ حکومت کا خاکہ تیار کر رہے ہیں[5] اور اُن اصلاحات کی فہرست بنا رہے ہیں، جو ان کے خیال میں ضروری ہیں۔ کوئی وجہ تحریر کیے بغیر وہ لکھتے ہیں کہ سرکاری ملازمین کے لیے ''گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز'' تبدیل کر دینے چاہییں۔ نہ معلوم ان کے ذہن میں کیا ہے۔

صدر ایوب نے اقتدار سنبھالا، تو ان رولز کے تبدیل کرنے کی ابتدا ہوئی۔ اگلی حکومتیں اس کو آگے چلاتے ہوئے مزید تبدیلیاں کرتی رہیں، حتیٰ کہ جنرل ضیاء کے دور میں ان رولز کا رُخ ۱۹۵۸ء سے پہلے کے رخ کے بالکل اُلٹ ہو چکا تھا۔

اس کتاب کے صفحات میری نظر کو وطن کے مینار کی چوتھی منزل پر لے جاتے ہیں۔ جہاں ان رہنما اصولوں کی روشنی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ بالکل متضاد قسم کا اندھیرا ہے۔ شام کے جھٹپٹے سے زیادہ گہرا۔ مگر رات کی تاریکی سے کم... اس اندھیرے میں میرا ایک رفیقِ کار پریشانی کے عالم میں بیٹھا نظر آتا ہے۔

یہ جنرل ضیاء کا دورِ حکومت تھا۔ ۱۹۸۵ء کا سال جس میں بظاہر تو صرف ۱۹۵۸ء کے سال کے ہندسے اُلٹ پلٹ ہوئے تھے، اور صرف سترہ برس کا فرق تھا، مگر دراصل وہ لمبی ڈھلان تھی، جس پر سے لڑھکتی ہوئی ہماری انتظامیہ ایک گہرے نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا آغاز جنرل ایوب کے دور میں ہوا۔ جنرل یحییٰ کے دور میں وطن کا مینار گڑھے میں گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے آدھا مینار تو سیدھا کر دیا، مگر اس کے انتظامی ٹکڑوں کو جوڑنے کی بجائے مزید توڑ پھوڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ بعدازاں جنرل ضیاء ان ریزوں کو نئے انتظامی سانچے میں ڈھالنے لگے۔ اب وطن کے مینار کی چوتھی منزل میں میرا پریشان حال دوست مجھے یہ نیا سانچہ دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا:

میرے ایک عزیز نے دو برس پیشتر اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اب اپنی ساری ٹریننگ مکمل کر لی ہے تو کسی تحصیل میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے طور پر تعیناتی کا مرحلہ پیش ہے، مگر گزشتہ آٹھ ماہ

سے وہ تعینات نہیں ہو سکا، کیونکہ جس ضلع میں بھی اس کی تقرری کی جاتی ہے، وہاں سے اسمبلی کا ممبر اعتراض کر دیتا ہے کہ یہ میرا آدمی نہیں ہے۔ یہاں میری مرضی کے مطابق تقرری ہو گی، اس پر وہ تقرری منسوخ ہو جاتی ہے... اب کل اُسے سیکریٹریٹ میں بلا کر کہا گیا ہے کہ پہلے اپنے طور پر کسی اسمبلی کے ممبر کی حمایت حاصل کرو، تاکہ تمھیں اس کے علاقے میں تعینات کیا جا سکے۔

فروری ۱۹۸۵ء میں جنرل ضیاء الحق نے بلا پارٹی الیکشن کرائے تھے۔ اس کے بعد اسمبلی ممبران کی انفرادی حمایت اور تابعداری پہلے حاصل کرنے اور پھر قائم رکھنے کے لیے انھیں بہت سی مراعات ملنے لگیں، جن کی وجہ سے وہ اپنے اپنے علاقے میں بہت منھ زور ہو گئے اور سرکاری ملازموں کی بھرتی، ملازمت اور تبادلوں میں دخل اندازی کرنے لگے تھے۔ اس لحاظ سے میرے رفیق کار کی پریشانی کوئی اتفاقیہ یا منفرد وقوعہ نہ تھی، بلکہ مذکورہ بالا ڈھلان کے رُخ کا تعین کرتی تھی۔ اور تب تک کے نشیب کی پیمائش تھی۔

۱۹۵۸ء میں ہماری اعلیٰ ملازمت کا سفر حکومت کی اس تنبیہ سے شروع ہوا تھا کہ ہم بالکل غیر جانبدار ہیں اور مفاد پرست عناصر سے محفوظ فاصلہ رکھیں۔ مگر ۱۹۸۵ء میں اعلیٰ ملازموں کو آغازِ سفر میں ہی حکومت کی طرف سے یہ واضح تلقین کی جا رہی تھی کہ وہ مفاد پرست عناصر کی سرپرستی حاصل کریں۔ اور ان کے فدوی بن کر رہیں ؏

ببیں تفاوتِ راہ از کجا... تا بہ کجا است

وطن کے مینار کے پہلے گیارہ برس میں بیوروکریسی کی سربلندی... جو اگلے سترہ برس میں بتدریج سرنگوں کی گئی... سرفرازی سے سجدہ ریزی تک... اس رپورتاژ کے اس حصے میں اسی خود ساختہ انحطاط کی بکھری بکھری جھلکیاں ہیں۔ کوئی اس وقت کے ماحول کی علامت، کہیں کسی فرد کا درد و کرب اور کہیں کہیں میری اپنی لڑکھنی۔ ان بکھرے بکھرے منتشر نقطوں کو اگر ملاتے جائیں تو قاری کو نظم و نسق کی وہ ڈھلان نظر آ جائے گی جو ۱۹۵۸ء کے بعد کی تمام حکومتیں اپنے مفادات کے لیے کھودتی رہی ہیں۔

میری نظر دوبارہ میرے مینار کی تیسری منزل کی طرف مڑ جاتی ہے۔ جہاں ہمیں اکیڈمی میں ضلعی انتظامیہ چلانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ یہ ملکی امور کی پہلی سیڑھی تھی، کیونکہ ضلع ہمارے ملک کی سب سے چھوٹی اور نچلی انتظامی اکائی ہے۔ جس میں ہر محکمے کا ضلعی سربراہ اسی محکمے کی مقامی اور زمینی نمائندگی کرتا ہے۔ ان تمام نمائندوں کے مابین ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنا ڈپٹی کمشنر کی ذمے داری ہے، تاکہ جملہ ضلعی نظام یک جان ہو کر ہموار انداز میں چلتا رہے۔ ان دنوں اس رابطے کی نشان دہی

اس طرح ہوتی تھی کہ اپنے ضلع کی حدود میں دورہ کرتے وقت اس کی کار پر پاکستان کا جھنڈا نصب ہوتا تھا۔ تمام محکموں کے ضلعی نمائندوں اور رابطۂ کار ضلعی سربراہ کے لیے لازم تھا کہ وہ ہر مہینے کے دس پندرہ دن ضلع میں دورے کرتے رہیں، تاکہ وہ کونے کونے کے مقامی مسائل سے آگاہ ہوتے رہیں۔ دوروں کے دوران قیام و طعام کے لیے جابجا ریسٹ ہاؤس (rest house) موجود تھے۔

علاوہ ازیں ریلوے لائن اور سڑک سے دور افتادہ مقامات کا دورہ کرنے کے لیے ہمیں اکیڈمی میں گھڑسواری کی کڑی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ یہ بھی لازمی تھا کہ ہر دورے کے بعد واپسی پر اپنے مشاہدات تحریر کریں (tour notes) تاکہ آئندہ آنے والے افسروں کے پیش نظر رہیں۔ خود ٹائپ کرنا بھی سیکھنا ہوتا تھا، تاکہ صیغۂ راز میں رکھے جانے والے کاغذات ہم عملے سے ٹائپ کروانے کی بجائے خود ہی ٹائپ کیا کریں۔ ہر سرکاری ملازم اور افسر کی کارکردگی کے متعلق اس کے اوپر والا نگران بڑی دیانتداری اور معروضیت سے سالانہ رپورٹ (جو صیغۂ راز میں رہتی تھی) لکھتا تھا، جس کے منفی اندراجات کے بارے میں متعلقہ سرکاری ملازم کو اپنی صفائی کا موقع دیا جاتا تھا۔

پاکستان کے سنہری زمانے میں ان سب ہدایات پر بڑی سختی اور دیانتداری سے عمل کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے جب ہم آزاد ہوئے، تو بیوروکریسی کی مثالیت (idealism) اور خلوص بھری وارفتگی کی وجہ سے انگریزی دور سے بہتر دور میں جلد ہی داخل ہو گئے۔ اس مرحلے پر اس بے لوث کارکردگی کی تھوڑی سی گنتی اس لیے ضروری ہے کہ آئندہ اس سے انحراف کا زمانہ شروع ہونے والا تھا۔

دونوں مینار سیدھے ستواں اُوپر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔

قوم بڑے فخریہ انداز میں وطن کے مینار کی بڑھتی ہوئی بلندی سے مزید سنہری توقعات وابستہ کر رہی تھی۔

میرے مینار میں وطن کے مینار میں مدغم ہو کر کچھ کر گزرنے کے مرغولے ''من تو شدم تو من شدی'' کے انداز میں اُٹھ رہے تھے۔

ڈائریکٹر برجیس (Burgess) نے ہمیں ایک لیکچر میں بتایا:

ضلع کے انتظام میں آپ مسٹر علاء الدین کو اپنا عملی نمونہ (role model) بنا سکتے ہیں[1]۔ وہ چاہے دفتر میں بیٹھے ہوں یا علاقے میں دورہ کر رہے ہوں، پورا ضلع ان کی موجودگی ہر وقت محسوس کرتا رہتا ہے، کیونکہ وہاں کے عوام اب ان کی محنت، اہلیت، دیانتداری اور غیر جانبداری پر مکمل بھروسا کرتے ہیں۔

ان کا یہ جملہ تو اس وقت ایک لیکچر کا حصہ تھا، جو موضوع کی وضاحت کے لیے روانی میں بولا گیا، لیکن بعد ازاں یہ میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ بن گیا۔ ہمارے تربیتی پروگرام کا ایک چھوٹا سا مرحلہ

یہ بھی تھا کہ کلاس روم میں چار ماہ کے لیکچروں کے ذریعے ہمیں جب دیوانی، فوجداری، مال گزاری اور عوامی انتظامی امور کے علم سے کچھ شناسائی ہو جاتی، تو تمام پروبیشنروں (probationers) کو ہفتے بھر کے لیے فرداً فرداً ایک ایک ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے حوالے کر دیا جاتا تاکہ ہم ان کی روزانہ مصروفیات میں ان قوانین کے اطلاق کی عملی صورت سے بھی شناسا ہو جائیں۔ خوش قسمتی سے مجھے اس پروگرام کے تحت علاء الدین صاحب کے ساتھ منسلک کیا گیا۔

وہ ایک خاموش طبع اور کم گو فرد تھے، اور نرم خو، نرم گفتار اور باتحمل افسر تھے۔ میں پورا ہفتہ ان کے دفتر اور عدالت میں موجود رہ کر ان کا طریق کار دیکھتا رہا جس میں ڈیڑھ دو دن کا دورہ بھی شامل تھا۔ سفر کے دوران انھوں نے دو ٹرکوں اور بس کو ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی پر روکا۔ ان کے کاغذات لے کر انھیں ہدایت کی کہ وہ بعد میں اس علاقے کے تھانے سے واپس لے لیں اور اپنے عملے کو ہدایت کی کہ الزام کے متعلق نوٹ کے ہمراہ یہ کاغذات فوراً تھانے بھجوا دیں، تاکہ وہ قانون کے مطابق کارروائی کر سکیں۔ اسی طرح سفر کے دوران اپنی گاڑی موڑ کر بلا اطلاع کسی گاؤں میں چلے گئے۔ پہلے وہاں کی ڈسپنسری میں جا کر عملے اور مریضوں سے بات چیت کی۔ ادویات کی موجودگی کے متعلق استفسار کیا اور وہیں کھڑے کھڑے ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کو اپنے مشاہدات کے متعلق نوٹ لکھوایا اور کہا کہ وہ مناسب محکمانہ کارروائی کریں۔ پھر اسی گاؤں کے بازار میں چکر لگا کر صفائی اور اشیائے خوردنی کی دکانوں کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر متعلقہ محکموں کے ضلعی سربراہوں کو اپنے مشاہدات کا نوٹ لکھوا دیا اور مناسب کارروائی کی درخواست کی۔

ہفتے بھر کی وابستگی کے بعد ہم سب اپنے اپنے علاقوں سے واپس اکیڈمی میں پہنچ گئے اور کئی دن تک اپنے اپنے تجربوں سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے رہے۔ پھر جیسے جیسے ماہ و سال گزرتے گئے اور میں انتظامیہ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مختلف علاقوں اور محکموں میں تعینات ہوتا رہا، تو مجھ تک علاء الدین صاحب کی اچھی شہرت کی خبریں پہنچتی رہیں، جو ہر اُس علاقے یا محکمے سے سنی جاتی تھیں، جہاں جہاں وہ کام کر چکے تھے۔

ان دنوں مشرقی اور مغربی پاکستان کو باہم قریب کر کے ایک متحدہ ملک بنانے کا ہر جگہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ اکیڈمی میں گیارہ مغربی پاکستانیوں کو بنگالی زبان سکھانے کی کلاس ہوتی تھی اور بارہ بنگالیوں کو اُردو پڑھانے کے لیے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم آیا کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ اپنی کلاس کو مقامی کلچر کا اندازہ دینے کے لیے وقتاً فوقتاً لاہور شہر کی سیر بھی کرایا کرتے تھے۔ جس میں شاہی قلعے، شاہی مسجد اور ''شاہی محلے'' کے دورے بھی شامل تھے۔ تھوڑے عرصے بعد

ہمارے کمروں کے مکین اس طرح ادل بدل کیے جاتے تھے کہ سب بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کو باری باری اکٹھے رہنے کا موقع مل سکے۔ ڈائننگ روم میں سب کو اکٹھے کھانا پڑتا تھا اور کمروں میں کھانا منگوانے کی اجازت نہ تھی۔ اکیڈمی میں چند ماہ گزارنے کے بعد ہمیں چار ماہ کے لیے مشرقی پاکستان بھیجا جاتا تھا، جہاں مختلف اضلاع کی ضلع کچہری میں ہم زیر تربیت مجسٹریٹ درجہ سوم کے طور پر کام کرتے اور سب سے بڑا اہتمام یہ تھا کہ انگلستان سے واپسی پر جب پہلی باضابطہ تعیناتی کا مرحلہ آتا تھا، تو سارے مغربی پاکستانیوں کو تین برس کے لیے مشرقی پاکستان میں اور سارے بنگالیوں کو تین برس تک مغربی پاکستان میں تعینات کیا جاتا تھا۔ اس طرح بعض دفعہ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی آپس میں شادی بھی ہو جاتی تھی۔

اکیڈمی میں بنگالیوں سے چند ماہ کی قریبی سنگت کے دوران میں ان کی پاکستانیت کا قائل ہو چکا تھا، اس لیے مشرقی پاکستان میں اپنی پہلی تقرری کے سلسلے میں چشم براہ تھا۔ علاوہ ازیں، اپنے چار ماہ کے قیام کے دوران مجھے وہ خطہ بہت پسند آیا تھا جس کی زمین پر سبزہ ہی سبزہ تھا اور دل میں خلوص ہی خلوص تھا۔ اسی وجہ سے ان کی محبت بھی خالص ہوتی تھی اور نفرت بھی خالص ہوتی تھی۔ وہ بنگالی سے بھی پیار کرتے تھے اور اُردو سے بھی پیار کرتے تھے۔ مثلاً سابقہ نواب آف ڈھاکہ کا سارا خاندان اور برادری اُردو میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی لیے سارے بنگالی بہار سے آنے والوں کے لسانی فخر و امتیاز سے نالاں ہی رہتے تھے۔ جن میں سے اکثر برملا کہتے تھے کہ اُردو بولنے والا کوئی اور زبان نہیں بولے گا۔

ہم لوگوں نے اپنی ٹریننگ شروع تو اسی پروگرام کے تحت کی تھی، جو دس برس سے مسلسل جاری تھا، مگر جیسے جیسے صدر ایوب کی نئی حکومت کے قدم جمتے گئے، اس پروگرام میں ایسی تبدیلیاں کی جانے لگیں جو ہماری سمجھ اور خواہش سے بالا تھیں، ملک کے دونوں بازوؤں کو ملانے والی سابقہ روایت سے انحراف کرتی تھیں اور متحدہ پاکستان کی بنیادی ترتیب میں پچکاڈ یا چب (dent) ڈال رہی تھیں۔ اس وقت ان کا عمومی جواز تو یہی تھا کہ آزادی کے بعد نوآبادیاتی خدوخال کو ختم کرنا ضروری تھا، لیکن عملی طور پر یہ کچھ ایسے امتیازی انداز میں ہو رہا تھا کہ اگر کچھ سابقہ نقوش دانستہ مٹائے جا رہے تھے تو کئی دوسرے دانستہ طور پر مزید اجاگر بھی کیے جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وطن کے مینار کی ساتویں منزل میں آج بھی کئی نوآبادیاتی خدوخال بڑے ٹھسے سے براجمان ہیں۔ مثلاً وڈیروں کا جاگیرداری نظام، ملک کا عسکری نظام، مذہبی فرقہ پرستی کا نظام اور ہمارے لیڈروں کی غلامانہ ذہنیت کا نظام وغیرہ۔

بہت سی نئی تبدیلیوں میں سے صرف تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔ جن کا تعلق بیوروکریسی سے تھا۔ سب سے پہلا حکم یہ جاری ہوا کہ آئندہ کے لیے ڈپٹی کمشنر کی کار پر پاکستانی جھنڈا نصب نہیں ہوگا یعنی آئندہ یہ تشہیر نہیں ہوگی کہ وہ ضلعی سطح پر تمام محکموں کا رابطہ کار ہے۔

دوسرا حکم جاری تو نہیں ہوا، مگر ایک افواہ نے ہماری اکیڈمی کے در پر اُس وقت دستک دی، جب اوکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں ہمارے داخلے ہو چکے تھے اور پاسپورٹ بنوانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ افواہ یہ تھی کہ شاید اس دفعہ ہمارے لیے انگلستان میں ٹریننگ کا پروگرام منسوخ ہو جائے۔ کچھ دنوں بعد اس افواہ کی تصدیق ڈائریکٹر برجیس (Burgess) نے یوں کی کہ حکومت پاکستان نے برٹش گورنمنٹ کو اس پروگرام کی منسوخی کے لیے خط لکھا تھا، مگر برٹش کامن ویلتھ آفس نے اتفاق نہیں کیا، جو اس تعلیم وتربیت کے جملہ اخراجات برداشت کرتا تھا اور جس نے یہ پروگرام ان تمام نوآزاد ممالک کی رہنمائی کے لیے تراشا تھا، جو سابقہ برٹش ایمپائر کا حصہ تھے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد حال ہی میں باری باری آزاد ہو رہے تھے۔ پھر معلوم ہوا کہ خط وکتابت ابھی جاری ہے۔ چنانچہ اگلے چند ماہ میں کبھی خبر آتی کہ ہم انگلستان جائیں گے اور کبھی آتی کہ نہیں جائیں گے۔ بالآخر ستمبر ۱۹۵۹ء میں ہم اس طرح روانہ ہوئے کہ آخر دم تک یقین نہ تھا کہ ہم واقعی جا رہے ہیں۔

تیسرا حکم ہمیں ایک برس بعد انگلستان سے واپسی پر ملا، جب میں بڑے شوق سے مشرقی پاکستان میں تعیناتی کے تصورات سے سرشار تھا۔ یہ حکم بڑا حتمی تھا کہ پرانی پالیسی ترک کر دی گئی ہے اور نئی پالیسی کے تحت اب مشرقی اور مغربی پاکستان کے سرکاری ملازمین صرف اپنے اپنے علاقوں میں ہی تعینات ہوں گے۔ چنانچہ میری فعال ملازمت کی ابتدا مشرقی پاکستان کی بجائے مغربی پاکستان میں ہوگئی۔ اس کا صرف ایک ہی فائدہ ہوا، کہ میں پاکستان کی تعمیر میں مضمر خرابی کی پہلی شکل سے آگاہ ہونے لگا۔

وطن کا مینار اس نئی پالیسی کے جھٹکے سے ذرا ہلا۔ پھر حسب سابق سیدھا ستواں کھڑا ہو گیا، مگر اس میں کہیں ایک چھوٹا سا چب (dent) پڑ گیا تھا... یا شاید ایک سے زیادہ چب تھے۔

یہ گنتی اب وقت کی انگلیاں کر رہی تھیں۔

میں فقط دیکھ رہا تھا۔

قوم خاموش تھی۔

نئی حکومت کی تحسین کا مسلسل شور نہ معلوم کہاں سے اُٹھتا رہتا تھا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ پاکستان کے سنہری دور میں وطن کی تعمیر میں مضمر خرابی کی ساری

اشکال نے مصلحتوں کے لبادے اوڑھ رکھے تھے۔[۸] ''میری ذات'' اور ''میری مرضی'' کو اپنے اپنے دامن تلے چھپایا ہوا تھا اور من مانی اپنی یلغار کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھی۔

وقت کی قسم کھانے والے نے جب سے انسانی خسارے کی نشان دہی کی تھی (سورۂ عصر) تب سے وقت کی انگلیاں ہر وقت گنتی کرتی رہتی ہیں... انسانی عزائم کی، انسانی نیت کی اور انسانی اعمال کی گنتی...

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد اس گنتی کی رفتار تو وہی رہی، جو پہلے تھی مگر وقت کے تیوروں میں بیداری، توجہ اور نگرانی زیادہ ہوگئیں۔ کیونکہ اُس مضر خرابی کی پہلی شکل اپنا لبادہ اُتار کر بالکل سامنے آ چکی تھی اور اُس کے سارے پیکر سے ''میری مرضی'' جھانک رہی تھی۔ جو قوم پہلے ہی اصلاح کی راہ پر اس طرح گامزن تھی کہ اُس کے نوآموز سیاستدان بعد از خرابیِ بسیار نئے وطن کا آئین تیار کر کے اب الیکشن کی تیاری کر رہے تھے اور اس کی محبِ وطن بیورو کریسی انگریزی دور کے حُسنِ انتظام کو بھی ایک قدم آگے لے جا چکی تھی، اس اصلاح شدہ قوم کو اس پیکر کی جارحانہ ''میری مرضی'' نے یکسر گمراہ قرار دے دیا اور نئی ''اصلاحات'' کی ضرورت پر نہ صرف زور دینے لگی، بلکہ یکے بعد دیگرے ان کا نفاذ بھی کرنے لگی۔

برسوں بعد ایک وقوعہ ہوا، جس کا یہاں بھی حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا۔ اپنے دورِ حکومت میں جنرل ضیاء الحق جن دنوں ملک کے آئین کو کاغذ کا ایسا ٹکڑا قرار دے رہے تھے، جسے وہ کسی وقت بھی پھاڑ کر پھینک سکتے تھے، انھی دنوں ان سے یہ قول بھی منسوب کیا گیا کہ پاکستان کے سیاستدان تو سیاست کی اے بی سی (ABC) بھی نہیں جانتے۔ ساتھ ہی ولی خان کی طرف سے اس جواب کی بھی افواہ تھی کہ ہم اے بی سی سے کہیں زیادہ جانتے ہیں، بلکہ ڈی ای ایف (DEF) تک بھی پہنچ جاتے ہیں، مگر کیا کریں اس کے بعد جی ایچ کیو ہمارا راستہ روک لیتا ہے۔

۱۹۵۶ء میں ہمارے نوآموز سیاستدان جو اے بی سی سے روانہ ہوئے تھے اور اب نئے وطن کا آئین بہ مشکل بنا کر ڈی ای ایف تک پہنچے تھے کہ اچانک جنرل ہیڈ کوارٹر نے ان کا راستہ روکا۔ گمراہ قرار دے دیا اور اصلاحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس لیے وقت کی انگلیوں پر گنتی تو جاری رہی، مگر کچھ حیرت اور تعجب کے ساتھ۔ کیونکہ ''مرے کو مارے شاہ مدار'' والا محاورہ تو اکثر سنا تھا، مگر جیتے جاگتے چاق چوبند انسان کو ''قم باذن اللہ'' کہتے اور دوبارہ زندہ کرتے کبھی نہ سنا تھا... نہ ہم نے نہ وقت نے اور نہ قدرت نے۔

ان دنوں ہسٹری کے مذکورہ بالا بے نام پروفیسر جیسے فلک پیا تو خال خال ہی تھے۔ لیکن نئی

حکومت کی طرف سے اصلاحات کا شور تھا۔ اور غالب کے طرف دار بہت تھے۔ اس لیے ریاست کے بنیادی ڈیزائن میں یہ چھوٹے چھوٹے چپ (dent) کسی کو بھی نظر نہ آئے۔ ایسی حالت میں ع

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

لیکن چند برس بعد صدر ایوب نے اپنی سوانح عمری شائع کی، تو دل کے معاملے کھلنے لگے اور قوم ان اصلاحات کے پس منظر اور اُس خاکے سے واقف ہوئی، جو انھوں نے ۱۹۵۴ء میں لندن کے ہوٹل میں بیٹھ کر ترتیب دیا تھا۔[۹] اس خاکے میں کہی گئی تو یہ تھی کہ قوم کو چند گنی چنی اصلاحات کی ضرورت ہے، مگر ان کہی یہ تھی کہ مرکزی حکومت کی کابینہ میں باوردی کمانڈر ان چیف کی ڈیفنس منسٹر کے طور پر شمولیت اس کی جزوی کامیابی تھی۔ اس کے بعد اب ملک کے کلی اقتدار کی طرف پیش قدمی تھی اور جب اقتدار ملے گا تو اس کی مضبوطی کے لیے اصلاحات کی جائیں گی۔

وقت کی اُنگلیاں اس کہی، ان کہی اور اصلاحات کی بھی گنتی کر رہی تھیں، اور اب یہی گنتی قوم کو بتائے گی کہ کون سی اصلاحات سے ملک کو استحکام ملا اور کن سے اقتدار کو دوام ملا یا شخصیات کو انعام ملا۔ اُس وقت تو قوم صرف یہی اندازہ کر سکی تھی کہ بیورو کریسی کے متعلق مذکورہ بالا نئے احکام دراصل وہ موہوم سے اوّلین جھونکے تھے جو ہوا کا رُخ بدلے جانے کا اشارہ تو دے رہے تھے، مگر سمت کا تعین نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی ان کی زد میں آنے والے سرکاری ملازمین کے ذہنوں میں اندیشہ ہائے دور دراز سر اُٹھانے لگے۔

پہلا اندیشہ تو یہ تھا کہ شاید فوج کی بالادستی کے لیے مارشل لا کے دوران غیر فوجی (civilian) کے چند پر کاٹ دیے جائیں گے، تاکہ وہ حسبِ سابق اپنی آزاد اور بلند پرواز جاری نہ رکھ سکیں۔ مگر وقت نے بتایا کہ یہ کوئی عارضی اقدام نہ تھے، بلکہ ایک مسلسل عمل کا آغاز تھے۔ جس میں آئندہ کی تمام حکومتیں بھی شامل ہوتی رہیں گی۔ اس عمل میں سویلین اداروں کے کچھ پر کاٹے جائیں گے۔ کچھ نوچے جائیں گے، اور کچھ توڑے جائیں گے۔ تاکہ بیورو کریسی کی اُڑان بتدریج گھٹتی جائے، اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے قانونی مہرہ نکال دیا جائے گا۔[۱۰]

دوسرا اندیشہ اس نئے حکم کے متعلق تھا کہ قومی یک جہتی کو فروغ دینے والی گیارہ برس پرانی پالیسی اچانک ترک کر دی گئی ہے۔ اس لیے آئندہ مشرق والے سرکاری ملازمین مغرب میں اور مغرب والے مشرق میں تعینات نہیں ہوں گے۔ اس اندیشے میں وسوسوں سے زیادہ حیرت تھی۔ کیونکہ اُردو کو واحد قومی زبان بنانے پر ملکی سالمیت کو جو زخم ۱۹۴۸ء میں لگے تھے، وہ مزید گہرے ہونے کے بعد اب مندمل ہو رہے تھے۔ ان پر مئی ۱۹۵۴ء میں سکون بخش اور شفا آمیز مرہم رکھ دیا

گیا تھا۔ جب قومی اسمبلی نے اُردو اور بنگالی دونوں کو قومی زبان ہونے کا درجہ دے دیا۔ اسی وجہ سے مشرقی پاکستان نے بڑے فراخ دلانہ ایثار سے برابری کا فارمولا مان لیا۔ تب ملک کا ۱۹۵۶ء والا آئین بن بھی گیا اور نافذ بھی ہو گیا۔ دیر آید درست آید... لیکن اس درستی کے بعد جب نئی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں دونوں حصوں کے درمیان انتظامی، سماجی بلکہ معنوی رابطہ حکماً گھٹا دیا، تو یہ نئی پالیسیاں بعید از فہم ہی ہیں۔ اُس وقت بھی اور بعد میں بھی۔ حتیٰ کہ وقت نے اپنی رفتار اور اپنے انداز میں برسوں بعد بتایا کہ ان پالیسیوں نے بالکل لال گلاب کے موسم میں ایسے بیج بو دیے تھے جس سے اُگنے والے پھولوں کے رنگ بتدریج کالے ہوتے گئے۔

برٹش دور میں انڈین سول سروس کے کُل ہند مقابلے کے امتحان میں مقامی باشندوں کو حصہ لینے کی اجازت ۱۹۲۲ء میں دی گئی تھی، اور تب سے اب تک (دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کے علاوہ) ان کی ابتدائی تربیت انگلستان میں ہو رہی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان نے یہ سلسلہ جاری رکھا، ان تمام نو آزاد ممالک کی طرح جو ماضی میں ہماری طرح انگریزی سلطنت کا حصہ تھے اور اب برٹش کامن ویلتھ کی مہمان نوازی سے مستفید ہو رہے تھے، لیکن صدر ایوب کی نئی حکومت چونکہ پر کاٹنے والی حکمتِ عملی اپنا رہی تھی اس لیے بڑی عُجلت میں یہ تربیتی بندوبست ختم کرنے کے درپے ہو گئی۔ اگر برٹش حکومت پاکستان کی فوجی حکومت کی بات بلا چون چرا مان لیتی تو ہمارا گروپ بھی یقیناً اس کی زد میں آ جاتا۔ اور انگلستان نہ جا سکتا، لیکن برٹش کامن ویلتھ آفس کے اعتراضات اور خط و کتابت میں طوالت کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی، اس میں ایک پرانے مسلسل اور جاری پروگرام کے تحت ہمیں وہاں جانے کا موقع مل گیا۔

بیرونی تربیت کی اس قابلِ قدر سہولت سے مستفید ہونے والا ہمارا آخری گروپ تھا... اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔"

اگلے تین برس کے دوران سول سروس اکیڈمی والی ٹریننگ تو اپنے چند ماہ کے دورانیے کے مطابق حسب سابق جاری رہی، مگر اُس کے بعد بیرونِ ملک تربیت والا دورانیہ پاکستان کے اندر تجربات میں بھٹکنے لگا۔ انھی تجربوں میں مشرقی پاکستان میں چار ماہ کی ضلعی تعیناتی کہیں گم ہو گئی، جس کی وجہ سے ملک کے دونوں حصوں میں فاصلے تھوڑے اور بڑھ گئے۔

دو برس بعد اس تجربہ گاہ سے ایک نیا تربیتی پروگرام یوں برآمد ہوا کہ ۱۹۶۲ء والے گروپ کے لیے اکیڈمی کی ٹریننگ کا دورانیہ بڑھا کر ایک برس کر دیا جائے گا اور اس کے بعد انھیں انگلستان کی بجائے کاکول کی ملٹری اکیڈمی بھیجا جائے گا، جہاں وہ پانچ ماہ کے لیے اس فوجی تربیت میں شامل

رہیں گے جو فوج میں کمیشن ملنے والے نئے افسروں کو دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے اضلاع میں چار ماہ کی سابقہ تربیتی تعیناتی بھی ختم ہو جائے گی اور اس کی بجائے تین چار ہفتوں کے لیے سارے مشرقی پاکستان کا تیز رفتار دورہ شامل ہو گا، تاکہ ملک کے مشرقی حصے سے ایک اچٹتی سی واقفیت ہو سکے... یعنی صرف ''ہیلو ہیلو'' (hello) تو ہو، مگر جم کر معنی خیز گفتگو کا موقع نہ دیا جائے۔

یہ بھی اعلان ہوا کہ آئندہ کے لیے سول سرونٹس کی ٹریننگ ہمیشہ اسی پروگرام کے مطابق ہوا کرے گی۔

پرانی روایت صرف اس حد تک قائم رکھی گئی کہ ۱۹۶۲ء کا گروپ جب اکیڈمی میں تھا تو سابقہ برسوں کی طرح اس سال بھی ان کے سالانہ ڈنر کے مہمان خصوصی صدرِ پاکستان ایوب خان تھے۔ وہاں اُنھوں نے نئے تربیتی پروگرام کی بڑی تعریف کی اور فرمایا:

By sending you to the military academy in Kakul we want to make a man out of you.

''آپ کو کاکول کی ملٹری اکیڈمی میں اس لیے بھیجا جا رہا ہے کہ آپ لوگ مرد بن سکیں۔''

بدقسمتی سے وہ مجوزہ نمونے کے مسلح ذہن والے مرد تو نہ بن سکے مگر کچھ مردانگی کا احساس اس طرح ہوا کہ ملٹری اکیڈمی میں نت نئے جھگڑے ہونے لگے۔ اُن دنوں بارہ جماعت" پاس کرنے کے بعد فوج میں کمیشن مل جاتا تھا، جس کے بعد انھیں کاکول میں پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ ملٹری اکیڈمی میں زیر تربیت فوجی افسران کی یہی سطح تھی۔ مگر سول سروس والے ایم اے (MA) کرنے کے بعد کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لیکچرر رہ چکے تھے، بلکہ ان میں سے چند ایک امریکہ اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں سے مقابلے کے امتحان میں شامل ہو کر منتخب ہوئے تھے۔ ان تمام سویلین افسروں کو زیر تربیت فوجی افسروں سے نیچے کی سینیارٹی (seniority) دی گئی۔ یعنی First Term Trainee کا جونیئر (junior) درجہ۔ اس وجہ سے کئی سابقہ پروفیسروں کو اپنے سابقہ شاگردوں کے سامنے ایڑیاں جوڑ کر اور سیلیوٹ کر کے ان کے منطقی اور غیر منطقی احکام بجا لانے پڑتے تھے۔ اس ماحول میں انسانی اور منصبی رشتے بے ڈھب اور بے جوڑ تناؤ کا شکار ہونے لگے۔ اس کے علاوہ بھی ساری ٹریننگ کے حرف وصوت خالص فوجی افسران تراشنے کے لیے تھے، جن کی صلاحیتوں کا ہدف میدانِ جنگ میں دشمن کو تباہ و برباد کر کے شکست دینا تھا۔ جب کہ سول سرونٹس کی فہم کا ہدف امن میں شناوری کے دوران زندگی کی ترتیب و تعمیر تھا۔ اس لیے سویلین افسران باوردی پریڈوں، کئی قسم کے اسلحہ جات کی سنگت، فوجی گفتار و اطوار کے

ساتھ ساتھ کھلے کانوں اور بند منھ سے صرف یس سر (Yes sir!) کہنے کے ساتھ نباہ نہ کر سکے، جس کی وجہ سے سزائیں، چارج شیٹ اور احتجاج اُبھرنے لگے، بلکہ ایک آدھ دفعہ تو بغاوت (mutiny) کے الزام تک نوبت پہنچ گئی۔ چنانچہ اڑھائی تین ماہ بعد اس ٹیڑھی بینگی صورتِ حال کو ناقابلِ عمل قرار دیتے ہوئے یہ پروگرام نہ صرف اس برس کے لیے اپنے دورانیے سے پہلے ختم کر دیا گیا، بلکہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

اس پروگرام کی کامیابی صرف اس حد تک تھی کہ وطن کے چنار میں سول انتظامیہ کو اپنی آئندہ حیثیت کا احساس ہونے لگا کہ اگر وہ چمکنا چاہتے ہیں تو چاند کی طرح مستعار روشنی پر ہی اکتفا کرنا ہو گا۔ سورج جیسی تیز اندرونی روشنی تو صرف عسکریت ہی اُگل سکے گی۔

اس کے بعد پاکستان کے سول سرونٹس (Civil Servants) کا تربیتی پروگرام تو آئندہ کے لیے صرف کلاس روم کے لیکچروں تک محدود ہو گیا، جہاں عملی تربیت کا سایہ بھی نہ تھا۔ مگر دولتِ مشترکہ کے باقی نوآموز ممالک برٹش حکومت کی سرزمین پر بسنے والے تربیتی چشمے سے فیض یاب ہوتے رہے۔

انسان کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے، اس کے ہاتھ کی گرفت وقت کی رفتار کو نہیں روک سکتی۔ اسی انداز میں وطن کا چنار حسبِ سابق بلند ہو رہا تھا، جیسے پچھلے گیارہ برس میں ہوتا رہا تھا لیکن اب اس تعمیر کی تربیت اور ساخت کچھ بدلنے لگی تھی۔ ماضی میں باہر کا سیاسی ڈھانچہ ناپائیدار اور بھربھرا سا لگتا تھا، مگر اندر کا انتظامی ڈھانچہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا جو ہمیں سنہری زمانے میں لے گیا۔ اب حال کی صورت یوں بدلنے لگی کہ باہر کی دیواروں کی مضبوطی کے تو خوشامدانہ چرچے ہونے لگے، کیونکہ ان پر اصلاحات کے نام پر بڑے تیز رنگ چڑھائے جا رہے تھے مگر اندر کے انتظامی ڈھانچے کی اینٹیں جس بھٹے میں پکائی جا رہی تھیں اس کی آنچ دانستہ کم کر دی گئی تھی، جس سے ان کی اندرونی ساخت میں ہوا کے بلبلے سے پڑنے لگے۔ جو اُن دنوں تو محسوس نہیں ہوتے تھے مگر بعد میں وقت کی گنتی نے بتایا کہ ان اندرونی ہوا بھرے بلبلوں کی وجہ سے وطن کے سنہری زمانے کا سابقہ سنہرا پن دھیرے دھیرے ماند پڑنے لگا۔

بیوروکریسی پر اثر انداز ہونے والے مندرجہ بالا احکام کے پسِ پردہ یہ مقصد تو واضح تھا کہ فوجی بالادستی کی تدریجی یلغار سول سوسائٹی کو زیر دست رکھنا چاہتی تھی۔ جس کی حربی تفصیلات تو جنرل ایوب خان کے ۱۹۵۴ء والے اصلاحی خاکے کی ان کہی کی اوٹ میں تھیں لیکن یہ معمہ بعید از فہم تھا کہ اب ایسی نئی پالیسی دانستہ کیوں بنائی جا رہی تھی، جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین روز افزوں بڑھنے والی قربت میں بتدریج کمی کے راستے کھول دے، کیونکہ ماضی کے برعکس اگر آئندہ سرکاری

ملازمین کی تعیناتی اُلٹ پلٹ کر ایک دوسرے کے حصے میں نہیں ہو گی، بلکہ صرف اپنے علاقے میں ہو گی تو باہمی فاصلے کم نہیں ہوں گے، بلکہ بڑھتے جائیں گے۔

یہ معمہ اُس وقت تو قوم کے لیے ایک معمہ ہی رہا، مگر بعد میں بھی یہ حل نہ ہو سکا۔ کیونکہ وقت کی انگلیوں نے اپنی خاموش گنتی سے مزید اُلجھن پیدا کر دی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ۱۹۶۰ء کی اس انتظامی پالیسی کے صرف دو برس بعد مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں تک صدر ایوب کا یہ خیال بھی پہنچایا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو علیحدہ ہو سکتے ہیں۔

یہ انکشاف ایک سابق وفاقی وزیر محمد منیر صاحب نے کیا جو سابق چیف جسٹس آف پاکستان بھی تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنی تصنیف[۱۳] میں یہ جائزہ لیا کہ کس طرح قائداعظم کے سماجی انصاف والے اسلام کے برعکس ان کے تصورِ پاکستان کو بتدریج مُلّا کے فتنہ انگیز اسلام کی طرف دانستہ دھکیلا گیا۔ اس کتاب کے دیباچے کے مطابق قائداعظم کی وفات کے چھے ماہ بعد یہ عمل نواب زادہ لیاقت علی خان نے قراردادِ مقاصد سے شروع کیا، اگلی حکومتوں نے آگے چلایا اور جنرل ضیاء الحق نے اپنے دور میں مکمل کر دیا۔ اس عمل کی رُوداد بتانے میں انھوں نے بعض سیاسی اور انتظامی امور پر بھی روشنی ڈالی ہے، جس سے اس حیران کن سوچ یا خواہش کا بھی کچھ سراغ ملتا ہے، جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین سرکاری ملازموں کی تعیناتی کے متعلق پہلی فوجی حکومت کے انتظامی فیصلوں سے جھلکتی ہے۔ اپنی کتاب کے صفحہ ۹۲ اور ۹۳ پر وہ لکھتے ہیں۔ (انگریزی سے ترجمہ):

۱۹۶۲ء میں کچھ عرصہ کے لیے میں صدر ایوب کی کابینہ میں شامل ہوا، تو میں نے دیکھا کہ قومی اسمبلی کا کردار مثبت نہ تھا۔ ہر روز کی کارروائی یہ ہوتی تھی کہ سب ممبران مشرقی پاکستان کے ممبروں کی طویل تقاریر سنتے رہتے، جن میں یہی گلے شکوے ہوتے تھے کہ مرکزی حکومت نہ صرف ان سے سوتیلی اولاد والا سلوک کرتی ہے، بلکہ اس صوبے کا مسلسل استحصال بھی کیا جاتا ہے۔ ایوب خان ریڈیو پر یہ تقاریر سنتے رہتے تھے اور بیزار ہوتے رہتے تھے کیونکہ کابینہ کے وزراء یا مشرقی اور مغربی پاکستان کے ممبرانِ اسمبلی کی طرف سے مکمل خاموشی ہی رہتی تھی اور ان میں سے کوئی بھی مؤثر جواب دینے یا ان الزامات کی تردید کرنے کو کھڑا نہ ہوتا تھا۔ میں نے اس معاملے میں صدر ایوب سے بات کی اور تجویز پیش کی کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے مابین مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لیے مشرقی پاکستانیوں کے لیے بہتر ہو گا کہ وہ اپنا گھر خود سنبھالیں۔ صدر ایوب نے میرے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے مجھے کہا کہ میں اس موضوع پر مشرقی پاکستان کے سرکردہ لیڈروں سے بات چیت کروں۔ چنانچہ میں نے مشرقی پاکستان کے سابقہ وزیر مسٹر رمیز الدین سے یہ موضوع چھیڑا، تو انھوں نے فوری طور پر بڑے صاف اور واضح انداز میں پوچھا کہ کیا تم مشرقی

پاکستان کو علیحدہ ہونے کی ترغیب دے رہے ہو۔ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ علیحدگی، کنفیڈریشن یا زیادہ خودمختاری جیسا کوئی حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا ''میری بات غور سے سنو۔ ہمارے صوبے میں ملکی آبادی کی اکثریت بستی ہے۔ اس لیے ہم پاکستانی ہیں۔ مگر تم لوگ اقلیت میں ہو، تم چاہو تو علیحدہ ہو جاؤ۔'' اس پر ہماری گفتگو تو وہیں ختم ہو گئی، مگر اسمبلی میں ان کی شکایات کا سلسلہ جاری رہا۔

''خوگرِ حمد'' مغربی پاکستانیوں کی ثنا خوانی سے مرعوب ہو کر صدر ایوب مشرقی پاکستانیوں کی طرف سے ''تھوڑا سا گلہ'' بار بار سنتے رہنے پر اتنے بیزار ہو گئے کہ انھوں نے اپنے وزراء یا اپنی سیاسی پارٹی کے نمائندوں کو یہ ترغیب ہی نہ دی کہ وہ اسمبلی میں ان الزامات کا کوئی مؤثر جواب دیں، بلکہ اس کی بجائے پہلے تو گلہ شکوہ کرنے والوں سے جان چھڑانے کی تجویز دے دی اور پھر یہی سوچ پال لی۔

وقت کی انگلیاں یہ گنتی بھی کر رہی تھیں کہ ۱۹۶۲ء کی یہ سوچ درجہ بہ درجہ اُوپر جاتی رہی تھی۔ پھر اگلی فوجی حکومت نے اسے مزید آگے چلاتے ہوئے ملک میں ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ نو برس بعد ۱۹۷۱ء میں اسی سوچ پر دانستہ منصوبہ بندی سے صدر یحییٰ کے دور میں جنگ وجدل سے عمل ہو گیا۔

وطن کے مینار کی پہلی منزل ریاست کے بنیادی آئینی تقاضوں کے مطابق اٹھائی گئی تھی۔ دوسری منزل کی تعمیر شروع ہوئی تو اس میں آئین کی بجائے بندوق کی عمل داری آ گئی۔ اس لیے تعمیر کا ڈیزائن بدلنے لگا اور مینار کی اساسی ترتیب اسی طرح بگڑنے لگی کہ عارضی سی حکومتِ وقت خود تو پھیلنے لگی لیکن دائمی ریاست کی ماہیت سکڑنے لگی، تاکہ حکومتی پھیلاؤ کو جگہ دی جا سکے۔ اس ڈیزائن میں سول سوسائٹی پر عسکریت کی فوقیت تھی۔ اس لیے وطن کے مینار کا ڈیل ڈول اور وضع قطع میں عدم توازن ہونے لگا اور شہری در و دیوار بیرک نما ہونے لگے۔

وطن کے سنہری دور میں پاکستان کی سول زندگی کا متحرک محور وہ انتظامی ڈھانچا تھا جس کے اُفقی اور عمودی پھیلاؤ کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے، مگر دوسری منزل کی نئی ترتیب میں اب اس محور کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ اس لیے اس کی رفتار کو بھی کم کرنا ضروری تھا۔ اس کا آغاز مذکورہ بالا انتظامی احکام سے ہو چکا تھا۔ اب ان سے اگلا قدم یہ تھا کہ سویلین شہریوں کو ان تمام اعزازات سے محروم کر دیا گیا جو ماضی کی حکومتوں نے انھیں عطا کیے تھے، اور آئندہ کے لیے بھی ان اعزازات کی نوازش بند کر دی گئی۔ یہ اعزازات بیوروکریسی کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی اعلیٰ کارکردگی کی قدر شناسانہ پہچان ہوتے تھے، مگر نئی حکومت کا یہ حکم کنایتاً دلالت کرتا تھا کہ سول سوسائٹی میں کوئی شخص اعلیٰ کارکردگی کے قابل ہی نہیں۔[14] لیکن چونکہ اسی قسم کے تمام عسکری اعزازات حسبِ سابق قائم تھے، اس لیے ریاست کے شہریوں کی نئی درجہ بندی بالکل واضح تھی، اور دوسری منزل کی تعمیر اس کے

مطابق بدلنے لگی تھی ع

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

۱۹۴۷ء میں وطن کے مینار کی پہلی منزل کی تعمیر قائداعظم کے تصورِ پاکستان کے مطابق شروع ہوئی تھی، جو ماضی اور حال کی کشید تھا۔ یہ ماضی میں خلافتِ راشدہ والے اسلامی سماجی انصاف اور حال میں برٹش جمہوری نظام پر مبنی تھا۔ اس لیے اُس وقت کے بڑے شاعر حفیظ جالندھری نے اس مینار کو قومی ترانے میں ''سایۂ خدائے ذوالجلال'' کہا تھا... لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد دوسری منزل کی تعمیر جنرل محمد ایوب خان کے تصورِ پاکستان کے متعلق بدلنے لگی، جو فوجی چھاؤنی کی فضا کی کشید تھا اور عسکریت کی بالادستی اور باقی سب کی زیردستی پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس مختلف تصور کے مطابق جب مختلف پالیسیوں کا آغاز ہوا تو اس وقت کے بڑے شاعر فیض احمد فیض نے وطن کے نئے روپ کو یوں بیان کیا ع

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کہتے ہیں فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ قائداعظم کی فکری اُڑان نے پہلے وطن کا مینار کھڑا کر دیا۔ پھر بطور گورنر جنرل تیرہ ماہ کی تقاریر میں اس کے ریاستی تقاضے سمجھائے، جن پر لبیک کہتے ہوئے بیوروکریسی وطن کو ایسے سنہری زمانے میں لے گئی جو واقعی خدائے ذوالجلال کا سایہ تھا۔ اس کی چھاؤں میں ۱۹۵۷ء تک ۱۵ رکمیشن اور کمیٹیاں قائم ہوئیں، جن کی سوچ سے کئی انتظامی اصلاحات نافذ ہوئیں، مگر ان میں سے کسی نے پاکستانی بیوروکریسی کو قائداعظم کے تصور سے ہٹانے کی نہ تو کوشش کی اور نہ ہی ایسی سوچ اُبھرنے دی۔ لیکن ۱۹۵۸ء کے فوراً بعد وہ سوچ ایک دھمک کے ساتھ برآمد ہو گئی جو ۱۹۵۴ء میں لندن کے ایک کمرے میں پاکستان کے باوردی وزیر دفاع کے ذہن میں اُبھری تھی۔[15] اس کے بعد انتظامی اصلاحات کے جتنے بھی کمیشن قائم کیے گئے وہ پاکستانی بیوروکریسی کو اس تصور سے دور... بہت دور... ہانکتے گئے۔ جسے قائداعظم نے نئی سلطنت کے سرکاری ملازموں کا ایمان بنایا تھا۔ ۱۹۵۸ء کے بعد ۲۰۰۹ء تک انتظامی اصلاحات کے ۲۴ رکمیشن اور کمیٹیاں قائم ہوئیں۔[16] مگر ان کی نافذ کردہ اصلاحات سے وطن کی گڈ گورننس (Good governance) سمندر میں ڈوبنے والی کشتی کی طرح نیچے ہی نیچے ڈوبتی گئی۔

جن دنوں قائداعظم اپنی نئی ریاست کی پرانی بیوروکریسی کو دیانتداری، غیرجانبداری اور

قانون پرستی کی تلقین کر رہے تھے، انھی دنوں میں ہندوستان کے سردار ولبھ بھائی پٹیل نے بھی اپنی پارلیمنٹ میں باقاعدہ مہم چلائی ہوئی تھی کہ انگریزی دور کی آئی سی ایس (Indian Civil Service) کی وارث انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے لیے پرانے آئینی تحفظات جاری رکھے جائیں تاکہ وہ کسی بھی قسم کے دباؤ کو نظرانداز کر سکیں اور بلاخوف قانون کے دائرے میں کام کر سکیں۔ پنڈت نہرو کے اعتراضات کے باوجود یہ مہم کامیاب ہوئی اور ہندوستانی بیوروکریسی کو آئین میں ایسے تحفظات فراہم کر دیے گئے کہ مستقبل کی حکومتیں انھیں اپنے مقاصد یا مفادات کے لیے جھکا نہ سکیں۔[17] اس کے برعکس پاکستانی بیوروکریسی کو پہلے گیارہ برس تو انگریزی دور کی باقیات کے طور پر ویسے ہی تحفظات حاصل رہے، مگر اس کے بعد مارشل لاء ریگولیشنز (Martial Law Regulations) کی ژالہ بردار بوچھاڑ اس آئینی ڈھال میں جابجا سوراخ کرنے لگی۔

اس بوچھاڑ کے پہلے قطرے تو بیوروکریسی کے متعلق وہ تین احکام تھے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[18] لیکن پھر سرکاری ملازمین کے دلوں میں نئی حکومت کی ہیبت ڈالنے کے لیے بتدریج دوطرفہ حملے ہونے لگے، باہر سے بھی اور اندر سے بھی، تاکہ بیوروکریسی قانون پرستی کی سابقہ روش کو ترک کر کے نئی حکومت کے عزائم کی تعمیل و تکمیل کی آلۂ کار بن سکے۔ اس طرح حسنِ انتظام (Good governance) کو پس پشت ڈال دیا گیا اور پہلی دفعہ سرکاری طور پر اس کوشش کا آغاز ہوا کہ سرکاری ملازمین کے ریاستی کردار کو بتدریج بدلتے بدلتے بالآخر ان میں حکومتی روح ڈال دی جائے، تاکہ وہ ریاست سے وابستہ رہنے کی بجائے ہر آمرانہ حکومت کی مرضی کے تابع ہو سکیں۔ اس کے بعد تو ع

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
(غالب)

اگر بیرونی حملوں کے جزوی تذکرے سے بات شروع کی جائے تو پہلا بھرپور حملہ ۱۹۵۹ء میں ہوا، جب مارشل لا ریگولیشن نمبر ۶۲ کے تحت تقریباً ۱۵۰۰ سرکاری ملازمین برطرف کر دیے گئے۔ ان میں انگریزی دور کے بارہ سینئر آئی سی ایس (ICS) کے علاوہ اس دور کے دیگر محکموں کے سینئر افسران بھی شامل تھے۔ یہ برطرفیاں تو کرپشن اور نااہلی کی بنا پر کی گئیں، مگر طریقِ کار اتنا حیران کن تھا کہ انگریزی حکومت کے سارے دورانیے اور پاکستان کے سنہری زمانے میں کوئی مثال نہ تھی۔ پندرہ سو متاثرہ افراد میں سے نہ تو کسی کو الزامات کی تفصیل (charge sheet) سے آگاہ کیا گیا، نہ ہی انھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دیا گیا اور نہ ہی انھیں آخر میں اپیل کا حق دیا گیا۔

اس رپورتاژ میں وطن کی تعمیر میں مضمر خرابی کی مجموعی شناخت ''میری مرضی'' کے طور پر کی گئی ہے۔[19] مارشل لاء حکومت کی طرف سے برطرفیوں کا یہ طریقِ کار اس مرضی کی پہلی یلغار تھی، جو نہ صرف ماضی کی تمام آئینی روایات اور قانونی مبادیات کو روندتی چلی گئی، بلکہ آئندہ کی تمام حکومتوں کے لیے بھی من مانی کرنے کا نیا طریقہ ایجاد ہو گیا۔ جس سے اہلِ اقتدار کے لیے اپنے گروہی اور ذاتی مفادات بلاروک ٹوک حاصل کرنے کے نئے امکانات پیدا ہو گئے۔

وطن کی تعمیر میں مضمر خرابی کی دوسری شکل[20] کا یہ پہلا وار تھا، جس سے وطن کے مینار کے علاوہ اس کے اندر ریاست کی روح میں بھی ایک اور چب (dent) پڑ گیا۔ جس طرح ریاست کی روح کے پہلے اندرونی زخم کو قوم دیکھ ہی نہ سکی تھی، (سوائے ایک آنکھ کے جو ہسٹری کے بے نام پروفیسر کی باغی آنکھ تھی۔)[21]

اسی طرح اب روح کا دوسرا زخم بھی نئی حکومت کی تحسین کی اوٹ میں ساری قوم کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔

سرکاری ابرو کی شہ پر اُٹھائی جانے والی یہ تحسین اتنی پُرشور تھی کہ عوام کی سرگوشیوں والے زیرِلب سوالات کہیں اُبھر ہی نہ سکے۔ کیونکہ پریس کے ہونٹ تازہ تازہ سِلے تھے۔ سابقہ اسمبلیوں میں اُٹھنے والی آوازیں انھی اسمبلیوں کے ملبے تلے دب گئی تھیں اور نئی نئی پابندیاں فضا میں تنکوں اور پتوں کی طرح اُڑ رہی تھیں۔ اس لیے ان سرگوشیوں کے سارے سوالات تشنہ ہی رہے۔ مثلاً گیارہ برس میں نئے وطن کو زیرو سے ہیرو بنانے والی بیوروکریسی نااہل کیسے کہلا سکتی تھی؟ جس ملک میں ہر شخص کا کام متعلقہ دفاتر میں بغیر وسائل، سفارش یا رشوت کے ہو رہا تھا، وہاں کے سرکاری ملازمین پر کرپشن کا الزام کیسے لگ سکتا تھا؟ مزید برآں اگر نچلا عملہ سب سرکاری محکموں میں اپنے اپنے فرائض مستعدی سے انجام دے رہا تھا تو ان محکموں کے سینئر افسران کرپٹ یا نااہل کیسے ہو گئے؟

ایک محتاط اندازے کے مطابق انگریزی دور میں مختلف محکموں کے ضلعی افسران اپنے اپنے علاقے میں قریباً ۳۰ لاکھ افراد کے انتظامی تقاضے بڑی کامیابی سے پورے کر رہے تھے۔ جبکہ کئی اضلاع کا رقبہ سترہ ہزار مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں سارے برٹش انڈیا میں کُل ۱۳۸۴ برٹش آئی سی ایس (ICS) آفیسر تعینات تھے۔ جبکہ افریقہ کی برٹش سول سروس میں ان کی تعداد صرف ۱۲۰۰ رہی تھی۔ جو بارہ نوآبادیوں کی ساڑھے چار کروڑ آبادی کے منتظم تھے۔ اور ملایا (موجودہ ملائشیا اور سنگاپور) کی ۳۲ لاکھ آبادی کا انتظام صرف ۲۲۰ ملایان سول سروس والے سنبھال رہے تھے۔[22]

اسی لیے رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) نے انگریزوں کی سول سروسز کے بارے میں لکھا تھا:

(انگریزی سے ترجمہ)

یہ لوگ حاکم ہیں، مگر غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی طبعی موت مرتے ہیں، کبھی کام کی شدت سے مر جاتے ہیں اور کبھی انتظامی بوجھ تلے قریب المرگ رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی صحت اس لیے بگڑ جاتی ہے کہ ان کی زیرِ نگرانی علاقہ قحط، وبا اور بدامنی سے محفوظ رہ سکے... اگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہتے ہیں تو اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے مقامی ساتھیوں اور اہلکاروں کو بھی شاباش دیتے ہیں لیکن ناکامی کی حالت میں سارا قصور اپنے سر لے لیتے ہیں۔[۲۳]

۱۹۴۷ء میں انگریز چلا گیا، مگر اس کے جانے کے بعد اس کی تربیت یافتہ بیوروکریسی کام کرنے کی پرانی روایت پر ہی چلتی رہی، اور گیارہ برس میں پاکستان کی نئی مملکت کو اپنے حُسنِ انتظام سے نکھار دیا۔ اس کا سارا سہرا ان تمام محکموں کے ضلعی افسران کے سر ہے جو اپنے محکمانہ سربراہوں کی زیرِ نگرانی قائداعظم کے فرمودات کی تعمیل کر رہے تھے۔ ایسی کارکردگی والے سرکاری ملازمین نئی حکومت کو پسند نہ تھے۔ نہ معلوم کیوں؟ اس ناپسندیدگی کا اظہار ۱۹۵۴ء میں ایک قلم نے لندن کے بند کمرے میں کیا تھا۔ چار برس بعد ۱۹۵۸ء میں یہ قلم پورے ملک میں بندوق بردار بن چکا تھا۔ اس لیے اس کی نافذ کردہ اصلاحات سے وطن کے مینار کے اُفق پر سرخی چھا گئی، کیونکہ بندوق اور سرخی لازم ملزوم ہیں۔

درباری تحسین اس کو نئے طلوع کی سرخی کہہ رہی تھی، مگر حیران و پریشان بیوروکریسی اسے سنہری زمانے کے غروب کی سرخی سمجھ رہی تھی۔

یہ شفق رنگ اصلاحات بڑی ہی عجیب اور پُرفریب تھیں، جن میں طلوع و غروب کی آنکھ مچولی تھی اور اگلا کل بھول بھلیوں میں راہ ڈھونڈ رہا تھا۔

وقت کی انگلیاں خاموشی سے گنتی کرتی رہیں... اس گنتی میں اب بیوروکریسی پر نئی حکومت کے اندرونی حملے بھی گنے جانے لگے۔

اندرونی حملوں کی واردات مختلف اور نتائج بہت دور رس تھے۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں نئی حکومت نے ایک بالکل نئی پالیسی بنائی جو کسی فاتح کی پیشانی پر چمکنے والی من مانی کا ایک اور لشکارا بن گئی۔ قریباً ایک صدی پہلے سے سول سروس (Civil Service) کے لیے مقابلے کے امتحان کے ذریعے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ امتحان ہمیشہ سے ایک آزاد ادارے پبلک سروس کمیشن (Public Service Commission) کی ذمے داری رہی تھی، مگر ۱۹۶۰ء میں نیا فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ نوجوان فوجی افسران کو براہِ راست سول سروس میں نامزد کر دیا جائے گا، جنھیں مقابلے کے امتحان میں شامل

ہونے اور پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہونے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس پالیسی کے تحت ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء کے دوران ۱۴ فوجی کپتان (captain) سی ایس پی (CSP) میں شامل کیے گئے۔[۲۴] (جنھیں کچھ فوجی مراعات اور ترجیحات بھی حاصل رہیں) ان چار برسوں میں پبلک سروس کمیشن نے مقابلے کے امتحانوں کے ذریعے ۹۸ افسران کا انتخاب کیا تھا۔ اس طرح یہ فوجی افسران اس تعداد کا کوئی ۱۴ فی صدی حصہ تھے، مگر ایک آئینی حد بندی میں غیر آئینی نقب زنی سو فی صدی تھی، جس نے آئندہ کے لیے بار بار نقب لگانے کی نئی رسم ڈال دی۔

پہلا حملہ سرکاری ملازموں کو بیرونی محاصرے اور گولہ باری سے خوفزدہ کرنے کے لیے تھا، مگر یہ دوسرا حملہ بیوروکریسی کی سوچ کو اندر سے بدلنے کے لیے ایک اندرونی شب خون تھا۔ عمومی طور پر یہ دونوں اندرونی اور بیرونی حملے "میری مرضی" کی اس یلغار کے لیے انتہائی کارگر ثابت ہوئے، جو فوجی حکومت کے روزِ اول سے جاری تھی، اور جس کے تحت قوم کا قبلہ "ریاست" کی بجائے "حکومت" کی طرف بدلا جا رہا تھا۔ قبلے کی تبدیلی کے لیے ضروری تھا کہ ان چاروں ستونوں کو بھی کچھ سرکایا جائے، کچھ ہلایا جائے، کچھ بدلا جائے اور کچھ گرایا جائے۔ جن پر پولیٹکل سائنس کے علم کی رُو سے کوئی بھی ریاست کھڑی ہوتی ہے، اپنا توازن درست رکھتی ہے اور اجزائی ترتیب کا تناسب (symmetry) قائم رکھتی ہے۔ یعنی مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ اور پریس اگر اپنی ساخت میں مضبوط ہیں اور اٹھان میں سیدھے ستواں کھڑے ہیں، تو ان چاروں ستونوں پر قائم ریاست متوازن، متحرک اور مستقل بن جاتی ہے۔ لیکن اگر ان ستونوں میں دراڑ پڑ جائے یا کجی آ جائے تو ریاست اگر ٹوٹنے سے بچ بھی جائے تو یہ غیر متوازن ہو کر لڑکھڑاتی رہتی ہے۔

پولیٹکل سائنس کے یہ اصول میں نے یونیورسٹی میں سیکھے۔ اخبارات کے ذریعے مختلف ممالک میں ان کی عملی شکل سے واقف ہوا، اور چار ستونوں کی اہمیت کو سمجھا۔ لیکن جب زندگی مجھے ان کے درمیان لائی تو وطن میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے پہلا ستون (مقننہ) تو اسی دم گر چکا تھا، جب آئین اور اسمبلیاں توڑی گئیں۔ دوسرے ستون (پریس) کو بھی نیشنل پریس ٹرسٹ (National Press Trust) کے ہتھوڑے سے توڑا جا رہا تھا اور تیسرے ستون (انتظامیہ) کے بالائی حصوں پر تو کوئی اور قابض ہو چکا تھا۔ صرف پاؤں (بیوروکریسی) موجود تھے۔ مضبوط تھے اور سابقہ استقامت سے قائم تھے۔ میں اب ان پاؤں کے جوڑوں سے جڑ گیا تھا، اس لیے حملوں کی دھمک محسوس کرنے کے قابل تھا اور جان گیا تھا کہ بیوروکریسی اب فوجی حکومت کا فوری ہدف ہے۔ پہلے دو کے بعد اب نیا ثبوت بھی مل گیا، جب تیسرا حملہ ہوا۔

اس حملے میں مارشل لا کے کسی ضابطے کے تحت نئے قواعد بنا دیے گئے جنھیں ''مزید افادیت کے قواعد'' (Further Usefulness Rules) کہا گیا۔ ان کی رُو سے یہ لازمی قرار پایا کہ جب کوئی سرکاری ملازم اپنی ملازمت کے ۲۵ برس پورے کر لے گا تو حکومت جائزہ لے گی کہ کیا وہ آئندہ حکومت کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر حکومت اس نتیجے پر پہنچے گی کہ وہ ہمارے لیے مفید نہیں ہوگا، تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔ گویا ریاست کے لیے مفید ہونے کی بجائے حکومتِ وقت کے لیے مفید ہونا افضل بلکہ ضروری قرار دیا گیا۔

یہ ریاست کا غروب تھا۔ حکومت کا طلوع تھا۔ اور کُل پر جزو کو فوقیت دینے کی نئی رسم تھی کہ دجلہ حقیر مگر قطرہ اہم۔ اس رسم کے تحت تب سے اب تک ہر قطرہ دجلے سے اہم ہی رہا ہے ع

شب رفت سحر نہ شد شب آمد (بیدل)

میں ابھی پچیس برس والے پل صراط سے بہت دور تھا۔ اس لیے بغیر پریشانی کے دُور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ تمام سرکاری ملازمین گہری سوچوں میں ڈوب گئے تھے، جو ملازمت کے اس سنگِ میل کے آس پاس تھے اور زندگی کے اس مقام پر تھے جب کسی وزن اُٹھانے والے weightlifter کی طرح زمین پر پاؤں جمائے، پورے بازو اُوپر اُٹھائے زندگی کا سارا بوجھ بڑے بھرپور انداز میں بیک وقت اُٹھائے ہوئے تھے، کیونکہ انھیں اس وقت جوان بچوں کی اعلیٰ تعلیم یا شادیوں کا مرحلہ درپیش تھا۔ گھر بنانے کی منصوبہ بندی تھی اور ریٹائرمنٹ کے بعد بڑھاپے کی نقاہت کے لیے سرمایہ کاری کی ضرورت تھی۔ ان کا ماضی دیانتدار تھا، کفایت شعار تھا، مگر پُرسکون تھا۔ کیونکہ وہ سرکاری سرپرستی میں محفوظ تھے، لیکن اگر سرپرستی کا یہ شامیانہ ہٹ جائے گا، تو ان کا مستقبل غیر یقینی ہوگا، غیر محفوظ ہوگا۔ اور عیالداری کے بوجھ سے بے روزگاری کے جوہڑ میں ڈوب جائے گا۔ ایسی پریشانی نے انھیں زندگی میں پہلی بار دبوچا تھا۔ تب انھیں یوں لگا کہ وطن کے مینار کی دیواروں سے چپکے ہوئے فرمودات قائد پر کوئی بھاری برش سے کالا رنگ پھیرنے لگا ہے اور ریڈیو پر بارہا سنی ہوئی قائداعظم کی تقاریر کی گونج اب ماند پڑنے لگی ہے۔

آپ ریاست کے ملازم ہیں۔ کسی سیاسی پارٹی، سیاستدان یا حکومت کے ملازم ہرگز نہیں۔ (۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں گورنر جنرل قائداعظم کا سرکاری ملازمین سے خطاب)

اگر سرکاری ملازمین پاکستان کا نام بلند اور قوم کا وقار بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی سیاسی یا ذاتی دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔ سرکاری ملازمین ریاست کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ حکومتیں آتی جاتی ہیں۔ حاکم بدلتے رہتے ہیں، مگر آپ ریاست کی رکھوالی اور خدمت کے لیے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اس لیے یہ آپ کا کام نہیں کہ

کسی حکومت یا حکومتی سیاسی پارٹی یا حاکم کی ذرّہ برابر بھی پاسداری کریں یا اس کی جانب جھکاؤ ظاہر کریں..... اسی طرح میں پاکستانی لیڈروں اور سیاستدانوں پر بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ سرکاری ملازمین پر ناجائز دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے، تو اس کا لازمی نتیجہ اقربا پروری، رشوت ستانی اور کرپشن ہی ہوں گے۔ اگر آپ ان کے لیے فرائض کی بجا آوری میں اس طرح کی رخنہ اندازی کریں گے، تو یوں سمجھیں کہ آپ پاکستان سے بڑی دشمنی کر رہے ہیں۔ (۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو پشاور میں سول افسران سے قائداعظم کا خطاب)

گورنر جنرل کے طور پر اپنی زندگی کے آخری تیرہ ماہ میں قائداعظم نے متعدد دفعہ سرکاری ملازمین کو یہی تلقین کی۔ ریڈیو پاکستان پر سنی ہوئی یہ تقاریر ہر سرکاری ملازم کے ذہن میں وقتاً فوقتاً گونجتی رہتی تھیں۔ مگر اب یہ گونج کسی دور جانے والے ریلوے انجن کی وِسل کی طرح مدھم ہونے لگی تھی۔

تمام سرکاری ملازمین عجب مخمصے میں تھے۔ صدر ایوب کی حکومت کا نیا قانون تھا کہ ملازمت کے پچیسویں سنگ میل پر سرکاری کراماً کاتبین بتائیں گے کہ آپ حکومت کے لیے مفید ہیں یا نہیں۔ مگر قائداعظم کا پرانا اور مسلسل اصرار یہ تھا کہ آپ کی افادیت ''حکومت'' کی بجائے ''ریاست'' کے لیے ہونی چاہیے۔ ع

حیراں ہوں دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں (غالب)

یہ سرکاری ملازمین نئی پاکستانی ریاست کے سنہرے زمانے کے معمار تھے۔ مگر اب درباری شادیانے بج رہے تھے کہ نئے معمار اس سے بھی زیادہ چمکیلا زمانہ لا رہے ہیں۔ اس لیے پرانی صفات ترک کر دو اور ان کا ساتھ دو۔ وہ حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ کعبہ ان کے پیچھے اور کلیسا ان کے آگے تھا۔ ع

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں (غالب)

لیکن قائداعظم نے یہ بھی تو کہا تھا:

عین ممکن ہے کہ آپ میں سے بعض کو حکومتی دباؤ کا شکار ہونا پڑے اور اس لیے تکلیف اُٹھانی پڑے کہ آپ راہِ راست پر چل رہے تھے اور غلط کار نہ تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ راست روی کی وجہ سے آپ کا نام کالی بھیڑوں (Black List) میں شامل ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا ہے تو آپ اس کا سامنا کریں، قربانی دیں اور پاکستانی ریاست کو بچائیں۔ (پشاور میں سرکاری ملازمین سے خطاب: ۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء)

اس تقریر کی گونج ابھی مدھم پڑی تھی، غائب نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے زیادہ تر سرکاری ملازمین راہِ راست پر ہی قانونی چال چلتے رہے۔ ان میں سے بہت کو صرف تکلیفیں ہی اُٹھانا پڑیں

لیکن کئی ایک زیرِ عتاب بھی آ گئے اور نئے قوانین کے تحت خاموشی سے برطرف کر دیے گئے لیکن وسیع بیوروکریسی کے کونوں کھدروں میں ان کی اکا دُکا بکھری بکھری گمنام سرکاری موت کا نہ تو کبھی شمار ہوا اور نہ ہی کبھی ذکرِ خیر ہوا۔ چوپال میں یا ڈرائنگ روم میں، یا پریس میں یا تاریخ میں۔ ''ثناخوانِ تقدیسِ وطن'' بھی خاموش رہے۔ معزول شدہ مغلیہ فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے مصرعے کے مصداق اب ان کا ''نہ نشاں ہے نہ مزار ہے'' اگر آج ان کی آل اولاد کے دلوں میں کوئی غائبانہ نشان یا مزار ہے تو وہ بھی ایسا کہ[25] ع

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

وقت کی انگلیوں پر بلاشبہ ان شہدائے فرض کی گنتی ہوتی رہی، مگر وقت صرف گنتی کرتا رہتا ہے، گویائی نہیں رکھتا، منہ سے اظہار نہیں کرتا۔ فقط آنے والے نتائج کے انکشاف کرتا ہے۔ وہ بھی زبانِ حال سے اور مزید بھیانک نتائج سے۔

اسی وقت نے بالآخر انکشاف کیا کہ جب قوم قائداعظم کی تقریروں کی گونج سن رہی تھی، بیوروکریسی سن رہی تھی اور عمل بھی کر رہی تھی۔ تو نئی فوجی حکومت نہ تو سن رہی تھی نہ عمل کرنے پر آمادہ تھی۔ ساتھ ہی وقت ایک اور سرگوشی بھی کر رہا تھا کہ یہی سانحہ ایک دفعہ پہلے بھی قائداعظم کی زندگی میں ہی گزر چکا تھا۔ جب ۱۴ر جون ۱۹۴۸ء کو اسٹاف کالج، کوئٹہ میں ان کی تقریر بالکل ہی بے اثر رہی۔[26]

۱۹۶۰ء میں انگلستان سے واپسی کے ساتھ ہی ہمارا تربیتی دور (probation) ختم ہو گیا اور فعال ملازمت کا آغاز ہو گیا۔ چند ماہ تک الگ الگ اضلاع میں ایک ابتدائی تعارفی تعیناتی کے بعد ہم میں سے ہر ایک نے دور دراز علاقوں کی ایک یا دو تحصیلوں پر مشتمل سب ڈویژن (subdivision) کا چارج ایسے سنبھال لیا جیسے وہ کسی سست رفتار بیل گاڑی کا کوچوان ہو۔ مگر کار کی طرح تیز چلانے کے لیے دل ہی دل میں بے تاب ہو رہا ہو۔ کیونکہ اس کے سامنے وطن کا نیا مینار تھا۔ کانوں میں قائداعظم کی اخلاقی اور آئینی ہدایات کی گونج تھی۔ ذہن میں ان کا دیا ہوا تصورِ پاکستان تھا۔ حوصلوں میں دو سالہ کڑی تربیت کی عطا کردہ بلندی تھی۔ ذات میں اس اہمیت کا اُبال تھا کہ ہم وطن کے معماروں میں شامل ہونے جا رہے ہیں اور دل میں اُمنگ تھی کہ اپنی حد تک ملک سنوارنے میں کچھ کر کے دکھائیں۔ چنانچہ میں اپنے مینار کی تیسری منزل سے وطن کے مینار کی دوسری منزل میں داخل ہوا تو گیلے اسفنج کی طرح آئیڈیل ازم اور حب الوطنی سے بھرپور تھا۔ اس فوجی دستے کی طرح جو سلامی دیتا ہوا وطن کے پرچم کے سامنے سے گزرتا ہے تو اُس کے رُوئیں رُوئیں سے وطن

پر قربان ہونے کا لاوا پھوٹ پڑتا ہے۔

یہ ۱۹۶۱ء کا سال تھا۔ صدر ایوب کی حکومت قریباً اڑھائی برس مکمل کر کے اپنے قدم پوری طرح جما چکی تھی۔ حکومت کی بالائی منزلوں کی سوچیں اب گلی کوچوں کا زمینی انتظام بن رہی تھیں۔ ان کے انڈے بچے مختلف انتظامی احکامات کی شکل میں میرے بے تاب ہاتھوں میں پہنچ رہے تھے اور میں دل و جان سے ان کی تعمیل میں غرق تھا۔

تب تک میرا شعور صرف دو شہروں کا پروردہ تھا۔ ابتدائی سات جماعتوں کی بنیاد راولپنڈی میں اور باقی ساری تعلیم اور ملازمت کا آغاز لاہور میں۔ دیہات کبھی تو ایسے دیکھے جیسے سیرِ چمن ہو یا کبھی مہمان بن کر چند دنوں یا ہفتوں کا قیام کر لیا اور ذہن میں سہانے تصورات پال لیے۔ اصل دیہاتی روح سے کچھ شناسائی تو پریم چند، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ وغیرہ کی تحریروں نے کروائی اور زیادہ واقفیت ان دوستوں کی وجہ سے ہوئی، جو اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں کی معرفت شہری زندگی کا دلچسپ مگر اہم حصہ بن جاتے تھے۔ لیکن وطن کے مینار کی ۸۰ رفیصد جسامت سے پوری طرح تب آگاہ ہوا جب دُور دراز تحصیلوں میں سست رفتار انتظامی بیل گاڑی کا بے صبر کوچوان بنا۔ چند کچی پکی سڑکیں اور بے شمار پگڈنڈیاں دیکھیں جن کی زمین اور ساخت تو ناہموار ہوتی ہی تھی مگر ان پر متحرک زندگی کہیں زیادہ ناہموار تھی۔ کیونکہ قدم قدم پر جاگیرداری نظام کی اونچ نیچ تھی۔

میں اُس وقت تو اس سے زیادہ کچھ سمجھ نہ پایا، مگر بعدازاں جیسے جیسے وقت کی اُنگلیوں کی گنتی بڑھتی گئی، اس کی دائمی خاموشی تو جاری رہی، مگر زبانِ حال بہت کچھ ظاہر کرنے لگی۔ تب بہت ہی دھیرے دھیرے یہ بھیانک انکشاف ہونے لگا کہ صدر ایوب کی زرعی اصلاحات کے باوجود ہمارے معاشرے کی یہ ناہمواری اور اونچ نیچ بڑھتی جا رہی تھی، کیونکہ پہلے تو صدر ایوب خان نے عوام کو خوش کرنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کھوکھلی سی زرعی اصلاحات[27] کا اعلان کیا۔ اس دعوے کے ساتھ کہ وہ جاگیرداری نظام کا گلا گھونٹ رہے ہیں، لیکن پھر خود ہی انھی جاگیرداروں کی سرپرستی کرنے لگے، تاکہ ان کی مدد سے وہ اپنے اقتدار کو دوام دے سکیں۔ چنانچہ انھوں نے خود تو ساڑھے دس برس حکومت کر لی، مگر اس دوران ان جاگیرداروں کے نہ صرف پرانے پنجے تیز کر دیے بلکہ صنعت و تجارت کے کئی نئے پنجے مہیا کر دیے اور وہ عوام پر اس طرح مسلط ہو گئے جس طرح چیتا اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے۔ مگر مستقبل کا یہ منظرنامہ ابھی میرے عینی اور ذہنی اُفق کے پار تھا اور میرے احساس و شعور سے بالکل اوجھل تھا۔

ان دنوں میرا مینار وطن کے مینار سے اس طرح یک جان ہو رہا تھا کہ میں فرض کی ادائیگی

کے علاوہ کچھ اور محسوس نہ کر سکتا تھا، مگر آج جب ان میناروں کی بلند ترین منزلوں سے جھانک رہا ہوں تو صاف نظر آ رہا ہے کہ جب میری سرکاری عبادت شروع ہو رہی تھی تو وطن کے مینار کا سیاسی قبلہ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی سمت قائداعظم کے تصورِ پاکستان کی بجائے جنرل ایوب خان کے تصورِ پاکستان کی طرف مڑنے لگی تھی۔ ماضی وحال کے زمانوں کی گہری تاریخی کشید سے ہٹ کر فوجی چھاؤنی کی سطحی کشید کی طرف۔ سایۂ خدائے ذوالجلال کی بجائے زرد پتوں کے بن کی طرف... قبلہ مڑنے کے ساتھ سماجی قدروں کا رُخ بھی بدلنے لگا۔ پرانے رویے بھی تڑخنے لگے اور علامہ مشرقی اور قائداعظم کے تراشے ہوئے انسان دوست اور قانون پرور معاشرے کی صفات ماند پڑنے لگیں۔

تب وطن کے مینار کی اس منزل کی فضا میں یہ سراسر بٹ تھی کہ ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا (غالب)

دھوکا یہ تھا، کہ وطن کی تعمیر میں مضمر خرابی کی پہلی اور دوسری شکلوں[۲۸] میں باہمی گٹھ جوڑ کے لیے نظر بازی شروع ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں یہ نظریں مل بھی چکی تھیں۔ لڑ بھی چکی تھیں اور گہرے مراسم کے وہ بیج بوئے جا رہے تھے جن سے بالآخر مک مکا کے کئی چمن مہکے اور تمام اشجار باہمی مفاہمت اور منفعت کے پھلوں سے لدے جاتے رہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے کسی افسانے میں لکھا ہے کہ عورت بلّی کی مانند ہوتی ہے۔ پہلے پنجے مارتی ہے پھر پیار سے خُرخُر کرنے لگتی ہے۔ یہ فطری مماثلت کی ایک تشبیہ تھی۔ مگر آج مجھے دونوں میناروں کی بلندی سے یوں نظر آ رہا ہے کہ اُن دنوں صدر ایوب کی سیاسی حکمت عملی بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ پہلے بھرپور حملے سے سب پر دانستہ ہیبت طاری کر دی جائے پھر چند ایک وفادار پوری طرح حلقہ بگوش ہو جائیں۔ اس طرح کہ ؏

خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں (غالب)

پندرہ سو افسران نکالے جانے کے بعد بھی بیوروکریسی کے لیے ابھی ہیبت والا پہلا مرحلہ جاری تھا، مگر جاگیردار سیاستدانوں کے لیے خوف زدگی کا پہلا مرحلہ ''پوڈو'' (Podo)[۲۹] اور ایبڈو (Ebdo)[۳۰] کے بعد ختم ہو چکا تھا اور اب وہ کرم نوازی کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے۔

عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی صدر ایوب نے سیاستدانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے دو قانون نافذ کیے تھے۔ پہلا قانون عرفِ عام میں ''پوڈو'' (Podo) کہلایا، جس کے تحت غلط کار سیاستدانوں کا جرم ثابت ہونے پر انھیں پندرہ برس تک سیاست کے لیے نااہل قرار دیا جاتا

تھا۔ دوسرا قانون ''ایبڈو'' (Ebdo) تھا۔ جس کے تحت فردِ جرم ثابت ہونے پر چھے برس کے لیے سیاست سے کنارہ کشی کی سزا تھی لیکن اس میں یہ رعایت بھی تھی کہ اگر کوئی مقدمے سے بچنا چاہے تو وہ رضاکارانہ طور پر سیاست سے چھے برس کے لیے لاتعلق ہو جاتا تھا۔ ملک میں ۹۸ ممتاز سیاست دانوں کے خلاف ''ایبڈو'' کی کارروائی شروع ہوئی، تو ان میں سے ۷۰ نے چھے برس کے لیے سیاست سے توبہ کر لی اور مقدمے سے بچ گئے۔ ۲۸ نے مقدمہ لڑا۔ جن میں سے صرف چھے بری ہو سکے اور باقی کو سزا ہو گئی۔ ان کے علاوہ بھی دو ہزار سے زائد نچلی سطح کے کارکن ''ایبڈو'' کا شکار ہوئے۔[۳۱] نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو سیاستدان اور جاگیردار حکومت کا دم بھرنے کا وعدہ کرتا وہ فوراً کرم فرمائی والے دوسرے مرحلے میں داخل ہو جاتا۔

بیوروکریسی کا رکن ہونے کی وجہ سے میں ابھی پہلے عتاب والے مرحلے میں تھا، مگر میری پہلی تعیناتی جب پنڈ دادن خان سب ڈویژن (ضلع جہلم) میں ہوئی، تو وہاں کے ممتاز سیاستدان راجہ غضنفر علی خان دوسرے شفقت والے مرحلے میں جا چکے تھے۔ اسی لیے وہ ماسکو میں پاکستان کے سفیر تعینات ہو چکے تھے۔ اس طرح پنڈ دادن خان میں مذکورہ بالا مفاہمت کے بیج بوئے جا چکے تھے۔

یہ سب ڈویژن میری ملازمت کا پرائمری اسکول بن گئی۔ ویسا ہی ٹاٹوں والا پرائمری اسکول جو ان دنوں پاکستان کے طول وعرض میں ہر جگہ پایا جاتا تھا۔ ہر گاؤں میں اور اکثر بڑے شہروں میں بھی۔ اسی مناسبت سے وہاں کے علاقائی خدوخال ہمارے سارے وطن کی پوری اور مکمل علامت تھے۔ پنڈ دادن خان میں بجلی نہ تھی۔ پانی کی انتہائی قلت تھی۔ کان نمک (کھیوڑہ) کی وجہ سے شور آلود زمین پر گرمی کی شدت تھی۔ زہریلے سانپوں کی ریل پیل تھی۔ زمین سے اوپر اور نیچے کڑوا نمکین پانی تھا۔ زندگی کا سکون صرف چھت پر لٹکے ہوئے کپڑے کے لمبے پنکھے سے لہراتا تھا۔ جس کی چال کا تعین اونگھنے والے پنکھا قلی کے ڈانواں ڈول ہاتھ کرتے تھے یا پھر رات کو نصف صدی پرانے مکان کی اونچی چھت پر ملتا تھا۔ بشرطیکہ مسہری، مچھروں اور بند ہوا میں کوئی سمجھوتا ہو سکے۔ اس تحصیل کے ایک طرف اگر لِلّہ کا ریتیلا صحرا تھا تو دوسری طرف جالب کے علاقے میں کنوؤں کا میٹھا پانی تھا۔ کھیوڑہ میں نمک اور کوئلے کی کانوں کے پار چواسیدن شاہ کی پہاڑی بلندیاں سرسبز باغات اور شیریں چشمے تھے۔ یہ تحصیل گویا وطن کے پاندان کی طرح تھی۔ جس کی مختصر سی جسامت میں چونا، کتھا، الائچی سپاری سبھی کچھ موجود تھا۔ اس لیے میرا ذہن نہ صرف اس کا پورا مزہ چکھ رہا تھا، بلکہ اسی سُرور میں مقامی لوگوں کے مشوروں سے میں جلد ہی ایسی تجاویز بنانے میں مصروف ہو گیا جن سے وہاں میٹھے پانی کی بہتات ہو سکے۔

میں پہلے دن اپنے دفتر میں ایک فٹ اونچے عدالتی چبوترے پر بیٹھا تو میرے سامنے عدالتی کٹہرہ تھا۔ جس کے ایک طرف استغاثہ کے وکیل اور پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ دوسری طرف ملزم اور اس کے وکیل اور ساتھی تھے۔ سامنے کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ جن کی تیز نظروں میں کئی قسم کی شعاعیں تھیں۔ التجا والی، توقعات والی اور شکوک والی۔ مگر ان سب نظروں میں ڈائریکٹر برجیس (Burgess) کے وہ الفاظ پروئے ہوئے تھے جو انھوں نے اپنے پہلے تربیتی لیکچر میں کہے تھے کہ، ''آپ کو ہر دم ثابت کرنا ہوگا کہ کیا آپ واقعی اعلیٰ ہیں یا نہیں؟؟'' ان تمام نظروں کی تنقیدی چبھن بڑی خاموش تھی، مگر گویائی سے زیادہ مؤثر انداز میں وہ الفاظ پروئے ہوئے نظر آتے تھے۔

پہلے دن کی یہ نظریں بعد ازاں ہر وقت، ہر جگہ اور ہر تعیناتی میں میرا تعاقب کرتی رہیں اور ان سے تب خلاصی ہوئی جب ۳۶ برس بعد میں ملازمت سے ریٹائر ہوا۔

اسی پرائمری اسکول میں مجھے اگلے دن دوسرا... مگر بالکل مختلف... سبق پڑھنا پڑا۔ ماضی قریب میں راجہ غضنفر علی خان ٹاؤن کمیٹی کے صدر تھے لیکن جب وہ سفیر بن کر بیرونِ ملک چلے گئے تو انھوں نے قانونی تقاضوں کے مطابق ٹاؤن کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ نہیں دیا، بلکہ دور دراز سے ''میری مرضی'' پر اصرار کرتے رہے۔ بظاہر تو سیکریٹری، ٹاؤن کمیٹی اس ادارے کو ان کی ''ہدایات'' کے مطابق چلا رہا تھا اور یہی اس کی سرکاری ڈھال تھی، مگر اُس زمانے میں ان ہدایات کی ترسیل کا کوئی مؤثر نظام نہیں تھا۔ اس وقت نہ تو ہوائی ڈاک کا زیادہ رواج تھا، نہ ہی بیرونِ ملک ٹرنک کال (trunk call) کی سہولت عام تھی۔ اس لیے وہ ان کی ایک ہی مستقل ہدایت پر عمل کرتا رہتا تھا کہ ان کے مفادات کی حفاظت کرے۔ مزید نگرانی راجہ صاحب کے منشی قسم کے دو تین کارندے کرتے تھے۔

میرا دوسرا سبق ان کارندوں سے ملاقات تھی۔ جس میں بالکل دوسری اور مختلف نظروں سے میری آشنائی ہوئی اور مجھے ڈائریکٹر برجیس کا دوسرا فقرہ یاد آ گیا کہ، ''ایسے سرکردہ لوگوں سے محفوظ فاصلہ رکھو، جن کے مفادات تمھاری تعیناتی والے علاقے سے وابستہ ہوں۔''

ان کارندوں کا لہجہ مؤدبانہ، گفتگو شریفانہ مگر نظریں تحکمانہ تھیں۔

دوسرے دن کی ان دوسری نظروں سے بھی میرا مسلسل سامنا ہوتا رہا۔ بالکل اسی طرح جس طرح پہلے دن کی پہلی نظروں سے ہوتا رہا۔ ہر جگہ، ہر تعیناتی میں اور پوری ملازمت کے دوران۔

ان دو نظروں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ پہلی قائداعظم کے تصورِ پاکستان سے اُبھری تھی، مگر دوسری اب جنرل ایوب خان کے تصورِ پاکستان سے جنم لے رہی تھی۔

میری ملازمت کے شب و روز مجھ پر دھیرے دھیرے عیاں کرتے رہے کہ پہلی نظروں کی حدت دن بدن کم ہو رہی ہے اور دوسری نظروں کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

اپنی دو سالہ تربیت اور مزاج کی بنا پر میں چاہتا تھا کہ دو پٹڑیوں پر بڑی ہمواری سے چلنے والے ریلوے انجن کی طرح میں بھی ان دو نظروں کے متوازی وجود پر ہموار اور متوازن انداز میں چلتا رہوں، مگر جب راجہ غضنفر علی خان وقتاً فوقتاً وطن آتے اور مجھ سے ملتے تو پتا چلتا کہ وہ مجھے صرف ایک پٹڑی پر چلانا چاہتے ہیں، جو ان کے مفادات کی پٹڑی تھی۔

میں نے ایک دفعہ انصاف کے تقاضوں اور دیگر شہریوں کی توقعات کا ذکر کیا تو ان کی پگڑی کا بلند اور کھڑا کھڑا شملہ، خوش باش لہجہ اور اونچا قہقہہ صرف یہی کہہ پایا، ''توقعات کی بجائے ان لوگوں کو اپنی حیثیت کا بھی تو احساس ہونا چاہیے۔''

میں خاموش تو ہو گیا، مگر قائل نہ ہوا۔ اس لیے حسبِ سابق دونوں پٹریوں پر متوازن انداز میں چلتا رہا کہ حُسنِ انتظام (Good governance) اور فرض شناسی کا یہی تقاضا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ جیسے جیسے راجہ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، ویسے ویسے ہر ملاقات میں ان کے لہجے کی مٹھاس اور قہقہے کی آواز گھٹتی گئی۔

ان دنوں ضلع کیمبلپور (موجودہ اٹک) کی پنڈی گھیب سب ڈویژن دو تحصیلوں پر مشتمل تھی (پنڈی گھیب اور تلہ گنگ) اور وہاں سجاد احمد سب ڈویژنل مجسٹریٹ (SDM) تھے۔ اپنے علاقے میں وہ بھی کم و بیش ایسے ہی حالات سے دو چار تھے، جن سے میں گزر رہا تھا۔ ملک امیر محمد خان (نواب کالا باغ) ان دنوں مغربی پاکستان (one unit) کے گورنر تھے۔ اور اُن کا تعلق ضلع میانوالی سے تھا، جو دریائے سندھ سے پار اُس سب ڈویژن کا ملحقہ علاقہ تھا۔ اتفاق سے نواب کالا باغ کے سیاسی حلیف اور حریف پنڈی گھیب سب ڈویژن میں بستے تھے اور ان میں بعض سجاد احمد کے قانونی فیصلوں اور غیر جانبداری سے اسی طرح نالاں تھے، جیسے راجہ غضنفر علی خان مجھ سے نالاں تھے۔ ہمارے افسرانِ بالا اس صورتِ حال سے باخبر تھے، مگر وہ ہم دونوں کے طرزِ عمل کو درست قرار دیتے تھے۔ اس لیے کمشنر راولپنڈی ڈویژن نے اپنے ہی علاقے میں ہم دونوں کے باہمی تبادلے کی تجویز دے کر ہمیں گورنر کی ممکنہ مداخلت سے بچا لیا۔ چنانچہ سجاد نے پنڈ دادن خان اور میں نے پنڈی گھیب کا چارج لے لیا۔ یہ بھی اسی وجہ سے ممکن ہو سکا کہ اس وقت تک Further Usefulness Rules نہیں بنے تھے اور کمشنر کی سطح کے افسران غیر محفوظ نہ ہوئے تھے، بلکہ اپنے انتظامی امور پر خود اعتمادی سے فیصلے کر سکتے تھے۔

اب صدر ایوب کی حکومت کو چار برس مکمل ہو رہے تھے۔ ۱۹۵۹ء کا مارشل لا ریگولیشن نمبر ۶۲ ''پوڈو'' اور ''ایبڈو'' کے ذریعے بیوروکریسی اور سیاستدانوں کی بدنامی اور تطہیر مکمل ہو چکی تھی۔ کئی قسم کی اصلاحات نافذ ہو چکی تھیں۔ جن میں سے زرعی اصلاحات کے لیے ہر طرف تحسین ہی تحسین تھی کیونکہ یہ جاگیرداری نظام کے مکمل خاتمے جیسے زوردار اعلانات کے ساتھ نافذ کی جا رہی تھیں۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ نہ تو سیاست دانوں کے خلاف کوئی قابلِ ذکر کرپشن ثابت ہو سکی تھی اور نہ ہی بیوروکریسی کے خلاف کوئی باضابطہ انکوائری ہوئی تھی)۔ پوری قوم کے مکمل ووٹوں والی جمہوریت کی بجائے نقلِ کفر والی بنیادی جمہوریت کا نظام قائم ہو چکا تھا، جس میں قوم کی قسمت کا فیصلہ ۸۰،۰۰۰ بکاؤ افراد کے ہاتھوں میں گروی رکھ دیا گیا تھا۔ فروری ۱۹۶۰ء میں ان میں سے ۷۵۰۰۰ ووٹر ایک ریفرنڈم (referandum) کے ذریعے صدر ایوب کو ملک کا آئینی صدر منتخب کر چکے تھے۔ ۱۹۶۲ء کے نئے آئین کا اطلاق ہو چکا تھا اور چند برس پہلے والے (۱۹۵۴ء) سپہ سالار کے اصلاحی خاکے کی ان کہی اب مکمل طور پر کہی جا چکی تھی۔ اس لیے ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء ختم کر دیا گیا تھا اور مارشل لاء لگانے والے اب فوج کی بجائے پوری قوم کے سپہ سالار بن چکے تھے۔

ان تمام پیچیدہ مراحل کا روشن پہلو یہ تھا کہ ۱۹۵۸ء سے پہلے والے سنہری دور کی ترقی کو اب مزید مہمیز لگ رہی تھی۔ قوم کی اُمیدیں اور اعتماد بڑھ رہے تھے۔ حوصلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے۔ دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بڑھ رہا تھا۔ بین الاقوامی معاشی ادارے اور ماہرین ہمارے وطن کے مینار کو دنیا کے لیے ایسا نمونہ قرار دے رہے تھے جو بیرونی قرضوں کو عقل و فراست سے استعمال کر کے ان سے بھرپور توانائی حاصل کرنے کی واحد مثال بن رہا تھا۔ جہاں صنعت و حرفت کے علاوہ تجارت اور زراعت بھی حیران کن ترقی کر رہے تھے۔

ملکی تاریخ کے اس روشن مرحلے پر پنڈی گھیب سب ڈویژن میں تعیناتی میرے جواں سال آئیڈیل ازم کے لیے ایک مہمیز بن گئی۔ کیونکہ میری ناتجربہ کاری کو اس باہمی تبادلے کے منفی پہلوؤں کا پورا ادراک نہ تھا کہ سیاسی مداخلت کے ان اوّلین جھونکوں کے پیچھے کتنی آندھی آ رہی ہے۔ نئی جگہ کا ماحول مجھے زیادہ بہتر اور زیادہ اہم لگتا تھا۔ دو تحصیلوں کی عملداری، پختہ سڑکوں پر خوبصورت سنگ میل، رقبہ بارانی مگر میٹھے چاہی پانی کی بہتات۔ سبز فصلوں کی فراوانی۔ اٹک آئل کمپنی اور اس کے تیل کی وجہ سے علاقے کی نسبتاً زیادہ خوشحالی، راجہ غضنفر علی سے کہیں زیادہ کئی بھاری بھرکم سیاسی شخصیات، تلہ گنگ میں چار اضلاع کو جانے والی سڑکوں کے سنگم کی وجہ سے چہل پہل۔ پہلے سے دُگنی تگنی وسیع عملداری میں ہر ماہ میں بارہ راتیں دورے پر گزارنے کی لازمی

پابندی کی وجہ سے میں نے تھوڑا سا قرضہ لے کر ایک پرانی کار خرید لی اور پورے ذوق و شوق سے نئے نظام کی نئی اصلاحات کے پُرخلوص نفاذ میں اپنے آپ کو اعلیٰ ثابت کرنے پر تل گیا۔

اُس وقت ساری قوم کی طرح میرے بھی وہم و گمان میں نہ تھا کہ نئے نظام کی جڑوں میں ایک دیمک محوِ خواب ہے... من مانی کی دیمک... جو ''میری مرضی'' کی بھوک سے بے حال ہے اور عوام کی بہبود، آئین کی حدود اور قواعد و ضوابط کی قیود کو کھرچ کھرچ کر کھاتی رہتی ہے۔ اسی عمل میں یہ میرٹ کو چاٹ جاتی ہے۔ اصولوں کو کھا جاتی ہے اور اخلاقیات کو لقمہ بنا لیتی ہے۔ انسانی ذہن کی کرید، سوچ اور سوال کو کھانے کے بعد صلاحیتوں والے افراد کو گونگا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔ اس قحط الرّجال سے ریاست اندر سے تو کھوکھلی ہو جاتی ہے، مگر باہر سے کوئی نہ کوئی آکاس بیل اسے ڈھانپے رکھتی ہے۔ اس خطرے سے بے خبر مجھ سمیت وطن کے سب لوگ وطن کے ہر دم پھلنے پھولنے والے سرسبز شجر کو مسرت سے دیکھ رہے تھے اور میں بے حد مسرور تھا کہ بالکل نچلی زمین پر مجھے اس کی آبیاری، نلائی اور گوڈی میں شامل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ میں اپنی دو سالہ تربیت کا کھرپا پوری تندہی سے استعمال کرتے ہوئے پسینے سے بھیگ رہا تھا۔

اس عرق ریزی میں ڈیڑھ برس گزر گیا۔ جس کا ہر لمحہ اس ذہنی خلجان سے بوجھل تھا کہ میرا ہر قدم اور فیصلہ قانون کے مطابق ہونا چاہیے۔ تاکہ اپنے اُوپر والوں کی نگران نظروں کے علاوہ اپنے سامنے والوں کی عوامی نظروں کی بھی تسکین ہوتی رہے، جنھوں نے میری عدالتی زندگی کے پہلے دن ایک واضح پیغام دیا تھا۔ اس دوران مجھے بعض اوقات قدرے مختلف سی مٹی کی لکیریں نظر آتی رہیں۔ مگر مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ یہ لکیریں نہیں بلکہ بہت باریک مٹی کا مضبوط خول ہے۔ جو دیمک اپنی پناہ اور استراحت کے لیے خود بناتی ہے۔

ایک دن میرے ہی کھرپے سے یہ خول اچانک ٹوٹ گیا۔

اُس دن سے چند روز پہلے ایک گھبرایا اور سہا ہوا فرد اتنی عجلت سے میری عدالت میں داخل ہو کر فریاد کرنے لگا کہ کمرے میں سب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ پہلے پولیس اسٹیشن پر گیا تھا، مگر وہاں کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ تو کسی خیر خواہ نے اسے عدالت میں بھیج دیا۔ وہ جو کچھ بتانے لگا وہ ہم سب کے لیے نیا تھا۔ میرے لیے بھی اور کمرے میں موجود وکلاء اور دیگر لوگوں کے لیے بھی۔ اس نے بتایا کہ صدر ایوب کی نئی زرعی اصلاحات پر عمل ہوا تو اس کے چھوٹے سے گاؤں میں چند مزارعوں کی قسمت جاگ گئی، کیونکہ اس علاقے کے بڑے زمیندار کی جاگیر کا جو تھوڑا سا حصہ حکومت نے ضبط کیا تھا اس کا گاؤں اس حصے میں تھا۔ اس لیے وہاں کے سابق مزارعوں کو تھوڑا ہی عرصہ پہلے

حقوقِ ملکیت مل گئے تھے۔ مگر چند روز پہلے جاگیردار نے بیس پچیس نئے مالکان کو اغوا کر کے اپنی نجی جیل میں ڈال دیا تھا اور اب مجبور کر رہا تھا کہ وہ کئی کاغذوں پر انگوٹھے لگائیں جن سے ثابت ہو سکے کہ انھوں نے بہ رضا و رغبت اپنی اپنی زمین زمیندار کو بیچ دی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اس جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ مگر باقی لوگ ابھی تک اس ناجائز قید میں بند ہیں۔ اس لیے وہ ان کی رہائی اور دادرسی کے لیے سرکاری مدد مانگنے آیا تھا۔

میں نے اس کا سارا بیان قلم بند کیا اور اس تحصیل کے انچارج ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے نام حکم تحریر کر دیا کہ اس شکایت کا فوراً جائزہ لیں اور الزام درست ہونے کی صورت میں ان لوگوں کی رہائی کے لیے قانون کے مطابق ہر ممکن قدم اُٹھائیں اور تفتیش کر کے قانونی کارروائی کی جائے۔

دو چار روز تک پولیس کی طرف سے تو کوئی رپورٹ نہ آئی، مگر ایک روز رات گئے حکومت نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

میری سرکاری رہائش گاہ کچہری کے بالمقابل اس طرح تھی کہ درمیان میں ایک سڑک اور چھوٹا سا پارک تھا۔ ٹیلی فون صرف کچہری میں تھا اور وہ بھی اس ایجاد کی پہلی نسل کا نمونہ تھا کہ بالشت بھر اونچے ڈنڈے پر مائیکروفون سر اُٹھائے کھڑا تھا۔ جس سے منھ لگا کر بات کی جاتی تھی۔ اس ڈنڈے کے ایک پہلو پر ایک چونگا لٹکا ہوتا تھا جسے اُتار کر کان کے ساتھ لگاتے تھے۔ فون ملانے کا طریقہ یہ تھا کہ ڈنڈے کے دوسرے پہلو پر ایک چرخی لگی ہوئی تھی۔ سننے والا چونگا کان سے لگا کر چرخی گھماتے تو کہیں دور سے ٹیلی فون آپریٹر (operator) کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ ہم اسے نمبر دیتے تو مقامی کال تو وہ فوراً ملا دیتا مگر دوسرے شہر کی کال کے لیے فون بند کر کے کافی دیر تک گھنٹی بجنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

اُس رات ساڑھے دس بجے کے قریب میں سونے کی تیاری کر رہا تھا تو کچہری کے چوکیدار نے آ کر کہا کہ لاہور سے کال آئی ہے۔ آپ دفتر آ جائیں اور آپریٹر سے بات کریں۔ تو وہ آپ کو کال ملا دے گا۔ میں نے وہاں جا کر اپنے پہنچنے کی اطلاع آپریٹر کو دی تو گھنٹے بھر کے انتظار کے بعد وہ سول سیکریٹریٹ کا نمبر ملانے میں کامیاب ہو گیا۔

تب ون یونٹ[۳۲] (one unit) کا زمانہ تھا اور مغربی پاکستان کے سول سیکرٹریٹ (civil secretariat) سے جو سیکشن آفیسر بول رہے تھے وہ میرے اکیڈمی کے ساتھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے فوری طور پر تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تحریری آرڈر جاری ہو چکے ہیں۔ دو تین روز تک بذریعہ ڈاک تمھیں مل جائیں گے۔

ٹارچ کی روشنی کی سنگت میں چلتا ہوا میں گھر واپس پہنچا۔ کچھ دیر تک حالات کے اس نئے پلٹے کی بابت سوچتا رہا۔ پھر دوبارہ سونے کی کوشش میں ابھی نیند کو بلا ہی رہا تھا کہ کچہری کا چوکیدار دوبارہ نمودار ہو گیا اور حسبِ سابق مجھے دوسری متوقع کال کے لیے دفتر لے گیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد کال ملی۔ تو اسی آفیسر نے بتایا کہ گورنر صاحب[۳۳] کی طرف سے نیا حکم یہ ہے کہ کل صبح چارج چھوڑ دو اور شام سے پہلے اپنی سب ڈویژن کے علاقے سے نکل جاؤ۔ اب ہم تمھارا آرڈر ڈاک سے نہیں بھیج رہے۔ بہتر ہے پرسوں یہاں آ کر خود ہی وصول کر لو۔ کیونکہ تمھاری نئی تعیناتی اسی سیکریٹریٹ میں بطور سیکشن آفیسر ہوئی ہے۔

اگلے ہفتے میں لاہور سول سیکرٹریٹ کے ایک کمرے میں بطور سیکشن آفیسر کام کر رہا تھا۔ میری دو سالہ کڑی تربیت اس کمرے کے کونے میں بے بسی سے منھ چھپائے کھڑی تھی اور فرموداتِ قائداعظم اور ہدایاتِ ڈائریکٹر برجیس (Burgess) کھڑکی سے ایسے سر ٹکرا رہے تھے جیسے پروانے تاریکی سے روشنی کی طرف جانے کو بے تاب ہوتے ہیں۔

ملک بھر میں زرعی اصلاحات پر تحسین ناشناس دن بدن بلند ہوتی گئی اور سکوتِ سخن شناس پر بلھے شاہ کی طرح ان کی اصلیت واضح ہوتی گئی

میری بُکّل دے وچ چورنی ... میری بُکّل دے وچ چور

سب ڈویژن کے لازمی دورے ختم ہوئے تو سفر خرچ ملنا بھی بند ہو گیا اور میری کار کے اخراجات میری محدود تنخواہ کی ہنسی اُڑانے لگے۔ تب میں نے کار بیچ کر قرض ادا کر دیا اور اٹلی کی نئی ایجاد سے استفادہ کیا۔ یہ ویسپا (Vespa) کمپنی کا بنایا ہوا اسکوٹر (scooter) تھا، جو بازار میں تو مہنگا تھا مگر سرکاری ملازمین کے لیے ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر (District Food Controller) کی معرفت قریباً دو ہزار روپے میں مل جاتا تھا۔

چند ہی روز بعد میرے ایک اور ہم عصر بھی کسی دور دراز کی سب ڈویژن سے تبدیل ہو کر لاہور سیکریٹریٹ میں پہنچ گئے۔ انھوں نے بھی جب کار بیچ کر اسکوٹر خریدا تو ان کی طرف سے تصدیق کرنے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بھی بقول مصطفیٰ زیدی انھی پتھروں پر چل کر یہاں پہنچے تھے جن سے میں گزرا تھا اور ہم دونوں اپنی آرزوؤں کی کہکشاں کہیں پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔[۳۴]

تھوڑے ہی عرصے بعد سجاد احمد بھی آن شامل ہوئے۔ کیونکہ ہمارے باہمی تبادلے کے بعد وہ بھی پنڈ دادن خان میں راجہ غضنفر علی خان کو مطمئن یا خوش نہ کر سکے تھے۔[۳۵]

ون یونٹ (one unit) کے سیکریٹریٹ میں سابقہ چاروں صوبوں سے ہر محکمے اور ہر سطح کے

لوگ تھے۔ حفظِ مراتب کے باہمی رابطے تو اُفقی ہی تھے۔ مگر کچھ خبریں سینہ بہ سینہ عمودی طور پر اُوپر نیچے چلتی رہتی تھیں، جن سے مجھے اس نئے نظامِ حکومت کا ابتدائی ادراک ہونے لگا، کیونکہ یہاں کی بھری بزم میں راز کی بات کہنے والے ہم صرف تین ہی نہ تھے، بلکہ دھیرے دھیرے کھلا کہ ''یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں'' (اقبال)۔ عام تاثر یہی تھا کہ ''اصلاحات'' کے لغوی معنی جو بھی ہوں اس حکومت کے لیے وہ صغیرہ اور کبیرہ مصلحتیں ہی بن جاتی تھیں۔ اسی لیے حکومت قانون اور قواعد کی روایتی یا اصولی تشریح پسند نہیں کرتی تھی، بلکہ ایسی تشریح چاہتی تھی جو کسی من مانی کا راستہ ہموار کرتی ہو۔ گویا مذہبی منافقت والا گہرا اور گاڑھا رنگ اب ریاست اور سیاست پر بھی چڑھایا جا رہا تھا۔ اس ضمن میں اگر کوئی مشکل پیش آتی تو نیا مارشل لا آرڈر جاری ہو جاتا تھا۔ اس لیے سنکی لوگ انگریزی لفظ Law کو اُردو میں ''لا'' لکھ کر اس کا عربی ترجمہ یوں کرتے کہ یہ ''لاقانون'' ہے۔ جس کی لاقانونیت کو بندوق کے زور پر ''اصلاحات'' کہلوایا جاتا تھا۔

صدر ایوب کا دورِ حکومت چونکہ بڑی کامیابی سے طویل ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کے بعد آنے والی تمام حکومتیں بھی آج تک صدر ایوب کے مجوزہ نسخے ہی استعمال کرتی رہی ہیں۔ چنانچہ ہر حکومت اصلاحات کے نام پر ''میری مرضی'' قوم پر ٹھونستی رہی ہے۔ ۱۹۵۹ء کی زرعی اصلاحات کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں مزید زرعی اصلاحات نافذ کیں، مگر ان تمام زرعی اصلاحات کے باوجود جاگیرداری نظام ختم ہونے کی بجائے سیاسی اور معاشی طور پر پہلے سے زیادہ طاقتور ہوتا گیا۔ اسی طرح صدر ایوب کے بعد صدر یحییٰ اور پھر ذوالفقار علی بھٹو بھی انتظامی اصلاحات کا نفاذ کرتے رہے اور اُن سے حکومتوں کی من مانی تو نکھرتی گئی لیکن ملک کی انتظامی بساط بکھرتی گئی اور حُسنِ انتظام (Good governance) کی پرانی تصویر بگڑتی گئی۔

یہ ادراک مجھے ۱۹۶۳ء میں تو نہ ہوا۔ جب ''نیم شبی تبادلے'' کے بعد مجھے چوبیس گھنٹے میں سب ڈویژن چھوڑنا پڑی، مگر آج دونوں میناروں کی بلندی سے اچھی گورنس کی ڈھلان پر جملہ اصطلاحات کا نقصان صاف دیکھ سکتا ہوں ؎

چلو فیض دل جلائیں کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

حواشی

۱۔ Central Superior Services Exam۔

۲۔ یہ بندوبست تمام برٹش کولونیز (British Colonies) کے لیے تھا۔ جس کی وجہ سے میری ملاقات کرسٹفر اینڈرسن سے ہوئی تھی۔ حوالے کے لیے دیکھیے ص: ۲۱۔

۳۔ British Commonwealth Office۔

۴۔ قائداعظم کی ہدایت کے مطابق یہ بندوبست چوہدری محمد علی نے کیا تھا، جو پہلے تو سیکریٹری جنرل تھے، مگر بعد میں پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔

۵۔ نہ معلوم کیوں؟... یہ راز بالآخر ۱۹۵۸ء میں کھل گیا، جب وہ برسرِ اقتدار آ گئے۔

۶۔ علاء الدین ان دنوں غالباً ضلع سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر تھے۔

۷۔ ص: ۲۰۰۔

۸۔ ص: ۲۱۰۔

۹۔ ص: ۲۰۴ اور ۲۱۴ پر، حاشیہ نمبر ۹۔

۱۰۔ ص: ۲۱۳۔

۱۱۔ ص: ۲۱۹۔

۱۲۔ یعنی ایف اے پاس (میٹرک کے بعد Intermediate کلاس) کرنے کے بعد۔

۱۳۔ محمد منیر، ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان، *From Jinnah to Zia*، (لاہور: وین گارڈ بکس، ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۳ء)۔ یہ اقتباس ۱۹۸۳ء والے دوسرے ایڈیشن سے لیا گیا ہے۔

۱۴۔ غالباً اسی لیے فوجی محاورے اور گفتگو میں انھیں Bloody Civilian کہا جاتا ہے۔

۱۵۔ ص: ۲۰۴ اور ۲۱۴ پر، حاشیہ نمبر ۹۔

۱۶۔ امین اللہ چوہدری، *Political Administrators* (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس پاکستان، ۲۰۱۱ء ایڈیشن)، ص: ۹۳۔

۱۷۔ *Indian's Political Administrations*, David C.Potter (نئی دہلی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس) ص: ۲۴۔

۱۸۔ ص: ۲۲۷۔

۱۹۔ ص: ۲۱۰۔

۲۰۔ ص: ۲۰۲۔

۲۱۔ ص: ۲۱۷۔

۲۲۔ امین اللہ چوہدری، *Political Administrators*، (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ء) ص: ۱۸، ۱۹۔

۲۳۔ *Indian's Political Administrations*, David C.Potter (نئی دہلی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس) ص: ۹۲۔

۲۴۔ ان میں پاکستان نیوی (navy) کے ایک افسر بھی شامل تھے۔

۲۵۔ ترجمہ: ہم غریبوں کے مزار پر نہ تو کوئی گل کھلتا ہے۔ نہ ہی چراغ جلتا ہے۔ اسی لیے یہاں کسی بلبل کی صدا نہیں آتی اور کسی پروانے کا پر نہیں جلتا۔

۲۶۔ ص: ۲۰۲۔

۲۷۔ ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو قوم سے خطاب میں صدر ایوب نے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا کہ ملک میں جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لیے اب جاگیریں بغیر معاوضے کے ختم کر دی گئی ہیں۔ پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی رقبے سے زائد زمین بحقِ سرکار ضبط کر کے مزارعین میں بانٹ دی جائے گی اور انھیں حقوقِ ملکیت مل جائیں گے، لیکن ان اصلاحات کے عملی نفاذ میں کئی قسم کے استثنیٰ، پیداواری یونٹ کے پیمانوں، اور گھر کے افراد کے حقوق کی وجہ سے ان اصلاحات کے مقاصد پورے نہ ہو سکے اور صرف چند ایک بہت بڑے زمینداروں کے علاوہ باقی کی اکثریت حسبِ سابق معاشی اور سیاسی طور پر طاقتور ہی رہی۔

۲۸۔ ص: ۲۰۰ تا ۲۰۲۔

۲۹۔ ۲۱ / مارچ ۱۹۵۹ء، Disqualification of Public Offices Order

۳۰۔ ۷ / اگست ۱۹۵۹ء، Disqualification of Elective Bodies Order

۳۱۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، دوسرا ایڈیشن (۱۹۸۷ء) ص: ۸۲۱۔

۳۲۔ ۳۰ / ستمبر ۱۹۵۵ء کو دوسری آئین ساز اسمبلی نے ون یونٹ قائم کرنے کا قانون منظور کیا۔ جس کی رو سے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں (پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان) متعدد ریاستوں اور قبائلی علاقوں کو مدغم کر کے مغربی پاکستان کا ایک صوبہ قائم کر دیا۔ جس کا مرکز لاہور تھا۔ پھر ۲۰ / نومبر ۱۹۶۹ء کو جنرل یحییٰ خان نے قوم سے خطاب میں ون یونٹ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح یہ صوبہ چودہ برس قائم رہا۔

۳۳۔ ملک امیر محمد خان، نواب کالا باغ۔

۳۴۔ انھی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے (مصطفیٰ زیدی)

۳۵۔ تین چار برس بعد سجاد احمد سرکاری وفد میں غالباً بیروت گئے اور وہاں ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔

منفی قوتیں

صدر ایوب خان اپنے انقلاب کی پانچویں سالگرہ منا چکے، تو قوم متحرک تھی۔ ملک میں جوش و خروش تھا۔ نگر نگر نقار خانے تھے اور جابجا ڈھولوں کی تھاپ بتاتی تھی کہ یہ ترقی کا میلہ ہے۔ بارونق، پُرشور، بھیڑ بھاڑ، ہاؤ ہو۔

یہ منظر تب کا ہے جب میں بھی اس میلے میں شریک تھا اور یہ میلہ وطن کے مینار کی دوسری منزل میں لگا ہوا تھا۔

آج میں جس بلندی سے جھانک کر اُس دور کو دیکھ رہا ہوں، وہ میرے مینار کی آٹھویں اور وطن کے مینار کی ساتویں منزل ہے۔ اس بلندی پر نہ تو ماضی کے ڈھول کی تھاپ پہنچ سکتی ہے۔ نہ تب کے میلے کا شور آ سکتا ہے اور نہ ہی تب کی خود فریبی کا یہاں گزر ہے۔ زمان و مکان کی پس نظری نے یہاں کی ہوا کو لطیف اور شفاف بنا دیا ہے، جس میں چشمِ بینا بہت دور تک دیکھ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی گوشِ نصیحت نیوش سے غیب سے آنے والی نوائے سروش بھی سنی جا سکتی ہے۔

یہاں سے منظر تو پرانے ہی نظر آتے ہیں، مگر ان کے گرد نئے معانی کا ہالہ بھی بنا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے علامہ اقبال کی نظم میں جب آسمان اپنی لامتناہی بلندی سے جھک کر کوہِ ہمالہ کی پیشانی چومتا ہے تو اسے بے جان سنگلاخ منظر میں متحرک زندگی کے کئی نئے روپ نظر آتے ہیں۔ اس کی صد رنگ اونچی نیچی چوٹیوں پر برف کی دستارِ فضیلت ہے۔ پاؤں کی گرفت زمین پر اور سر کی سوچ فلک پر ہے۔ موجِ نسیم کے گہوارے میں جھومنے والی گُل کی کلیاں ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے وہاں گلچیں کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ وہاں فیلِ بے زنجیر کی طرح اُڑنے والا ابرِ شاداں ہے اور جابجا خیمہ زن کالی گھٹائیں بھی ہیں۔ گویا یہ بلندی، فاصلہ، لاتعلقی اور معروضیت اس عام سے منظر میں خاص معنی اس طرح بھر دیتے ہیں کہ کوہِ ہمالہ کائنات کے شاعرانہ دیوان کا مطلعِ اوّل بن جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح اس بلندی، فاصلے اور معروضیت سے آج میری طائرانہ نظر جب زمانے کے پہاڑ جیسے اُتار چڑھاؤ پر پاکستانی تاریخ کے مناظر دیکھ رہی ہے تو مجھے وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو اُس وقت نظر نہیں آتا تھا۔ آڑی ترچھی ڈھلانوں پر جابجا بکھری ہوئی کئی ندیاں اِدھر اُدھر سے بہہ کر آگے پیچھے ملتی جا رہی ہیں، اور دھیرے دھیرے ۱۹۴۷ء میں قوم کا دریا بن جاتا ہے۔ پہلے یہ

ابتدائی رکاوٹوں سے سر پٹختا ہے لیکن پھر ہموار اور شفاف ہوتا جاتا ہے۔ سرسبز کنارے، سرشار مچھلیاں، بے تاب پرندے، چمکتی لہریں اور متحرک کشتیاں اس کی بھرپور زندگی کو سجا رہی ہیں۔ اپنی روانی کی جملہ خوشیوں سے کھیلتا ہوا یہ دریا جب صدر ایوب کے زمانے میں پہنچتا ہے تو یکساں طور پر شفاف دریا میں مختلف قسم کے لوگوں کی سرپرستی، پشت پناہی، کرم گستری اور حمایت کی لکیریں سی نظر آنے لگتی ہیں۔ ہلکے ہلکے بھینے بھینے رنگوں کی یہ لکیریں پہلے تو دور تک ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی خوش نما اور خوبصورت لگتی ہیں مگر مزید آگے جا کر یہ رنگ گہرے ہونے لگتے ہیں تو لکیریں بھی گاڑھی ہونے لگتی ہیں۔ ان کی روانی ایک دوسری کے قریب کھسکنے لگتی ہے۔ پھر آگے جا کر یہ آپس میں گلے ملنے لگتی ہیں۔ پھر مدغم ہونے لگتی ہیں۔ رنگ آپس میں گڈمڈ ہونے لگتے ہیں۔ ان کا سہانا پن دھندلانے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے پانی گدلا ہونے لگتا ہے۔ پھر جب یہ دریا پہلے جنرل یحییٰ اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں داخل ہوتا ہے، تو یہ گدلاہٹ بڑھنے لگتی ہے۔ پانی کا تناسب گھٹنے لگتا ہے اور دریا میں کہیں کیچڑ اور کہیں دلدل نظر آنے لگتے ہیں۔

میں آنکھیں میچ کر ذرا غور سے دیکھتا ہوں...

پھر نظریں چرا کر پریشان ذہن پر زور ڈالتا ہوں...

پھر علامہ اقبال ہی کی نصیحت کے مطابق ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی'' کی سعی کرتا ہوں۔ تو پہچاننے لگتا ہوں کہ شفاف دریا میں یکے بعد دیگرے اُبھرنے والی رنگ دار لکیریں دراصل وہ تمام خرابیاں تھیں جو وطن کی تعمیر میں شروع سے ہی مضمر تھیں، اور جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کی گنتی کچھ بھی ہو، ان کا رنگ کوئی بھی ہو، ان کی ترتیب جیسی بھی ہو۔ اب قیامِ پاکستان کے گیارہ برس بعد انھیں پہلی دفعہ اپنے اُبھرنے کے لیے سازگار ماحول مل رہا تھا، کیونکہ جنرل ایوب خان کی نئی حکومت ریاست کی پرانی، کلاسیکی اور بنیادی ترتیب کو اپنی من مانی سے بدل کر اسے ایک ملک گیر چھاؤنی بنانے پر تُلی ہوئی تھی۔

اپنی کتاب میں صدر ایوب نے جس بونا پارٹ ازم[۲] کا ذکر کیا ہے وہ اب پوری طرح کارفرما تھا، مگر اُس وقت کسی کو بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ طرزِ عمل علامہ اقبال کے ایک مصرعے ؏

''تن پرست و جاہ مست و کم نگاہ''

کی صحیح تشریح تھا اور ''اصلاحات'' کے زعم میں بہت سی منفی قوتوں کے دہانے کھول رہا تھا، جن کی وجہ سے صدر ایوب کا دورِ حکومت اپنے اعلیٰ ترقیاتی حاصل جمع کے باوجود آئینی، قانونی اور اخلاقی اقدار کی تفریق کا نقطۂ آغاز بننے لگا تھا۔ ان میں سے بعض منفی قوتیں تو اپنے واضح لمس کی وجہ سے

گنتی میں آ سکتی تھیں، مگر کئی ایسی تھیں جو ابھی محسوس بھی نہیں ہوتی تھیں۔

بالکل صاف نظر آنے والی منفی قوتوں میں سرفہرست یہ تھی کہ ریاست کے صدیوں پرانے تقسیمِ کار کا صدیوں پرانا سانچہ توڑ دیا گیا۔ اس سانچے کا عام فہم نام ''وردی'' ہے۔ جو کسی بھی قوم کے جملہ افراد کے مابین ان کی پیشہ ورانہ ذمّے داریوں کا تعین کرتی ہے۔ مثلاً جج، وکیل، ڈاکٹر، نرس، پروفیسر، بحری، بری اور ہوائی فوجی، ریلوے ملازم، پولیس، ٹریفک اسٹاف اور ڈاک خانے کا عملہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کی مخصوص وردی یہ اعلان کرتی رہتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ تربیت، اہلیت، مہارت اور فرائض کیا ہیں۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ وردی پہننے والا صرف وہی کام کرے گا جو اس پوشاک سے عیاں ہے۔ کوئی دوسرا کام کرنے کی صورت میں اسے یہ وردی اتارنا ہوگی۔ یہ بیک وقت قانون، قاعدہ، دستور، قرینہ اور روایت سبھی کچھ ہے۔ جس نے دنیا بھر میں ہر زمانے کی ہر وردی کو ایک منصبی تقدیس دے دی ہے۔ پہلے مارشل لاء نے اس تقدیس کو روندتے ہوئے وردی کی حدود سے تجاوز کر ڈالا اور آئندہ کے لیے وردی سے تجاوز کی عام رسم ایسے ڈال دی کہ جیسے جیسے وقت گزرنے کے ساتھ کرپشن اور لالچ معاشرے پر غالب آتے گئے، تو ہر وردی والا اپنی وردی کے رنگ اور فرائض روندنے لگا۔ پروفیسر اور ڈاکٹر کے گاؤن (gown)، وکیل کا کالا کوٹ اور امام کا چوغہ و دستار اپنے اپنے معنی کھونے لگا اور استحصالی حرص و ہوس سے بھیگنے لگا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

ہر ایک کو نظر آنے والی دوسری منفی قوت کا یہ رجز یہ دعویٰ تھا کہ خاکی وردی والے اپنے علاوہ دوسروں کا ہر کام کرنے کے نہ صرف اہل ہیں، بلکہ ان سب سے بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ یہ کم نگاہی بار بار سینہ زوری کے ساتھ نافذ ہوتی رہی اور اس قسم کا سیاسی اور سماجی رویہ بنتی گئی جو دھیرے دھیرے پاکستانی زندگی کے ہر شعبے سے میرٹ (merit) یعنی موزونیت، اہلیت اور استحقاق کو منہا کرنے لگا۔ پنجابی محاورے کے مطابق کہ ''ڈاڈھے دے ستی ویہہ سو ہوندے نیں'' (زبردست کی گنتی میں پانچ دفعہ کی بجائے سات دفعہ ۲۰ ر گنا جاتا ہے تب ایک سو بنتے ہیں)۔ ملک کے حُسنِ انتظام پر اس کا دور رس منفی اثر یہ ہوا کہ جس طرح صدر ایوب کے دور میں فوجی افسران کو پبلک سروس کمیشن کے امتحان اور انٹرویو کے بغیر بیوروکریسی میں جگہ دینے کی رسم ڈالی گئی، اس طرح بعد میں آنے والی تمام حکومتیں بھی اپنے سیاسی کارکنوں اور حاشیہ نشینوں کو بیوروکریسی میں گھسیڑتی گئیں اور انگریزی محاورے کے مطابق تب سے اب تک گول سوراخوں (round holes) میں چار کونوں والی سلاخیں (Square pegs) ہی ڈالی جاتی رہی ہیں۔

تیسری واضح اور دیدنی منفی قوت حکومت کا وہ دستِ شفقت (patronage) تھا جو ایک طرف تو اقتدار کے وفاداروں کی طرف دراز ہو جاتا تھا اور دوسری طرف میرٹ کا گلا گھونٹ دیتا تھا۔ اس منفی قوت کی داستان طویل ہے۔ کیونکہ غرض مندوں اور احسان مندوں کی قطاریں اس دور میں دن بدن طویل ہوتی گئیں۔ اس لیے مختصراً اتنا ہی ذکر کافی ہے کہ صدر ایوب کے دور میں تقریباً تمام سیاسی اور معاشی پالیسیوں میں وفاداروں کے لیے خاص مراعات ہوتی تھیں۔ کہیں واضح شہادت دیتی ہوئی اور کہیں کونوں کھدروں میں چھپ کر سمائی ہوئی۔ یہ چلن اتنا جاری وساری رہا کہ جو ملک برِعظیم کے مسلمانوں کی آئینی اور معاشی آزادی اور اسلام کے سماجی انصاف کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس میں ''سیاسی وفاداری'' کے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھ دی گئی۔ صدر ایوب کے بعد اگلی حکومتوں نے بھی اس کی منظم تبلیغ کو اتنی شد ومد سے جاری رکھا کہ میرٹ (merit) کا بتِ حُسنِ انتظام کے عوامی کعبے سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔ بیوروکریسی کی قانونی بالادستی والی کفر بزورِ شمشیر توڑ دی گئی اور سرکاری ملازموں کو یہ نیا کلمہ پڑھایا گیا۔ ع

وفاداری بہ شرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے (غالب)

وطن کے کندھوں پر ان کے علاوہ اور بھی منفی قوتیں سوار ہیں اور یہ گنتی جاری رہ سکتی ہے لیکن یہاں صرف تین مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے جن کا تعلق اس رپورتاژ کے مرکزی خیال (theme) سے ہے۔ یعنی حُسنِ انتظام (Good governance) کا دانستہ قتل اور قانون پرست سرکاری ملازموں کی مسلسل درگت تاکہ وہ شخصیت پرست بن جائیں، لیکن ان سب کے علاوہ ایسی کئی منفی قوتیں بھی تھیں جو اُس وقت نظر نہیں آتی تھیں، مگر وطن کے باطن میں پوشیدہ پرورش پا رہی تھیں اور آج دونوں میناروں کی بلندیوں سے اسی طرح صاف دکھائی دے رہی ہیں جیسے خدا کا آسمان علامہ اقبال کے کوہِ ہمالہ کو اوپر سے دیکھتا رہتا تھا۔ ان کی بھی علیحدہ گنتی ہو سکتی ہے۔

ان آنکھ اوجھل باطنی خامیوں میں سے سب سے پہلی تو پاکستانی معاشرے کی وہ ڈھکی چھپی کروٹ تھی جس کا ابھی کروٹ لینے والے کو بھی احساس نہ تھا کہ ریاست کی اُلٹ پلٹ سے قومی معاشرہ بھی ہل پڑا تھا۔ صدر ایوب اپنا انقلاب لائے تو یہ پاکستانی سوسائٹی کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ جوشِ نمو سے بے تاب عمر اور کسی بھی طرف ڈھل جانے والا اثر پذیر مرحلہ... چنانچہ پاکستانی ریاست کی ترتیب بدلے جانے پر پاکستانی سوسائٹی کی بساط بھی سکڑنے سمٹنے اور ہلنے لگی۔

پاکستانی معاشرے کے اجزائے ترکیبی کی جڑیں بہت گہری تھیں اور ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی سے پھوٹی تھیں۔ جب سرسیّد نے اس مایوس زمین کو امید افزا انگلیوں سے کریدا تھا۔

پھر ۱۹۰۶ء میں بنگال کی زرخیز سرزمین پر مسلم شناخت کا شگوفہ مسلم لیگ بن کر پھوٹا۔ بعدازاں اسی مسلم لیگ کو اقبال نے خودی کی آنکھ سے نئے وطن کا خواب دکھایا۔ ساتھ ہی علامہ مشرقی نے خدمتِ خلق کا کڑا ڈسپلن دے کر مسلم قوم میں انسانی فطرت کے اعلیٰ عناصر کو اُبھارا اور آخر میں قائداعظم نے تصورِ پاکستان کو مزید نکھار کے اپنے کردار کی دیانت اور عظمت سے وطن کا مینار کھڑا کر دیا۔ ان سب کے علاوہ کچھ اور بھی تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے سارے مسلم رہنماؤں کا اپنا کردار صاف ستھرا اور دیانتدارانہ ہوتا تھا۔[۳] اس لیے وہ سب انسانی فطرت کے ارفع عناصر کو اُبھارتے رہے، کیونکہ وہ سب اپنی اپنی سوچ کے مطابق اپنے انداز میں غیروں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے پُرخلوص جدوجہد کر رہے تھے اور خیر کی اندرونی قوت سے سرگرم تھے۔

پاکستانی معاشرے کی تعمیر کرنے والی ان کڑیوں میں سے اگر کوئی ایک بھی کم ہوتی تو اس معاشرے کا ظہور ہی نہ ہو سکتا تھا، اسی لیے ان سب کی ہلکی سی جھلک زیرِ نظر رپورتاژ میں اب تک دکھائی جاتی رہی ہے۔

صدر ایوب کے دورِ حکومت کی من مانی سے ان مضبوط کڑیوں کو بتدریج توڑنے کا آغاز ہو گیا، کیونکہ وہ غیروں سے آزادی چھیننے والی جدوجہد نہیں کر رہے تھے، بلکہ اپنوں سے اقتدار چھین کر اس پر دائمی قبضہ جمانے میں مصروف تھے اور ریاست کو اپنی وردی کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ اس غاصبانہ مہم کے لیے خیر کی اندرونی قوت کی بجائے شر کی بیرونی قوت درکار تھی جسے استعمال کرنے میں انھیں تامل یا جھجک نہ تھی۔ ان کی حکومت گئی تو بعد میں آنے والی تمام حکومتیں بھی اسی انداز میں خیر کی بجائے شر کا سہارا لیتی رہیں۔ چنانچہ تمام پاکستانی حاکموں کی اس طویل مہم سے پاکستانی شہری کی فطرت یوں بدلنے لگی کہ خیر والے اچھے عناصر حوصلہ شکنی کی وجہ سے نیچے دبتے گئے اور شر والے برے عناصر حوصلہ پا کر اُوپر آتے گئے۔

آج جب میں وطن کے مینار کی ساتویں منزل میں کھڑا ہوں تو وہاں ان شہریوں کا نام ونشان بھی نہیں، جنھیں میں پہلی منزل میں دیکھا کرتا تھا۔ پہلی منزل میں سرسیّد، اقبال، علامہ مشرقی اور جناح کے پروردہ شہری بستے تھے، مگر ساتویں منزل میں بسنے والے شہری بڑے مختلف ہیں، کیونکہ درمیان والی منزلوں کی حکومتیں انھیں اچھائی سے برائی کی طرف آنے کی ترغیب دیتی رہی تھیں، بلکہ انعام سے نوازتی تھیں۔ میں اُوپر سے جھانکتا ہوں تو پہلی منزل میں سنہرے دور کی بے بسی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

شوکت ہمارے ساتھ بڑا حادثہ ہوا
ہم رہ گئے ہمارا زمانہ چلا گیا (شوکت واسطی)

دوسری باطنی خرابی کے آغاز کا سرسری ذکر اُوپر ہو چکا ہے کہ پوڈو (PODO) اور ایبڈو (EBDO) کے ذریعے جاگیرداروں کو ابتدائی سرزنش اور دہشت گردی[۴] کے بعد اب ان سے خفیہ راز و نیاز اس طرح ہونے لگے کہ۔

وصل کا تھا تذکرہ جب یہ کہا اُس شوخ نے
ہاں کہیں ہو تو سہی، لیکن کہیں پردے میں ہو

چنانچہ پردے ہی پردے میں باہمی وفاداریوں کے ادل بدل سے ایک ایسی دیرپا قربت کے رشتے کا آغاز ہو گیا جو وقت کے ساتھ ہر دم مستحکم ہوتا رہا اور وطن کے مینار کی ہر منزل کی دھوپ چھاؤں گرمی سردی اور برق و باراں میں نہ صرف قائم و دائم رہا، بلکہ آج تک مذہبی نکاح جیسی مضبوطی سے چل رہا ہے اور وطن کی ساری سیاست اس کے اردگرد متحرک رہی ہے۔ بچوں کے پارک میں نصب شدہ کھیل see-saw کی طرح جس میں ایک ہی لمبے تختے کے دونوں کناروں پر دو بچے جم کر بیٹھ جاتے ہیں اور باری باری ان میں سے ایک اُوپر جاتا ہے تو دوسرا نیچے آ جاتا ہے۔ یہ اونچ نیچ ایسی مسلسل اور متوازن ہوتی ہے کہ دونوں بچوں میں سے نہ کوئی گرتا ہے نہ ہارتا ہے اور کھیل جاری رہتا ہے۔

دونوں میناروں کی بلندی سے ہماری تاریخ کے شفاف دریا میں پہلے تو اس رشتے کی دو رنگدار لکیریں متوازی بھاگتی نظر آتی ہیں۔ پھر قدم بہ قدم قربت ہے۔ پھر ہم آغوشی ہے اور پھر یک جان ہونے سے ایک نئے سیاسی محور کا جنم ہے، جس کی دو رنگی گدلاہٹ آگے چل کر مشرقی پاکستان کی یک رنگ شفاف لکیر کو بھی پرے دھکیل رہی ہے۔ کیونکہ صدر ایوب کی ۱۹۶۲ء والی سوچ[۵] کو اب مزید ہم خیال ساتھی بھی مل گئے ہیں۔

تیسری باطنی خرابی کی نشان دہی تو ۱۹۵۹ء میں ہی ہو گئی تھی۔ جب اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی ایک رپورٹ نے اس خطرے سے آگاہ کیا کہ پاکستان کے تمام بینک نجی صنعتی شعبے کو جو قرضہ مہیا کرتے ہیں اس کا بڑا حصہ (دو تہائی کے قریب) صرف دو سو کھاتے دار لے جاتے ہیں اور باقی خواہش مندوں کے لیے صرف ایک تہائی باقی بچتا ہے۔ لیکن صدر ایوب کی حکومت نے اس خطرے کی گھنٹی کو نہ صرف نظرانداز کر دیا بلکہ اس رجحان کو مزید بڑھا دیا۔ پھر وفاداروں کی مزید دستگیری اور پشت پناہی سے یہ مرض تیزی سے بڑھنے لگا اور حکومت کی صنعتی ترقی گنے چنے من پسند

افراد تک محدود ہونے لگی۔ ۱۹۶۸ء میں جب ترقی کا عشرہ منایا جا رہا تھا تو قوم اس سے بے خبر تھی کہ ملک کی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں اکٹھی ہو رہی ہے، مگر بعد میں پلاننگ کمیشن کے چیف اکانومسٹ ڈاکٹر محبوب الحق نے انکشاف کیا کہ وطن کے مینار پر اب بائیس خاندان قابض ہو چکے ہیں۔ صنعتی اداروں کا ۶۶ ر فیصدی، انشورنس کا ۷۰ ر فیصدی اور بینکوں کا ۸۰ ر فیصدی حصہ اب حکومت کے وفادار خاندانوں کی جیب میں ہے۔[۶] معاشرے میں تقسیم زر کا اندرونی تناسب و توازن اس طرح بگڑ چکا ہے کہ اب غریبوں کی غربت اور امیروں کی امارت بڑھنے والے عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس عمل سے وطن کے مینار میں باہر کے علاوہ اب اندر بھی dent یا چب پڑنے لگے۔ تب لوگوں کی آنکھیں دیکھنے لگیں اور کان کھڑے ہو کر سننے لگے، مگر زبانیں حسبِ معمول بولنے سے گریز ہی کرتی رہیں۔

بولنے سے گریز... دانستہ گریز... مسلسل گریز... یہ چوتھی باطنی خرابی تھی۔ جو مغربی پاکستان کے باطن میں ہمیشہ سے غالب تھی کیونکہ ایک تو یہاں جاگیرداری نظام کی جابرانہ گرفت تھی اور دوسرے اس معاشی بندھن کی گرفت تھی کہ عوام کی بڑی اکثریت کی روزی عسکری سرگرمیوں سے وابستہ تھی۔ ان دونوں عوامل کا اطلاق مشرقی پاکستان پر نہیں ہوتا تھا۔ جہاں نہ تو جاگیرداری نظام تھا اور نہ ہی ان کا نان نفقہ فوجی تنخواہوں سے وابستہ تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں اپنے حقوق کے لیے آواز اُٹھانے کی رسم عام تھی۔ جس سے ملٹری ڈکٹیٹر اور وڈیروں کی شراکت کا نیا محور بہت نالاں تھا اور ان کی من مانی کے کباب میں مشرقی پاکستان ایک ناگوار ہڈی بننے لگا۔

اس رپورتاژ کے اب تک کے جائزے کے مطابق وطن کے مینار کی پہلی منزل میں سنہری زمانے کی روشنی تھی لیکن مذکورہ بالا تین ظاہری چار باطنی اور دیگر کئی خامیوں کی وجہ سے صدر ایوب کا دورِ حکومت جھٹپٹے کا وقت (twilight zone) بن گیا۔ جس میں گزرے سنہرے زمانے کی روشنی بھی باقی تھی اور آنے والے اُفق پار اندھیرے کا سایہ بھی تھا۔ یہ اندھیرا جنرل یحییٰ کے دور میں آن پہنچا اور پوری طرح چھا گیا۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں صبحِ کاذب اور صبحِ صادق غلط ملط ہوتی رہیں اور اُس کے بعد جنرل ضیا کی ظلمت آ گئی۔[۷] تب سے اب تک شب و روز بیدل کا مصرع ہیں۔ ع

شب رفت، سحر نہ شد، شب آمد

اس جھٹپٹے میں ہی تواریخ کا قتلِ عمد کرنے والے بھی پیدا ہو گئے، جو شام کی محدود روشنی کو دوپہر کی چمک لکھنے لگے۔ رات کے اندھیرے سے کبھی انکار کرتے اور کبھی فراموش کر دیتے۔ حالانکہ اس کی آڑ میں مقتول تاریخ کا قبرستان پھیلتا جا رہا تھا، جس میں انگریز کی تربیت یافتہ

بیوروکریسی کی بھی قبر بن گئی اور اس پر گالیوں کا کتبہ لگ گیا۔ تاریکیوں میں گھری ہوئی قوم نہ تو یہ مناظر دیکھ سکی اور نہ ہی گن سکی۔ اس لیے اس جھٹپٹے کے دوران وقت کی انگلیوں کی گنتی ہمیں بہت کچھ بتا سکتی ہے۔ جس کا شمار میں اب آٹھویں اور ساتویں منازل سے کر رہا ہوں۔

اس گنتی سے پتا چلتا ہے کہ اس جھٹپٹے میں نوآبادیاتی دور کے نشانات مٹانے کے نام پر مسلسل اصلاحات کا مقصد صرف ایک مضبوط نشان کو مٹانا تھا جو ان کے آئندہ عزائم کی راہ میں حائل تھا۔ یہ قانون کی بالادستی والا نشان تھا جو برٹش دور کا سب سے تابناک نشان تھا اور اُسی دور کی منظم تربیت یافتہ بیوروکریسی اس کی معاون، محافظ اور ضامن تھی۔ پہلے اسے بدنام کیا گیا۔ پھر کئی طریقوں سے خوفزدہ کیا گیا۔ کئی سرکاری ملازم نکالے گئے۔ باقی سب کو پچیس برس کی ملازمت کے بعد بالکل غیر محفوظ کر دیا گیا۔ نئے رولز کے ذریعے انھیں اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ان کی صفوں میں اپنے وفادار گھسیڑے گئے۔ ان کے فخریہ نشان میرٹ (merit) کو درہم برہم کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ تابناک نشان ماند پڑنے لگا۔ بے رونق اور بھربھرا ہونے لگا۔ مگر نوآبادیاتی دور کے دیگر تمام نشانات نہ صرف قائم رکھے گئے، بلکہ انھیں پختہ سے پختہ تر کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ جن کی مثالیں یہ ہیں:

۱۔ برٹش دور کے عسکری اور جاگیردارانہ نظام دن بدن پختہ تر ہوتے گئے۔ پھر حصہ دار بن کر ایک دوسرے کو باہمی تقویت دینے لگے۔

۲۔ برٹش دور کی متروک پالیسی یعنی تقسیم کر کے حکومت کرو (Divide and rule) از سر نو زندہ کی جانے لگی۔ جس کی ابتدائی شکل تو یہ تھی کہ دونوں حصوں کے سرکاری ملازمین اپنے اپنے حصے میں تعینات رہیں گے۔[۸] اور معتبر شہادت ایک شریکِ کار جسٹس منیر نے دی۔[۹] مزید شہادتوں سے پاکستان کی تاریخ بھری ہوئی ہے۔

۳۔ تعلیم کا رُخ انگلش میڈیم اسکولوں کی طرف مڑنے لگا، کیونکہ سیاسی آزادی کے باوجود اب پابجولاں قوم پر لیڈروں کی غلامانہ ذہنیت نیچے کی طرف ٹپکنا شروع ہو گئی تھی۔

۴۔ سماجی اسلام کے نقیب ڈاکٹر فضل الرحمان کو اسلامک ایڈوائزری کونسل کا چیئرمین مقرر کرنے کے بعد مولویوں کے اعتراض پر فارغ کر دیا گیا اور مُلّا کو برٹش دور کی فرقہ پرستی پھیلانے کی اجازت دے دی گئی۔

۵۔ برٹش ایمپائر میں انگریز حاکم جس من مانی کا تختۂ مشق غلام قوموں کو بناتا تھا وہی من مانی اب پاکستانی حاکم اپنوں پر مسلط کرنے لگے۔

وقت کی گنتی یہ بتا رہی ہے کہ پاکستان کی تعمیر میں مضمر خرابیاں[۱۰] اور مذکورہ بالا ظاہری اور باطنی خامیاں اس جھٹپٹے میں مدغم ہونے لگی اور ان کے اشتراکِ عمل نے چپکے چپکے وہ بیج بونے شروع کر دیے جن سے صرف درد کی فصل ہی اُگ سکتی تھی اور جسے آج کی نسل کی تشکیک، اُلجھن، بے یقینی اور منتشر خیالی کاٹ رہی ہے۔ پہلا بیج تو وہ انقلاب خود تھا جو تعمیرِ وطن کے نام پر آیا، مگر دھیرے دھیرے تخریبِ وطن کے ایسے ایسے راستے کھولتا گیا کہ بالآخر وقت کو فیصلہ دینا پڑا کہ ؎

سبھی شامل ہیں تخریبِ چمن میں
خزاں بھی، فصلِ گل بھی، باغباں بھی

دوسرے بیج سے آئین شکنی، قانون کی پامالی اور من مانی کی متعدد روایات پھوٹیں، جنھیں اگلی ساری حکومتیں بھی گلے لگاتی رہیں۔ تیسرے بیج سے حکومت کے غیر متوازن پھیلاؤ کی آکاس بیل پھوٹی جس نے ریاست کے متوازن شجر کو پوری طرح ڈھانپ کر چھپا دیا۔ چوتھا بیج سرکاری ملازموں کی فصل میں ایسا پھل اُگانے کے لیے تھا جو عوام کے لیے کڑوا مگر حاکموں کے لیے شرطیہ میٹھا ہو۔[۱۱] پانچواں بیج کرپشن کی منظم افزائش کے لیے تھا، تاکہ یہ افراد کے کندھوں سے اداروں کی گود میں اُچک جائے، اور وفاداروں کی دست گیری اور پشت پناہی کے لیے تمام سرکاری ادارے استعمال ہو سکیں۔

بیج تو اور بھی تھے، مگر یہاں صرف ان کا شمار کیا گیا ہے جن سے نکلنے والی ٹیڑھی اور موٹی جڑیں وطن کے مینار کی سیدھی انتظامی بنیادوں میں دراڑیں ڈالتی رہیں اور حُسنِ انتظام کو تار تار کرتی رہیں۔

صدر ایوب کے دور کی سب سے نرالی... مگر نقصان دہ... بات یہ تھی کہ ان تمام بیجوں کی مشترکہ تاثیر سے ایک ایسا پودا پھوٹا جو اونچا بھی ہوتا گیا۔ پھیلتا بھی گیا... مگر کسی قسم کا پھل دینے کی بجائے بڑ کے درخت کی طرح ہوا سے زمین کی طرف نئی نئی جڑیں پھینکتا رہا، جن کی مدد سے وہ خود ہی پھیلتا رہا اور زمین کی ساری توانائی بھی صرف اپنے لیے ہی حاصل کرتا رہا۔

یہ پودا دراصل اُن بااثر افراد کا تھا جو اس جھٹپٹے میں پہلی دفعہ ایک نئی شکل و صورت میں جنم لے رہے تھے... جیسے بعض گوشت خور پودے ہوتے ہیں جو بظاہر تو خوبصورت پھول اور پتے پھیلا کر اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی کوئی تتلی، پروانہ، شہد کی مکھی یا مچھر وغیرہ ان پر بیٹھتے ہیں وہ پھول اور پتے انھیں اپنے کلاوے میں جکڑ لیتے ہیں اور اس کا گوشت پوست ہضم کرنے کے بعد دوبارہ کھل جاتے ہیں۔[۱۲]

باثر افراد ہر ملک اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں، مگر ان کی موجودگی بالگام ہوتی ہے اور ان کی حکومتیں انھیں بے لگام نہیں کرتیں۔ اسی لیے وہ معاشرے اپنی ہموار چال چلتے رہتے ہیں، مگر ''باثر افراد'' کی جو نسل مملکتِ خداداد میں تیغوں کے سائے میں پیدا ہوئی اور پل کر جواں ہوئی، اس نے ہمارے معاشرے کو اس طرح ڈگمگا دیا کہ آج وطن کے مینار کی ہر منزل تلملا رہی ہے کہ ؏

کیا اس کے سوا دامن میں ترے اے گردشِ ماہ و سال نہ تھا

(حفیظ ہوشیارپوری)

یہ باثر افراد کون تھے؟

کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں دیتا۔ مگر جانتے سب ہیں مورخ، مصلح، محتسب، سب کے سب... کہ یہ لوگ پاکستان کی تعمیر میں مضمر خرابی کی اُن تمام شکلوں کے پروردہ افراد ہیں۔ جن کا پہلے ذکر بھی ہو چکا ہے اور گنتی بھی ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں یہ کئی ایسی خرابیوں کے نمائندے بھی تھے جو ہماری گنتی میں نہیں آئی تھیں...

ان باثر افراد کی پیدائش کی بہت سی شکلیں تھیں اور پروان چڑھنے کی کئی اور شکلیں تھیں... ان میں سے ایک شکل تو میں خود بھی پہچانتا ہوں، کیونکہ میں نے بڑے قریب سے ایک باثر فرد کو پیدا ہوتے دیکھا تھا۔

وہ صاحب ایک چھوٹی سی جاگیر اور بڑے سے جاگیردارانہ ذہن کے مالک تھے۔ ہوا کا رخ خوب پہچانتے تھے۔ اس کے سہارے اونچا اُڑنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کئی بلاواسطہ سفارشوں اور وسیلوں کے بعد ان کی پہلی کامیابی یہ تھی کہ صدر ایوب خان نے ان کی جاگیر پر شکار کھیلنے کی دعوت قبول کر لی۔ یہ شکار اُس زمانے کا طلسمِ اعظم ہوتا تھا اور ''کھل جا سم سم'' کے ذریعے کامیابی و کامرانی کے کئی راستے کھول دیتا تھا۔ مثلاً میانوالی میں کالا باغ جاگیر کے نواب امیر محمد خان ایک عظیم منتظم اور جابر جاگیردار تھے۔ ان کے علاقے میں صدر ایوب نے ایک انتہائی منظم اور کامیاب شکار کھیلا۔ جس کی بدولت وہ مغربی پاکستان کے ون یونٹ (one unit) کے گورنر تعینات ہو گئے۔

اب صدرِ مملکت کی رضامندی اس نئے میزبان کے لیے بھی ایک حکومتی پروانہ بن گئی، جس کی وساطت سے انھیں تمام سرکاری محکموں تک فوری رسائی مل گئی، جس سے اپنے علاقے کی سڑک، نکاسیِ آب، حد بندیاں اور زراعتی قسم کے دیگر کام کروا لیے۔ ضلعی اور مقامی انتظامیہ پر بیگار ڈال کر شکار کا بیشتر بندوبست بھی ان سے کروا لیا۔ ساتھ ہی کئی ذاتی کام بھی نکال لیے۔ شکار میں تمام روایتی اور متعدد مصنوعی طریقے استعمال ہوئے، جن سے ہوا میں اڑنے والے پرندوں کے علاوہ نیچے سے

چھوڑے ہوئے پرندے بھی از خود زخمی ہو ہو کر بارش کی طرح گرتے رہے۔ چنانچہ شکار بہت کامیاب گردانا گیا، تو بعد میں ان پر صدر صاحب کی حقیقی یا فرضی مہربانیوں کے تذکرے چہار سُو سنائی دینے لگے، جن کی مبالغہ آمیزی کی وجہ سے اس علاقے میں سرکاری محکموں کا نچلا عملہ اُن سے دبنے لگا اور دیگر لوگ انھیں ایک نئے رنگ میں دیکھنے لگے... سرکاری قربت کا رنگ... اثر و رسوخ کا رنگ... اور دربار کے ہر نورتن تک رسائی کا رنگ وغیرہ... یہ نئے رنگ تھے۔ جو اُس دور میں وطن کے مینار کی دوسری اور تیسری منازل کی دیواروں پر سلطانی دستِ شفقت وفاداروں کی دست گیری کے موٹے برش سے پھیر رہا تھا۔

ملک میں ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز ہونے لگی، تو اس میں بھی سرپرستی کا رنگ چوکھا ہونے لگا۔ چنانچہ، اس نئے منظورِ نظر کو پہلے انڈسٹری لگانے کا لائسنس مل گیا۔ اس سے مالی وسائل بڑھے تو وہ سیاست کی سیڑھیاں چڑھنے لگے اور دھیرے دھیرے ان کے خاندان کے لیے اسمبلیوں اور وزارتوں کے دروازے کھلنے لگے۔ پھر اگلے دو تین حاکموں کے دور میں وفاداری کے نئے مذہب پر ایمان کی مضبوطی سے انھیں اس دنیا میں جنت ملنے لگی۔

کسی باثر فرد کی پیدائش کا قریبی نظارہ مجھے اس وقت ملا جب میں پنڈی گھیب سب ڈویژن میں کام کر رہا تھا لیکن جیسے جیسے مجھے مختلف اضلاع، ڈویژن اور صوبائی سطح پر کام کرنے کے مواقع ملتے رہے مجھے دائیں بائیں ان کے کئی قد آور ساتھی نظر آتے رہے۔ جنھوں نے صدر ایوب اور ان کے بعد کی حکومتوں کے دور میں پیدائش، پرورش اور پشت پناہی کے مراحل طے کیے تھے۔ پھر جیسے جیسے میں دونوں میناروں پر چڑھتا گیا مجھے ان کے اثر کی رسائی اور بازو کی توانائی کا اندازہ ہوتا گیا۔

آج آٹھویں منزل سے ان سب کا مجموعی نظارہ مجھے وہ کچھ دکھا رہا ہے جو اس وقت زمین پر نظر نہیں آتا تھا۔ ان باثر افراد کا کوئی خاص قبیلہ، طبقہ یا علاقہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ؏... ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے'' کی زندہ مثال تھے۔ کیونکہ ہر حکومت اپنے باثر افراد خود پیدا کرتی تھی۔ حکومت بدلتی تو یہ افراد بھی بدل جاتے۔ فوجی ڈکٹیٹروں کے زمانے میں ان کی اکثریت کا رنگ خاکی ہو جاتا۔ غیر فوجی حکومتوں کے دور میں یہ سیاسی پارٹیوں کے جھنڈوں کے رنگ میں رنگے جاتے اور کولیشن حکومت بنتی، تو مذہبی جماعتوں کے کارکن اولی الامر کی اطاعت کی اذانیں دینے لگتے۔ لیکن لباس کی تبدیلی کے باوجود ان سب کے چہرے ایک جیسے ہی رہتے۔ اس یکسانیت کی وجہ سے یہ ایک دوسرے کے ایسے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتے گئے کہ ماضی و حال آپس میں مدغم ہونے لگے اور ہر نسل،

مرتبے اور دور کے بااثر افراد آپس میں ہاتھ پکڑ کر ایسی مضبوط انسانی زنجیر بناتے گئے جو ہر حکومت کو اپنے گھیرے میں رکھتی تھی۔ یہ زنجیر نہ تو کوئی آئین یا قانون توڑ سکتا تھا نہ اس کو اخلاقیات کی قینچی کاٹ سکتی تھی اور نہ ہی کبھی خوفِ خدا سے اس میں لرزش پیدا ہوتی تھی۔ یہ بااثر افراد حکومت سے باہر ہوتے تو حکومت کی دسترس سے باہر رہتے۔ حکومت کے اندر ہوتے تو آئین اور قانون کی بندش سے باہر رہتے۔ اپنی غرض پوری کرنے اور اپنی مرضی ٹھونسنے کے لیے یہ وعدہ فراموشی سے شرماتے نہ تھے۔ ریاست کے ادارے توڑنے سے جھجکتے نہ تھے اور قومی مفادات کو قربان کرنے سے گھبراتے نہ تھے۔ بااثر افراد درحقیقت قانون دشمن، انصاف دشمن، تعلیم دشمن اور عوام دشمن لوگ تھے اور ان کا تمام اثر و رسوخ اسی دشمنی میں استعمال ہوتا تھا۔

علامہ اقبال کے کوہِ ہمالہ کو اوپر سے جھک کر دیکھنے اور سمجھنے والے آسمان کی طرح آج میں بھی آٹھویں منزل سے دیکھ کر ان کا طریقِ واردات سمجھ رہا ہوں کہ یہ بااثر افراد بیوروکریسی کی اس غیر جانبداری، قانون پرستی اور راست روی کو برداشت نہ کر سکتے تھے جو حکومت اور رعایا کے درمیان دوطرفہ رابطہ ہوتی ہے اور اسی طرح ملک کے حُسنِ انتظام (Good governance) کی ضامن بن جاتی ہے۔ بااثر افراد ہمیشہ ہی اس دوطرفہ رابطے کو مکمل طور پر منقطع کرنا چاہتے ہیں، تاکہ خوش انتظامی کی بجائے ابتری اور بدنظمی پھیل جائے۔ انتظامی ڈھانچہ عوام کی دادرسی کے قابل نہ رہے اور بے بسی سے ہراساں لوگ اپنے مسائل حل کرنے کے لیے انھیں اپنا وسیلہ بنانے پر مجبور ہو جائیں۔ اس طرح بیوروکریسی کے دوطرفہ رابطے کی جگہ یہ خود ایک دانستہ اور ایک طرفہ رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ یہ رکاوٹ ایک طرف تو حاکم سے رعایا تک کا راستہ بند کر دیتی ہے، تاکہ حکومت کی ذمّے داریوں اور فرائض سے لوگ فیض یاب نہ ہو سکیں اور دوسری طرف اس راستے پر اپنا پہرہ بٹھا دیتی ہے کہ صرف بااثر افراد کی وساطت سے لوگ حکومت تک پہنچ سکیں۔ واحد وسیلہ ہونے کی وجہ سے یہ اس کی قیمت وصول کرتے ہیں اور بار بار نرخ بڑھا کر اپنی جیب بھرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ، بیوروکریسی کی غیر جانبداری اور قانون پرستی کو ملیامیٹ کرنے کے لیے انھیں اپنا پٹواری، اپنا تھانیدار اور اپنے افسرانِ بالا چاہییں۔ پاکستان کی شاہانہ حکومتیں اس بندوبست کی سرپرستی کر کے ان کا اثر و رسوخ مسلسل بڑھاتی رہی ہیں اور بدلے میں بااثر افراد کی بے ضمیر وفاداری حاصل کرتی رہی ہیں۔

وطن کے مینار کی متعلقہ منازل میں اس باہمی بندوبست کی وجہ سے بااثر افراد عام زندگی سے بڑے ہو گئے۔ دوسروں کی زندگیوں پر حاوی ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے اپنی زندگی کے اندیشۂ سود و زیاں کو قومی زندگی سے برتر سمجھنے لگے۔ یہ بااثر افراد پہلے مارشل لا کے ساڑھے دس

سالہ دور میں پیدا ہوئے۔ دوسرے مارشل لا کے پونے تین سالہ دور میں بالغ ہو گئے اور ذوالفقار علی بھٹو جب انھیں اپنے نقلی سویلین مارشل لا[۳] کے دوران نوازتے رہے تو پہلے ان کے پھیلنے اور پھر ان کی آل اولاد کے پھیلنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو تب سے اب تک جاری ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ان بااثر افراد میں سے ایک نسل ''نامعلوم افراد'' کی اُبھری، جن کی وجہ سے مختلف مافیاز (mafias) کی کئی نسلیں پیدا ہوئیں۔ ان سب کی ڈھکی چھپی کارکردگی سے ''لاپتا افراد'' کی سراسیمہ نسلیں ظاہر ہونے لگیں۔ اسی لیے کوئی حیرت نہیں کہ وطن کے مینار کی تیسری منزل کے بعد ہماری تاریخ ایسے ہی کئی افراد اور ان کی کئی نسلوں کی ہنگامی داستان بن جاتی ہے۔ ان میں وہ نسل بھی شامل ہے جس کے ہاتھوں تاریخ کا اپنا ہی قتلِ عمد ہوتا رہا۔

ان نسلوں کا ظہور تو اوپر تلے ایک دوسرے کے بعد ہوتا رہا، مگر ان کی ہستی کسی آئینِ فطرت یا قانونِ قدرت کی پابند نہ تھی۔ نہ ہی ان کا وجود کسی زمان و مکان سے وابستہ ہے۔ نادیدہ قوتیں جب چاہتیں اور جہاں چاہتیں ان نسلوں کے افراد حرکت میں آ جاتے اور جیسے وہ چاہتیں ویسے ہی متحرک رہتے۔ یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔

''نامعلوم افراد'' وہ طلسمی مخلوق ہے جن کے متعلق سب کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان کی شناخت نہیں ہو سکتی ع

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مگر سب جاننے والوں کی بینائی، سماعت اور گویائی مفلوج ہی رہتی ہے۔ وطن کے مینار کی تیسری منزل کے بعد ہر منزل میں ایسے نامعلوم جنات کے اَن دیکھے بسیرے بتدریج گھنے ہوتے گئے اور تب سے اب تک کسی نہ کسی الٰہ دین کے لیمپ کی رگڑ سے ان کے بھاری سائے نہ معلوم کون سی ان دیکھی خدمات اس مستعدی سے بجا لاتے رہے کہ ان خادموں کے مخدوم بھی نامعلوم ہی رہے اور اپنے مقاصد اور مفادات پورے کرتے رہے۔

کچھ ایسا ہی حال ''لاپتا افراد'' کا بھی ہے۔ جن کا سراغ ریاست کے کسی ادارے کو بھی نہیں ملتا اور ان مافیاؤں (mafias) کا ہے جن کی تعداد حکومتوں کے محکموں کے برابر یا زیادہ ہی رہتی ہے اور کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کون کس کو کنٹرول کرتا ہے۔

ٹریننگ وغیرہ کے بعد ۱۹۶۰ء میں میری فعال ملازمت کا آغاز ہوا، تو حکومت کی اصلاحات کے گملوں میں مصلحتوں کی پنیری پھوٹ چکی تھی، بلکہ کئی علاقوں میں تو یہ پنیری وفاداری کی کیاریوں میں منتقل بھی ہو چکی تھی اور ہاتھ بھر اونچے پودے بااثر افراد کے تناور درخت بننے کو لہلہا رہے تھے۔

لیکن مزید آبیاری ان کی اہم ضرورت تھی اور یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ ہر سطح کی انتظامیہ سے رابطے میں رہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مجھ سے ملنے آتے تو وہ ماضی کی انگریز حکومتوں کے استحکام کے لیے اپنے باپ دادا کی خدمات گنواتے رہتے اور اصرار کرتے کہ ان کے معاملے میں خواص و عوام کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور ان کے مطالبات کو ان قواعد و ضوابط سے نہ پرکھا جائے، جو عام لوگوں پر لاگو ہوتے ہیں۔ گویا انھیں عزت دینے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ قانون سے بالا سمجھے جائیں۔ لوک گیت میں سمویا ہوا معاشرتی رویّہ کہ ع

مورے سیاں بنے کوتوال اب ڈر کا ہے کا۔

''ہم خاندانی لوگ ہیں!'' ایک صاحب مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''اور عام لوگوں سے مختلف سلوک کے مستحق ہیں۔ انگریز حاکم اس راز کو خوب سمجھتا تھا۔ اس لیے ہماری خدمت کی قدر کرتا تھا اور ہمیں عزت کا مقام دیتا تھا۔''

میں نے کہا:

برٹش راج کے اپنے سامراجی تقاضے تھے لیکن اس نو آزاد ملک کے مختلف تقاضے ہیں۔ عوامی بہبود اور قومی ترقی... ان کے لیے قائداعظم نے ہمیں اتحاد (unity) ایمان (faith) اور تنظیم (discipline) کی تلقین کی ہے۔ اس ڈسپلن کے لیے تو قواعد و ضوابط سب کے لیے یکساں ہو جاتے ہیں۔ انگریز کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بہت فرق ہے۔

''کوئی فرق نہیں جی!'' وہ کہنے لگے ''حکومت انگریز کی ہو یا پاکستانیوں کی اسے خواص کے سہارے کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ خواص ہی سے حکومتوں کی گرفت مضبوط ہوتی ہے اور عوام بھی کنٹرول میں رہتے ہیں۔''

خواص و عام کے لیے علیحدہ علیحدہ خانوں کے متعلق میرا یہ مکالمہ وطن کے مینار کی دوسری منزل میں ہوا تھا۔ جہاں میں تو پہلی منزل والی وہ سوچ لے کر پہنچا تھا جو مجھے یونیورسٹی کی تعلیم اور ملازمت کی تربیت نے دی تھی لیکن اُس وقت تک لاعلم تھا کہ دوسری منزل کی فضا میں اب ایک مختلف سوچ پروان چڑھ رہی ہے۔ ان حاکموں کی سوچ جو اب وطن کے مینار پر پوری طرح سے قابض تھے اور ان کے خیالات اب دھیرے دھیرے کئی قسم کی اصلاحات کے پردے سے برآمد ہو رہے تھے۔ ان خیالات کا مرکزی محور یہ تھا کہ حاکم و محکوم کی درجہ بندی سے ملک و قوم کی تربیت مختلف انداز میں کی جائے۔ اس لیے اب مختلف پیمانے سے خواص چنے جا رہے تھے اور چناؤ میں آنے والوں کا سماجی اور سیاسی وزن دانستہ بڑھایا جا رہا تھا، تاکہ ان کی وفاداری سے اقتدار خود بھی

بھاری بھر کم ہوتا رہے۔ اس طرح ''باثر افراد'' حکومتوں کا اثاثہ بننے لگے۔

اُس وقت کی دوسری منزل کی بجائے اب میں دونوں میناروں کی ساتویں اور آٹھویں منزل سے نیچے دیکھ رہا ہوں۔ تو مجھے ان خواص کے ناروا اور زائد از ضرورت وزن کے ویسے ہی نتائج نظر آ رہے ہیں۔ جو آج سے سات آٹھ صدیاں پہلے کسی اور جگہ دیکھے گئے تھے۔ یعنی دو مختلف زمانوں میں اور دو مختلف مقامات پر۔

اُس زمانے میں اٹلی میں بھی ایک مینار کی تعمیر شروع ہوئی تھی، تاکہ گرجے سے ملحق بلند مینار کی چوٹی پر نصب گھنٹیوں کی ٹن ٹن سے لوگوں کو عبادت اور فلاح کی طرف بلایا جائے۔ جیسے آج کے زمانے میں قائداعظم نے لاہور میں مینارِ پاکستان والی جگہ سے قوم کو ۱۹۴۰ء میں فلاح کی طرف بلایا تھا۔ تاکہ وطن کے مینار کی تعمیر شروع کی جائے۔

اٹلی کے اس شہر کا نام پیسا (Pisa) تھا، جس کا مطلب تھا، ''دلدل والی زمین۔'' اُس وقت کے معماروں کو اس تعمیر میں مضمر خرابی کا پورا احساس و ادراک تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی فہم و فراست سے پورا کام لیا اور بڑی احتیاط سے نچلی دلدلی زمین پر ۱۱۷۳ء میں سنگ مرمر کی مضبوط بنیاد بنائی اور مینار کی جسامت اُٹھانے لگے... جس طرح آج کے دور میں قائداعظم کو بھی پورا احساس و ادراک تھا کہ برٹش راج کے خاندانی لوگ ہندی مسلمانوں کی زمین میں خواص و عام کی دلدل پیدا کر چکے ہیں۔ اسی لیے اپنی فہم و فراست کے مطابق ایک مضبوط بنیاد قائم کرنے کے لیے انھوں نے ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ دہلی اجلاس سے اپنے خطاب میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو یہ تنبیہ کی تھی:

یہاں میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے ظالمانہ اور شر پسند نظام کی پیداوار ہیں جس کی بنیادیں ہمارے خون سے سینچی گئی ہیں۔ عوام کا استحصال ان کی رگوں میں خون بن کر گردش کر رہا ہے اس لیے ان کے سامنے عقل اور انصاف کی کوئی دلیل کام نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھیں انتہائی مشقت کے باوجود صرف ایک وقت کی روٹی میسر ہے۔ کیا یہ ہے ہماری شاندار تہذیب؟ کیا پاکستان کا مطلب یہ ہے؟[۱۴]

قبل ازیں اس بنیاد کو مضبوط بنانے کی اپنی سی کوشش علامہ اقبال بھی کرتے رہے لیکن جب وطن کے مینار کی دوسری اور تیسری منزل کی تعمیر شروع ہوئی تو قابض معمار قائداعظم کی تنبیہ کو نظرانداز کرنے لگے اور علامہ اقبال کی تمام کوششوں کو دانستہ بھول گئے، کیونکہ وہ قوم کا سیاسی قبلہ تبدیل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے تھے اور اپنے ڈھب کے باثر افراد تراش رہے تھے۔ اس رویّے

کے متعلق فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

افسوس کہ بانیانِ پاکستان کے یہ خواب و خیال اب تک حقیقت کا روپ نہیں دھار سکے۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ تو درکنار آج تک کسی حکمران کو زرعی آمدن پر ٹیکس عائد کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی۔ علامہ اقبال ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک پنجاب قانون ساز اسمبلی کے منتخب رُکن تھے۔ اس دوران اپنی ہر بجٹ تقریر میں انھوں نے زرعی آمدن پر ٹیکس عائد کرنے کے حق میں انتہائی موثر استدلال پیش کیا تھا۔ اُن کے اس مطالبے کو برطانوی ہند میں کیا پذیرائی ملنا تھی، قیامِ پاکستان کے بعد بھی کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ رواں سال[15] کے بجٹ کی تیاری کے مراحل میں ہی باخبر حلقے یہ پیش گوئی کرنے لگے تھے کہ جاگیردار سیاستدانوں کی خوشنودی کی خاطر زیرِ تشکیل و ترتیب بجٹ میں بھی زرعی آمدن پر ٹیکس عائد کرنے کی ہر تجویز مسترد کر دی جائے گی۔ یہ پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ جناب سلطان احمد[16] نے اپنے مضمون "Taxation without evasion?" میں بڑے اعتماد کے ساتھ لکھا تھا کہ:

Agricultural income tax is no more acceptable to the provincial governments than are land reforms to the federal government and capital gains tax on property transactions to the federal bureaucrats. Resisting land reforms and capital gains tax on land deals are not only the traditional feudal lords but also the generals and senior officials, who own vast lands and now valuable urban property. Both serving and retired, And the triple combination has been prevailing for long shooting down all lands reform proposals.

جناب سلطان احمد کے اس تجزیے کی رُو سے جاگیردار، جرنیل اور افسرانِ بالا کا یہ اتحادِ ثلاثہ پاکستان میں نظریۂ پاکستان کے نفاذ کی راہ میں ایک سیسہ پلائی دیوار بن کر حائل ہے۔ کہاں تو نظریۂ پاکستان کی تشریح کرتے وقت علامہ اقبال نے ایک ایسی دنیا کا نقشہ پیش کیا تھا جس کے نمایاں ترین امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ اس دنیا میں غریب امیروں پر ٹیکس عائد کریں گے اور کہاں یہ دنیا کہ جس میں امیروں کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوستے رہیں۔ نظریۂ پاکستان کے معاشی عدل و احسان اور معاشرتی اخوت و مساوات کے اہداف سے رُوگردانی کسی ایک حکومت پر موقوف نہیں ہے۔ آتی جاتی حکومتوں کے ادلتے بدلتے حکمران معاشی انصاف اور معاشرتی مساوات کے نصب العین سے رُوگردانی کے مرتکب چلے آ رہے ہیں۔ پاکستان میں نظریۂ پاکستان سے اس مسلسل انحراف کا راز فوجی آمریت اور جمہوری تماشے میں پنہاں ہے۔ ان نام نہاد سیاسی ڈراموں کے کردار تو وہی تین ہیں جن کی جانب جناب سلطان احمد نے

اشارہ کیا ہے۔ جاگیردار، جرنیل اور افسر بالا۔ یہ نظریۂ پاکستان کی نفی ہے۔[17]

برٹش راج کا جاگیرداری نظام ہی وہ دلدل تھی جو Pisa کی زمین میں قدرتی دلدل کی طرح برِعظیم کی زمین میں مصنوعی دلدل کے طور پر موجود تھی۔ قائداعظم کو اس کا پورا ادراک تھا اور اپنی متعدد تقاریر سے وہ اس سماجی اور فکری دلدل کو سنگِ مرمر جیسی مضبوط بنیاد بنانے کی کوشش کرتے رہے، مگر کامیابی سے پہلے ہی قدرت نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ پھر بھی ماضی میں کئی مخلص مسلمان لیڈروں کی سدھاری ہوئی قوم نے ان کے فرمودات کے مطابق سنہرے رنگ والی پہلی منزل تعمیر کر لی۔ پھر سُکھ کا سانس لے کر مزید بہتر تعمیر کے لیے کمر کسنے لگے اور ۱۹۵۶ء کا آئین بنا کر سمجھے کہ انھوں نے تمام مشکلات کی دہلیز پار کر لی۔

اسی طرح اٹلی والے مینار کی نچلی دو منزلوں کی تعمیر میں Pisa کے لوگ بھی بڑے پُرجوش تھے، مگر جب تیسری منزل تعمیر ہونے لگی تو زیرِ بنیاد دلدل عمارت کے بھاری وزن کو سہار نہ سکی اور مینار کی عمودی اُٹھان اوپر سے ایک طرف جھکنے لگی۔ تب تعمیر روک دی گئی۔ معماروں نے اپنی کارروائی سے حالات پر قابو پانے کے لیے چندے اکٹھے کیے، قرضے لیے اور تعمیر دوبارہ شروع ہو گئی۔ یہی حادثہ بار بار ہوتا رہا اور بالآخر پونے دو سو برس بعد ۱۳۹۹ء میں ساٹھ میٹر اونچا مینار مکمل ہو گیا۔ اس کا وزن ساڑھے چودہ ہزار ٹن تھا۔ اُوپر اتنا وزن اور نیچے دلدل پہ ٹکی ہوئی بنیاد۔ ایسا ڈیزائن قانونِ قدرت کی خلاف ورزی تھی۔ اس لیے اس مینار کی اُٹھان عمودی نہ رہ سکی۔ بلکہ ایک طرف کے جھکاؤ کی وجہ سے اس کی چوٹی عمود سے پانچ میٹر دور ہٹی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا نام Leaning Tower of Pisa پڑ گیا۔ یعنی پیسا کا جھکا ہوا مینار جسے قدرت نے تو اپنے ابدی قانون کے مطابق جھکا دیا، مگر ساری اٹالین قوم کی اجتماعی نیک نیتی اور کوشش نے اس کے جھکاؤ کو سہارا دے دیا۔ چنانچہ، دنیا بھر سے لوگ اس مینار کو ایک عجوبے کے طور پر دیکھنے کے لیے آنے لگے۔

ہمارے متوازی قصے کے کوائف بھی قریباً ویسے ہی ہیں۔ مگر نتائج مختلف ہیں... بااثر افراد کی وجہ سے... وطن کے مینار کی جب دوسری منزل کی تعمیر شروع ہوئی، تو اسی تعمیر میں مضمر تمام خرابیوں میں سے ایک خرابی نے اپنا آپ ظاہر کر کے یہ تعمیر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر دوسرا ہاتھ بڑھا کر دیگر پوشیدہ خرابیوں کو بھی اُوپر اپنے پاس کھینچ لیا اور پھر ان سب کے بااثر افراد اکٹھے ہو گئے، مگر مینار کی تعمیر پر توجہ دینے کی بجائے یہ ایک دوسرے کو کھلا پلا کر توانا کرنے لگے۔ حکومتِ وقت کی مصلحتیں ان سب کا وزن مزید بڑھانے لگیں۔ جس سے تیسری منزل کا وزن بہت بڑھ گیا اور بنیاد کے نیچے والی فکری دلدل ڈولنے لگی۔ جس کی وجہ سے وطن کا مینار قائداعظم کے مقرر کردہ عمود سے ایک طرف

ہٹ کر جھکنے لگا۔ ساتھ ہی متعدد معماروں کے ذاتی مفادات میں رسّہ کشی شروع ہو گئی۔ جس کی وجہ سے یہ جھکاؤ کبھی ایک طرف ہو جاتا کبھی دوسری طرف۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعمیر تو جاری رہی مینار بھی بلند ہوتا گیا۔ مگر مختلف منزلوں کی تعمیر ٹیڑھی بینگی ہونے لگی اور دنیا بھر کے لوگ حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ کس قسم کا مینار ہے جس کی نہ تو بلندی میں درست عمود ہے اور نہ ہی منزلوں میں صحیح تناسب و توازن (symmetry) ہے۔

۱۹۶۰ء میں جب مجھے Leaning Tower of Pisa کو دیکھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ لوگ اس عجوبے کو کئی وجوہات کی بنا پر دیکھنے آ رہے تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس کی ساری بلندی عمودی نہیں بلکہ ترچھی تھی۔ پھر بھی مختلف منزلیں ایک دوسری کے اوپر سیدھے باہمی توازن سے اُٹھائی گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے ترچھے پن سے یوں لگتا تھا کہ یہ مینار ابھی گر پڑے گا۔ مگر یہ گرتا نہیں کیونکہ پوری قوم اسے گرنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ پچھلی آٹھ صدیوں سے کئی مختلف معماروں کی مشترکہ سوچ بچار نے اس جھکتے مینار کو گرنے سے روکا ہوا ہے۔ آخری کامیاب کوشش یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء کے آس پاس کئی برسوں تک ہزاروں ٹن سیمنٹ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے اس کی بنیادوں کے نیچے گھسیڑی جاتی رہی (grouting)۔

آج ۲۰۱۶ء میں پاکستانی وطن کے مینار پر دنیا بھر کے لوگوں کی نظریں بھی ہیں، مگر اس کی وجوہات بالکل مختلف ہیں۔ وہ ششدر ہیں کہ اس کا عمود ترچھا ہو گیا ہے۔ منزلیں بھی چھوٹی بڑی ٹیڑھی بینگی اور غیر متوازن ہیں اور جس رُخ سے بھی دیکھیں یہ مینار اس طرح گرنے والا لگتا ہے کہ تماشائیوں کے منہ سے بے ساختہ ''ناکام ریاست'' کی پکار اُٹھتی ہے۔ مگر اس پر قابض متعدد معمار یہ گراوٹ روکنے پر آمادہ نہیں بلکہ ریاستی تقسیم کار میں بھی اپنا مخصوص مقام اور کام چھوڑ کر وہ اس رسہ کشی میں مصروف رہتے ہیں کہ میں اس مینار کی تعمیر ''اپنی مرضی'' سے کروں گا اور ''اپنے مفادات'' کے مطابق کروں گا۔ چاہے وہ ٹیڑھی بینگی غیر متوازن اور جھکنے والی عمارت ہی بن جائے۔

دو زمانوں میں دو مقامات پر یہ دو الگ الگ عجوبے ہیں۔ پیسا (Pisa) کا مینار تو اس لیے ایک عجوبہ ہے کہ آٹھ سو برس سے اطالوی قوم قانونِ قدرت والا جھکاؤ تو نہیں روک سکی، مگر قانونِ ریاست سے اسے تھام رکھا ہے۔ لیکن ہمارے وطن کا مینار اس لیے ایک عجوبہ ہے کہ پوری قوم کی بے بسی اور چند بااثر افراد کی خدائی اس مینار کا حلیہ بگاڑ رہی ہے، اور مزید بگاڑتی جا رہی ہے۔

دنیا والے یہ دونوں عجوبے بڑی حیرت سے دیکھ رہے ہیں... ایک باہمت جماعت کا مثبت عجوبہ... اور دوسرا بااثر افراد کا منفی عجوبہ۔

آج ۲۰۱۶ء میں میری پس نظری مجھے جو کچھ اوپر سے دکھا رہی ہے، یہ اُن تمام مناظر سے بہت مختلف ہے، جو میں نیچے وطن کے مینار کی دوسری اور تیسری منزل میں اندر سے دیکھا کرتا تھا۔ جب چمکتی دمکتی ترقی کے چرچے تھے۔ یہ چرچے بڑھتے بڑھتے ۱۹۶۷ء میں ترقیاتی عشرے کا جشن بن گئے۔ سال بھر طویل جشن کی مصنوعی روشنیوں میں یہ چمک خیرہ کن ہوتی گئی اور قوم کی آنکھیں مندنے لگیں۔ بصارت ماند پڑنے لگی... تب اندر سے بصیرت نے جاگ کر دستک دی کہ ضروری نہیں ہر چمکنے والی شے سونا ہی ہو۔ یہ تو اچھا پالش شدہ پیتل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر قوم کے کان کھڑے ہونے لگے۔

انھی دنوں اس نئے نظام کی جڑوں میں پوشیدہ دیمک بھی سطح پر آنا شروع ہو گئی۔ پھر وہ جلسے، جلوس، احتجاج، پکڑ دھکڑ اور ہنگاموں کی شکل میں ظاہر ہونے لگی۔

تب وقت کی اُنگلیوں نے اپنی گنتی روک دی...

ایک ہاتھ اُوپر اُٹھالیا... اور اس کی ایک انگلی کھڑی کر دی...

مشیت کے ایمپائر نے صدر ایوب کو آؤٹ قرار دے دیا اور اگلے کھلاڑی جنرل یحییٰ خان کو بلا لیا۔

ایک باوردی حاکم چلا گیا... دوسرا باوردی حاکم آ گیا... باوردی حاکمیت کی پریڈ جاری رہی۔

پریڈ منظم ہوتی ہے۔ متحرک ہوتی ہے۔ مقصد پرست ہوتی ہے۔ اجتماعی عزم کے ساتھ نقطۂ آغاز سے رواں ہوتی ہے۔ مجموعی قوت سے ہدف کے انجام کی طرف بڑھتی جاتی ہے اور راستے کے ہر پتھر، روڑے یا بڑی رکاوٹ کو روندتی چلی جاتی ہے۔

جون ۱۹۴۸ء میں قائداعظم بہ حیثیت گورنر جنرل اسٹاف کالج، کوئٹہ گئے تو فوجی افسران سے گفتگو کے دوران وہ بھانپ گئے کہ ان کی سوچ کا نقطۂ آغاز مختلف شکل اختیار کر رہا ہے، اس لیے انھوں نے اپنی تقریر کے تحریری متن سے انحراف کیا اور چند فی البدیہہ فقروں میں اسی شک کا اظہار کیا[18] مگر سامعین کا ذہن نقطۂ آغاز سے چل چکا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں اس کا سایہ سا نظر آیا[19] اور ۱۹۵۸ء میں یہ پریڈ کھل کر سامنے آ گئی۔

اب ۲۵ ؍ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل ایوب خان کا دستہ گزر چکا تھا اور جنرل یحییٰ خان کا دستہ سامنے آ گیا تھا۔ پریڈ جاری تھی اور مقصد واضح تھا کہ من مانی کے راستے میں ہر آئینی اور قانونی رکاوٹ روند دی جائے گی۔ چنانچہ، بیوروکریسی پر یلغار جاری رہی۔

اس یلغار کا ہدف یہ تھا کہ بیوروکریسی کا جسم بدل دیا جائے اور روح روند دی جائے۔ اس

ہدف تک پہنچنے کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ کو روندنا ضروری تھا۔ اس لیے غیر روایتی برطرفی اور غیر آئینی بھرتی کے پہیے تیز چلنے لگے اور شخصی وفاداری کی کوک کی آواز بلند سے بلند تر ہونے لگی۔

دوسرے دستے کی اینٹھتی ہوئی چال میں زیادہ اکڑ تھی۔ جلال کی زیادہ نمائش تھی۔ رُخ تو پرانا ہی تھا مگر تیور کہیں زیادہ کڑے تھے۔ چنانچہ، ساری سوچیں تو صدر ایوب کے زمانے والی ہی رہیں، مگر ان کی شدت کئی گنا زیادہ بڑھ گئی۔

پہلے کی طرح سرکاری ملازم اس دفعہ بھی غیر روایتی انداز میں برطرف ہوئے، مگر آسمانی بجلی کی کڑک اور چمک کے ساتھ... صدر یحییٰ نے ۳۰۳ نمبر کی فوجی بندوق کو علامت بنایا۔ ۱۹۶۹ء میں تین سو تین افسران برطرف کر دیے گئے۔ اور مرگِ انبوہ کا جشن منایا گیا۔ اسی طرح بیوروکریسی میں پہلے کی طرح غیر آئینی فوجی بھرتی بھی جاری رہی لیکن صدر ایوب کے زمانے میں صرف چودہ فوجی افسران کی سی ایس پی میں شمولیت کے برعکس جنرل یحییٰ نے یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے چوپٹ کھول دیا۔ چنانچہ، ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۶ء تک ۱۴۶ رفوجی افسران سابقہ سی ایس پی یا نئے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ (District Management Group) میں شامل ہو چکے تھے۔[۲۰] ان کے علاوہ بھی آنے والوں کے لیے نئے دروازے بنا دیے گئے اور مرکزی حکومت، صوبائی حکومتوں اور دیگر کئی اداروں میں حاضر سروس فوجی افسران تعینات ہونے لگے۔ اپنی سہولت کے مطابق کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ واپس چلے جاتے اور کئی دوسرے آ جاتے۔ وقت کے ساتھ آمد و رفت کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا اور جو ادارے اس کا تختۂ مشق بنتے رہے ان کی فہرست طویل ہے۔

جنرل ایوب خان کے پہلے دستے کے بعد جنرل یحییٰ خان کے دوسرے دستے کی پیریڈ زیادہ شان سے جاری رہی، کیونکہ اس میں معاشرے کے وہ بااثر افراد بھی شامل ہوتے گئے جو پچھلی حکومت کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ریاست کی چھاتی پر اس دُہرے بوجھ تلے بیوروکریسی کا جسم کچلا جاتا رہا۔ روح روندی جاتی رہی اور شخصی وفاداری کی دھول اُڑ کر قانون و قواعد کو ڈھانپتی رہی۔ حتیٰ کہ اس ملبے میں اب کہیں کہیں حُسنِ انتظام (Good governance) کے ٹکڑے بھی نظر آنے لگے۔ اس صورت حال کی صرف تین جھلکیاں اور مستند حوالے درج ذیل ہیں:

پہلا حوالہ: پہلا مارشل لا نافذ ہوئے چھے ماہ گزر چکے تھے۔ جب سیّد منیر حسین کو ضلع ہزارہ کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا۔ وہ بڑی گھبراہٹ اور اضطراب کی حالت میں وہاں پہنچے، کیونکہ صدر ایوب کا پیدائشی تعلق بھی ضلع ہزارہ سے تھا۔ منیر حسین اپنی خودنوشت[۲۱] میں لکھتے ہیں: (انگریزی سے ترجمہ)

اُس وقت ضلعی انتظامیہ پر فوج کا پورا پورا تسلط تھا۔ سویلین افسران مکمل طور پر مارشل لا کے افسران کے

ماتحت تھے اور ڈپٹی کمشنر کے اختیارات صرف نام کے تھے۔ تمام سول افسران کے حوصلے بالکل پست ہو چکے تھے۔ کیونکہ ایسے واقعات عام تھے کہ فوجی افسران انھیں لوگوں کے سامنے ذلیل کرتے تھے۔ میں پہلے دن سے ہی محسوس کر رہا تھا کہ ضلعی انتظامیہ کے فیصلوں میں میری کہیں بھی شمولیت نہ تھی اور کرنل کے عہدے کے ایک مارشل لا ایڈمنسٹریٹر میرے ماتحتوں کو بلا کر خود ہی حکم جاری کر دیتے تھے۔ جب میں اپنے اسسٹنٹ کمشنر کے ہمراہ پہلی دفعہ ان کے اسٹاف کی موجودگی میں ایک میٹنگ میں شریک ہوا تو بڑی شکستہ دلی سے محسوس کرتا رہا کہ سول انتظامیہ کو کس حد تک ایک عضوِ معطل بنا دیا گیا ہے۔ پہلا مہینہ اسی مایوسی میں گزر گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اپریل ۱۹۵۹ء میں صدر ایوب خان ملٹری اکیڈمی کاکول کی پاسنگ آؤٹ پریڈ میں بطور مہمانِ خصوصی تشریف لائے اور میں نے علاقے کے معززین کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ان کا استقبال کیا... اگلے دن تقریب ہوئی تو میں بھی وہاں مدعو تھا... پریڈ کے بعد ایک لیفٹیننٹ کرنل میرے پاس آئے اور کہا کہ صدر صاحب آپ کو طلب کر رہے ہیں... میں حاضر ہوا تو وہ بہت اچھے موڈ میں تھے۔ انھوں نے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور ایک طرف لے جا کر مجھے کہنے لگے کہ ہزارہ ایک پسماندہ ضلع ہے اور یہاں ایک اچھے منتظم کی ضرورت ہے... چند مختصر جملوں کی یہ ملاقات سب فوجی افسروں کی نظروں کے سامنے ہوئی، تو اسی شام ضلع کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میرے گھر آئے اور پوچھا کہ صدر صاحب نے ان کے لیے کوئی حکم تو نہیں چھوڑا...

مصنف مزید لکھتے ہیں کہ:

اس دن کے بعد مارشل لا کے مقامی فوجی افسران سے ان کے تعلقات بہتر ہو گئے اور بہتر ہی رہے لیکن ہر ذی ہوش قاری یہ سوچے بغیر رہ نہیں سکتا کہ اس وقت متحدہ پاکستان کے متعدد اضلاع تھے، جن میں سے صرف ایک ہی ضلع ہزارہ تھا اور اس کی انتظامیہ کو تھوڑا سکون اس لیے ملا کہ وہ صدر ایوب کے آبائی گاؤں ریحانہ میں ان کے ذاتی باغ کا خیال رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ان سے رابطے میں رہتے تھے، مگر ملک کے باقی تمام اضلاع میں تو وہی حالت رہی، جس کی عکاسی اس اقتباس کے پہلے حصے میں ہوئی ہے۔

دوسرا حوالہ: ایک اور سرکاری افسر اپنی سوانحی اور تجزیاتی کتاب میں اپنا ذاتی تجربہ یوں بیان کرتے ہیں۔[۲۲] (انگریزی سے ترجمہ)

صدر ایوب کے جانے کے بعد بیوروکریسی مزید بکھرنے اور مایوس ہونے لگی کیونکہ نئے فوجی حاکم جنرل یحییٰ خان نے ۳۰۳ سرکاری ملازمین کو برطرف کر دیا۔ جن میں سے ۳۸ سی ایس پی افسران تھے۔ جنرل یحییٰ خان اور ان کی ساری ٹیم... کے رویوں سے سول انتظامیہ کے متعلق بالعموم اور سی ایس پی افسران کے متعلق بالخصوص انتہائی رعونت اور اہانت ٹپکتی رہتی تھی۔ ڈویژنل ہیڈ کوارٹروں میں تعینات سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹرز

(Sub Martial Law Administrators) خود کو وائسرائے کی مانند سمجھتے تھے۔ ملتان میں جنرل جہاں زیب اپنے ہیڈکوارٹر میں دربار لگاتے اور سول افسران پر من مانی ٹھونستے رہتے۔ اگر ہم جنرل گل حسن کی یادداشتوں کے چند حصے ہی پڑھ لیں تو پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ فوجی افسران سول انتظامیہ کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

تیسرا حوالہ قدرت اللہ شہاب کا ہے لیکن اس کی تفصیلات شہاب نامہ میں جابجا اس طرح بکھری ہوئی ہیں کہ انھیں ایک مربوط اقتباس میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران آئی سی ایس (ICS) سے چار دفعہ استعفیٰ دیا۔[۲۳] جن میں ایک دفعہ جنرل ایوب خان کا عہد بھی شامل ہے۔ آخری استعفے کی نوبت تب آئی جب دوسرے مارشل لا کے نفاذ کے چند روز بعد اپنی پہلی میٹنگ میں انھوں نے کہا، ''پچھلے دس برس میں مارشل لا دوسری دفعہ نافذ ہوا ہے۔ یہ بے چارہ ملک بار بار مارشل لا کی تاب نہیں لا سکتا...''

اس پر جنرل یحییٰ خان سخت ناراض ہو گئے۔ انھی دنوں قدرت اللہ شہاب ایک میٹنگ کے لیے پیرس گئے۔ تو صدر یحییٰ کے عتاب سے محفوظ رہنے کے لیے انھوں نے وہیں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ اس وقت ان کی ملازمت میں نو برس بقایا تھے لیکن ایک برس تک یہ منظور نہ ہوا اور جب ہوا تو تین برس تک ان کی پنشن بند رہی۔ جو بالآخر تب بحال ہوئی جب صدر یحییٰ کا اقتدار ختم ہوا۔ مالی تنگی کی وجہ سے انھوں نے یہ طویل عرصہ انگلستان کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں بسر کیا، تاکہ کم اخراجات میں گزارہ کر سکیں۔ ان دنوں کی مالی تنگ دستی کی وجہ سے ان کی اہلیہ کی بیماری بگڑ گئی اور وہ جون ۱۹۷۴ء میں انتقال کر گئیں۔

ریاست کی بیوروکریسی پر فوجی من مانی کی یلغار قدرت اللہ شہاب نے صدر ایوب کے دور میں ایوانِ صدر میں بیٹھ کر دیکھی۔ پھر صدر یحییٰ کے آتے ہی وہ خود اس کا نشانہ بن گئے اور ؏

''بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے...''

اس بے آبروئی کی اصل آبرو کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

سیاستدان اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور محرومیوں کا الزام بیوروکریسی پر ہی لگاتے ہیں۔ مارشل لا نازل ہو تو سارے بگاڑ کی وجہ بیوروکریسی کو بھی گردانا جاتا ہے... ہر بار نئے حکمران اپنے آپ کو اللہ کے مقرب فرشتے سمجھتے ہیں اور نوکر شاہی کے ہر فرد کو ابلیس کا ساتھی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سارے ہتھکنڈے سرکاری ملازمین پر خوف و ہراس کی دھونس جمانے اور عوام پر اپنی برتری کا رعب گانٹھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں ہر ملک کی بیوروکریسی مملکت کا نظم و نسق چلانے میں ریڑھ کی ہڈی کا

درجہ رکھتی ہے... اور بیوروکریسی کا نعم البدل بھی بیوروکریسی ہی ہے...[۲۴]

ان جملوں میں تو قدرت اللہ شہاب فقط ایک اٹل سچائی بیان کر رہے ہیں کہ بیوروکریسی کا نعم البدل بھی بیوروکریسی ہے (جس سے ان کی مراد صرف وہ بیوروکریسی ہے جو حسنِ انتظام کی امین اور محافظ ہے) لیکن شہاب نامہ کے باقی صفحات ایک کھلی گواہی ہیں کہ دونوں فوجی حکومتیں پاکستان کے سنہری دور کی قانون پرست بیوروکریسی کا نعم البدل اپنی مرضی کی قانون گریز (بلکہ قانون شکن) جانبدار بیوروکریسی کو بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ شہاب جب ایوانِ صدر کے جھروکوں سے اس مہم کا رخ پہچان رہے تھے تو میں ان دنوں بیوروکریسی کی ابتدائی سیڑھیوں سے وطن کے مینار میں اوپر کی طرف چڑھ رہا تھا اور دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ بعد میں آنے والی تمام حکومتیں بھی اسی مہم میں شامل ہوتی جا رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں رعایا کی دیہاتی فراست (rustic wisdoms) سے بھی آگاہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں دورے پر تھا اور ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں کا اَن پڑھ چوکیدار حالاتِ حاضرہ پر یوں تبصرہ کر رہا تھا کہ ایک دھوبی اپنے گدھے پر دھلے ہوئے کپڑے لاد کر جا رہا تھا کہ ڈاکو آ گئے۔ دھوبی نے زور سے گدھے کو ڈنڈا مارا کہ بھاگ ڈاکو آ گئے ہیں... مگر گدھا رُک گیا کہ بھاگنا ہے تو تم بھاگ جاؤ۔ میں کیوں بھاگوں۔ میرے اوپر تو تم نے بھی بوجھ لادنا ہے اور وہ بھی بوجھ لادے گا۔

''اور صاحب جی...'' وہ تعلیم سے بے بہرہ فرد نیچی نظروں اور اونچی بصیرت سے کہہ رہا تھا، ''بے چارے گدھے کو ہم برا بھلا کیوں کہیں۔ جو کہنا ہے مالک کو کہیں... اچھا مالک تو خود ہی اس پر صاف ستھرے کپڑوں کا بوجھ رکھے گا اور برا مالک ڈاکے کی گندی لوٹ کا سامان رکھے گا۔''

یہ بوڑھا چوکیدار اس ریسٹ ہاؤس کو برسوں سے کبھی خوردبین اور کبھی ایسی سیربین کی طرح دیکھتا رہا تھا جس میں ان تینوں ادوار کی حکمرانی کے رنگ کئی مختلف نمونے بناتے رہے تھے۔ وہ یہاں قیام کرنے والے تمام محکموں کے افسروں کے ذہنی اُتار چڑھاؤ سے بھی خوب واقف تھا اور اسی ریسٹ ہاؤس میں بااثر ملاقاتیوں کی شعبدہ بازی کا بھی شاہد تھا۔ زندگی کے کھردرے زمینی حقائق کو دیہات کے لوگوں سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے، جن کی زندگی کے تمام اوقات تھانیدار، وڈیرے اور مُلّا کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے ہمیشہ تلخ ہی رہتے ہیں۔

برٹش ایمپائر تقریباً ایک تہائی دنیا پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نظم و نسق چلانے والی بیوروکریسی کو انگریز اپنی سلطنت کا آہنی ڈھانچہ کہا کرتا تھا۔ یہ ڈھانچہ اس کی حاکمیت کے مضبوط بدن کو ایستادہ

اور بلند قامت رکھتا تھا۔ اس کی مسلسل استقامت کا راز یہ تھا کہ انگریز کے سامراجی عزائم تو عالمی بلندی پر تیرتے رہتے تھے لیکن اس کی مقامی بیوروکریسی نیچے زمین پر مقامی رعایا کو اپنے حُسنِ انتظام سے مطمئن رکھتی تھی۔ اس مقصد کے لیے سرکاری ملازموں کو خصوصی تربیت دی جاتی کہ وہ ہر حال میں قانون کو فوقیت دیں۔ پھر اسی تربیت پر عمل پیرا ہونے کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ منصفانہ غیر جانبداری کے ڈسپلن میں جکڑ دیا جاتا تھا اور سب سے اہم یہ کہ سرکاری ملازم کے اردگرد آئینی تحفظات کا ایک حصار کھینچ دیا جاتا تھا تاکہ اس کی قانونی کارکردگی پر کوئی بھی اور کچھ بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس حصار کی لوہے جیسی مضبوطی کی وجہ سے ہی بیوروکریسی خود بھی آہنی ڈھانچہ بن جاتی تھی۔

برٹش ایمپائر تحلیل ہونے لگی تو برٹش کامن ویلتھ بن گئی۔ جس کے تمام آزاد ملکوں نے سرکاری ملازموں کے گرد آئینی حفاظت کا حصار قائم رکھا، بلکہ ان تمام میں یہ آج بھی قائم ہے۔ سوائے پاکستان کے جہاں جنرل ایوب خان پہلے حملہ آور تھے، جنھوں نے اس حصار میں متعدد سوراخ کر ڈالے۔ دوسرے حملہ آور جنرل یحییٰ خان تھے جن کی یلغار تیز تر تھی۔ اسی لیے یہ سوراخ بھی بڑے ہوئے اور باقی حصار میں بھی دراڑیں پڑ گئیں۔ آخر میں تیسرے حملہ آور ذوالفقار علی بھٹو نے تو یہ حصار ہی تہس نہس کر دیا، جس کا ذکر اپنے وقت پر آگے آئے گا۔ ان تمام حملہ آوروں کے لاؤ لشکر میں انھی کی ولدیت والے بااثر افراد اپنے اپنے مفادات کے نیزے بھالے اُٹھائے جوق در جوق شامل ہوتے رہے۔

ان تمام حملوں کی غرض و غایت صرف یہی تھی کہ بیوروکریسی کی شکل و صورت تو قائم رہے، مگر اس کا کردار اس طرح بدل دیا جائے کہ یہ قانون کا دامن چھوڑ کر حاکمِ وقت کا دامن تھام لے۔ آئین اور قانون کو فوقیت نہ دے، بلکہ اقتدار والوں کے مفادات کو اہم جانے۔ ان کی من مانی کی تابعداری کرے۔ ان سے وفاداری نبھائے اور ان کے مطابق کارگزاری دکھائے۔

جب تک سرکاری ملازموں کے گرد آئینی تحفظات کا یہ حصار قائم رہا ان میں سے ہر ایک اپنی سابقہ تربیت کی قانونی ڈھال کا مؤثر استعمال کر کے کسی نہ کسی حد تک اس طوفانی یلغار سے بچتا رہا اور چھوٹے بڑے کئی زخم سہتا رہا، جن سے اس کی ملازمت کبھی لولی اور کبھی لنگڑی ہوتی رہی۔ اگر اُس دور کی بیوروکریسی کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو تاثر یہی اُبھرتا ہے کہ آہنی ڈھانچے پر تین متواتر حملوں کے دوران ؏

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

لیکن جب ۱۹۷۳ء میں یہ آہنی حصار ہی توڑ دیا گیا تو چھوٹی بڑی ہر مدافعت دم توڑنے

لگی۔ گو پھر بھی کئی مجاہد ایسے تھے جو خون کے آخری قطرے تک جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا جہاد کرتے کرتے شہید ہو گئے۔

حیف یہ ہے کہ گرتے شہسواروں کی یہ آخری مدافعت قوم کی نظروں سے اوجھل ہی رہی۔ نہ کوئی قصہ کہانی یا داستان بنی۔ نہ کوئی مثال قائم ہوئی۔ نہ کوئی مرحبا گونجا۔ نہ آنسو ٹپکا۔ نہ حکایتیں نہ شکایتیں۔ یہ سب کچھ ان حملہ آوروں کی رجزیہ للکار میں گم ہوتا رہا، جو اصلاحات کی گھن گرج سے گونج رہی تھی۔ چنانچہ، سرکاری ملازموں کے لیے آئین، قانون و قواعد اور اصولوں کی وادی قدم بہ قدم زیادہ پُرخار ہوتی گئی اور آبلہ پا بیوروکریٹ بڑی استقامت سے لڑکھڑانے والے زخمی قدموں کو سنبھالتے رہے۔ مگر اس آخری منظر (drop scene) کو دیکھنے والا کوئی دردمند تماشائی نہ تھا اور آواز اُٹھانے والا کوئی معتبر گواہ نہ تھا۔ حالانکہ ؏

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

... جب سے صدر ایوب نے عوام و خواص کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا شروع کیا تھا تب سے عوام کی گواہی بے اثر ہونے لگی تھی۔ خواص کے ہاتھ بااثر افراد کی بیعت کرنے لگے تھے اور بااثر لوگ اپنا اثر بڑھانے کے لیے اصلاحات کے ڈرامے میں شامل ہونے لگے تھے۔

بسمل کی یہ تڑپ میں نے کئی دفعہ دیکھی۔ ہر محکمے کے سرکاری ملازموں میں دیکھی۔ پاکستان کے ہر علاقے میں دیکھی۔ مگر بوجوہ اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں، کیونکہ میرا اکیلا بیان غالب کی طرف داری کے طور پر رد ہو سکتا ہے۔ اس کی تصدیق کرنے والوں میں سے کئی ایک ہمیں داغِ مفارقت دے چکے ہیں۔ کئی ایک کی اجازت کے بغیر میں ان پر بیتی ہوئی منظر عام پر نہیں لا سکتا اور کئی ایک چاہتے ہی نہیں کہ انھیں بلھے شاہ کے تجربے سے گزرنا پڑے۔ ؏

سچ آکھیاں بھانبڑ بلدا اے (سچ بولنے سے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں)

اور ان کی راست گوئی کہیں ''راستی فتنہ انگیز'' نہ بن جائے، کیونکہ تب کے بااثر افراد اب بھی بااثر ہیں۔ اور ان کی تخلیقی دروغ گوئی اب ایک سیاسی فیشن بن چکی ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ کو صرف ان حوالوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، جو بعض گواہوں کی آشفتہ سری سے تحریر بن چکے ہیں اور میری نظر سے گزر چکے ہیں۔

پہلا حوالہ ایک سرکاری افسر امین اللہ چودھری کا ہے۔ جن کی سوانحی اور تجزیاتی کتاب یہ بتاتی ہے (انگریزی سے ترجمہ):

صدر ایوب کے عہدِ حکومت کے پہلے چار برسوں میں سول سروس کو متعدد طوفانوں میں گزرنا پڑا، مگر

بیوروکریسی ہر دفعہ اپنی اہلیت، ذکاوت اور انتظامی مہارت کی وجہ سے اپنا جسم و جاں بچا سکی۔ فوجی حکومت نے اپنے اقتدار کے پہلے ہی برس سویلین انتظامیہ کی وسیع چھانٹی کر دی، جس کے لیے مارشل لا ریگولیشن ۶۲ کے تحت ملک بھر میں کمیٹیاں قائم کر دی گئیں۔ ان کمیٹیوں نے کرپشن اور نااہلی کی بنا پر ۱۵۰۰ سرکاری ملازموں کی برطرفی کی سفارش کی جن میں پہلی دفعہ ۱۳ سی ایس پی افسران بھی شامل تھے... ۱۹۵۹ء میں دوسرا بڑا حملہ یہ ہوا کہ سول سروس کی تشکیل نو کے لیے ایک کمیشن بنا دیا گیا، جس کے سربراہ جسٹس اے آر کارنیلس (A.R.Cornelius) خطرے کی پہلی گھنٹی بن گئے، کیونکہ وہ متعدد دفعہ اس سروس سے نفرت کا اظہار کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں نوآبادیاتی سامراج کے ان آلہ کاروں کے تن اور من میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ اس کمیشن کو اپنی سفارشات مکمل کرنے میں ۳ برس لگ گئے... مگر ۱۹۶۲ء تک صدر ایوب کا اپنا انقلابی جذبہ بھی ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور انتظامیہ اصلاحات کی ترجیح بہت نیچے سرک گئی تھی۔[25]
سب سے اہم بات یہ تھی کہ صدر ایوب نے اس غلط روایت کا آغاز کر دیا تھا کہ ان کے بعد آنے والے فوجی حاکم بھی پہلے تو مارشل لا ریگولیشنز کی لاٹھی بنائیں۔ پھر اسے اپنی مرضی کے مطابق اندھا دھند چلائیں، اور سرکاری ملازموں کی بڑے پیمانے پر برطرفیوں سے انتظامیہ کو اپنے ڈھنگ پر لے آئیں... چنانچہ ۱۹۶۹ء میں صدر یحییٰ بھی یکے بعد دیگرے ایسے اقدام کرنے لگے، جن سے انتظامیہ کو مکمل طور پر تسخیر کر لیا جائے... اس کے لیے انھوں نے پہلے تو سی ایس پی کے سینئر افسران کی صفوں میں ایک بے رحم چھانٹی کر دی۔ پھر باقی ماندہ افسران کے سر پر تلوار لٹکا دی کہ ان کے دامن اور گریبان کی ترتیب و تنظیم بدل دی جائے گی۔ چنانچہ مزید اصلاحات کے لیے جسٹس اے آر کارنیلس کو دوبارہ بحال اور فعال کر دیا گیا۔

صدر ایوب اور صدر یحییٰ کے دور میں بیوروکریسی کی "تنظیم نو" اور "تشکیل نو" کے انداز پر ایک اور سرکاری افسر مسٹر اے کے خالد نے بھی اپنی کتاب[26] میں روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے دو واقعے بیان کیے ہیں جن میں سے ایک واقعہ ان کے سینئر افسر کے متعلق تھا اور دوسرا واقعہ ان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔

پہلا واقعہ یوں ہے:

...انھی دنوں ایک ایسے دل خراش سانحے کی اطلاع ملی کہ دل و جگر پھٹ اُٹھے۔ خبر یہ تھی کہ ہمارے صدرِ محترم ایوب خان نے جو ریفرنڈم میں سو فیصد ووٹوں کے ساتھ ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکنوں کے دعویدار بنے بیٹھے تھے، کسی ذاتی رنجش کی بنا پر اپنے سیکرٹری داخلہ میاں انور علی جیسے نابغۂ روزگار شخص کو بہ یک بینی و دو گوش ملازمت سے نکال باہر کیا تھا۔ میاں صاحب کے ساتھ میں نے چھ سات ماہ کام کیا، مگر ان کے پائے اور قابلیت کا کوئی افسر پوری سی ایس پی منڈلی میں ڈھونڈے سے نہ پا سکا۔ میں افسوس کے لیے میاں صاحب

کے بنگلے پر گیا... اطلاع بھجوائی تو میاں صاحب نے اندر بلا لیا۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میاں صاحب بولے کہ لوگ کیا کہتے ہیں... (ص: ۱۲۷)

دوسرا واقعہ صدر یحییٰ کے دور میں ہوا۔ جب مصنف لاہور میں رجسٹرار کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ تھے۔ ان دنوں مسٹر منگی اسٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک کے مالک اور پریذیڈنٹ تھے، جن کے حق میں راہوالی کوآپریٹو شوگر ملز کی الاٹمنٹ ہو چکی تھی اور بقول مصنف:

انھوں نے اس مل کو چلانے کے لیے ۴۰ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ جو کنٹریکٹ کی شرائط کے صریحاً خلاف تھا، مگر چونکہ مسٹر منگی کو صدرِ پاکستان جنرل یحییٰ خان، جو بوجوہ اس کے احسان کے زیر بار تھے، کی مکمل تائید حاصل تھی۔ اس نے اپنے اثر و رسوخ سے ایک صدارتی حکم نامہ جاری کروا لیا، جس کی رو سے اسے ۴۰ لاکھ روپے کی مطلوبہ رقم کوآپریٹو بینک سے فوری ادا کر کے صدر کو اطلاع دینے کو کہا گیا تھا... میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ جس رقم پر مجھے امین بنا کر بٹھایا گیا ہے میں اس میں خیانت کا ارتکاب نہیں کر سکتا...

(ص: ۲۰۵ تا ۲۰۶)

اتنے میں صدرِ پاکستان کا اپنا دھمکی آمیز فون آ گیا اور یہ جان کر کہ رقم کی ادائیگی میں ابھی چند رکاوٹیں دور کرنی باقی ہیں، بڑے درشت اور تلخ لہجے میں دھمکایا کہ وہ رقم کی ادائیگی میں رکاوٹ بننے والے آفیسر کو مشرقی پاکستان میں پھینک دیں گے۔ اس پر چیف سیکریٹری افضل آغا نے مجھے آخری تنبیہ دیتے ہوئے ہفتے بھر کی مہلت دی اور کہا کہ اس دوران سوچ سمجھ کر اپنا فیصلہ بدل لوں یا مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے تیرو تبر کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاؤں۔

مہلت کا یہ ہفتہ میرے سر پر موت بن کر منڈلاتا رہا۔ میں اپنے تصور میں کبھی یحییٰ خان اور اس کے منظورِ نظر غاصب دوستوں کے ہاتھوں قومی دولت کو بے دریغ لٹتے دیکھ کر غصے سے بل کھاتا، کبھی مشرقی پاکستان کی خون آشام مکتی باہنی کے تیر و تفنگ سے اپنے جسم و جان کو بچانے کی کوشش کرتا اور کبھی اپنے افسرانِ بالا کی خوشامدانہ ذہنیت کا رونا روتا جو خوشنودیٔ شاہ کے لیے روزِ روشن کو رات بنا کر جھوٹ موٹ کے آسمان پر "مہ و پروین" دکھانا چاہتے تھے۔ (ص: ۲۰۶)

اس مرحلے پر مشیت کی دخل اندازی یوں ہوئی کہ کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ کے صوبائی سیکریٹری (مجیب الرحمان) اچانک ٹریفک کے حادثے میں وفات پا گئے اور کچھ عرصے کے لیے یہ معاملہ ملتوی ہو گیا۔ دریں اثنا ۱۹۷۱ء کی ہندو پاک جنگ چھڑ گئی اور جب وہ ختم ہوئی تو صدر یحییٰ کا دورِ حکومت بھی ختم ہو گیا۔

دونوں جرنیلوں کے دورِ حکومت میں بیوروکریسی کے سبھی اراکین اور ہر سطح کے سرکاری

ملازمین کسی نہ کسی حد تک ایسے ہی ذہنی اور جذباتی زلزلوں سے لرزاں رہتے تھے اور سرگوشیوں میں
اپنے احساسات ایک سے دوسرے تک پہنچاتے رہتے تھے۔ اُن دنوں کا سرکاری ملازم غالب کے
تصور میں یوں تھا۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

پہلے اور دوسرے مارشل لا کے دوران زیادہ تر one unit کا زمانہ تھا۔ جب میری تعیناتی
سب ڈویژن اور ضلع کی سطح پر مختلف علاقوں (پنجاب، بلوچستان، سندھ، مشرقی پاکستان) میں ہوتی
رہتی تھی اور مجھے اکثر اوقات ناگوار زمینی حقائق سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ جرنیلوں کے اندازِ حکومت
کے مطابق غیر قانونی اور غیر روایتی اینٹ پتھر روڑوں سے ٹھوکریں لگتی رہتی تھیں، اس لیے میں بھی
مذکورہ بالاقسم کے چھوٹے بڑے تجربوں کے کئی ذائقے چکھ چکا تھا۔ اگر یہ تحریر آپ بیتی ہوتی تو ان
کا بھی ذکر لازمی ہوتا لیکن یہ صرف وطن بیتی ہے اور اس میں بھی فوکس صرف حُسنِ انتظام
(governance) کی دانستہ ہلاکت اور تباہی پر ہے۔ اس لیے یہاں صرف ایک نمایاں واقعہ کی
طویل داستان کو بڑے اختصار سے پیش کیا جارہا ہے۔

میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد ڈویژن) کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ صدر ایوب کے دور کی صنعتی
ترقی میں یہ ضلع ایک بہتی گنگا کی طرح تھا۔ جس میں یہاں کے صنعت کار بڑی آسودگی سے ہاتھ دھو
رہے تھے، بلکہ ان میں سے چند ایک سیاسی اُمنگیں بھی پال رہے تھے۔ سہگل خاندان کے رفیق
سہگل کنونشن مسلم لیگ کے خزانچی ہونے کی وجہ سے اس پارٹی کے صدر جنرل ایوب خان کے بہت
قریب تھے اور اپنے علاقائی اثر ورسوخ کو مزید مستحکم کرنے میں بہت سرگرم تھے۔ ماضی میں اسی شہر
سے کوہستان بس سروس[27] کا اجرا ہوا تھا۔ اور اب اس کا ہیڈ کوارٹر اس شہر میں ایک انتہائی کامیاب
اور منافع بخش کاروبار کا مرکز تھا۔

اچانک خبر آئی کہ صدر ایوب کے ایک شاہزادے اور ان کے مسلح ساتھیوں نے اس ہیڈ کوارٹر
کا محاصرہ کر لیا ہے اور تقاضا کر رہے ہیں کہ کوہستان بس سروس کا جملہ کاروبار ان کے حوالے کر دیا
جائے۔ ضلعی انتظامیہ کی فوری مداخلت کی کوشش جب محاصرین کی رعونت کو قبول نہ ہوئی تو بس سروس
کے محصور ملازمین نے بھی بندوقیں تان لیں۔ ریت کی بوریوں کے مورچے اوپر اُٹھتے گئے۔ بندوقوں
کی تعداد بڑھنے لگی... پولیس نے ان دونوں کے گرد اپنا گھیرا تان لیا۔ مجسٹریٹ ڈیوٹی پر متحرک ہو
گئے۔ پُرامن حل کی ہر کوشش ناکام ہوتی گئی۔ ضلعی اور علاقائی سیاست میں سہگل مخالف گروپ بھی

چوکنا ہو گیا اور سارے شہر بلکہ ضلع میں تناؤ بڑھنے لگا۔ کسی وقت بھی گولیاں چل سکتی تھیں۔

دو اڑھائی دنوں میں سارے شہر کا اعصابی تناؤ اور درجۂ حرارت کوئی ہزار درجے پر پہنچ گیا۔
میرا اپنا کہیں اس سے بھی اُوپر تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو ملک بھر میں ترقیاتی عشرے کے جشن کا
پُرتحسین شور تھا اور دوسری طرف سوگوار سرگوشیاں فیض احمد فیض کی نظم "لہو کا سراغ" کے اشعار سینہ بہ
سینہ پھیلا رہی تھیں۔[28] میں نے اس دھماکہ خیز واقعے کی خبر درجہ بہ درجہ اپنے تمام افسرانِ بالا تک
پہنچانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ سب یہ سننا ہی نہیں چاہتے تھے اور مصر تھے کہ ضلعی سطح سے اُوپر اس
موضوع کا ذکر ہی نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کا کورا جواب یہی تھا کہ امن وامان ڈپٹی کمشنر کی ذاتی
داری ہے... ان کا اصولی موقف درست تھا، مگر میری حیرت پوچھتی تھی کہ اس پرانے قانون کا اچانک
ادراک آج پہلی دفعہ انھیں کیسے ہو گیا... حالاتِ حاضرہ نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ وہ لوگ
اپنی مدتِ ملازمت کے پچیس پچیس برس پورے کر چکے ہیں یا کرنے کو ہیں اور اس طرح صدر ایوب کی
حکومت کے نئے لاگو شدہ قواعد[29] کی پوری زد میں ہیں۔

میرے پاس اس سرگوشی کا کوئی جواب نہ تھا۔

دراصل کسی کے پاس بھی اس ریاستی زبردستی کا کوئی جواب یا جواز نہ تھا۔ نہ مشرق سے، نہ مغرب
سے، نہ شمال سے نہ جنوب سے۔ کوہِ ہمالیہ کی بلندیوں والے اس وسیع ملک میں ایک بھی کوہِ ندا نہ تھا۔

میں بند گلی میں اکیلا گھرا ہوا تھا۔ میری واحد سنگت فیض کی نظم "لہو کا سراغ" کر رہی تھی۔
اور یہ بڑی ہی حوصلہ شکن سنگت تھی۔ ساتھ ہی گھٹی گھٹی فضا میں بے یقینی کی حدت تھی۔

تب میں نے بڑی یکسوئی سے ایک دفعہ پھر ان آئینی تحفظات کا جائزہ لیا۔ جن کا حفاظتی
حصار ہر سرکاری ملازم کے گرد نو آبادیاتی دور سے قائم تھا۔ ۱۹۵۸ء میں نظر سے اوجھل ہو گیا اور
۱۹۶۲ء میں مارشل لاء اُٹھائے جانے کے بعد پھر سے بڑی دھندلاہٹ میں نظر آنے لگ گیا تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ سارے شہر کا تین روزہ اعصابی تناؤ میرے گھر والے دفتر میں
سمٹ آیا تھا۔ ایسے میں اس حفاظتی حصار نے مجھے سہارا دیا... ہر چہ بادا باد سوچتے ہوئے میں نے
ٹیلی فون ایکسچینج کا نمبر ملا کر آپریٹر سے کہا کہ مجھے راولپنڈی میں ایوانِ صدر سے ملا دیں۔ (ان
دنوں ڈائریکٹ ڈائلنگ (direct dialing) کی سہولت میسر نہ تھی)

تھوڑی دیر بعد نمبر ملا تو قدم قدم پر رکاوٹ... کئی سوالوں اور کئی آوازوں کے بعد بالآخر
ملٹری سیکریٹری (Military Secretary) فون پر آ گئے۔ (وہ بھی ایک جنرل تھے) میں نے انھیں
مقامی صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ ناراض ہونے لگے کہ میں نے فون کیوں کیا... اس گفتگو کی

تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ یہ آپ بیتی نہیں ہے لیکن میرا مختصر جواب یہ تھا کہ کل صبح ہم قانون کے مطابق کارروائی کر رہے ہیں اور یہی بتانے کے لیے میں نے فون کیا ہے۔

فون غصے سے پٹخا گیا... اور بند ہو گیا۔

رات بھر میری غنودگی اور بیداری اپنے آئینی حصار کی دیواریں بار بار ٹٹولتی رہیں اور تسکین کے ذرّے ڈھونڈتی رہیں کہ کسی بھی تادیبی کارروائی سے پہلے میری جواب طلبی ضروری ہے۔ اور یہی جواب طلبی میرا یقینی دفاع بھی ہو گی، جب میں بالکل سچے انداز میں سارے واقعات تحریر کر دوں گا۔

میرے اردگرد وسوسے، شکوک اور شبہات ناچتے رہے کہ کیا حالات اس وقوعے کو تحریر میں لانے کی اجازت دیں گے یا نہیں؟

لیکن ہوا یوں کہ ع

رات گئی، بات گئی

پو پھٹتے ہی اطلاع ملی کہ ایس پی صاحب (سپرنٹنڈنٹ پولیس) آئے ہیں۔

میں باہر نکلا تو عبداللہ خان ایس پی کے ہشاش بشاش مسکراتے چہرے نے اطلاع دی،

"رات ۳ بجے وہ لوگ بوریا بستر اُٹھا کر چلے گئے ہیں!!"

اس طرح ایک مقامی مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن بیوروکریسی کا قومی مسئلہ مزید بگڑ گیا کیونکہ سرکاری ملازموں کو آئینی تحفظ دینے والا حصار اب من مانی کرنے والے حاکموں کی آنکھوں میں پہلے سے زیادہ کھٹکنے لگا۔

تب آسمانی مشیت حرکت میں آئی اور حالات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا... دیکھتے ہی دیکھتے ترقیاتی عشرے کا جشن آمریت کے خلاف تحریک کا طوفان بننے لگا... بالآخر ۲۵ رمارچ ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب نے استعفیٰ دے دیا اور جنرل یحییٰ خان کی صدارت میں دوسرا مارشل لا نافذ ہو گیا۔ جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ جابر تھا۔

میری جواب طلبی کا وقت دانستہ گزار دیا گیا تھا اور اب تادیبی کارروائی نے یہ بظاہر معصومانہ رُخ اختیار کیا کہ مجھے ضلع لائل پور سے ضلع لسبیلہ تبدیل کر دیا گیا... ساتھ ہی ایک قاصد کے ذریعے ایک بااثر شخصیت کا پیغام ملا کہ اگر اس سے آگے سمندر نہ ہوتا تو آپ کو مزید دور بھیجا جا سکتا تھا... لیکن مناسب شرائط پر یہ تبادلہ بھی منسوخ ہو سکتا ہے۔

یہ پیغام ملتے ہی میں نے چارج چھوڑ دیا اور نقل مکانی کے سات دن کے وقفے (joining time) میں لاہور چلا گیا لیکن ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ مجھے فون پر نیا حکم ملا کہ ضلع لسبیلہ والا حکم

منسوخ کر کے مجھے ضلع لاڑکانہ میں ڈپٹی کمشنر لگا دیا گیا ہے۔ نقل مکانی کا باقی ماندہ وقفہ بھی منسوخ ہو گیا اور کڑی ہدایت ملی کہ فوراً وہاں پہنچ کے چارج لے لوں۔

اس اچانک قلابازی کا پس منظر یہ تھا کہ نومبر ۱۹۶۸ء سے نئی سیاسی پارٹی (پاکستان پیپلز پارٹی) کے صدر ذوالفقار علی بھٹو میانوالی جیل میں قید تھے۔ فروری ۱۹۶۹ء میں انھیں جیل سے تو رہا کر دیا گیا، مگر اپنے آبائی ضلع لاڑکانہ میں اپنے گھر "المرتضیٰ" میں نظر بند کر دیا گیا، لیکن اُن دنوں زمانہ قیامت کی چال چل رہا تھا۔ اس لیے صدر ایوب کو ۱۷ رفروری کو ہنگامی صورتِ حال ختم کرنا پڑی، تو بھٹو صاحب کو بھی رہا کرنا پڑا، مگر ان کی سیاسی سرگرمیوں پر کچھ پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ صدر یحییٰ خان کی نئی حکومت آئی تو اپنے ساتھ نئے ہتھکنڈے بھی لائی جن کے ذریعے ان پابندیوں کے نفاذ میں ضلعی انتظامیہ سے کچھ بدمزگی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ، ڈپٹی کمشنر کو تبدیل کر دیا گیا اور چونکہ میں ان سات دنوں میں ہوا میں اُڑنے والے تنکے کی طرح آزاد تھا اس لیے فوری خانہ پُری کر سکتا تھا۔ چنانچہ، مجھے حکم ملا کہ فوراً لاڑکانہ پہنچ جاؤں۔

اس طرح ذوالفقار علی بھٹو کو قریب سے جاننے کا موقع مل گیا اور ہمارے باہمی تعلقات میں اُتار چڑھاؤ کا چند سالہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر اس کی داستان یہاں شامل نہیں ہو گی، کیونکہ یہ تحریر میری آپ بیتی نہیں ہے۔ البتہ گورننس (governance) کے بارے میں بھٹو صاحب کے بدلتے رویّوں کے مختصر حوالے ضرور شامل ہوں گے۔

حواشی

۱۔ ص: ۱۹۹، ۲۰۰۔

۲۔ ص: ۲۰۲ اور صدر ایوب خان کی کتاب *Friends not Masters* کا ص: ۶۰۔

۳۔ تقسیم ہند کے بعد اُبھرنے والے پاکستانی لیڈروں کے متعلق ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔

۴۔ ص: ۲۴۴۔

۵۔ ص: ۲۳۳ تا ۲۳۵۔

۶۔ شاہد الرحمان کی انگریزی تصنیف *Who Owns Pakistan* چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۱۔ طابع و تقسیم کار مسٹر بکس (Mr. Books) سپر مارکیٹ، ایف سکس (F-6) مرکز اسلام آباد۔

۷۔ ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا (حبیب جالب)۔

۸۔ ص: ۲۲۷ تا ۲۲۹۔

۹۔ ص: ۲۳۳۔

۱۰۔ ص: ۲۰۲۔

۱۱۔ ص:۲۲۹۔

۱۲۔ Carnivorous Plants۔

۱۳۔ جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دوران جب ملک ٹوٹا اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تو انھوں نے ۲۱/اپریل ۱۹۷۲ء تک مارشل لا جاری رکھا اور پہلے سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہلائے۔

۱۴۔ فتح محمد ملک کی تصنیف پاکستان کا روشن مستقبل میں مضمون: ''نظریۂ پاکستان، سلطانیِ جمہور اور معاشی انصاف'' (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء ایڈیشن) ص: ۴۲۔

۱۵۔ بجٹ برائے ۲۰۰۶ء...۲۰۰۷ء۔

۱۶۔ پاکستان فارن سروس کے نمایاں افسر کا روزنامہ ڈان (*Dawn*) میں مضمون مورخہ ۱۵ فروری ۲۰۰۷ء۔

۱۷۔ ایضاً، فتح محمد ملک، ص: ۴۳۔

۱۸۔ ص: ۲۰۲۔

۱۹۔ ص: ۲۲۹۔

۲۰۔ امین اللہ چوہدری، *Political Administrator* (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، دوسرا ایڈیشن) ضمیمہ جات، ا سے ۱۵؛ صفحات ۳۳۷ تا ۳۹۷۔

۲۱۔ سیّد منیر حسین، *Surviving The wreck*، (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء) صفحات ۶۳، ۶۴۔

۲۲۔ امین اللہ چوہدری، ایضاً، ص: ۱۴۵۔

۲۳۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز) صفحات ۱۱، ۱۰۱۸، ۱۰۲۰ اور ۱۰۳۳

۲۴۔ شہاب نامہ، ایضاً، صفحہ ۷۱۵۔

۲۵۔ امین اللہ چوہدری، ایضاً، صفحات ۴۸، ۴۹۔

۲۶۔ اے کے خالد، فردِ حیات (لاہور: الائیڈ پریس، ۲۰۰۶ء)۔

۲۷۔ اگر یادداشت غلطی نہیں کر رہی تو بس سروس کا یہی نام تھا۔

۲۸۔ اس نظم کا مصرعِ اولیٰ ہے ''کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ'' اور آخری مصرع ہے ''یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا''... آغا ناصر نے اپنی کتاب بہ عنوان ہم جیتے جی مصروف رہے میں اس نظم کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ ۱۹۶۵ء صدارتی الیکشن میں جب محترمہ فاطمہ جناح کو صدر ایوب کے ہاتھوں شکست ہوئی، تو کراچی میں کنونشن مسلم لیگ نے جلوسوں پر پابندی کے باوجود اپنی فتح کا جلوس نکالا۔ جس کی قیادت صدرِ مملکت کے صاحبزادے کر رہے تھے۔ اس موقع پر فتح منانے کی ہوائی فائرنگ سے ایک نوجوان ہلاک ہو گیا اور حالات بگڑ گئے۔ لیکن ''اوپر'' کی ہدایت پر کوئی ایف آئی آر (FIR) درج نہ ہو سکی اور نوجوان کی لاش بغیر کسی لکھا پڑھی کے دفنا دی گئی۔ (صفحات ۱۵۷ تا ۱۵۹)

۲۹۔ ص: ۲۴۰۔

ملکی سالمیت

پہلے اور دوسرے مارشل لا میں صرف بیوروکریسی ہی نہیں روندی جا رہی تھی بلکہ اور بھی بہت کچھ روندا جا رہا تھا۔

گندم کے ساتھ پسنے والے گھن کی طرح بیوروکریسی کے ساتھ ملکی سالمیت بھی پس رہی تھی، کیونکہ بیوروکریسی وطن کی مٹی کے تمام ذرّوں کو یک جان کرتی ہے اور ملکی سالمیت کا استخوانی ڈھانچہ (skeleton) ہے۔

مشرقی پاکستان میں ہماری آبادی کی ایسی اکثریت آباد تھی جو ہندی مسلمانوں کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام، ۱۹۴۰ء میں لاہور کے جلسے میں پاکستان ریزولیوشن کی پیشکش۔ پھر سات سالہ تحریک میں بھرپور شرکت اور بالآخر ۱۹۵۶ء کے آئین پر اتفاق کے لیے اپنی اکثریت کی قربانی... اس درخشاں ماضی کے ساتھ مشرق نے مغرب کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور ملکی سالمیت کا امین تھا۔ اسی لیے مشرق سیاسی طور پر زیادہ بیدار، آواز اُٹھانے میں زیادہ بلند بانگ اور اس آواز کے نظر انداز ہونے پر زیادہ زود رنج تھا۔

لیکن من مانی کرنے والوں کو اپنی مرضی کے علاوہ اور کسی کی آواز یا رنج کی پروا نہ تھی۔ جنرل ایوب کی تو رونمائی سے ہی ملکی سالمیت میں چب (dent) پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ جب وہ ۱۹۵۶ء والا آئین روندتے ہوئے آئے تھے۔ یہ آئین اُردو اور بنگالی دونوں کو قومی زبان کا درجہ دے کر مشرقی پاکستان سے اُٹھنے والے شعلوں کی آگ کو بجھا چکا تھا اور مشرقی پاکستان کے ایثار کے بعد برابری کے فارمولے کے تحت قومی تاریخ کا رُخ ایک نئے کہکشاں کی طرف موڑ چکا تھا۔ اس طرح یہ ملکی سالمیت کا ضامن بن چکا تھا۔ لیکن صدر ایوب اسے روند چکے تھے۔ اور پھر ۱۹۶۰ء میں مشرق اور مغرب کے درمیان سرکاری ملازموں کی پہلی تعیناتی میں اُلٹ پلٹ کی روایت ختم کر دی گئی تھی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ ۱۹۶۲ء میں صدر ایوب کی طرف سے مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں کو یہ پیغام بھیج دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو علیحدہ ہو سکتے ہیں۔

جنرل یحییٰ آئے تو صدر ایوب کی انھی سوچوں کو آگے چلانے لگے، جن کی وجہ سے ملکی سالمیت لرزنے لگ گئی تھی۔ بالکل ویسی ہی اصلاحات کی شعبدہ بازی۔ ویسے ہی الیکشن کے لیے ویسی ہی

قانون سازی۔ الیکشن کے بعد ویسے ہی صدارتی نظام والے آئین کی تیاری جوان کو بھی صدر ایوب جیسا ہی مطلق العنان صدر (یعنی بادشاہ) بنا دے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں بھی مشرقی پاکستان پر ویسی ہی بداعتمادی تھی، جیسی صدر ایوب کو تھی۔ یہ بداعتمادی بلاوجہ نہیں تھی۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جاگیردار سیاستدانوں کو صدر ایوب نے پہلے تو ایبڈو (ebdo) اور پوڈو (podo) کے ذریعے ہراساں اور خوفزدہ کیا۔ پھر انھی کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ان سے راز و نیاز ہونے لگے اور دیرپا قربت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ یہ رشتہ پہلے سیاسی مفادات کی شراکت بنا۔ پھر مشترکہ تسلط قائم رکھنے کا گٹھ جوڑ بنا اور بالآخر جاگیرداری اور فوجی آمریت کا ایسا محور بن گیا جو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے مصداق ایک دوسرے کے گروہی مفادات کو مضبوط کرنے لگا۔ یہی محور ۱۹۶۸ء کا پورا سال ترقیاتی عشرے کا جشن مناتا رہا۔ عوام کی بے صبری کو نظرانداز کرتا رہا۔ جو بالآخر آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑی اور صدر ایوب کو جانا پڑا۔

جنرل ایوب خان کا آنا بھی غیر آئینی تھا اور ان کا جانا بھی غیر آئینی تھا۔ اس لیے اپنے دورِ حکومت میں وہ عوام کی بجائے اس غیر عوامی محور سے تقویت حاصل کرتے رہتے۔ یہی تقویت اب جنرل یحییٰ کو بھی ملنے لگی، مگر ساتھ ہی خطرے کا یہ احساس بھی ملا کہ مشرقی پاکستان کے بیدار مغز لوگ اس خالص مغربی پاکستانی محور کے لیے خطرہ ہیں۔ کیونکہ اس محور سے دوری نے انھیں یہ مزاج دیا تھا کہ ع

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے (فیض)

چنانچہ، جنرل یحییٰ کی ساری پالیسیاں ایک ہی رُخ چلنے لگیں کہ کسی طرح اس خطرے سے نمٹ کر وہ اپنے لیے صدارت حاصل کر لیں۔ جنرل ایوب تو محض ۱۹۵۶ء کا آئین روند کر آئے تھے لیکن جنرل یحییٰ اس عزم کے ساتھ آئے کہ ہر اس رکاوٹ کو روند ڈالا جائے جو انھیں صدر بننے سے روک سکتی تھی۔[۱]

اس عزم کے آثار شروع میں تو نظر نہیں آئے لیکن جب اس پر آمادگی دھیرے دھیرے شدت پکڑنے لگی، تو ملک ایک فٹ بال بن گیا اور اقتدار حاصل کرنے کے کھیل کی ایک نئی طرز ایجاد ہوئی۔ جس میں دو کی بجائے تین ٹیمیں تھیں، جن کے کپتان تھے۔ جنرل یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمان اور ذوالفقار علی بھٹو۔ مگر گول کرنے کے لیے دو کی بجائے صرف ایک ہدف تھا۔ یعنی ملک کی صدارت کا ہدف۔ اس نئی طرز کے نرالے کھیل کے مطابق اس اکیلے گول میں جنرل یحییٰ فٹ بال ڈالنا چاہتے تھے اور دوسرے دو کھلاڑی انھیں ناکام بنانا چاہتے تھے۔ اس کھیل میں قوم شریک نہ تھی۔ محض ایک بے بس اور بے حس تماشائی تھی۔

۲۵ رمارچ ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب نے جب قوم سے الوداعی خطاب کیا، تو انھوں نے آئین کے مطابق اقتدار اسمبلی کے اسپیکر کو نہیں دیا، بلکہ اپنی آخری اور جنرل یحییٰ کی پہلی من مانی کرتے ہوئے ملک کی باگ ڈور ایک دفعہ پھر فوج کے حوالے کر دی۔ دراصل اس طرح وہ اس نئے اور نرالے کھیل کے شروع ہونے کی سیٹی بجا رہے تھے۔

کھیل کے شروع ہوتے ہی مجھے ضلع لاڑکانہ کا چارج مل گیا اور تین میں سے دو ٹیموں کے ملک گیر کھیل کو میں ایک مقامی مورچے سے دیکھنے لگ گیا۔ اس مورچے میں اس وقت ذوالفقار علی بھٹو اپنے کھلاڑی تیار کر رہے تھے۔

دوسرے مارشل لاء کی ٹیم (team) اس نئی اننگ کو بڑی کائیاں منصوبہ بندی سے کھیل رہی تھی، تاکہ صرف وہی یہ گول کر سکے اور بازی جیت سکے۔ چنانچہ ہر ضلع کے ڈپٹی کمشنر پر مقامی بریگیڈیئر کو نگران مقرر کر دیا گیا تھا۔ کمشنر کے اوپر ایک میجر جنرل نگران ہوتا تھا۔ اور صوبائی سطح پر عام طور پر فوجی گورنر کے علاوہ ایک اور جنرل نگران ہوتا تھا۔ ہر دو عملی کی طرح یہ دُہرا بندوبست بھی مسائل سے بھرپور تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ لاڑکانہ کی فوجی ٹیم یہ چاہتی تھی کہ نئے کھلاڑی ذوالفقار علی بھٹو کی اس کھیل میں شرکت بہت ہی محدود، غیر اہم اور خفیف ہو۔ اس لیے ان کی سیاسی سرگرمیوں پر کچھ پابندیاں عائد تھیں، تاکہ ان کی نئی سیاسی پارٹی بارآور نہ ہو سکے۔ اس کے برعکس بھٹو کوئی سوا سال پہلے یکم دسمبر ۱۹۶۷ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ چکے تھے اور وہ اس کی تنظیم کے لیے بہت سرگرم ہونا چاہتے تھے، تاکہ اس ٹیم کے ساتھ وہ سیاست میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

لاڑکانہ میں ان دو کھلاڑیوں کے عزائم متصادم تھے، مگر ضلعی انتظامیہ کا مستقل فرض یہ تھا کہ اپنی قانونی حدود میں رہتے ہوئے ضلع میں کسی قسم کے تصادم کو روکیں۔ یہ انتہائی مشکل کام تھا۔ کیونکہ ہمارے اوپر تین نگران فوجی افسران اپنی ٹیم کی جیت کے لیے درپردہ غیر قانونی اقدام پر آمادہ رہتے تھے۔ خصوصاً جب کہ اس عجیب کھیل میں ایمپائر (umpire) کوئی نہ تھا۔ چنانچہ حالات نے مشیّت کو ایمپائر بنا دیا اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں ہر دم قانون کا سہارا تلاش کروں۔ یعنی جتنا سہارا ہمارا قانون مارشل لاء کے دور میں دے سکتا تھا۔ غالباً اس پل صراط سے گزرتے وقت میرے پیش رو ڈپٹی کمشنر کا توازن کہیں ڈولا ہوگا اور انھیں فوری طور پر تبدیل کر دیا گیا۔ تب مشیّت کا ایمپائر مجھے وہاں لے گیا۔

ضلع لاڑکانہ میں سندھ کے تین سیاسی ہاتھی رہتے تھے۔ قاضی فضل اللہ، ایوب کھوڑو اور ذوالفقار علی بھٹو۔ باقی دو سے تو روایتی پروٹوکول کے مطابق فوراً ہی ہمواری آ گئی۔ مگر بھٹو صاحب کے ساتھ پروٹوکول کی وجہ سے ڈیڑھ دو ماہ ملاقات ہی نہ ہو سکی لیکن آخرکار جب ہوئی تو بڑی ہموار

رہی اور ہمارے باہمی ربط نے دو رُخ اختیار کر لیے۔

پہلا رُخ غیر سرکاری اور غیر روایتی تھا۔ ایک دو سرسری سی سرکاری ملاقاتوں کے بعد ایک اتوار کو بھٹو صاحب کا فون آیا کہ اگر فرصت ہے تو میں تمھارے ہاں چائے پینے آ رہا ہوں اور جب آئے تو تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد پوچھنے لگے۔

"لائل پور میں آپ کا کتنا قیام تھا؟"

"دو اڑھائی برس کے قریب!" میں نے بتایا۔

"تو لائل پور کے متعلق مجھے جتنا کچھ بتا سکتے ہو بتاؤ"

پھر ان کے کئی تیکھے سوالات اور میرے محتاط جوابات کے دوران عقدہ کھلا کہ وہ اپنے انقلاب کا آغاز لائل پور سے اُسی انداز میں کرنا چاہتے تھے جیسے کارل مارکس نے اپنا انقلاب جرمنی کے صنعتی مراکز سے شروع کرنے کا سوچا تھا۔

میں نے یاد دلایا کہ تاریخ کی گواہی اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ کارل مارکس کا انقلاب یورپ کے صنعتی علاقوں میں برپا نہیں کیا جا سکا، بلکہ وہ روس کے زرعی علاقوں سے خود بخود اُبل پڑا تھا اور میرے خیال میں انھیں بھی لائل پور جیسے صنعتی مرکز سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہییں کیونکہ وہاں کے صنعت کار کی لمبی چھلانگ اور بے بس مزدور کی محرومی کا دورانیہ زیادہ طویل نہیں اس لیے ابھی ان کے ٹکراؤ سے آئیڈیل ازم کی وہ چنگاریاں نہیں نکلی تھیں جو انقلاب کا محرک بنتی ہیں اور شاید اب یہ چنگاریاں پھوٹ بھی نہ سکیں۔ کیونکہ صدر ایوب کے دور میں افضل اقدار کی پسپائی اور ارزل رویّوں کی چڑھائی ہوتی رہی ہے۔ اس لیے یہ دور انسانی فطرت کی بری اور منفی پرتیں کھولنے والا دور تھا۔ نہ صرف لائل پور کی صنعت بڑے غیر صحت مندانہ انداز میں پھیلی تھی۔ بلکہ لائل پور کا فرد بھی احتجاجی بننے کی بجائے منافع پرست بن چکا تھا اور یہ کوائف انقلاب لانے والے نہ تھے۔

یہ بحث اتنی طویل ہوئی کہ کئی ملاقاتوں پر پھیل گئی۔ لائل پور سے پہلے میں بلوچستان کے ضلع لورالائی میں قریباً تین برس تک ڈپٹی کمشنر اور پولیٹکل ایجنٹ رہا تھا۔ اس لیے وہ بلوچستان کے متعلق بھی بہت کچھ کریدتے رہے۔ ان ملاقاتوں کے لیے کبھی وہ میرے گھر آ جاتے، کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا۔ ایسی ہی ایک نشست میں انھوں نے برآمدے سے گزرنے والی ایک دبلی پتلی لڑکی کو اندر بلایا اور تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ میری بیٹی بے نظیر ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اسے بھی ملک کی سیاست کے لیے تیار کروں۔ ان ملاقاتوں کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ مجھے ایک ایسے شخص کو جاننے کا موقع مل رہا تھا جو انتہائی ذہین اور زیرک تھا۔ اوکسفرڈ کی تعلیم سے اپنی فہم و فراست کو مزید چمکا چکا

تھا۔ تاریخ کا نہ صرف جبلّی شعور رکھتا تھا بلکہ ایک فعال وزیرِ خارجہ کے طور پر بین الاقوامی امور کا ماہر کھلاڑی بن چکا تھا۔ انھی دنوں عالمی منظرنامے میں پاکستان کے مقام کے متعلق ان کی نئی کتاب[۲] شائع ہوئی، جس کی دستخط شدہ جلد انھوں نے لاڑکانہ سے میرے تبادلے کے وقت مجھے دی۔[۳]

ان دنوں میں بھٹو کی دو صفات سے بہت متاثر ہوا۔ ایک تو ان کا اندازِ گفتگو تھا۔ انگریزی میں بات کرتے وقت ہر جگہ پر صحیح لفظ کا مناسب استعمال ایسی روانی سے ہوتا تھا۔[۴] جیسے میر تقی میر نے اپنے بارے میں کہا تھا ع

میر دریا ہے کوئی دیکھے روانی اس کی

دوسرے برٹش جمہوریت اور برٹش ایمپائر کی گورننس کے وہ بہت معترف تھے۔ ان دونوں کی تاریخی تفصیلات پر بھی ان کی اچھی گرفت تھی۔ اس طرح ان کا مخاطب پوری طرح قائل ہو جاتا تھا کہ ایک فوجی ڈکٹیٹر کا فعال ساتھی رہنے کے بعد وہ اس کی جملہ خامیوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں اور ان کے اندر کے شہری کا قدرتی ردِّعمل یہی ہے کہ جمہوریت اور گڈ گورننس (Good governance) کے علاوہ پاکستان کے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔[۵]

ہمارے رابطے کا دوسرا رُخ خالص سرکاری تھا، مگر نہ تو کبھی ہمارے درمیان گفتگو کا موضوع بنا اور نہ ہی کہیں اور نظر آتا تھا۔ اس کا نادیدہ تعلق میری منصبی کارگزاری سے تھا اور بھٹو کی مقامی مقبولیت سے تھا۔

بعض دفعہ ضلع اور ڈویژن کے نگران فوجی افسران اپنی بھٹو مخالف سوچ کی وجہ سے ایسی زبانی ہدایات جاری کر دیتے تھے کہ ہمارے لیے انھیں تحریری احکامات کی شکل دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اگر انھیں عدالت میں یا کسی اور جگہ چیلنج کر دیا جاتا تو ان کا قانونی جواز نہ مل سکتا تھا۔ اس لیے فون پر تبادلۂ خیالات یا میٹنگ کے ذریعے میں فوجی افسران سے نظرِ ثانی کا تقاضا کر کے انھیں قانون کی حدود میں لانے کی کوشش کرتا رہتا۔ میرا اصرار ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ میرے دستخطوں سے صرف وہی آرڈر جاری ہو گا جس کا قانونی دفاع میں ہر سطح پر کر سکوں۔ بصورتِ دیگر فوجی افسران ہمارے نگران ہونے کی وجہ سے خود تحریری حکم جاری کرنے کے مجاز ہیں۔ اس قسم کے متعدد واقعات میں سے صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے سوانح نگار اسٹینلے وولپرٹ نے اپنی کتاب میں میرے ایک خط کا حوالہ دیا ہے۔[۶] جس میں بھٹو کی توجہ مارشل لا قواعد کی شق نمبر ۲۱ کی طرف دلائی گئی ہے۔ جس کے تحت سیاسی جلسے اور جلوسوں پر پابندی تھی۔ لیکن جب بھٹو موہنجوداڑو سے لاڑکانہ کی طرف سفر کر رہے تھے

تو پاکستان پیپلز پارٹی اس قانون کی خلاف ورزی کرتی رہی۔ اس لیے بھٹو صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنی پارٹی کو آئندہ اس قسم کی خلاف ورزی کرنے سے روک دیں۔

مصنف نے یہ خط ۱۹۹۳ء میں چھپنے والی کتاب کی ریسرچ کے دوران بھٹو خاندان کی لائبریری میں دیکھا اور نتیجہ نکالا کہ حکومت، ''قدم قدم پر پیپلز پارٹی کے سفر میں کانٹے بکھیر رہی تھی۔'' امریکن سوانح نگار نے محض ایک کاغذ یا خط سے جو نتیجہ نکالا وہ اس موقعے کے لیے کُلی طور پر درست نہ تھا، کیونکہ خلاف ورزی تو واقعی ہوئی تھی، لیکن وقوعہ کے قریباً ربع صدی بعد مصنف کو یہ معلوم نہ تھا کہ مارشل لا افسران نے زبانی طور پر مجھے کیا ہدایات دی تھیں۔ جن کی میں نے شدید مخالفت کی تھی۔ کیونکہ وہ قانونی طور پر درست نہ تھیں۔ پھر طویل بحث، کئی میٹنگوں اور کسی حد تک بدمزگی کے بعد بھی انھیں بالآخر آمادہ کر لیا تھا کہ صرف اسی قسم کا خط لکھا جا سکتا ہے جس کا اس سوانحی کتاب میں ذکر ہے۔

اس وقوعے کا اہم پہلو یہ ہے کہ جس پس منظر کا اسٹینلے وولپرٹ کو علم نہ تھا ذوالفقار علی بھٹو اس سے پوری طرح باخبر تھے۔ کیونکہ لاڑکانہ کے سرکاری دفاتر میں چپے چپے پر ان کے ہمدرد موجود تھے اور انھیں سول اور فوجی افسران کی دوعملی انتظامیہ اور دُہرے بندوبست کی اندرونی کھٹ پٹ اور اختلافی سوچوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ ان حالات سے مسلسل آگاہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قاعدے قانون کی طرف میرے جھکاؤ کو پسند کرنے لگے۔ گو اس کا زبانی اظہار کبھی نہ ہوا اور نہ ہی اُس زمانے کے پابند آداب پروٹوکول میں اس کی گنجائش تھی۔ مجھے پہلی دفعہ یہ احساس تب ہوا جب صدر یحییٰ نے اچانک ون یونٹ (one unit) کے خاتمے کا اعلان کر کے سابق صوبوں کو بحال کر دیا اور اپنے اپنے صوبے کو مراجعت کے عمل میں میرا تبادلہ صوبہ پنجاب میں ہو گیا۔

تب ذوالفقار علی بھٹو نے چیف سیکریٹری افضل آغا سے کہا کہ میرا تبادلہ منسوخ کر کے مجھے لاڑکانہ میں ہی تعینات رکھا جائے۔ چیف سیکریٹری نے فون پر مجھ سے پوچھا تو میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان کی سفارش پر مجھے یہاں رکھا گیا تو میں لاڑکانہ میں رہنے والے صوبہ سندھ کے تین سیاسی ہاتھیوں کے مابین موجودہ توازن برقرار نہیں رکھ سکوں گا۔ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے انھوں نے بھٹو سے معذرت کر لی۔

روایتی پروٹوکول کے مطابق میں نے روانگی سے پہلے ضلع کے سرکردہ لوگوں کو الوداعی خطوط لکھے۔ چند دنوں تک ان کے جوابات آتے رہے۔ بھٹو صاحب کے جواب کا عکس یہاں شامل ہے۔ اسے خود ستائی نہ سمجھا جائے، بلکہ اس طرح لیا جائے کہ اس سے زیر نظر رپورتاژ کے مرکزی خیال (گورننس اور حُسنِ انتظام کی بتدریج تباہی) پر بہت روشنی پڑتی ہے۔

70, Clifton
Karachi-6

9th January 1970

My dear Masud,

In acknowledging the letter you wrote on January 3rd before leaving Larkana I would like to tell you candidly that I considered you to be one of the best Deputy Commissioners this district has had in its long and chequered history.

I was indeed sorry to learn from the Chief Secretary that the Governor wanted you to return to the Punjab before the dismemberment process is completed. I had met the Governor the previous evening. Had I known of his decision earlier I would have tried to prevail upon him to allow you to remain in our difficult district. However, now that you have left us not much can be done to retrieve the position. I wish you every success in your career which I believe will be a distinguished one.

Finally, I thank you for appreciating the co-operation you received from my friends and my party.

With best wishes,

Yours sincerely,

Zulfikar Ali Bhutto

(Zulfikar Ali Bhutto)
H.Pk.

Mr. Masud Mufti, TQA, CSP,
Deputy Commissioner,
LAHORE.

ذوالفقار علی بھٹو کے جوابی خط کا عکس۔

میں نے ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور کا چارج جنوری ۱۹۷۰ء کے شروع میں لیا، تو تین چار روز بعد اپنی بیالیسویں سالگرہ پر ذوالفقار علی بھٹو نے کراچی سے الیکشن کی مہم کا آغاز کیا۔ فوراً ہی یہ خبر ملک بھر میں پھیل گئی اور لاہور پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم کا مرکز بن گیا۔ جس کی وجہ سے میرا اور بھٹو صاحب کا وہی سرکاری تعلق قائم رہا، جس کی ابتدا لاڑکانہ میں ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے تین نگران فوجی افسران الیکشن کی وجہ سے بہت متحرک تھے اور غیر جانبداری کے دعووں سے اپنی جانبداری کو چھپاتے رہتے تھے۔ غیر جانبداری کا برملا اعلان تو یہ تھا کہ سب پارٹیاں الیکشن میں حصہ لیں، مگر جانبداری کی پوشیدہ کوشش یہ تھی کہ ہر سیاسی پارٹی کا قد اتنا ہی رہے، جتنا فوجی حکومت چاہتی ہے۔ اس کے برعکس نومولود پیپلز پارٹی کے قد کاٹھ کو بڑھانے کے لیے ذوالفقار علی بھٹو ان سے کہیں زیادہ متحرک تھے۔ علاوہ ازیں، کچھ اور بھی تھا کہ سارا ماحول ہمارے قومی منافقانہ رویوں کی وجہ سے بوجھل تھا، جو اصولوں کے نام پر ہر بے اصولی کو جائز بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ، اس دوعملی اور منافقانہ بے راہ روی میں سویلین انتظامیہ کو پھونک پھونک کر قدم اُٹھانے پڑتے تھے اور قانون کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ حالات کی بے چین حرکت اور رفتار شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کے بعد اب گرد باد کی طرح گھوم رہی تھی۔ ایسے میں ہمیں کبھی فوجی نگرانوں سے تحمل کی درخواست کرنا پڑتی تھی اور کبھی کسی سیاسی مہم جُو کو دھیمے پن پر آمادہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے بھٹو سے لاڑکانہ والا تعلق بار آور ثابت ہوتا رہا۔

۱۹۷۰ء کا سال الیکشن کا سال تھا۔ پھیکے پکوانوں والی اونچی دکانوں کا سال۔ خالی دعووں اور کھوکھلے وعدوں کا سال۔ ڈھکی چھپی بری نیت کو رنگ برنگے خوش نما پیکٹ میں پیش کرنے کا سال۔ شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کے پہلے اعلان کا سال۔ پھر اس کے مسلسل پرچار کا سال۔ اس پرچار کو دھمکیوں میں بدلنے کا سال اور ان نکات پر صدر یحییٰ کی معنی خیز خاموشی کا سال۔ جس کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمان نے اس الیکشن کو "علیحدگی کا ریفرنڈم" قرار دے دیا۔ اس سال کی مکمل تفصیلات آپ بیتی کا جھومر تو بن سکتی ہیں لیکن زیرِ نظر رپورتاژ کی حد سے باہر ہیں۔ یہاں صرف فوجی حکومت اور سیاسی پارٹیوں کی آنکھ مچولی اور سویلین انتظامیہ کی مشکلات کا اندازہ دینا مقصود ہے۔ جسے ریاست کے ملازم کی بجائے حکومت کی لونڈی بنانے کی کوشش ہو رہی تھی (اور لونڈی بھی ایسی جو عسکری فاتح کو مالِ غنیمت کے طور پر ملی ہو)۔ اس لیے مشتے از خروارے کے طور پر صرف ایک مثال کافی ہے۔

۱۹۷۰ء کا پورا سال ہی ایک گردشی دور تھا۔ جس میں ملکی سالمیت پر کئی قسم کے منفی چھینٹے

پڑنے شروع ہو گئے۔ حاکموں کی نیت پر شکوک کے چھینٹے، سیاست دانوں کی تقریروں میں طعن و تشنیع کے چھینٹے۔ علاقائی مطالبات میں نفرتوں کے چھینٹے۔ چھ نکات میں دوئی کے چھینٹے اور عوام کی امیدوں پر مایوسیوں کے چھینٹے۔ ایسی مسموم فضا میں مشرقی پاکستان کے جسٹس عبدالستار کی سربراہی میں الیکشن کمیشن قائم ہوا۔ جس نے اگست تک مشرقی پاکستان میں تین کروڑ دس لاکھ اور مغربی پاکستان میں دو کروڑ پچاس لاکھ ووٹ ڈالنے والوں کی فہرستیں تیار کر لیں۔ اکتوبر میں الیکشن کا پروگرام بنا۔ مگر ستمبر میں مشرقی پاکستان کے قیامت خیز طوفان کی وجہ سے التوا کے بعد ۷/ دسمبر ۱۹۷۰ء کو الیکشن ہو گئے اور جب جنوری ۱۹۷۱ء میں صدر یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں پریس کے سامنے شیخ مجیب الرحمان کو "وزیراعظم پاکستان" کہا تو یوں لگا گردشِ ایام تھم گئی ہے۔ موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ مطلع صاف ہے۔ ہلکی ہلکی گرم آغوش جیسی دھوپ بھی ہے اور بادِ صبا کے فرحت بخش جھونکے بھی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور سمیت پانچ اضلاع سے الیکشن لڑا۔ مغربی پاکستان میں بھٹو کو ۸۱/ نشستیں ملیں اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب کو اس سے دگنی ۱۶۰/ نشستوں پر کامیابی ہوئی۔ چنانچہ ملک کے دونوں بازوؤں میں دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی فتح کے جشن منائے۔

ڈھاکہ والا جشن تو میں نے نہیں دیکھا، مگر لاہور والا دیکھا تو ایسا کہ انسان کبھی بھول نہ سکے۔ اتوار کی چھٹی والے دن صبح کی ٹرین سے بھٹو لاہور پہنچ رہے تھے۔ مگر ہفتے کی شام سے ہی لوگ ریلوے اسٹیشن کی چھتوں، چھجوں، پرنالوں یا کسی بھی نکلنے والی چند انچ کی جگہ پر قابض ہونے لگے۔ پو پھٹتے ہی ریلوے اسٹیشن کی عمارت گڑ کی اس بھیلی کی طرح نظر سے غائب ہو چکی تھی جو چیونٹیوں کی یلغار اور تہ در تہ قیام کے نیچے چھپ جاتی ہے۔ جدھر نظر جاتی، اُوپر، نیچے، درمیان، لوگ ہی لوگ نظر آتے۔ نعروں کا والہانہ جوش اور اس شدت سے جیسے ان لوگوں کو اُسی دم روٹی کپڑے اور مکان کی تقسیم شروع ہونے والی ہے۔ جلوس کو ریلوے اسٹیشن سے سرکلر روڈ کے راستے داتا دربار پہنچنا تھا۔ پھر کربلا گامے شاہ سے گزر کر گول باغ میں ختم ہونا تھا۔ پیپلز پارٹی کے منتظمین سے یہ روٹ (route) طویل مذاکرات کے بعد طے ہوا تھا، جس میں ہماری طرف سے اصرار تھا کہ پرانی انتظامی روایت کے مطابق کوئی جلوس گول باغ سے آگے مال روڈ پر نہیں جاتا اور طویل ماضی کی یہ روایت اب بھی قائم رکھی جائے گی۔

صبح صبح سارے علاقے کا دورہ کر کے میں ضلع کچہری میں اپنے دفتر جا بیٹھا۔ جہاں وائرلیس کے ذریعے ڈیوٹی پر مامور تمام پولیس افسران کی گفتگو ہر دم سن سکتا تھا۔ سارے راستے پر لوگوں کا ایسا

ہجوم تھا کہ زمین پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور چھتوں، منڈیروں، بالکونیوں، کھڑکیوں پر بے شمار لوگوں کو جیسے گوند سے اوپر تلے ایسے چپکا دیا گیا تھا کہ جالا تاننے والی مکڑی کو اپنے پہلے تار سے لٹکنے کی بھی جگہ نہ مل سکے۔

اس دن کا طلوع بخیر ہوا۔ ٹرین بھی معمولی تاخیر سے پہنچ گئی اور جلوس کا ریلا سرکلر روڈ کی طرف بہنے لگا۔ پولیس کا نظم وضبط بے مثال تھا۔ اسی لیے جلوس پُرامن طریقے سے رواں تھا، مگر ایسی مریل رفتار اور آہستگی کے ساتھ کہ کچھوا بھی مذاق اُڑائے۔

اچانک وائرلیس پر پولیس کے پیغاموں میں کھلبلی مچ گئی۔ کیونکہ بھٹو نے اعلان کر دیا تھا کہ فتح کا یہ جلوس گول باغ میں ختم نہیں ہوگا، بلکہ مال روڈ سے گزر کر گورنر ہاؤس کے سامنے اختتام پذیر ہوگا۔

میں تو چونکا ہی تھا مگر میرے دو تین فون بھی بار بار چلانے لگ گئے۔ گھنٹی کے بعد گھنٹی، ضلع ڈویژن اور صوبائی سطح کے نگران فوجی افسران غصے سے بے حال تھے۔ انھیں روکو... دفعہ ۱۴۴ لگاؤ... لاٹھی چارج کرو... گیس پھینکو... فائر بریگیڈ سے پانی پھینکو وغیرہ وغیرہ۔ میں بار بار کہتا رہا کہ اتنے بڑے انسانی سیلاب کو روکنا ممکن ہی نہیں۔ میری عائد کردہ دفعہ ۱۴۴، پولیس کی ہر کوشش، گیس گولی حتیٰ کہ فوجی دستے بھی اسی طوفان میں تنکوں کی طرح غرق ہو جائیں گے۔ شاید نادر شاہ کا قتل عام ہی انھیں روک سکے۔ مگر اس وقت مارشل لا پورے جلال میں تھا اور وہ میری کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔

آہستہ... بہت ہی آہستہ... رفتار سے جلوس آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر میرے لیے تو وقت تیزی سے اُڑنے لگا کہ کیا کیا جائے۔

میرے افسرانِ بالا بھی اتنے ہی بے بس تھے جتنا میں تھا۔ یا ہجوم کا سامنا کرنے والے گنتی کے پولیس والے تھے جو اپنی بھاری مگر منتشر نفری کے باوجود اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح تھے۔ مگر اصل حاکموں کا اصرار تھا کہ جلوس کسی حالت میں گول باغ سے آگے نہیں جائے گا اور ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے آپ کی روکنے کی تیاری مکمل ہو جانی چاہیے۔

قانون کی یہ بے بسی تھی کہ سول انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج کو بھی طلب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ مارشل لا کا زمانہ تھا۔ مگر مارشل لا والے خود سامنے نہیں آنا چاہتے تھے یا شاید وہ حالات کا رُخ کسی اور طرف موڑنا چاہتے تھے، مگر ہمیں نہیں بتانا چاہتے تھے۔ یہ نئی قسم کا فٹ بال کا کھیل جو تھا۔

بالآخر میں نے ہوم سیکریٹری اور کمشنر کو فون پر کہا کہ نہ معلوم حالات کیا رُخ اختیار کریں گے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ میں خود جا کر بھٹو صاحب سے درخواست کروں۔ مگر شاید ہمارے نگران فوجی افسران کسی بگڑی صورتِ حال میں میرے وہاں جانے پر اعتراض کریں۔ اس لیے میں آپ کی اجازت چاہتا ہوں۔

اجازت مل گئی تو میں نے وائرلیس کے رابطے سے معلوم کر لیا کہ بھٹو کا ٹرک اس وقت سرکلر روڈ پر شاہ عالمی گیٹ کے قریب کھڑا ہے۔ اپنی گاڑی کے وائرلیس کی مدد سے میں ہجوم کے کنارے تک تو پہنچ گیا۔ مگر اس کے بعد پولیس کے توسط سے میرا دوسرا سفر شروع ہوا اور میں کبھی پیدل، کبھی چار پانچ افراد کے بازوؤں میں اور کبھی ان کے کندھوں پر سے اُچھلتا کودتا آگے بڑھتا گیا۔ پندرہ بیس منٹ کی تگ و دو کے بعد میں موقع پر پہنچ گیا۔ کئی ہاتھوں اور کندھوں نے مجھے ٹرک کی پچھلی طرف اُچھالا اور میں گرتا پڑتا لڑھکتا ڈولتا ٹرک کے اندر کود گیا۔

ٹرک کے اگلے حصے میں بھٹو ہاتھ ہلا کر ہجوم کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ اطراف میں ڈاکٹر مبشر حسن، حنیف رامے اور ملک معراج خالد وغیرہ تین چار افراد کھڑے تھے۔ میری طرف ان کی پشت تھی اس لیے یہ میری نقب زنی سے بے خبر ہی رہے۔ آگے جا کر میں بھی ان کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔

ایک کے بعد دوسری، تیسری چوتھی حیرت میں ڈوبی، اچنبھے سے ترچھی اور سوالوں سے لدی ہوئی نظریں مجھے دیکھنے لگ گئیں۔ مگر میں خاموش کھڑا رہا۔ اچانک بھٹو کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ تیزی سے پلٹ کر پوچھنے لگے "What are you doing here?" (آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟)۔ لہجے میں ناگواری غالب تھی۔

تب میں نے آگے بڑھ کر انھیں لاہور انتظامیہ کی دیرینہ روایت سے آگاہ کیا کہ ہمیشہ تمام جلوس گول باغ میں ختم ہو جاتے ہیں اور مال روڈ پر جانے سے اس لیے گریز کیا جاتا ہے کہ توڑ پھوڑ یا لاتعداد قدموں کی پامالی سے اس سڑک کا روایتی حُسن تباہ نہ ہو جائے۔ تحریکِ پاکستان کے سات برسوں میں بھی یہ روایت قائم رہی اور اس دفعہ بھی اس جلوس کے لیے حنیف رامے سے یہی طے پایا تھا۔

وہ بڑے تحمل سے میری بات سنتے رہے۔ پھر اپنے مخصوص لیڈرانہ انداز میں دونوں ہاتھ ہجوم کی طرف پھیلا کر بولے، ''یہ میرا یا حنیف رامے کا فیصلہ نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام عوام کی خواہش ہے اور میں عوام کی خواہش کے خلاف نہیں جا سکتا۔''

دو چار منٹ کی گفتگو کے دوران میرے اصرار میں التجا بڑھتی گئی اور ان کے انکار میں یہ تلخی

اُبھرتی گئی۔ وہ اس دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے۔ چاہے وہ انتظامیہ کی طرف سے ہو یا مارشل لا کے افسران کی طرف سے ہو۔ دریں اثنا وہ بار بار ہجوم کی طرف اشارے کر کے عوامی فیصلے کا حوالہ دیتے رہے اور بالآخر جب انھوں نے زیادہ سختی سے انکار کیا تو میں مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

ٹرک کے اگلے حصے میں وہ سب جلوس کی طرف متوجہ تھے۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں اکیلا کھڑا میں پریشانی میں ڈوبا تھا کہ اب کیا کروں۔ جب کچھ نہ سوجھا تو واپسی کا ارادہ کر کے میں بھٹو صاحب کے پاس گیا اور اجازت چاہی۔ اب کے انھوں نے الوداعی انداز میں خوش خلقی سے سر ہلایا تو میں نے کہا، ''سر! آج آپ یہ پرانی روایت توڑ رہے ہیں۔ کل کو آپ کی حکومت آنے والی ہے۔ اگر اس وقت آپ ہمیں حکم دیں گے کہ اس روایت کو پھر سے دوبارہ زندہ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرانا ہمارے لیے ممکن نہ ہوگا۔''

ذوالفقار علی بھٹو نے گھور کر مجھے دیکھا... چند ثانیے گھورتے رہے... پھر ٹرک کے فرش پر نظریں گاڑ دیں... اور جب دوبارہ اُٹھائیں تو مجھے کہنے لگے "OK! We will go only upto Gol Bagh." (ٹھیک ہے ہم صرف گول باغ تک جائیں گے۔)

میں بظاہر تو خاموش کھڑا رہا۔ مگر میرے اندر طمانیت کی پھوار پڑنے لگی... اور میں تب تک کھڑا رہا جب انھوں نے جلوس کو مخاطب کر کے یہ اعلان کر دیا کہ جلوس کی سست رفتاری کی وجہ سے ہم بمشکل شام تک گول باغ پہنچ سکیں گے۔ اس لیے یہ جلوس اب گول باغ میں ہی ختم کر دیا جائے گا۔

ٹرک کے پچھلے حصے سے میں نے ہجوم میں چھلانگ لگائی تو جسم پر کئی خراشوں کے باوجود مجھے ایسی راحت ملی جیسے کوئی سوئمنگ پول (swiming pool) کے اسپرنگ بورڈ (spring board) سے کود کر نیچے ٹھنڈے پانی کی مچھلی بن جاتا ہے۔

ہمارے فوجی نگرانوں کا ردِعمل کچھ اس قسم کا تھا کہ بھٹو کی کیا مجال تھی جو ہمارے حکم سے انکار کرتا... آنے والے چند ماہ میں یہی زعم انھیں مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی میں لے ڈوبا۔ بھٹو نے بھی اسی زعم میں گول باغ کے متعلق اپنا فیصلہ بدلا تھا کہ ان کی حکومت کے قائم ہونے میں کوئی دیر نہیں، مگر اُس وقت اپنے اپنے زعم میں مبتلا لوگوں کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس نرالے کھیل کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

پبلک اور پریس کے سامنے شیخ مجیب الرحمان کو ''وزیرِ اعظم پاکستان'' کہنے کے بعد صدر یحییٰ انتقالِ اقتدار میں بہت لیت و لعل سے کام لینے لگے کیونکہ کسی بھی اگلے قدم سے پہلے وہ اپنی آئندہ صدارت کی یقین دہانی چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ملکی وحدت کے فٹ بال کو اپنے دونوں پاؤں پر

نچانے لگے۔

دریں اثنا مجھے امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے بلاوا آ گیا۔ جہاں اعلیٰ تعلیم کے ایک کورس کے لیے میرا کچھ عرصہ پہلے چناؤ ہوا تھا۔

صدر یحییٰ کو جب صدارت کے اکیلے گول میں بال پھینکنے میں مشکل پڑنے لگی۔ تو ۲۵ / مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں فوجی ایکشن میں قیامت برپا کر دی اور بھرپور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ملک میں ہر شے اتھل پتھل ہونے لگی۔ ملک کے دونوں حصوں میں ہزار میل کے فاصلے کو بڑی کڑی سینسر شپ (censorship) نے اور بھی بڑھا دیا۔ مغربی پاکستان میں کسی کو اندازہ ہی نہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن سرکاری ذرائع ابلاغ ''سب اچھا ہے'' کی گردان کر رہے تھے۔

ایک دن مجھے اچانک آرڈر ملے کہ میرا تبادلہ مشرقی پاکستان میں کر دیا گیا ہے۔

تبادلہ تو اچانک تھا۔ مگر مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی... کیونکہ میں عرصے سے اپنے نگران فوجی افسروں کی نظریں پہچان رہا تھا۔

ویسے تو میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ مجھے وطن کے مشرقی بازو میں تعیناتی کا موقع ملے لیکن اب ع

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں (غالب)

امریکہ جانے کی بجائے میں ڈھاکہ پہنچ گیا اور نرالے میچ کے حیران کن کھیل کے میدان میں بلامقصد اِدھر اُدھر دوڑنے پر مامور ہوا۔ کیونکہ بال تو صرف تین فارورڈ (forward) کھیلنے والے کھلاڑیوں کے مابین رہتی تھی۔ باقی بھاگ دوڑ محض دکھاوا تھی۔

ملکی سالمیت کے فٹ بال سے جس نرالے کھیل کا آغاز دکھانے کے لیے مشیت مجھے لاڑکانہ لے گئی تھی، اب اس کا انجام دکھانے کے لیے مجھے کھیل کے میدان میں ڈھاکا لے گئی۔ لیکن چونکہ اس کھیل کی اوٹ میں بہت کچھ اور بھی ہو رہا تھا اس لیے سویلین بیوروکریسی کو شرکت کی اتنی ہی اجازت تھی جتنی گراؤنڈ کی بیرونی حدود پر دوڑنے والے جھنڈی برداروں کی ہوتی ہے کہ وہ قریب ترین بیرونی پوزیشن سے دیکھ تو بہت کچھ سکتے ہیں مگر گراؤنڈ کی حدود کے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔

اسی بھاگ دوڑ کے دوران میں نے بہت کچھ دیکھا، مگر اس کا یہاں ذکر نہیں ہوگا، کیونکہ میں بدلتے وقتوں کی چال کے مطابق یہ سب کچھ اپنی چار کتابوں میں بیان کر چکا ہوں[8] کہ بظاہر تو کھیل یہی تھا کہ پہلے بندوق بردار صدارت، پھر مصلحت آلود الیکشن۔ اس کے بعد اپنی مرضی کی آئین سازی اور بالآخر جنرل یحییٰ کی صدارت کا گول ہو جائے گا لیکن پس پردہ وہ پرانی سوچ بھی موجود تھی

جس کے تحت جنرل ایوب خان شروع سے ہی وطن کے دونوں حصوں میں دانستہ دوری پیدا کرتے رہے تھے۔[۹] کیونکہ مشرقی پاکستان کے سیاسی شعور کو اور ملکی امور میں مساوی شرکت کے مطالبے کو فوجی — وڈیرہ محور اپنے اقتدار اور ''میری مرضی'' کے لیے ایک خطرہ سمجھتا تھا۔ اب جنرل یحییٰ کی صدارت اس خطرے سے حقیقی طور پر دو چار ہونے لگی، تو اُن کی نیت کے کھوٹ نے اس نرالے کھیل کو خانہ جنگی میں بدل دیا اور پرانی سوچ کے تسلسل میں مشرقی پاکستان سے ہی جان چھڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ سازگار حالات پیدا کرنے کے لیے محبِ وطن بنگالیوں کو نظرانداز کر کے علیحدگی پسند بنگالیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور بالآخر ہندوستان سے مصنوعی جنگ کر کے بڑی عجلت میں دانستہ ہتھیار ڈال دیے گئے، تاکہ باقی ماندہ پاکستان میں فوجی آمر اور وڈیرہ محور کی حکومت قائم رہ جائے۔

یہی نقطۂ نظر میری چاروں[۱۰] کتابوں میں بکھرا ہوا ہے جو اُس زمانے میں لکھی گئیں جب حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ ۲۷ ؍ برس تک زیرِ زمین دفن تھی۔ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں بالآخر جب یہ رپورٹ جزوی طور پر شائع ہوئی[۱۱] تو اس کے مندرجات نے میرے نقطۂ نظر کی تصدیق کردی۔ اس ضمن میں اس رپورٹ کا یہ جملہ بہت برمحل ہے۔

دوست ممالک کے انتباہ کے باوجود جس بے حسی اور لاپروائی سے ہندوستانی خطرے کو دانستہ نظرانداز کیا گیا تھا، اس پر ہم حیرت میں ڈوبے رہ جاتے ہیں۔ شاید وہ فوجی حکومت کی اصل نیت کا غماز تھا کہ اگر مشرقی پاکستان مستقل طور پر اطاعت گزار نہیں بنتا تو بہتر یہی ہے کہ ہم خود ہی اس صوبے سے نجات حاصل کرلیں، تاکہ پھر مغربی پاکستان کے تن آسان سیاستدانوں پر ہماری حکومت جاری رہ سکے۔[۱۲]

ملکی سالمیت کے فٹ بال سے کھیلا جانے والا یہ کھیل ایک نرالا کھیل تھا۔ اس لیے مشیت نے بھی اس نرالے انجام تک ہی پہنچا دیا۔ جس میں ہار صرف پاکستانی قوم کی ہوئی اور جیت اس طرح بٹ گئی کہ تینوں کھلاڑی لیڈروں نے اسے اپنی اپنی جیت سمجھا۔ جنرل یحییٰ کی جیت یہ تھی کہ انھوں نے حسبِ ارادہ ملک کے بلند بانگ نکتہ داں اکثریتی حصے کو علیحدہ کردیا لیکن گھر میں نظربندی کی وجہ سے ہارنے والوں کے غیظ و غضب سے بھی بچے رہے۔ باقی دو کھلاڑی اپنی اپنی جیت کے مالِ غنیمت پر خود تو بادشاہ بن گئے لیکن رعایا پہلے سے بھی زیادہ خسارے میں رہی، مگر یہ تو صرف کھیل کا انجام تھا۔ کھلاڑیوں کا انجام نہیں تھا۔ اس لیے مشیت نے ان کے حصے کے مطابق تینوں کی رسّی دراز کردی اور بالآخر یہ تینوں کھلاڑی ناشاد اور ناامید ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

مجھے مشیت نے پہلے تو بڑے نامساعد حالات میں ہندوستان جیسے دشمن کی قید میں ڈال دیا۔

تاکہ دو برس تک یکسوئی سے وطن بیتی پر غور کرسکوں۔ پھر عینی شاہد کے طور پر مجھے اپنی گواہی رقم کرنے کی توفیق دے دی۔

جنوری ۱۹۷۴ء میں دشمن کی قید سے رہا ہو کر جب میں لاہور پہنچا تو ۱۹۷۱ء میں میری روانگی کے وقت تین ماہ کا بچہ اب تین برس کا تھا۔ میں چند روز تک اس سے مانوس ہونے کی ناکام کوشش کرتا رہا تو ایک دن اس نے احتجاج کر ڈالا اور پوچھنے لگا، ''امّی! یہ مہمان اپنے گھر کب واپس جائیں گے؟''

معصوم بچے کے یہ الفاظ دراصل میرے لیے مشیت کا ایک علامتی انتباہ تھا۔ جس طرح میں اپنے گھر میں اپنے ہی بچے کے لیے اجنبی بن گیا تھا۔ اسی طرح میں اپنے ہی وطن میں اپنی ہی ملازمت کے نئے تقاضوں کے لیے بھی اجنبی بن چکا تھا۔ جہاں میری پرانی تربیت اب قابلِ قبول نہ تھی۔ اس ٹریننگ میں ہمیں پہلے ہی دن سکھایا گیا تھا کہ آپ صرف غیرجانبداری اور انصاف سے ثابت کرسکتے ہیں کہ آپ واقعی اعلیٰ ملازمت کے حقدار ہیں[۱۳] اور علاء الدین صاحب کو اپنا عملی نمونہ بنا کر نیک نامی حاصل کرسکتے ہیں۔[۱۴] نئی اصلاحات سے یہ پرانی تربیت کالعدم قرار دی گئی تھی۔

اُس وقت ذوالفقار علی بھٹو چند ماہ تک سویلین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر[۱۵] اور صدر رہنے کے بعد نیا آئین بنا کر وزیرِاعظم پاکستان بن چکے تھے۔[۱۶] اس کے علاوہ تیرہ سو سرکاری ملازمین کی فوری برطرفی[۱۷] کے بعد بیوروکریسی پر اپنی دانست میں انقلابی اصلاحات مسلط کرچکے تھے۔[۱۸] میں نے واپس آتے ہی چہار سُو اُڑتی ہوئی یہ خبر سنی تھی کہ یہ اصلاحات نافذ کرنے سے چند روز قبل بھٹو صاحب کے بہت معتمد وزیر نے سرکاری افسروں سے خطاب کے دوران کہا تھا:

آپ لوگ ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلتے اور سیاستدانوں کی خواہشات کو غیرقانونی کہہ کر رد کردیتے ہیں۔ کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا اقتدار عارضی ہے اور آپ لوگوں کی ملازمت مستقل ہے۔ اس لیے اب ہم ایسی اصلاحات نافذ کرنے لگے ہیں جو آپ لوگوں کی مستقل ملازمت کو ہمارے عارضی عہدے سے بھی زیادہ عارضی بنا دے گی۔

میں نے یہ بھی سنا کہ ۱۹۷۳ء میں باقی ماندہ پاکستان لگاتار بارشوں کے بعد ہلاکت خیز طوفان کی زد میں تھا۔ جب اعلان ہوا کہ ۲۰ ؍ اگست کو وزیرِاعظم ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کریں گے، عام خیال یہی تھا کہ وہ سیلاب زدگان کے لیے حکومت کی طرف سے مراعات کا اعلان کریں گے لیکن خطاب شروع ہوا تو ہر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حجم سے ایک نیا سیلاب اُمنڈ کر باہر آنے لگا۔ یہ بیوروکریسی کے لیے انقلابی اصلاحات کے اعلان کا سیلاب تھا۔ ایک بالکل مختلف

قسم کا سیلاب جس میں تب سے اب تک پاکستانی قوم مسلسل ڈبکیاں اور غوطے کھاتی رہی ہے۔

ایک صدی پرانی بیوروکریسی کی قانونی کارکردگی کے گرد آئینی تحفظات کا جو حصار نو آبادیاتی دور سے قائم تھا، اس میں پہلے چند سوراخ صدر ایوب کی اصلاحات نے کیے۔ مزید توڑ پھوڑ صدر یحییٰ کی اصلاحات نے کی اور اب ذوالفقار علی بھٹو کی انتظامی اصلاحات نے وہ حفاظتی حصار ہی تہس نہس کر دیا، جس سے ایک مسلسل سیلاب کا راستہ کھل گیا۔ برسات کے سیلابوں میں پانچ دریاؤں کے سنگم ''پنج ند'' پر اتھاہ سیلاب کی طرح یہ ''تین ند'' کا ہولناک سیلاب تھا۔ جس کی سیلابی سطح آج قریباً نصف صدی (۴۳ برس) کے بعد بھی کم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس سیلاب کا منبع وہ چھوٹا سا چشمہ تھا جو ۱۹۵۴ء میں لندن کے ہوٹل کے ایک کمرے میں جنرل ایوب خان کی سوچ اور قلم سے پھوٹا تھا کہ ''میری مرضی'' چلانے کے لیے سرکاری ملازمین کے طرزِ عمل کے قوانین بدل دینے چاہییں۔[۱۹]

اس سیلاب کی تباہ کاری کی نوعیت سمجھنے کے لیے ہمیں آئینی تحفظات کے اس حصار کا جائزہ لینا ہوگا جو بیوروکریسی کو حسنِ انتظام کے ذریعے شہریوں کی بہبود و ترقی اور آرام و آسائش کا ضامن بناتا تھا۔ ریاست کے تمام ملازمین آئینی طور پر پابند ہوتے تھے کہ وہ ہمیشہ بلاخوف و خطر پوری غیر جانبداری سے قانون اور قواعد کا نفاذ کریں گے اور بااثر عناصر کے دباؤ میں نہیں آئیں گے۔ اس طرح وہ قانون کی بالادستی قائم رکھ سکتے تھے۔ اپنی کارکردگی کی وجہ سے اگر کوئی طاقتور عنصر انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا (یا حکومت کسی وجہ سے تادیبی کارروائی کرنا چاہتی) تو اس کے خلاف کسی بھی کارروائی کا صرف ایک طریق کار تھا، جس میں اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیا جاتا تھا۔ قصور ثابت ہونے کی صورت میں اسے سزا دینے کا اختیار بھی اسی منصب دار (authority) کے پاس تھا، جو اس کی تقرری کرتا تھا۔[۲۰] سرکاری ملازم کی اصل مضبوطی یہ تھی کہ وہ دائمی ریاست اور اس کے زیرِ کار آئین کا ملازم ہوتا تھا اور عارضی دور والی حکومت کا فرض ہوتا تھا کہ وہ ریاست اور ملازم کے مابین اس مقدس رشتے کا احترام کرے۔

''تین ند'' کی انتظامی ''اصلاحات'' کے سیلاب میں یہ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ سرکاری ملازم کا آئینی حفاظتی حصار توڑ دیا گیا اور بااثر عناصر اسے ہراساں کرنے کے قابل ہو گئے۔ عارضی حکومت نے دائمی ریاست کی تقدیس یوں غصب کر لی کہ وہ ریاست کی بجائے اپنے آپ کو مضبوط کرنے لگی اور بیوروکریسی ریاست کی بجائے حکومت کی ملازم بنا دی گئی۔ اس کے فرائض یوں بدل دیے گئے کہ وہ قانون کی بالادستی کا نظریہ ترک کر دے۔ قانون کی تشریح حکومتِ وقت کی مصلحت کے مطابق کرے اور غیر جانبدار رہنے کی بجائے حکومت اور اس کے حاشیہ نشینوں کی

جانبداری کرے۔ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کا پرانا آئینی طریق کار منسوخ کر دیا گیا اور ملزم کو صفائی دینے کا حق حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا، تاکہ اسے چٹکی بجا کر فوراً ہی برطرف کیا جا سکے۔ اس سے پہلے صدر ایوب نے ۱۵۰۰، صدر یحییٰ نے ۳۰۰ اور صدر بھٹو نے ۱۳۰۰ سرکاری ملازمین برطرف کرنے کے لیے مارشل لاء کا سہارا لیا تھا، مگر آئندہ کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہ رہی اور اب نئی اصلاحات کے تحت ہر حکومت کو ہمہ وقت یہ اختیار مل گیا کہ جس کو جس وقت چاہیں برطرف کر دیں۔ اس کی وجہ سے سرکاری ملازم دوامی ریاست کا باعزت ملازم ہونے کی بجائے عارضی حکومتِ وقت کا بے بس نوکر چاکر بن گیا۔ چنانچہ پچھلے تمام قوانین منسوخ کر دیے گئے اور سرکاری ملازمین پر ۱۹۷۳ء کے قانون (Civil Servants Act 1973) کا اطلاق ہونے لگا۔

ان اصلاحات کے تحت سی ایس پی (CSP) سمیت مرکزی حکومت کی تمام اعلیٰ ملازمتیں (Superior Service) ختم کر دی گئیں اور ان کی بجائے پیشہ ورانہ گروپ اس طرح بنا دیے گئے کہ سی ایس پی (CSP) کو مکمل خاتمے کے بعد تین گروپوں میں بکھیر دیا گیا، مگر باقی گروپوں کا اندرونی ڈھانچہ حسبِ سابق رہا اور صرف ان کے بیرونی نام بدلے گئے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ ملازمتوں میں بغلی داخلے (lateral entry) کی ایک نئی اسکیم بنا دی گئی، جس کے تحت من پسند افراد کو اِدھر اُدھر سے اعلیٰ ملازمتوں میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ یہ اُسی بے اصولی کی توسیع تھی جس کے تحت دو سابقہ ڈکٹیٹروں نے مارشل لا کے زور پر فوجی افسروں کو سول سروس میں شامل کرنے کی رسم ڈالی تھی۔ چنانچہ، حکومت نے ایک نام نہاد امتحان کے بعد پیپلز پارٹی کے لاتعداد جیالوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا۔ اس کے علاوہ کئی جیالوں کو بغیر امتحان یا انٹرویو کے بھی اعلیٰ ملازمتیں دے دی گئیں۔[۲۱] اہم بات یہ تھی کہ پبلک سروس کمیشن اور دیگر ایسے اداروں کے اختیارات کم کر دیے گئے جو سرکاری ملازموں کا چناؤ اہلیت اور میرٹ (merit) کے لحاظ سے کرتے تھے۔

ان اصلاحات نے آئندہ کے لیے تمام سیاسی اور فوجی حکومتوں کے لیے یہ راستہ پوری طرح کھول دیا کہ وہ بلاتکلف اپنے کارکنوں یا چہیتے لوگوں کو بیوروکریسی کی ہر سطح میں شامل کرتے رہیں۔ اس طرح بیوروکریسی کا وہی درجہ بن گیا کہ غریب کی جورو سب کی بھابی۔

بھٹو صاحب کی دھماکہ خیز اصلاحات اچھی گورننس کے بنیادی اصولوں کے اس طرح پرخچے اُڑا رہی تھیں کہ ایک امریکن ادارے (American Institute of Pakistan Studies) نے پولیٹیکل سائنس کے ایک پروفیسر کو اس کا مفصل جائزہ لینے پر مامور کر دیا۔ یہ کام مکمل کر لینے کے بعد بھی وہ پاکستانی بیوروکریسی کے موضوع پر ریسرچ کرتے رہے اور بالآخر ۱۹۸۷ء میں ان کی

کتاب شائع ہوئی۔ اس کے چند جملے قابلِ توجہ ہیں:[۲۲] (انگریزی سے ترجمہ)

ان اصلاحات کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستانی بیوروکریسی بھٹو کی سیاسی گرفت میں آ جائے۔ اس سے پہلے ۱۹۷۲ء میں بھٹو نے سرکاری ملازموں کی بڑے پیمانے پر جو برطرفیاں کی تھیں ان کے ذریعے ایک واضح پیغام دیا جا چکا تھا کہ پیپلز پارٹی کی حمایت کرو، ورنہ کوئی اور ملازمت تلاش کرو۔ یہ پیغام اس وجہ سے بھی بہت گرج دار اور کڑوا بن گیا تھا کہ اصلاحات سے ایک دن پہلے مزید ۱۸؍ افسران برطرف کر دیے گئے۔ دوسری طرف بھٹو بیوروکریسی میں داخلے اور تعیناتی کے عمل کو بھی کنٹرول کرنے لگے۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اپنے سیاسی مفادات کو وسعت اور تحفظ دے سکیں۔ اسی لیے انھوں نے بغلی داخلے (lateral entry) کی نئی اسکیم بنادی اور ساتھ ہی پیشہ ورانہ گروپوں کے مابین باہمی تبادلوں کی اجازت دے دی۔... بھٹو کے ذہن کی ایک نئی اختراع یہ بھی تھی کہ ان اصلاحات میں پبلک سروس کمیشن کے بعض اختیارات اسٹیبلشمنٹ ڈویژن (Establishment Division) کو دے دیے گئے، تاکہ سرکاری ملازموں کی وہ خودمختاری ختم ہو جائے جو پبلک سروس کمیشن کی وجہ سے انھیں سیاسی مداخلت سے محفوظ رکھتی تھی۔... ان تینوں اقدام کا مجموعی نتیجہ یہی تھا کہ سرکاری ملازموں کی قانون کے مطابق فیصلے کرنے کی آزادی اور خودمختاری سلب ہوگئی اور بھٹو کا یہ سیاسی مقصد پورا ہو گیا کہ بیوروکریسی پر اس کی سیاسی گرفت مضبوط رہے۔ (ص: ۸۱ تا ۸۲)

اس کتاب کے دیباچہ نگار نے پروفیسر کینیڈی (Kennedy) کے ان مشاہدات کی طرف خاص توجہ دلائی ہے کہ بھٹو کی انتظامی اصلاحات کو تو معمولی کامیابی ملی، مگر پاکستانی بیوروکریسی اور حسنِ انتظام کو غیر معمولی نقصان ہوا۔ ان پر نمایاں منفی اثرات یہ تھے:

۱۔ ماضی کی غیر جانبدار اور منصف مزاج بیوروکریسی کا مزاج آئندہ کے لیے سرتا پا سیاسی جانبداری کی طرف مڑ گیا

۲۔ ملازمت میں عدم تحفظ کی وجہ سے سرکاری ملازم بالعموم اور اعلیٰ افسران بالخصوص اہم اور بڑے فیصلے کرنے سے کترانے لگے، تاکہ ان کے کسی ناپسندیدہ حکم پر ملازمت ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس لیے فیصلہ سازی درجہ بہ درجہ اوپر ہی اوپر اُٹھتی گئی اور

۳۔ ماضی کے برعکس اب ملک کے بہترین دماغ سول سروس میں جانے سے پرہیز کرنے لگے، جس سے ملک کی انتظامیہ بیوروکریسی اور حسنِ انتظام کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ (دیباچہ، ص: xviii اور xix)

ریاست کے اُوپر حکومت کو منڈھنے والی جس بدعت کی ابتدا پہلے فوجی مارشل لا میں ہوئی اس کی انتہا اب تیسرے سویلین مارشل لا میں ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے آنے والے تمام حاکموں کو

ریاست اور آئین میں نقب زنی کا پورا اختیار مل گیا۔ اور تمام حکومتوں نے ریاست کے سرکاری ملازمین کو اپنے سیاسی اور ذاتی مفادات کا چوکیدار بنا دیا۔

اس مرحلے پر میں ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر دوبارہ وطن کے چنار میں داخل ہوا تو چاروں طرف عجیب سی بو باس تھی، مگر انقلاب کے شور شرابے میں قوم کی قوتِ شامہ درہم برہم ہو چکی تھی۔

ایک ماہ کی چھٹی گزارنے کے بعد مجھے مرکزی حکومت میں تعینات کر دیا گیا لیکن بھٹو صاحب تک خبر پہنچی تو تین ہفتوں بعد مجھے اسٹیبلشمنٹ ڈویژن (Establishment Division) کی طرف سے فون آیا کہ مجھے راولپنڈی ڈویژن کا کمشنر مقرر کر دیا گیا ہے۔ میں اس دن لاہور میں تھا اور تب تک انقلابی انتظامی اصلاحات کے مفہوم اور مضمرات کو جان چکا تھا کہ آئندہ اضلاع اور ڈویژن کی انتظامیہ کے لیے سابقہ خوداعتمادی والی کارکردگی ممکن نہ ہوگی۔ اس لیے میں فوراً چیف سیکریٹری کے پاس چلا گیا اور درخواست کی کہ مجھے مرکزی حکومت میں ہی رہنے دیا جائے اور میری یہ گزارش اوپر پہنچا کر یہ آرڈر منسوخ کرا دیں۔

چیف سیکریٹری افضل آغا مسکرا کر خاموش ہو گئے... لیکن یہ بہت ہی معنی خیز مسکراہٹ تھی، جس کے معنی میں تب سمجھا جب وہیں بیٹھے ہوئے ایک سینئر افسر نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ تم تین برس بعد یہاں واپس آئے ہو اور تمھیں اندازہ نہیں کہ اب یہ ایک مختلف دنیا ہے جس میں سرکاری ملازم اب صفر سے بھی کم ہو کر منفی رہ گیا ہے۔ تمھارا یہ انکار تمھیں مرکزی حکومت کی بجائے گھر بھیج سکتا ہے۔

میں نے راولپنڈی میں چارج لیا تو بھٹو صاحب کی حکومت تقریباً اڑھائی برس پورے کر چکی تھی۔ دارالحکومت سے جڑواں شہر میں ہر طرف پارٹی کے کارکنوں کی ہماہمی تھی (جنھیں جیالے کہا جاتا تھا)۔ بالکل ویسی ہی جیسی پہلے اور دوسرے مارشل لا کے شروع میں فوجیوں کا بڑا بول ہوا کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے یہ جیالا لا (Jiala Law) کا زمانہ کہلا سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بیوروکریسی میں بغلی داخلے (lateral entry) کے بعد اسلام آباد سیکریٹریٹ کی راہداریوں میں بھی جیالوں کی سرکاری نمائش اور خودنمائی بڑی نمایاں تھی۔ یوں لگتا تھا بیوروکریسی کی سابقہ یک رنگی جسامت پر ایک نئے رنگ کی تہ کا اضافہ ہوا ہے۔ سادہ کیک پیسٹری کے اُوپر میٹھے آمیزے (icing) کی خوشنما تہ کی طرح۔

اسی قسم کی ایک تہ صدر ایوب اور صدر یحییٰ کے دور میں سویلین ملازمتوں پر فوجیوں کی تعیناتی سے چڑھائی گئی تھی۔ اب اس پر دوسری تہ کا اضافہ ہو گیا۔ جو پہلی کی نسبت زیادہ موٹی اور دبیز تھی۔

فرق یہ تھا کہ پہلی تہہ کی اضافی مراعات صرف فوج سے آنے والوں کے لیے تھیں۔ مگر دوسری تہہ کو جو اضافی مراعات دل کھول کر دی جانے لگیں وہ ایک شاہانہ عطا کے طور پر ساری بیوروکریسی کے لیے کھلا دسترخوان بنتی گئیں۔

میں اب شکست و ریخت کے ایک نئے عمل کا آغاز دیکھ رہا تھا۔ نوآبادیاتی دور میں سرکاری ملازموں کے جملہ طرزِ عمل کے بہت کڑے قواعد تھے[۲۳] جن کی وجہ سے سارے ملک کی بیوروکریسی کا ایک مکمل سراپا ہوتا تھا اور اُس کا سرتا پا ایک ہی یکساں رویہ ہوتا تھا۔ جیسے کسی ایک مذہب یا مسلک کے پیروکاروں کا مخصوص چلن ہوتا ہے۔ اپنے ملک گیر پھیلاؤ کی وجہ سے یہ رویہ معاشرے کے دیگر رویّوں کا سنگم بن جاتا تھا اور ساری سوسائٹی کو ثبات بخشتا تھا۔ ہمیں آزادی ملی تو پاکستان کے اوّلین سنہری دور میں سرکاری ملازموں کی یکساں وضع نے معاشرے کے صحت مند توازن کو برقرار رکھا اور پورا معاشرہ ایک ٹھوس پیکر کی طرح ترقی کی چال چلتا گیا۔ لیکن اب یہ بیوروکریسی یک جان اور یک رنگ نہیں رہی تھی، بلکہ تین تہوں میں بٹ چکی تھی۔ سب سے نیچے پرانی بیوروکریسی کی موٹی تہہ۔ اس سے اوپر فاتحانہ فوجی رویّوں کی دوسری تہہ اور سب سے اوپر انقلابی جیالوں کی تیسری تہہ اور حیف یہ تھا کہ ہر تہہ کا الگ چلن تھا اور مختلف رویّے تھے، جس سے بیوروکریسی کی ملک گیر یکسانیت میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہو گیا اور وضع دار رویّوں کا سنگم کمزور پڑنے لگا۔

یہ عمل شروع ہوا تو بیوروکریسی کے واحد انجن نے قوم کو یکسوئی سے کھینچنا چھوڑ دیا اور اس کی جگہ تین چھوٹے بڑے انجن ملک کی لمبی ٹرین کو تین مختلف انداز میں کھینچنے لگے۔ اس تقسیم کے بعد ماضی کے سنہری زمانے کے احیاء کی کوئی گنجائش یا اُمید باقی نہ رہی۔

اُن دنوں راولپنڈی ڈویژن میں چار اضلاع شامل تھے۔ کیمبلپور (موجودہ ضلع اٹک)، راولپنڈی، جہلم اور گجرات جو ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ میں ان مختلف علاقوں میں دورے پر جاتا اور مقامی حالات دیکھتا تو میرا ذہن خودبخود لاڑکانہ پہنچ جاتا۔ پھر میرے گھر یا ''المرتضیٰ'' کے ڈرائنگ روم میں بھٹکنے لگتا۔ وہ گفتگو اور بحث میرے ذہن میں گونجنے لگتی، جب بھٹو صاحب آئندہ انقلاب پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ ان کے دلائل اور تجزیے کی بصیرت اور پیش بینی مجھے کبھی مرعوب اور کبھی مبہوت کر دیتی تھی، لیکن اب ان دوروں میں جب میں چار مختلف علاقوں میں اس انقلاب کی عملی تفسیر کی مختلف شکلیں دیکھ رہا ہوتا (جس کا تیسرا اور چوتھا برس گزر رہا تھا) تو میری ساری مرعوبیت اتنی ہی مایوسی میں بدل جاتی، کیونکہ اس انقلاب کے قدموں کی آہٹ بھی ویسی ہی تھی، جیسی ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۹ء کے انقلابات کے قدموں کی چاپ تھی۔ اور انھی کی طرح عوام دوستی کے

دعووں کے باوجود عوام سے ہم قدم نہ تھی۔ ان دونوں کے عہد میں عوامی فلاح کی جگہ صرف فوجی فلاح لیتی گئی، مگر اس عہد میں وہ صرف شاہ پرستوں کی فلاح و بہبود کا روپ دھارنے لگی۔ چنانچہ وفادار جیالوں کے لیے بھی ایک سویلین وردی بنا دی گئی، جو شاہی لطف و اکرام سے مستفید ہونے والی برادری کا امتیازی نشان بنتی گئی۔

لاڑکانہ کی یادیں مجھے بتاتی تھیں کہ ذوالفقار علی بھٹو نے کارل مارکس (Karl Marx) کے انداز میں سوچا، اس جیسی جدوجہد کی اور بے زبان عوام کو آگہی اور آواز دینے میں بھی ویسی ہی ہمت دکھائی۔ مگر پوٹھوہار کے زمینی حقائق کی گواہی بتاتی تھی کہ کسی نہ کسی چیز کی کمی رہ گئی تھی، جو بھٹو کو کارل مارکس نہ بنا سکی۔ پھر دارالحکومت کی فضا میں مجھ پر دھیرے دھیرے کھلا کہ یہ خلوص اور نیک نیتی کی کمی تھی۔ کارل مارکس واقعی عوام کو زمین سے اُٹھا کر اقتدار میں لا رہا تھا لیکن ذوالفقار علی بھٹو عوام کو زمین سے اُٹھا کر خود تخت پر بیٹھ رہا تھا۔ روس میں عوام جاگ رہے تھے۔ پاکستان میں عوام استعمال ہو رہے تھے۔ روس میں واقعی عوامی انقلاب آیا تھا لیکن پاکستان کا عوامی انقلاب محض اس کی شاطرانہ نقالی تھی۔ جس طرح آج کل صوفی شاعری پر محض دھمال کی نقالی کو ہی صوفی ازم سمجھا جاتا ہے۔

سابقہ فوجی ادوار میں بیوروکریسی پٹی بھائیوں کی یک جہتی اور ان کے بلند درجات سے تو واقف ہو چکی تھی لیکن بھٹو کی انتظامی اصلاحات نے جب بیوروکریسی کی غیر جانبداری کا حفاظتی حصار توڑا تو اس کے بعد وہ ایک اور نئے تصور سے واقف ہونے لگی۔ یہ ''وفاداری بہ شرطِ استواری'' کے لازمی بندھن کا تصور تھا جو انھیں حکومتِ وقت کی جانبداری پر مجبور کرتا تھا، لیکن بالکل نیا تصور ہونے کی وجہ سے یہ واضح نہ تھا کہ سرکاری ملازموں سے وفاداری کی توقعات کس حد تک جاتی ہیں۔ نہ ہی کوئی یہ وضاحت کرنے پر آمادہ تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ حاکموں کے من کی موج تھی کہ وہ کس عمل کی کیا توضیح کرتے ہیں۔ اس ابہام کی وجہ سے نئی قسم کے مسائل ہر روز پیدا ہوتے تھے لیکن یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

عوامی انقلاب کا رنگ چوکھا کرنے کے لیے بھٹو صاحب نے ''کھلی کچہری'' رائج کی، جسے اخبارات نے یوں سراہا کہ یہ بے بس فریادی کو زنجیرِ عدل ہلانے کا موقع دیتی ہے۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ کسی بڑے میدان میں ایک دو فٹ اونچے اسٹیج پر وزیرِاعظم بیٹھ جاتے اور مقامی افسر (Field Officer) کے طور پر ڈویژن کا کمشنر ان کے ساتھ بیٹھ جاتا۔ چیف سیکریٹری اور دیگر افسران تھوڑے فاصلے پر اسٹیج کے سامنے بیٹھے ہوتے اور ان کے پیچھے کرسیوں اور بنچوں پر لوگ بیٹھ جاتے۔ حاضری

زیادہ ہوتی تو لوگ قریب کے درختوں پر بھی بیٹھے نظر آتے۔ پھر فریادوں اور شکایتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ہر شکایت پر پہلے کمشنر تبصرہ کر کے حاضرین کو جملہ کوائف سے آگاہ کرتا اور پھر وزیراعظم اپنا فیصلہ سنا دیتے۔

میرے علاقے میں دو تین دفعہ کھلی کچہری کا انعقاد ہوا۔ بعض شکایات غلط ہوتیں تو میں ان کی تردید کر دیتا لیکن کئی شکایات درست بھی ہوتی تھیں۔ اس لیے میں اُن کی تصدیق کرتے ہوئے بتاتا تھا کہ مقامی انتظامیہ اس شکایت کو دور کرنے کے لیے کیا اقدام کر رہی ہے اور تادم معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔ اس کے بعد وزیراعظم اپنا حکم صادر کر دیتے۔ میرے طریق کار کے متعلق وزیراعظم نے تو مجھے کچھ نہ کہا، مگر وزیراعظم کے مقربین کا جو ردعمل مجھ تک پہنچا وہ بالکل منفی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ پبلک کی شکایات کو درست کہنے والے افسر کی وفاداری مشکوک ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح وہ بالواسطہ حکومت کے مخالف عناصر کا ساتھ دیتا ہے۔ صحیح قسم کے وفادار سرکاری افسر کو اپنے دلائل سے ثابت کرنا چاہیے کہ ہر شکایت غلط ہے، تاکہ حکومت کی پالیسیاں اچھی ہونے کا تاثر پیدا ہو سکے۔

اس زمانے میں گورننس (governance) کا یہ تصور تیزی سے پروان چڑھنے لگا کہ عوام کی شکایت اور مسائل کا چرچا نہ کرو۔ جس طرزِ حکومت کی ابتدا صدر ایوب اور صدر یحییٰ نے پہلے تو اپنے وفاداروں پر دستِ شفقت سے کی پھر قوم کو خواص اور عوام میں بانٹ کر اسے مضبوط کیا۔ اب اسی طرزِ حکومت کا اگلا قدم خواص کا یہی تجاہل عارفانہ تھا اور دانستہ چشم پوشی تھی، جس کے نتیجے میں خواص عوام کے مسائل سے فخریہ آنکھیں پھیرنے لگے اور بیوروکریسی کو گھورنے لگے کہ وہ ان کے عائد کردہ نئے نظام کے مطابق کسی چوپائے کی طرح صرف دم ہلاتی رہے۔ اس کا عوامی مسائل حل کرنے سے کوئی سروکار نہیں، کیونکہ وہ برسرِاقتدار پارٹی اپنی ترجیحات اور مصلحتوں کے مطابق خود کرے گی۔

اس طرزِ حکومت کی وجہ سے اُس دورِ حکومت میں روٹی کپڑا مکان کے لیے ووٹ دینے والوں کو ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ امیر امیر تر ہوتا گیا اور غریب غریب تر۔

ذوالفقار علی بھٹو تو چلے گئے، مگر ان کے طرزِ حکومت کی یہ رسم ایسی عام ہوئی کہ ان کے بعد آنے والی تمام حکومتوں کی عادت بنتی گئی۔ پیپلز پارٹی کی ستم ظریفی یہ تھی کہ عوام کو جگانے والی پیپلز پارٹی نے ہی ایسا طرزِ حکومت پروان چڑھایا، جس میں عوام حاکموں کی نظر سے اوجھل ہوتے گئے۔

شاہ کے مصاحب شاہ کے قریب تو نہیں ہوتے، مگر ان کا ذوقِ حضوری انھیں بادشاہ کا مزاج شناس ضرور بنا دیتا ہے۔ میں ان مصاحبوں سے وزیراعظم کی باتیں سنتا اور انھیں اپنے مشاہدات سے ملاتا تو میرے اندر ایک کرب ناک سوچ رینگنے لگتی کہ راولپنڈی کے ایوانِ اقتدار کو رونق بخشنے

والی شخصیت وہ بیدار مغز اور روشن خیال شخصیت نہیں ہے جس سے میں لاڑکانہ میں ملا تھا۔

اقتدار کے متلاشی بھٹو اور اقتدار پر براجمان بھٹو میں بہت فرق تھا۔

اُس وقت تو سمجھنا مشکل تھا لیکن آج میری طویل پس نظری اور وطن کے مینار کا موجودہ کوجہ پن[۲۴] مجھے سمجھا چکا ہے کہ بے اختیار بھٹو اور بااختیار بھٹو میں کیا فرق تھا... یہ وہی فرق تھا جو تعلیم اور تربیت کے درمیان ہمیشہ سے ہے۔ بیرونِ خانہ ظاہر اور درونِ در باطن میں ہے۔ مکتب کی تدریجی فراست اور زندگی کی اوّلین سرایت میں ہے۔ ذہن کے علمی وصل اور ذات کی اندرونی اصل میں ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی تعلیم اوکسفرڈ یونیورسٹی میں ہوئی، مگر تربیت سندھ کی جاگیرداری میں ہوئی۔ ان کے استدلال کو جدید علوم نے تراشا، مگر اقتدار کو قدیم فیوڈل ازم نے ڈھالا تھا۔ چنانچہ استدلال ان کی گفتگو سے ٹپکتا تھا اور اقتدار ان کے اقتدار سے جھانکتی تھیں۔

وہ دو متضاد مگر جڑواں حصوں کے واحد شخصی پیکر تھے لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ مجموعی طور پر ان کی وسیع بھرپور اور روشن شخصیت کسی طور بھی گرہن زدہ نہ لگتی تھی۔ ان میں ہر ماحول پر چھا جانے کی خوبی تھی اور وہ بڑی آسانی سے ہر سطح کے فرد سے ذہنی ربط قائم کر سکتے تھے۔ شاہ سے بھی اور گدا سے بھی۔ مالک سے بھی اور مزدور سے بھی۔ مُلا سے بھی اور ملحد سے بھی... لاڑکانہ کی بے چارگی میں جدوجہد کرنے والے پُرعزم فرد کو جب میں نے راولپنڈی میں کامرانی سے ہم کنار وزیراعظم کے طور پر دیکھا تو ان کے اونچے انقلابی خوابوں کی پھیکی تعبیر سے تو میں یقیناً مایوس ہوا تھا، مگر ان کی سیماب صفت شخصیت نہ صرف پہلے کی طرح متحرک تھی، بلکہ اونچی مسند پر ان کی ذہانت و فطانت میں مزید نکھار آ گیا تھا۔

ستاروں پہ کمند ڈالنے کے وہ ہمیشہ سے شوقین تھے، اسی لیے اب وہ خارجہ پالیسی میں مسلم ممالک کے باہمی اتحاد و یک جہتی جیسے مشکل آئیڈیل پر ہاتھ ڈال رہے تھے۔ قومی سطح پر پہلے تو انھوں نے ایک شکست خوردہ قوم کی منتشر خیالی کو نئی زندگی کا حوصلہ دیا اور بڑی حکمت عملی سے فتح کے نشے میں چُور دشمن سے مفتوحہ علاقے خالی کرائے اور جنگی قیدی چھڑا لیے۔ اس کے علاوہ بچے کھچے پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کی مہم بڑے خلوص سے دامے درہمے سخنے شروع کر دی۔ ایسے تصورات اور ان پر عملی اقدام کسی بڑی قیادت کی پیش بینی اور عالی نظری سے ہی جنم لے سکتے تھے اور ذوالفقار علی بھٹو ایسی ہی قیادت کے حامل تھے۔

ان کی دہری شخصیت کا المیہ یہ تھا کہ عالمی افق پر تو وہ ایک ماڈرن اور متحرک لیڈر بن کر چمکتے

تھے لیکن قومی افق پر روایتی وڈیرے بن جاتے تھے۔ چنانچہ اپنی ٹھوس شخصیت میں فیوڈل ازم کے پیوند کی وجہ سے ان کی مجموعی افادیت کا حاصل جمع گھٹنے لگا۔ جس کا خمیازہ وطن کے مینار کو یوں بھگتنا پڑا کہ دنیا والوں نے تو اسے ۱۹۷۱ء میں پہلے گرتے دیکھا۔ پھر اس کے نصف حصے کو دوبارہ کھڑے ہوتے دیکھا، مگر مینار کے اندر اہلِ نظر دیکھ رہے تھے کہ مینار کو اندر سے کھوکھلا کرنے اور باہر سے ٹیڑھا بینگا اُٹھانے کی جو کارروائی پچھلے دو حاکموں نے دُلکی چال سے شروع کی تھی، اس کو مہمیز دے کر بھٹو صاحب نے سرپٹ دوڑا دیا۔ پھر اس کی گرد میں اور بھی بہت کچھ ہو گیا، جس میں پہلی منزل کو خوبصورت، متوازن اور مضبوط بنانے والی منصف مزاج غیر جانبدار بیوروکریسی ریزہ ریزہ کر دی گئی اور اس کی جگہ سیاسی جانبداری والا ''خدمتی'' سرکاری ملازم تراشا جانے لگا۔ اس کے علاوہ نئے آئین کی انسانی حقوق والی دفعات بھی فوراً ہی معطل کر دی گئیں۔ بڑی خاموشی سے دلائی کیمپ بن گیا۔ اور بڑے دھڑلے سے ایک اسپیشل پولیس فورس (FSF) بنا دی گئی۔ کچھ ایسا ہی حشر تمام بڑے چھوٹے کارخانوں، اسکولوں اور کالجوں کا بھی ہوا، جنھیں سرکاری تحویل میں لینے کے بعد وہاں مرضی کے افراد کو تعینات کر دیا گیا، جن کی نااہلی اور ناتجربہ کاری سے ان کی اچھی کارکردگی بہت بری طرح متاثر ہوئی۔ مزید برآں آخری دنوں میں بھٹو صاحب اپنے اقتدار کو بچانے کی کوشش میں پاکستانی قوم پر اس مُلا کو دوبارہ حاوی کر گئے جس سے تحریکِ پاکستان کے دوران قوم اپنا دامن مکمل طور پر چھڑا چکی تھی لیکن ۱۹۴۹ء کی قراردادِ مقاصد نے انھیں تھوڑا سہارا دے دیا تھا۔

فیوڈل لارڈ کا پیٹ تو کبھی بھوکا نہیں رہتا، مگر اس کی آنکھ ہمیشہ بھوکی رہتی ہے۔ جو سب کو اپنا تابع بلکہ محتاج دیکھنا چاہتی ہے۔ پاکستان کی سابقہ بیوروکریسی اسی بھوک میں ہڑپ ہو گئی تھی اور اس کے اضافی اثرات اب مجھ تک بھی پہنچ رہے تھے۔

راولپنڈی ڈویژن کا چارج لینے کے کچھ ہی عرصہ بعد میں محسوس کرنے لگا کہ پانچ برس پہلے ضلع لاڑکانہ میں تعیناتی کے دوران قانون اور قواعد کی طرف میرے جس جھکاؤ کو بھٹو صاحب پسند کرتے تھے اب وہی طرزِ عمل انھیں ناگوار گزرنے لگا۔ اس کے براہِ راست اظہار کی نوبت تو کبھی نہیں آئی، کیونکہ یہ ناگواری بذریعہ پیپلز پارٹی نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتی رہتی تھی۔ نئے نئے اقتدار کے نشے میں چُور جیالوں کے مطالبات بسا اوقات ناممکنات کی حدیں پار کر جاتے تھے اور جب میں ان کا ساتھ نہ دے سکتا تو کسی نہ کسی شکل میں کوئی نہ کوئی منفی ردِعمل پرائم منسٹر ہاؤس میں پہنچ جاتا، جہاں سرکاری ملازموں کی وفاداریاں تولی جاتی تھیں اور پارٹی کے لیے ان کی افادیت کو پرکھا جاتا تھا۔

قریباً ڈیڑھ برس اسی طرح گزر گیا۔ میں نے جیالوں کی نظر میں بلند ہونے کی کوئی کوشش نہ

کی، کیونکہ اس طرح میں اپنی نظر میں گر جاتا تھا۔

۱۹۷۵ء کے وسط میں ایک دن وزیرِاعظم دو چار روز کے لیے بیرونِ ملک جا رہے تھے، تو پروٹوکول کے مطابق تمام وزرا، سرکاری ملازموں اور دیگر لوگوں کی بڑی تعداد ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ ان کے روانہ ہوتے ہی وزیرِاعظم کے بڑے معتمد وزیر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ حکومت سوچ رہی ہے کہ ملک میں وقت سے پہلے الیکشن کرا لیے جائیں، مگر لوگ ہمیں خلوص سے سچی بات نہیں بتاتے کہ ہماری مقبولیت کی اصل سطح کیا ہے۔ اس لیے ہمیں فیصلہ کرنے میں تذبذب ہے۔ جہاز میں چڑھتے ہوئے وزیرِاعظم نے مجھے کہا ہے کہ میں آپ سے صحیح صورتِ حال کے بارے میں پوچھوں اور واپسی پر اُن کو بتاؤں۔ اس لیے آپ آج رات میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ تاکہ ہم اطمینان سے بات کر سکیں۔

اُس شام طویل گفتگو ہوئی لیکن اگلے چند دنوں میں اس ضمن میں جو کچھ ہوتا رہا اس کی تفصیل[25] میں جانے کی بجائے صرف یہ مرکزی نکتہ بیان کر دوں کہ اُس وقت کی صورتِ حالات کی جو تصویر میں نے پیش کی وہ ایسی نہیں تھی جو وزیرِاعظم سننا چاہتے تھے، بلکہ ان کی توقعات سے ذرا مختلف تھی۔

مشہور ہے کہ خدا نے بطخ کی ایک ایسی مریضانہ قسم بنائی ہے جسے زمین پر بٹھا کر اگر اس کے گرد اُنگلی سے ایک گول دائرے کا نقش کھینچ دیا جائے تو وہ سمجھتی ہے کہ اب وہ گول جیل خانے میں گرفتار کر دی گئی ہے۔ جس سے باہر نکلنا اس کے بس میں نہیں۔ پھر وہ اسی نفسیاتی بندھن میں مر جاتی ہے۔ جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ نے تو بیوروکریسی کی بطخ کو صرف زمین پر بٹھایا تھا۔ مگر عوامی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو نے پہلے تو اُس کا حفاظتی حصار نوچ پھینکا اور پھر اپنی فیوڈل انگلی سے اس کے گرد اپنی وفاداری کا دائرہ کھینچ دیا۔ یہ سرکاری بطخ چونکہ اندرونی طور پر نفسیاتی مریض نہیں تھی اس لیے حکومت نے بیرونی طور پر یہ قانونی بندوبست کر دیا کہ اگر وہ اس امتناعی سرخ لکیر اور جبری وفا کے دائرے سے باہر نکلے گی تو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

بھٹو صاحب کے علمی استدلال کے مطابق ریاست کی گورننس (governance) کا اکتسابی تصور تو وہی تھا جو میں نے لاڑکانہ میں دیکھا تھا۔ جب وہ اقتدار میں نہیں تھے لیکن اب ان کی پیدائشی فیوڈل اقتدار کے مطابق گورننس کا اصل تصور وہ نکلا جو میں راولپنڈی میں دیکھ رہا تھا۔ جب وہ مکمل اقتدار میں تھے۔

خلوص کی تلاش میں وزیرِاعظم نے صحیح حالات جاننے کے لیے مجھے جو حکم دیا تھا میں نے اس

کی پُرخلوص تعمیل کی، تو جیالوں کی پرانی شکایات اور نئی گورنس کے جابر تقاضے سرگوشی کرنے لگے کہ سرکاری تیغ وفاداری کے دائرے سے باہر آ رہی ہے، جس کی اجازت نہیں ہے۔

صدیوں پہلے شیخ سعدی نے بادشاہوں کے مزاج کے متعلق کہا تھا، ''وقتے بسلامے برنجند۔ دگاہے بہ دشنامے خلعت دہند'' (کبھی یہ سلام سے ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی دشنام پر انعام دینے لگتے ہیں) ان صدیوں میں بادشاہت سکڑ کر جاگیرداری بن گئی ہے اور آج کا وڈیرہ ماضی کے شاہانہ مزاج کا وارث ہے اور اس مزاج نے مجھے بے وفا سمجھ لیا۔

چند روز بعد وزیر اعظم کچھ دنوں کے لیے کراچی جا رہے تھے۔ حسبِ پروٹوکول ہم چار افسران[۲۶] سہ پہر کے وقت انھیں ایئرپورٹ پر چھوڑنے کے لیے گئے تو وہ چند منٹ تک بڑی خوش خلقی سے انتظامی امور کی باتیں کرتے رہے، پھر ان کا خصوصی طیارہ پرواز کر گیا۔

اگلی صبح میں نے اخبار کھولا تو اس میں پنجاب گورنمنٹ کا نوٹیفکیشن تھا جس کے مطابق مجھے تبدیل کر دیا گیا تھا، مگر اگلی پوسٹنگ کا کوئی ذکر نہ تھا۔ میں ابھی حیرت اور خفت میں ڈبکیاں کھا ہی رہا تھا کہ میری جگہ تعینات ہونے والے افسر کا فون آ گیا کہ آپ چارج کب چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ مجھے اپنی اگلی تعیناتی کا انتظار ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ میرے آرڈر یہ ہیں کہ وزیر اعظم کی اسلام آباد واپسی سے پہلے چارج لے لوں۔

میں نے ہنس کر کہا کہ میرے دل میں تبادلہ رُکوانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ آپ بے شک کل صبح آ کر چارج لے لیں۔ وہ اگلے دن پہنچ گئے اور میں بصد خوشی فارغ ہو گیا۔ کیونکہ میرے کان میں الیکشن کی بھنک پڑ چکی تھی اور اب میں ڈویژن اور ضلع کی انتظامیہ سے میلوں دور بھاگنا چاہتا تھا۔

اس مسرت اور سکون کے باوجود تبادلے کا یہ انداز میرے لیے باعثِ توہین و تحقیر تھا اور دوسروں کے لیے واضح اعلان تھا کہ وزیر اعظم مجھ سے ناراض ہیں۔ اس لیے جب میں نے پنجاب کے چیف سیکریٹری بریگیڈیئر مظفر ملک سے فون پر درخواست کی کہ مجھے مرکزی حکومت میں بھیج دیا جائے تو انھوں نے صرف ایک لفظ "Done!" کہہ کر فون بند کر دیا۔

یہ خدائی ''کن'' کا انسانی روپ تھا اور اس کا ''فیکون'' یہ تھا کہ وزیر اعظم جس افسر سے ناراض ہوں گے اسے کوئی بھی صوبہ جھیلنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

قریباً ڈیڑھ برس بعد ۱۹۷۷ء میں الیکشن کا اعلان ہوا۔ تو میرے سابقہ تجربے کے بعض وسوسے حقیقت بن کر سامنے آ گئے، اور جب الیکشن ہو گئے تو حالات نے نئی کروٹ لے لی۔

دھاندلی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ سڑکیں جلوسوں سے بھر گئیں۔ پھر انھوں نے نظامِ اسلام تحریک کا روپ دھار لیا اور بالآخر ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو مردِ مومن جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا نازل ہو گیا۔

اگلے دو برس ایسے گزرے کہ ۱۹۷۱ء میں دو ٹکڑوں میں بانٹی جانے والی پاکستانی سرزمین اب اُس وقت کے فعال کردار ذوالفقار علی بھٹو کے لیے مزید تنگ ہونے لگی اور ۱۹۷۹ء میں ان کی سیمابی شخصیت بڑی شکستہ دلی سے آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔

تاریخ کے کوہِ ندا سے آواز آئی کہ ہم خدا کی ذات کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانتے ہیں۔ انسانوں کی وفا کو تو یرغمال بنایا جا سکتا ہے، مگر قسمت کی وفا کا سمجھنا محال ہے۔

یہ آواز تو اپنے وقت پر آئی، مگر اس سے بہت پہلے میرے کان کچھ اور بھی سن رہے تھے۔ آنکھیں کچھ اور بھی دیکھ رہی تھیں اور دھیرے دھیرے میری بصیرت پر وارد ہوتا جا رہا تھا کہ ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر جب میں دوبارہ وطن کے مینار میں داخل ہوا تھا تو چہار سُو عجیب سی بو باس کیوں تھی۔[۲۷] یہ وطن کے مینار میں ہر طرف پھیلی ہوئی بیوروکریسی کی قلبی آنچ اور خود سوزی کی بو باس تھی، جن کے معیار اور کارکردگی کو ماچس دکھا دی گئی تھی۔ اس کا پروردہ ضمیر اب شعلوں میں لپٹا تھا اور غیر جانبداری اب راکھ ہو چکی تھی۔ دو فوجی حکومتوں نے جب ابتدائی ضرب لگائی تھی تو سرکاری ملازم اپنے آئینی حصار اور قانونی ڈھال کے سہارے سرکاری ماحول سے لڑتا رہتا تھا، لیکن بھٹو کے سویلین مارشل لا کی کاری اور مہلک ضرب نے وہ حصار توڑ دیا اور ڈھال چھین لی تو اس شکستِ فاش کے بعد وہ اپنے آپ سے لڑنے لگا تھا کہ وہ خود کو بدلنے میں کہاں تک جائے؟ اپنی ذات اور خودی کی کتنی نفی کرے؟ خمیدہ سری اور سجدہ ریزی کے درمیان کہاں تک جھکے؟ اس کی بندگی کی حد کیا ہے؟ وہ خود کو کہاں تک گراتا جائے؟

یہ بڑی ہی خاموش اندرونی جنگ تھی۔ لب ساکت تھے، سینے بند تھے لیکن اندر گھمسان کا رَن تھا۔ کیونکہ شخصی انا اپنی ہی ذات سے گتھم گتھا تھی۔ مَن کی توکھد بد بھی انسان کو بے حال کر دیتی ہے۔ یہ تو پرانے ''میں'' اور نئے ''میں'' کا اندرونی باہمی ٹکراؤ تھا۔ من و تو کا بیرونی جھگڑا نہ تھا۔ مجھ سمیت ہر سرکاری ملازم اس ہولناک جنگ میں اندر ہی اندر گھرا ہوا تھا، مگر ہر سینے میں اس کی شدت مختلف تھی، کیونکہ ہر ایک کی شخصیت، نیت اور طبیعت مختلف تھی۔ کہیں خوفِ خدا تھا، کہیں جوشِ انا تھا اور بیچ بیچ میں قناعت سے ہوس تک کا ہر رنگ تھا۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست.... ہر شخص چاہے وہ دیندار تھا یا دنیا دار، اپنے اپنے انداز میں اپنے اپنے ساتھ نبرد آزما تھا۔ چنانچہ، اس انتہائی ذاتی

جنگ کا فیصلہ بھی ذاتی ہی رہا۔

اس جنگ کی ابتدائی شکل پچھلے دو حاکموں کے دور میں ہی نظر آنے لگ گئی تھی۔ اس دوران میری ملازمت کے جن اِکا دُکا واقعات کا ذکر اس تحریر میں آیا ہے وہ مجھ تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ بہت سے سرکاری ملازم اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے لیکن اب بھٹو کی اصلاحات کے بعد ہر سرکاری ملازم انہی اُلجھنوں میں ڈوبا تھا۔

دو چار برسوں میں یکے بعد دیگرے انفرادی فیصلے سامنے آنے لگے۔ جنگ تو رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ مگر جنگ بندی کے معاہدے فاتح فریق یعنی حکومت سے نہیں ہوئے، بلکہ اپنی اپنی ذات سے ہوئے۔ اور دل ہی دل میں اپنے آئندہ طرزِ عمل کے متعلق ہوئے۔ زیادہ تر نے تو فدویانہ انداز میں اپنے لب سی لیے۔ مگر سوچ نہیں بدلی۔ فقط اس کی اُڑان روک کر پر سمیٹ لیے... لیکن کئی ایک کی سوچیں بدلنے لگیں۔ اُن کا رخ دس بیس تیس ڈگری سے لے کر زاویۂ قائمہ تک بدلنے لگا... کئی تو ایسے بھی تھے جنھوں نے ۱۸۰ ڈگری پر مڑ کر اپنا پورا رُخ ہی اُلٹ لیا۔ یہ معاہدے نہ تھے بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی حد بندی کی تھی کہ میں یہاں تک جا سکوں گا۔ اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ وہ منطقہ بہ امانِ خدا تھا۔ پھر ہر چہ بادا باد... یہ بیوروکریسی کے بکھر کر دانہ دانہ ہو جانے کا سماں تھا۔

اپنی اپنی حد مقرر کرنے والوں کا حکومت نے تو کبھی ساتھ نہ دیا، مگر ان کی باقی ماندہ ملازمت میں قسمت کسی کو ڈبوتی اور کسی کو بچاتی رہی۔ کئی ایک وقتاً فوقتاً ملازمت سے نکالے گئے۔ کئی معطل ہوتے رہے یا افسر بکارِ خاص (OSD)[28] بنتے رہے۔ کئی ایک ملازمت کے تاریک کونوں (کھڈا لائن) میں گمنامی سے دن پورے کرتے رہے۔ کئی ایسے تھے جن کے بار بار تبادلے ہوتے رہتے، جن کی وجہ سے ان کے خاندانی مسائل بڑھتے رہتے اور مالی پریشانیاں ستاتی رہتیں۔ بعض کی ترقیاں رُکتی رہیں۔

عالی یونہی خراب رکھے گی شبِ حیات (جمیل الدین عالی)

لیکن کئی ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے اُوپر کوئی حد نہیں لگائی، بلکہ تن من اور ذہن کی ساری حدود شعوری طور پر توڑ دیں۔ اپنی ذات کو تنکے کی طرح ہلکا کر لیا اور سرکاری درباری ہواؤں کے رُخ پر اُڑتے اُڑتے ہر حکومت کے محبوب بنتے گئے۔ ان میں بغلی داخلوں (Lateral Entry) والے (فوجی اور جیالے) تو سبھی شامل تھے لیکن اب کئی پرانے بیوروکریٹ بھی شامل ہو کر ان کی تعداد تیزی سے بڑھانے لگے۔

میرا بچپن انگریز کی بیوروکریسی کے زمانے میں گزرا، جب عوام کے لیے اچھے انتظام کی

فراوانی تھی۔ میرا لڑکپن نوزائیدہ پاکستان کی بیوروکریسی کے دور میں گزرا، جب اسی حسنِ انتظام کو مزید تابانی ملی اور وطن اپنے سنہری زمانے میں پہنچ گیا۔ میری جوانی اسی بیوروکریسی کو اندر سے یہ دیکھتے گزری کہ بیوروکریسی پر کیا گزر رہی ہے۔ اب میرا بڑھاپا دونوں میناروں کی بلندیوں سے جھانک کر دیکھ رہا ہے کہ ان تین ادوار کے تذکرے کے بعد پاکستان کی بیوروکریسی کی داستان تو ختم ہو جاتی ہے... لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کیا حالات بہتر ہوتے ہیں یا بدتر؟ جو لوگ سرکاری ملازمت میں اس داستان کے خاتمے کے بعد بھرتی ہوتے رہے، ان کی تربیت، اہداف اور کارکردگی کا نقشہ کیسا ہے؟ کیا اس پر ''بیوروکریسی'' کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟

مقتدرہ قومی زبان کی قومی انگلش — اُردو ڈکشنری کے مطابق برطانوی انگلش میں bureau اس ڈیسک یا میز کو کہتے ہیں جس میں کاغذات رکھنے کے خانے بنے ہوتے ہیں اور بیوروکریٹ وہ ضابطہ پرست نگران فرد ہے جو اس میز پر بیٹھ کر دفتری نظام چلاتا ہے۔ لغت میں اس اندراج کی ضرورت نہ تھی کہ بیوروکریٹ کا بنیادی فرض اس نظام کو خوب سے خوب تر بنانا ہے۔ کیونکہ جس زمانے میں یہ لفظ انگریزی ڈکشنری میں شامل ہوا تھا اس وقت اعلیٰ کارکردگی پر بیوروکریسی کو برطانوی سلطنت آہنی ڈھانچا (iron framework) سمجھا جاتا تھا اور یہ تصور ہی نہ تھا کہ ان کی کارکردگی مجموعی طور پر خراب بھی ہو سکتی ہے۔

''تین نذ'' کی اصلاحات[29] کے سیلاب کے بعد پاکستان میں جو انتظامیہ نیچے سے برآمد ہوئی، اس کی شاہ پرستی، عوام بیزاری اور استحصالی طرزِ عمل کی وجہ سے وطن کے مینار میں ''بیوروکریسی'' کی اصطلاح کے معنی اس طرح بدلنے لگے جیسے خیر کے سنگ و خشت مقید ہوتے جائیں اور شر کے سگ آزاد ہوتے جائیں۔ یہ تبدیلی مسلسل بھی تھی اور دیرپا بھی۔ اس لیے نوبت بہ ایں جا رسید کہ نئے معانی کے مطابق ''بیوروکریسی'' عوامی لبوں کی گالی اور شکستہ دلوں کی بددُعا بن گئی۔ یہ ''بیوروکریسی'' پاکستان کی اپنی ایجاد تھی۔ جس کا سہرا ایوب، یحییٰ اور بھٹو کے سر ہے۔ یہ انگریزی لغت کی ''بیوروکریسی'' سے بالکل مختلف ہے۔ بقول اقبال ؏

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

پرانی بیوروکریسی کے مذکورہ بالا تین ادوار کی داستان تو ختم ہو گئی لیکن قرآن کریم کی ایک آیت کی گونج چھوڑ گئی ہے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا ترجمہ: ''اُس عورت کی طرح مت بنو جو اپنا سوت کات کر پہلے تو اسے پکا کرتی ہے اور پھر اسے نوچ نوچ کر توڑ دیتی ہے۔'' (النحل: ۹۲)

۱۸۵۷ء میں انگریز کے ہاتھوں ہندوستان کی شکست اور ذلّت کے بعد ہندی مسلمانوں کی قسمت کا سُوت کئی ہاتھوں اور دو تین نسلوں نے کاتا۔ پہلے پہل سر سیّد، اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کرنے والے مسلم عمائدین، علی برادران، عطاء اللہ شاہ بخاری، علّامہ مشرقی، علّامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح، ''لے کے رہیں گے پاکستان'' والی جنونی قوم اور ۱۹۴۷ء میں خون کے دریاؤں کو پار کر کے آنے والے پاکستانی پناہ گزین... اتنے ہاتھوں نے دل کے خلوص اور لگن سے یہ سُوت کات کر پاکستان بنایا۔ تو اس کے بعد پاکستانی بیوروکریسی کے تربیت یافتہ ہاتھوں نے اسی سُوت کو مزید پکّا کیا اور پاکستان کا سنہری زمانہ آ گیا۔

ہندی مسلمانوں کی قسمت کا سوت کاتنے کا آغاز ۱۸۵۹ء میں سر سیّد نے رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند سے کیا۔[۳۰] یہ طویل عمل قیامِ پاکستان کے ساتھ مکمل ہوا۔ تو سُوت پکّا ہونے لگا اور ۱۹۵۶ء کے آئین نے اسے پورا پکّا اور مضبوط کر دیا۔ اس طویل اجتماعی جدوجہد میں ۹۷ برس گزر گئے۔ اس طرح یہ دورانیہ ''ہمتِ مرداں مددِ خدا'' کی صدی ثابت ہوا۔

پھر نہ معلوم مشیّت کی کیا حکمت تھی کہ اس نے تخلیقی صدی کو پامال کرنے والے تخریبی لمحے بھیج دیے، جو ساڑھے تیرہ برس تک (۸ راکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۱ راپریل ۱۹۷۲ء تک) دندناتے رہے۔ ان میں جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ کے دو فوجی مارشل لا اور ذوالفقار علی بھٹو کا سویلین مارشل لا شامل تھے۔ یہ کلامِ پاک والی دیوانی عورت کے لمحے (برس) تھے، جن میں لمبی محنت اور مشقت سے کاتا ہوا اور پکا کیا ہوا سوت کھولا، نوچا اور توڑا جاتا رہا۔

ان ساڑھے تیرہ برسوں کی ''اصلاحات'' ایک تخلیقی صدی میں ''میری مرضی'' کی کبھی نقب لگاتی رہیں اور کبھی سرنگ در سرنگ نکال کر اسے کھوکھلا کرتی رہیں۔ اسی لیے ان برسوں کے اختتام پر اقبال اور قائداعظم کا فلاحی پاکستان دو ٹکڑے ہو چکا تھا اور دو تین صدیوں کی تربیت یافتہ بیوروکریسی کا جنازہ تیار ہو چکا تھا۔ جسے بالآخر ۲۰ راگست ۱۹۷۳ء کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا۔

تب پاکستان کی سرزمین سے حُسنِ انتظام (good governance) ایسے غائب ہونے لگا جیسے غالب نے کہا تھا:

''دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو''

اس کی بجائے من مانی ہر طرف پاؤں پسارنے لگی۔ جیسے فیض نے کہا تھا:

ہر اک بت کو صنم خانے میں دعویٰ ہے خدائی کا

اس کے بعد وطن کے باقی ماندہ مینار کی تعمیر ٹیڑھی بینگی تھی۔ ساتھ ہی یہ Pisa کے مینار کی

طرح جھکنے بھی لگ گیا تھا... بدن کا استخوانی ڈھانچا (skeleton) توڑ دیا جائے تو بدن سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا۔

میرا مینار ابھی سیدھا کھڑا تھا... لیکن دم بخود تھا... اس کے در و دیوار کا پلستر جا بجا اُکھڑ چکا تھا... نیچے کھلی دراڑیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

دونوں مینار ایک دوسرے کو غالب کی ۱۸۵۷ء[۳۱] والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

گاہ مل کے کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم!
ماجرا دِیدہ ہائے گریاں کا

حواشی

۱۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ کا ترجمہ مسعود مفتی کی کتاب چہرے اور مہرے میں دیکھیں۔ صفحات ۱۵۰ اور ۱۵۱، پیراگراف نمبر ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹۔

۲۔ ذوالفقار علی بھٹو، *The Myth of Independence*، (لندن: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء)۔

۳۔ یہ ذکر صرف یہ ستم ظریفی بتانے کے لیے کر رہا ہوں کہ ان کے دستخط کے نیچے ۱۶ ردسمبر ۱۹۶۹ء کی تاریخ درج ہے اور دو برس بعد ٹھیک اسی دن پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جس میں وہ خود بھی ایک فعال کردار تھے اور جس کا میں بھی عینی شاہد تھا۔

۴۔ چند برس بعد (۱۹۷۶ء) میں نے اسی اسلوبِ بیان کا کمال پیرس میں ایک محدود سی میٹنگ میں دیکھا، جہاں بھٹو فرانس کے وزیراعظم ژیک شیراک (Jacques Chirac) سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اسی قسم کا کمال حنیف رامے کی اُردو تقریر میں بھی ہوتا تھا۔ کئی اور مثالوں سے بھی پیپلز پارٹی کی صفوں میں اعلیٰ افرادی قوت کا اندازہ ہوتا تھا۔ جیسے بنگال کے پرانے آئی سی ایس (ICS) اور بعد میں پاکستان فارن سروس کے جے اے رحیم J.A.Rahim وغیرہ۔ مگر اس پارٹی کے اندر جمہوریت نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیش بہا اثاثہ قوم کے کام نہ آیا۔

۵۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ہم دو برس تک ہندوستان کی قید میں تھے۔ وہاں جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھٹو کے متعلق اپنی خیالات کا اظہار میں اپنے ساتھیوں کے سامنے کرتا۔ تو ہمارے چیف سیکریٹری مظفر حسین ہنس کر کہا کرتے تھے، ''میرے الفاظ یاد رکھنا جمہوریت کے بارے میں بھٹو جو بھی کہہ رہے تھے ان کا ہر عمل ان کے ہر لفظ کی تردید کرے گا۔'' مظفر حسین کا تعلق بھی سندھ سے تھا اور بھٹو خاندان سے ان کے زندگی بھر کے مراسم تھے۔

۶۔ اسٹینلے وولپرٹ، *Zulfi Bhutto of Pakistan* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء) ص: ۱۳۲۔ اس کتاب کے صفحات ۱۳۳ اور ۱۳۴ پر مصنف نے ذوالفقار علی بھٹو کے جوابی خط کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ یہ جواب لیگل (legal) سائز کے قریباً پندرہ صفحات پر مشتمل تھا۔ بظاہر یہ میرے خط کا جواب تھا۔ مگر اصل رُوئے سخن

حکومت کی طرف تھا اور سارے مندرجات جنرل یحییٰ اور ان کی پالیسیوں پر شدید تنقید کرتے تھے اور اپنی مدلل روانی کی وجہ سے یہ ایک نادر انشائی شاہکار کا تاثر دیتے تھے۔ اس کی ایک نقل انھوں نے جنرل یحییٰ کو بھی ارسال کی تھی۔

۷۔ انھی میں سے ایک جنرل امیر عبداللہ خان نیازی (Gen. A.A.K. Niazi) بھی تھے۔ جو لاہور ڈویژن کے نگران تھے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے ڈھاکہ میں ہندوستانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔

۸۔ ان چار کتابوں کے کوائف یہ ہیں:

(۱) چھپ اور مہپ (رپورتاژ) موجودہ ایڈیشن (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز)۔

(۲) ہم نفس (رپورتاژ) موجودہ ایڈیشن (لاہور: فیروز سنز)۔

(۳) ریزے (افسانے) موجودہ ایڈیشن (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز)۔

(۴) لمحے (ڈائری) موجودہ ایڈیشن (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز)۔ میری دانستہ کوشش یہی رہی کہ ان چاروں کتابوں کے اکٹھے مطالعے سے قاری نہ صرف ۱۹۷۱ء کے نمایاں واقعات و حالات سے آگاہ ہو سکے، بلکہ اسے مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کی مجموعی فضا کا بھی اندازہ ہو سکے۔

۹۔ ص: ۲۳۳۔

۱۰۔ حاشیہ نمبر ۸۔

۱۱۔ Vanguard Publications لاہور نے سالِ اشاعت درج کیے بغیر شائع کی۔

۱۲۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ، (لاہور: Vangaurd Books) ص: ۳۴۴، پیرا: ۹۰۔

۱۳۔ ص: ۲۲۱۔

۱۴۔ ص: ۲۲۴۔

۱۵۔ Civilian Marial Law Administrator، ۲۳ر جنوری ۱۹۷۲ء کو صدر بھٹو نے اعلان کیا کہ نئی انقلابی اصلاحات کے نفاذ کے لیے مارشل لا ضروری ہے۔ اس لیے ۲۱ر اپریل ۱۹۷۲ء تک مارشل لاء جاری رہا۔

۱۶۔ ۱۳ر اگست ۱۹۷۳ء کو بھٹو وزیر اعظم منتخب ہوئے اور اگلے دن نیا آئین نافذ ہو گیا۔

۱۷۔ ۱۳ر مارچ ۱۹۷۲ء کو مارشل لا آرڈر کے تحت ۱۳۰۰ر سرکاری افسران برطرف کر دیے گئے۔

۱۸۔ ۲۰ر اگست ۱۹۷۳ء کو انتظامی اصلاحات کا اعلان ہوا۔

۱۹۔ ص: ۲۲۲۔

۲۰۔ امین اللہ چوہدری، Political Administrators (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس) صفحات ۱۱۲ اور ۱۱۳۔

۲۱۔ اُس زمانے میں یہ قصہ مشہور تھا کہ کسی منظورِ نظر نے بھٹو صاحب کو براہِ راست اعلیٰ ملازمت کے لیے درخواست دی تو انھوں نے اس پر حکم لکھ دیا کہ اسے مرکزی حکومت میں ڈپٹی سیکریٹری تعینات کر دیا جائے۔ اس پر متعلقہ افسران نے ایک مذدیانہ نوٹ کے ذریعے وزیر اعظم کی توجہ اس طرف دلائی کہ اُمیدوار اس اسامی کے لیے اہلیت کی شرائط پوری نہیں کرتا۔ اس نوٹ پر وزیر اعظم کا آخری حکم یہ تھا کہ اس حالت میں اسے اُوپر والی اسامی (جوائنٹ سیکریٹری) پر لگا دیا جائے۔ خدا معلوم یہ حقیقت تھی یا لطیفہ۔ مگر یہ ان دنوں کے طرزِ حکومت کی علامت

وضاحت کرتا تھا۔ جس کے سارے تیور شاہانہ تھے۔

۲۲۔ ۱۹۸۷ء میں اوکسفرڈ یونیورسٹی کراچی سے شائع ہونے والی کتاب Bureaucracy in Pakistan Charles H. Kennedy (چارلس ایچ کینیڈی) صفحات ۸۱، ۸۲۔

۲۳۔ گورنمنٹ سروَنٹس کنڈکٹ رولز (Govt. Servants Conduct Rules)۔

۲۴۔ ص: ۱۸۰۔ انور مسعود کے اشعار۔

۲۵۔ اگر یہ آپ بیتی ہوتی تو اس تفصیل کا اندراج لازمی بھی ہوتا اور تاریخی دلچسپی کا باعث بھی بنتا۔

۲۶۔ کمشنر، ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس (DIG)، ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (SP)۔

۲۷۔ ص: ۳۰۵۔

۲۸۔ Officer on Special Duty، یہ کام یا ڈیوٹی بالکل ویسی ہی ہوتی تھی جیسے اسکول کے کلاس روم میں بعض اساتذہ طلبا کو یہ سزا دیتے تھے کہ بھری کلاس میں وہ کونے میں دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑے رہیں۔ چنانچہ OSD کے پاس نہ کام ہوتا تھا نہ دفتر، نہ اسٹاف۔ فقط تنخواہ ہی تنخواہ تھی جس میں الاونس شامل نہ تھے۔

۲۹۔ ص: ۳۰۲۔

۳۰۔ تفصیلات کے لیے دیکھیں جمیل یوسف، سرسید احمد خاں، (لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۲ء) صفحات ۷۱ تا ۷۴۔

۳۱۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کے حالات کے بارے میں میرزا غالب کے ایک خط میں اشعار۔ یہ خط علاء الدین احمد خان علائی کو بھیجا گیا تھا۔

اختتامیہ

سات آٹھ صدیاں پہلے لکھی ہوئی شیخ سعدی کی ایک حکایت کے مطابق کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ جنت میں ہے اور درویش دوزخ میں۔ وہ ابھی اس بوالعجبی پر حیران ہو رہا تھا کہ غیب سے صدا آئی کہ بادشاہ نیک درویشوں کی قدر کرتا تھا، اس لیے جنت میں ہے اور درویش بادشاہوں کا قرب ڈھونڈتا تھا اس لیے دوزخ میں ہے۔

آج کے بدامنی اور بدانتظامی والے پاکستان میں عبدالستار ایدھی مرحوم کی فقیرانہ زندگی اور شاندار موت بھی یہی سبق دیتی ہے کہ خلق کی خدمت میں خدا کی قربت ہے اور شاہوں کی قربت میں خلق سے بھی دوری ہے اور خدا سے بھی۔

پرانی بیوروکریسی کی مذکورہ بالا داستان ان منافقانہ ''اصلاحات'' کو درجہ وار مرتب کرتی ہے، جن کے ذریعے ساڑھے تیرہ برس تک ایک منفرد اور منظم بیوروکریسی کو کبھی حیلے بہانوں سے اور کبھی بزورِ شمشیر خلقِ خدا کی خدمت سے محروم اور شاہوں کی چاکری پر مامور اور مجبور کیا جاتا رہا۔ یہ ساڑھے تیرہ برس ان خفتہ خرابیوں کو بیدار کرنے والا فتنہ تھے۔ جو پاکستان کی تعمیر میں مضمر تھیں اور جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔[1] اس کے بعد جو زمانہ آیا، وہ اس فتنے کو مزید منظم کرنے اور استحکام دینے کا دور تھا۔

بیوروکریسی کے بتدریج گلا گھونٹنے کی یہ داستان بظاہر تاریخ کی سیاسی پگڈنڈیوں پر چلتی ہے، مگر راست بازوں کی مرگِ انبوہ سے جس طرح کج روی نے اپنے جشن منائے، اس کے وسیع اور دیرپا اثرات اسے محض ایک سیاسی بیانیہ نہیں رہنے دیتے، بلکہ پورے معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر جانے والا ایسا انسانی المیہ بنا دیتے ہیں جو آئینی، قانونی، اخلاقی، عمرانی اور روحانی سمتوں میں بھی پھیل جاتا ہے اور ملک کے ہر گلی کوچے کو گدلا کر دیتا ہے۔

''میری مرضی'' کے سیلاب اور ''من مانی'' کی اس سونامی کی وجہ سے وطن کا جغرافیہ بدلا۔ تاریخ مسخ ہوئی۔ ریاست اتھل پتھل ہوئی۔ آئین اور قانون بے توقیر ہوئے۔ میرٹ (merit) کچل دیا گیا۔ حتیٰ کہ پاکستانی قوم کا سابقہ اعلیٰ کردار بھی چولا بدل کر انسانی فطرت کی اچھائی پر اس کی برائی کو ترجیح دینے لگا۔ اس عمل میں اقدار ملیامیٹ ہوئیں، دل توڑے گئے، دماغ بدلے گئے

اور ضمیر خریدے گئے۔ اس طرح یہ کروٹیں محض سیاسی نہ رہیں، بلکہ انھوں نے پورے معاشرے کو اتھل پتھل کر دیا، کسی زلزلے کی طرح، جو بظاہر تو صرف زمین ہلاتا ہے، لیکن دراصل ہر قسم کی تباہی اُمڈ آتی ہے۔ اس ہلاکت خیزی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سیاسی زلزلے کے ذکر کے بغیر قومی اور سماجی تباہی کا اندازہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تب یہی ذکر ایک قومی مرثیہ بن جاتا ہے۔ جس کا فنی اظہار قومی ادب بن جاتا ہے۔ چاہے یہ اظہار کسی بھی صنفِ ادب میں کیا جائے۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں علامہ اقبال کی پکار ''از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز'' قوم کے دلوں کی دھڑکن کو تیز تر کر رہی تھی۔ علامہ مشرقی کے بیلچے سے قوم خدمتِ خلق کے ذریعے حقوق العباد کی ادائیگی سیکھ رہی تھی اور قائداعظم کی آواز پر اپنی تقدیر خود بنانے کو منظم ہو رہی تھی۔ اور جب یہ تقدیر وطن کا مینار بن کر اُبھری، تو بیوروکریسی کی دیانت، محنت اور لگن سے پہلی منزل کی پختگی اور پائیداری اس مینار کو ایک ٹھوس بنیاد مہیا کر رہی تھی۔ اُس دور میں قومی کردار انسانی فطرت کی تمام اچھائیوں کا عکس تھا لیکن قریباً تین دہائیوں بعد ساری کایا پلٹنے لگی، کیونکہ ماضی کے باکردار رہبر اُفق تلے غروب ہو چکے تھے اور نئے نہ صرف خود بے کردار تھے بلکہ ان تین دہائیوں میں وہ شعوری طور پر پاکستانی قوم کے اعلیٰ کردار کو بتدریج مسخ کرتے رہے۔ دراصل نئی قسم کے یہ رہبر نئے قومی اُفق سے طلوع نہیں ہوئے تھے، بلکہ سابقہ برٹش کالونی کی فوجی بیرکوں (barracks) اور عوام دشمن جاگیروں سے برآمد ہو رہے تھے۔ اور باہمی گٹھ جوڑ سے وطن کے مینار کو اسی قسم کی کالونی بنا کر اس پر قابض ہونا چاہتے تھے، جس قسم کی کالونی میں وہ خود پروان چڑھے تھے اور برٹش دور میں خود عوامی استحصال کے آلۂ کار تھے۔ اب وہ اپنے ذاتی اور گروہی مفادات بھی اسی انداز میں بڑھانا چاہتے تھے، جس انداز میں انگریز نے خود کو ایک بڑ کے درخت کی طرح پھیلایا تھا۔ جو اوپر سے نیچے زمین کی طرف نئی شاخیں پھینکتا رہتا ہے۔ تاکہ نچلی مٹی کی ساری توانائی صرف اسی تک براہِ راست پہنچتی رہے... یہ شر کا عمل تھا۔ انسانی فطرت کی سچائیوں کو دبانے والا اور برائیوں کو اُبھارنے والا... اسی عمل کی طوالت نے قومی کردار کا رخ خیر سے شر کی طرف موڑ دیا۔

ان مقاصد کا حصول بھی ایک مسلسل کارِ شر تھا۔

اس کا پہلا قدم تو یہ تھا کہ پاکستانی فرد پر جبر کا جال مزید پھیلا کر اسے بے دست و پا کر دیا جائے۔ اس کے لیے مذہب کا سیاسی استعمال کیا گیا اور مولوی کو نئی پاکستانی نوآبادیاتی شراکت میں شامل کر لیا گیا۔ یہ پہلے بھٹو اور پھر جنرل ضیاء کے دور میں ہوا۔ اس طرح وڈیرے، آمر اور مُلا کا اتحادِ ثلاثہ بن گیا۔

دوسرا قدم یہ تھا کہ سابقہ برٹش نوآبادیاتی نظام کی اچھی خاصیتوں کو برباد کر دیا جائے اور صرف بری خاصیتوں کو مستحکم کیا جائے اور آگے بڑھایا جائے۔ اس نظام کا سب سے تابندہ عنصر ان کا حُسنِ انتظام (Good governance) تھا، جس کا نفاذ بیوروکریسی کا آہنی ڈھانچہ کرتا تھا۔ یہ ان کی نیک نیتی کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ ان کی مجبوری تھی کہ چھوٹی سی برٹش قوم کو رُوئے زمین کے بڑے حصے پر اپنی وسیع ایمپائر کا انتظام چلانا تھا۔ اپنی محدود افرادی قوت اور طویل وعریض فاصلوں کی وجہ سے وہ بار بار فوج کشی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ مقامی بیوروکریسی کے ڈسپلن اور اہلیت کی مدد سے رعایا کو حُسنِ انتظام سے مطمئن رکھتے تھے تاکہ بغاوت کے امکانات کم ترین ہی رہیں۔[۲] اس کے برعکس اس نظام کا سب سے تاریک عنصر عوام کی سیاسی اور ذہنی غلامی تھی، جسے تلوار، جاگیر اور نفاق کے ذریعے قائم رکھا جاتا تھا، لیکن اتحادِ ثلاثہ نے اس نظام کے اکیلے مثبت عنصر کی ساری تابندگی تو دانستہ روند ڈالی لیکن غلام بنانے والے متعدد منفی عناصر کو زیادہ مضبوط کر دیا۔

تیسرا قدم یہ تھا کہ برٹش دور میں حُسنِ انتظام کے اُس آفاقی تصور کی جڑ ہی کاٹ دی جائے، جو آئین کو مقدس اور قانون کو بالادست بناتا ہے۔ اس کی بجائے حاکموں اور بااثر افراد کی فضیلت کے تصور کو وطن کے مینار کے ہر کونے کھدرے میں ٹھونس دیا جائے۔

کسی کا قول ہے کہ قومی قیادت کے لیے تین خصوصیات لازمی ہیں۔ دیانت، ذہانت اور قوت۔[۳] ان میں سے دیانت سب سے اہم ہے، کیونکہ اگر دیانتداری نہیں ہوگی تو باقی دو خصوصیات کا بھی بددیانتی سے غلط استعمال ہوگا اور غلط کاری اتنی ذہانت اور قوت سے آگے دھکیلی جائے گی، کہ یہ روِش پورے معاشرے کو غلط کار بنا دے گی۔ کیونکہ قیادت کے کردار کا ہر قطرہ نیچے رِس رِس کر ہمیشہ لوگوں کے کردار میں رچ جاتا ہے۔ قومی قیادت میں دیانت کا وہی مقام ہے جو انسانی زندگی میں حُسن کا ہے۔ حُسن اگر وفاشعار ہے، تو دو زندگیوں کو جنت بنا دیتا ہے اور اگر بے وفا ہے تو کئی زندگیوں کو جہنم بنا دیتا ہے۔

مذکورہ بالا ساڑھے تیرہ برس میں اس قول کی صداقت پوری طرح ثابت ہوگئی، جب وطن کے مینار کی دوسری منزل کی تعمیر میں ہر اینٹ دانستہ بددیانتی سے ٹیڑھی لگائی جانے لگی۔ اس دور کی تینوں حکومتوں کی خودغرضانہ حکمت عملی ان کے اپنے حق میں اتنی فائدہ مند رہی کہ ان کے ذاتی اور گروہی مفادات کو ریاستی اور قومی مفادات پر ہر دم ترجیح ملنے لگی۔ اس لیے ان کے بعد آنے والی تمام حکومتیں بھی انھی پالیسیوں کی نقالی بڑی شد و مد سے کرنے لگیں۔ جن کے تسلسل نے غیروں کی غلامی سے بصد مشکل آزاد ہونے والے عوام کو ایک دفعہ پھر اپنے ہی خواص کا غلام بنا دیا۔ غیروں کی غلامی توڑنے میں انھیں قریباً ایک صدی لگی، مگر اپنوں کی غلامی کا طوق صرف ڈیڑھ دہائی میں ان کے گلے میں دوبارہ پڑ گیا، کیونکہ تین ہتھیاروں (آئین، قانون اور حُسنِ انتظام) سے ان کی من مانی کا راستہ روکنے والی بیوروکریسی اب ختم کر دی گئی تھی۔

ستانوے برس تک بڑی محنت سے سُوت کاتنے والی قوم کی جب مسلسل بدن دریدگی ہوتی رہی، تو اس کے ملبے سے ٹپکنے والی خرابی بسیار آج وطن کے مینار میں بڑی بدرنگی سے بکھری پڑی ہے، کیونکہ ہر ٹیڑھی اینٹ پر لگنے والی نئی اینٹ اس سے بھی زیادہ ٹیڑھی ہوتی تھی اور یہ سلسلہ تا دمِ تحریر جاری ہے۔ اس لیے وطن کے مینار کی بیرونی اُٹھان میں جابجا کجی ہے۔ اندرونی زندگی میں زلزلے ہیں اور ہر منزل کی فضا میں ایک بے نام سی تشویش تیرتی رہتی ہے۔ زیرِنظر رپورتاژ ان سب کا احاطہ نہیں کر سکتی لیکن بیوروکریسی کے قتلِ عمد سے پیدا ہونے والے نتائج کی چند جھلکیاں دکھلا سکتی ہے۔

حُسنِ انتظام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ریاست کی چوٹی پر بیٹھی ہوئی حکومت کا ہر فیصلہ بیوروکریسی کی افرادی سیڑھیوں سے درجہ وار نیچے اُترتا ہے اور ریاست کے کونے کونے میں مقامی اداروں اور کارکنوں تک پھیل جاتا ہے۔ انھی سیڑھیوں سے مقامی اطلاعات نیچے سے اُوپر کی طرف جاتی ہیں اور صحیح فیصلے کرنے میں حکومت کی مدد کرتی ہیں۔ افراد کی صلاحیتوں (merit) اور پیشہ ورانہ تربیت سے ہر سیڑھی کی چوڑائی کا تعین ہوتا ہے۔ منصبی نگرانی کے تناسب سے اونچائی بنتی ہے اور ڈسپلن کی عمودی واُفقی ترتیب ان سیڑھیوں کو مضبوط اور دیدہ زیب بناتی ہے۔ یہ چار سیڑھیاں افرادی صلاحیت، پیشہ ورانہ تربیت، منصبی نگرانی اور مضبوط ڈسپلن کی سیڑھیاں ہیں۔ جن پر ریاستی نظام اوپر تلے آتا جاتا ہے۔

ان تینوں حکومتوں کی من مانی والی اصلاحات نے ان تمام بنیادی اصولوں کو جب دانستہ توڑ ڈالا تو بغلی داخلے اور وفاداری کے دستورِ مختل میں صلاحیت غیرضروری ہوگئی۔ پیشہ ورانہ تربیت جانبدار ہو کر کبڑی ہوگئی۔ منصبی نگرانی ماند پڑنے لگی اور ڈسپلن من مانی کے پاؤں تلے روندا گیا۔ تب ساری انتظامی سیڑھی جھولنے اور ڈولنے لگ گئی اور ہر سیڑھی پر تعینات سرکاری ملازم خود کو سنبھالنے میں اتنا مصروف ہوگیا کہ سرکاری فرائض فراموش ہونے لگے اور سرکاری ادارے قانون کی بجائے مصلحتوں پر چلنے لگے۔ اس طرح سنہری دور کا حُسنِ انتظام درہم برہم ہوتے ہوتے بالآخر ایسی بدانتظامی تک پہنچ گیا کہ ہر سرکاری سطح پر فیصلوں نے آنکھیں موند لیں، جو تب کھلتیں جب بااثر ہاتھ ٹہوکا دیتے اور صرف اُدھر ہی دیکھتیں، جس طرف دیکھنے کا اشارہ دیا جاتا۔

قیامت کا ذکر چھڑ جائے تو شاعر کا تخیل محبوب کی جوانی تک پہنچ جاتا ہے لیکن انتظام کے حسن کی جواں موت کے بعد جو قیامتیں وطن کے مینار میں برپا ہونے لگیں وہ کسی تخیل کی پیداوار نہ تھیں، بلکہ سنگلاخ حقائق کے ایسے زوردار ہتھوڑے تھے جنھوں نے وطن کے مینار کو اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا اور دنیا اسے ناکام ریاست کہہ کر ہر آن اس کے گرنے کا انتظار کرنے لگی۔ چوری، ڈاکے، بھتے، قتل و غارت تو ان قیامتوں میں جھینگر کی کمزور آواز لگتے تھے۔ ان سے کئی گنا بڑے ایسے کبھی بم کا دھماکا بن کر گونجتے، کبھی بوری بند لاشیں بن جاتے۔ کبھی لاپتا افراد ہو جاتے۔ کبھی خودکش حملے بن کر خون میں لتھڑے ہوئے انسانی اعضا کو چنگاریوں کی طرح ہوا میں اُچھال دیتے۔ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ مسلم کلچر کے نام پر قائم ہونے والے اسلامی ملک میں مسجدیں مقتل بننے لگیں اور سجدوں میں جھکے ہوئے نمازیوں پر گولیاں برسنے لگیں۔ ایسے حالات پیدا ہونے کی وجوہات تو کئی ہو سکتی ہیں لیکن ان سب کا تدارک ایک غیر جانبدار اور قانون پرور بیوروکریسی ہی کر سکتی تھی جسے ایوب، یحییٰ اور بھٹو نے ساڑھے تیرہ برس تک اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کے نقلی وارث اب اُن ہی بااثر افراد کے غلام بنا دیے گئے تھے جن کے مفادات ان تمام عوام دشمن کارروائیوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ چنانچہ وطن کا مینار تاراج ہونے لگا۔ بدامنی کی وبا پھیلتی گئی اور بے ترتیب ریاست کی افراتفری سے مایوس ہونے والے شہری اپنی نجات خودسوزی اور خودکشی میں ڈھونڈنے لگے۔ ع

ہم کیا گئے کہ رونقِ محفل چلی گئی

آج کی اس ابتری کی بنیاد گزشتہ کل کے وہ اقدامات تھے جنھیں اُس وقت کی حکومتوں نے اپنی بری نیت چھپانے کے لیے ''اصلاحات'' کا نام دیا تھا اور تاریخ کا قتل عمد کرنے والے مؤرخوں نے اپنی کتابوں میں یہی نام قائم رکھا، لیکن دراصل یہ اصلاحات قوم و ملک کی ترقی و بہبود کے لیے نہ تھیں، بلکہ بااثر افراد کا اثر مزید بڑھانے کے لیے تھیں۔ اصلاحات کے پردے میں جو افسر برطرف کیے جاتے تھے ان میں سے کئی ایسے ہوتے تھے جنھوں نے ماضی میں ان کا اثر قبول کرنے سے انکار کیا تھا، جس کا بدلہ لینے کے لیے اب وہ گھر بھیجے جا رہے تھے۔ اس قسم کی ذاتی دشمنی کی بہت سی مثالیں تھیں جن میں سے صرف چند ایک یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ جو اس اصلاح کی چغلی کھاتی ہیں۔ ع

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

سید منیر حسین ۱۹۵۹ء میں ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے، تو کبھی کبھار ان کی ملاقات

صدر ایوب کے بھائی سردار بہادر خان سے ہو جاتی تھی۔ جو بلوچستان میں ایجنٹ ٹو گورنر جنرل (Agent to Governer General) رہ چکے تھے۔ ان کے بارے میں سید منیر حسین اپنی کتاب[۴] میں لکھتے ہیں (انگریزی سے ترجمہ):

> اگلی دفعہ وہ مجھے ملنے آئے تو ظفر الاحسن کے متعلق پریشان تھے۔ جو تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین رہ چکے تھے اور ان دنوں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن (PIA) کے سربراہ تھے۔ ظفر الاحسن کا نام بھی انڈین سول سروس (ICS) کے ان دس اعلیٰ افسروں میں شامل ہونے کی افواہ تھی، جنھیں صدر ایوب نے صفائی کا موقع دیے بغیر ملازمت سے نکال دیا تھا۔ سردار بہادر خان کے ظفر الاحسن سے گہرے دوستانہ مراسم تھے، اس لیے وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ ان کو برطرفی سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ ایک جونیئر (junior) آفیسر ہونے کی وجہ سے میں یہی تجویز کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بھائی صدر ایوب خان سے بات کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں انھوں نے بات کی بھی تھی لیکن جب برطرفیوں کی خبر شائع ہوئی تو ظفر الاحسن کا نام بھی ان میں شامل تھا۔ دراصل ان سینئر افسران کی برطرفی صدر ایوب کا آمرانہ فیصلہ تھا اور یہی تاثر دیتا تھا کہ ان تمام افسران کے خلاف ان کے دل میں کوئی پرانا عناد یا ناراضی تھی۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ باقی تمام اعلیٰ افسران تک پیغام پہنچ جائے کہ وہ اس مارشل لاء سے تعاون کریں اور اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں جب مقررہ مدت سے ایک سال پہلے ۱۹۷۷ء میں الیکشن ہوئے تو سید منیر حسین صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) میں چیف سیکریٹری تھے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد جنرل ضیا کا دور شروع ہوا، تو بقول مصنف:

> مارشل لا حکومت نے بھٹو کے خلاف اور اس کے ماتحت افسروں کے خلاف کئی قسم کی باز پرس شروع کر دی۔ بھٹو کی بدعنوانیوں کی تلاش میں افسروں سے طویل پوچھ گچھ ہونے لگی اور ان پر بے جا دباؤ ڈالا جانے لگا کہ وہ بھٹو پر ایسے الزام لگائیں جن کی وجہ سے جنرل ضیا کے مارشل لا کا جواز پیدا ہو سکے۔ ان یک طرفہ الزامات کی صحت مشکوک ہی رہی۔ کیونکہ اس تفتیش میں بھٹو کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ مجھ سے بھی اس انداز میں پوچھ گچھ ہوئی کہ اگر جان کی امان چاہتے ہو تو بھٹو کو قصوروار ثابت کرو۔ میں نے اپنا بیان تو ریکارڈ کروا دیا لیکن بھٹو پر کوئی الزام نہ لگایا۔ کیونکہ وہ جیل میں بند ہونے کی وجہ سے اپنی صفائی پیش کرنے کے قابل نہ تھا۔
>
> کسی شادی کے موقع پر میری ملاقات جنرل ضیا سے ہوئی، تو ان کے چہرے کی رعونت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں کیونکہ میں نے بھٹو پر کوئی الزام نہیں دھرا تھا۔ مجبور و بے بس سرکاری ملازموں پر اپنے سابقہ حاکموں کے خلاف الزام تراشی کے لیے بے جا دباؤ ڈالنا ایک انتہائی قبیح اور مکروہ پالیسی تھی۔ بالآخر

مجھے تبدیل کر دیا گیا اور شماریات ڈویژن (Statistics Division) کا سیکریٹری لگا دیا گیا۔ جو مارشل لا کے دور میں مرکزی حکومت کا انتہائی غیر اہم عہدہ تھا۔ میرے لیے یہ خیال سوہانِ روح تھا کہ ملک کی خدمت میں میری ملازمت کے پچیس برس مکمل طور پر فراموش کر دیے گئے تھے۔ لیکن جب میں اپنے سے اوپر ان سابق آئی سی ایس (ICS) افسروں کا حشر دیکھتا اور دیگر ۳۰۳ افسروں کا سوچتا جنھیں اپنی صفائی کا موقع دیے بغیر برطرف کر دیا گیا تھا تو اپنی نسبتاً بہتر حالت پر یہ صدمہ قابلِ برداشت ہو جاتا۔ میری زندگی میں یہ تیسرا موقع تھا جب فوج نے سول انتظامیہ کو مکمل طور پر دبوچ لیا تھا، اس لیے میں بڑی سنجیدگی سے استعفیٰ دینے پر غور کرنے لگا لیکن روزی کمانے کا متبادل باعزت ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے ان چند کلیوں پر ہی قناعت کر گیا۔

(ص: ۲۱۹ تا ۲۲۰)

دوسری مثال قدرت اللہ شہاب کی ہے جو صدر ایوب کے عہد میں تو ایوانِ صدر میں ملازمت کرتے رہے لیکن صدر یحییٰ آتے ہی اُن سے ایسے ناراض ہوئے کہ اگر وہ بیرونِ ملک کانفرنس میں جا کر اپنا استعفیٰ وہاں سے نہ بھیج دیتے تو صدر یحییٰ کے عتاب سے بچ نہ سکتے تھے۔ اس وقت ان کی مدتِ ملازمت میں نو برس باقی تھے۔ اس کی تفصیلات پہلے بتائی جا چکی ہیں۔[۵]

تیسری مثال بھی انگریزی کی ایک کتاب[۶] سے لی گئی جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد مگر حکومت قائم ہونے سے پہلے، پیپلز پارٹی کی قیادت نے ملک کی انتظامیہ پر رعب ڈالنا شروع کر دیا۔ ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد ڈویژن) میں پیپلز پارٹی کے چند کارکن زیرِ حراست تھے اور ان کے خلاف نقضِ امن کے مقدمات چل رہے تھے۔ انھی میں مختار رانا بھی شامل تھے جو اس الیکشن میں نیشنل اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ ان کے بارے میں ذوالفقار علی بھٹو نے کمشنر سرگودھا ڈویژن اسلم باجوہ کو فون کیا اور ان سب کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ کمشنر نے سمجھانا چاہا کہ یہ مقدمات لائل پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (ڈپٹی کمشنر) نے قائم کیے تھے اور ضابطہ فوج داری کے تحت کمشنر کے پاس کوئی ایسا قانونی اختیار نہیں ہے کہ وہ مقدمات میں مداخلت کر سکے۔ اس پر بھٹو صاحب غصے میں چلّا اُٹھے کہ، مجھے قانون مت سکھاؤ اور فون بند کر دیا لیکن دسمبر ۱۹۷۱ء میں اقتدار سنبھالتے ہی انھوں نے اسلم باجوہ کا نام اس فہرست میں شامل کر دیا جنھیں بھٹو حکومت نے برطرف کر دیا۔

یہ واقعہ تو مسندِ اقتدار پر بیٹھنے سے پہلے کا ہے لیکن آگے چل کر مصنف با اقتدار بھٹو کے بارے میں لکھتے ہیں

۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو ملک کے صدر بھی تھے اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ایوب اور یحییٰ نے اقتدار سنبھالتے ہی انتظامیہ کی جراحی کر کے خود کو مضبوط کیا تھا، ویسی ہی نشتر آزمائی

ان کے اپنے حق میں بھی مفید رہے گی اس لیے ایک نئے قانون (مارشل لا ریگولیشن نمبر ۱۱۴) کا نفاذ کر کے بڑی عجلت میں ۱۳۰۰ افسران کی ایک فہرست تیار کی اور وزیر سیاسی امور غلام مصطفیٰ جتوئی نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان افسران کے نام سنا کر برطرفی کا اعلان کر دیا۔ ان برطرف ہونے والوں میں سے بہت سے ایسے تھے جن کی دیانت اور اہلیت میں کوئی شک نہ تھا۔ بہت سے ایسے تھے جو اپنی اہلیت کی وجہ سے مشہور تھے اور بعض ایسے بھی جو فوت ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر مبشر حسن وزیر معاشیات ان دنوں نئی حکومت کے مرکزی ستون تھے۔ وہ خود اپنی کتاب[۷] میں تسلیم کرتے ہیں کہ برطرفیوں کی یہ فہرست بغیر کسی سلیقے کے بڑی لاپروائی سے بنائی گئی تھی۔ اس کے لیے وہ ڈاکٹر امتیاز قزلباش کی مثال دیتے ہیں، جنھیں چند ہی روز پہلے ڈاکٹر مبشر اور رفیع رضا نے مل کر واپڈا (WAPDA) کے چیئرمین کے طور پر منتخب کیا تھا اور وزیر اعظم بھٹو نے بھی اس کی منظوری دے دی تھی۔ ایک روز پہلے وہ اپنے متعلقہ وزیر سے (جو خود غلام مصطفیٰ جتوئی تھے) مل چکے تھے اور وزیر اعظم سے ان کی ملاقات کا وقت بھی مقرر ہو چکا تھا، لیکن اس شام جتوئی صاحب نے تھوڑا ہچکچانے کے بعد ان کا نام ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سنائی جانے والی فہرست میں پڑھ ڈالا کہ یہ کرپشن اور بدعنوانی کی بنا پر فارغ کیے جا رہے ہیں:

اس اعلان کے بعد ساری بیوروکریسی تو بجا طور پر دہشت کھا گئی لیکن فدوی قسم کے پریس نے بڑی مدح سرائی کی اور ایچ کے برکی نے پاکستان ٹائمز میں لکھا کہ حکومت نے آج ہماری کرپٹ انتظامیہ کے مردہ جسم کا بڑا حصہ کاٹ کر پھینک دیا ہے۔ (ص: ۹۸)

اس فہرست کے متعلق مجھے ایک متاثرہ افسر نے بتایا کہ ان کا نام اس وقت شامل کیا گیا جب جتوئی صاحب ریڈیو اور ٹی وی پر اعلان کر رہے تھے اور انھیں یہ نام ایک رقعے کے ذریعے غلام مصطفیٰ کھر، گورنر پنجاب کی طرف سے بھیجا گیا۔ اس کی تفصیل یہ تھی کہ وہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ (PWD) میں سپرنٹینڈنگ انجینئر (SE) تھے اور راولپنڈی میں تعینات تھے۔ جب صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) میں ایک سیاستدان ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں صوبائی اسمبلی کے ممبر چنے گئے اور بعد ازاں وہاں کے چیف منسٹر بن گئے۔ انھوں نے اس افسر سے کہا کہ وہ اپنے پیش رو ایس ای (SE) کا ایک پرانا آرڈر منسوخ کر دیں، جس کے مطابق ان کے والد کو دیا گیا ٹھیکہ کسی بے ضابطگی کی وجہ سے ختم کر دیا گیا تھا، لیکن انھوں نے قانونی بندشوں کی وجہ سے انکار کر دیا تو سیاستدان نے گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ سے شکایت کر دی، جس کا فوری نتیجہ وہ رقعہ اور برطرفی کا اعلان تھا۔

کچھ اسی قسم کا واقعہ ایک اور افسر کے ساتھ بھی پیش آیا، جن کا نام کسی با اثر شخصیت کی پرانی

ناراضی کی وجہ سے شامل کر دیا گیا۔ برطرفی کے اعلان کے بعد انھیں یہ صدمہ کھانے لگا کہ میں اپنے بچوں کا سامنا کیسے کروں۔ اسی صدمے کی شدت نے انھیں دل کا عارضہ دے دیا اور برخاست ہونے کے چند ماہ بعد وہ بچوں کے علاوہ باقی دنیا سے بھی اپنا چہرہ چھپا کر اپنی قبر میں اکیلے چھپ گئے۔

سویلین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھٹو نے ۱۳۰۰ افسران ملازمت سے نکالے تو روئیداد خان صوبہ سندھ میں چیف سیکریٹری تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر کے دوران بتایا کہ میرے پاس ایک افسر نے فریاد کی کہ مجھے ایس پی حیدر آباد کے طور پر برخاست کیا گیا ہے، مگر میں تو کبھی وہاں تعینات ہی نہ رہا تھا۔ چھان بین کی گئی تو پتا چلا کہ اس نام اور عہدے کے دو افسر تھے لیکن مغالطہ ان کی تعیناتی کے بارے میں ہوا۔ صحیح فیصلے پر پہنچنے کے لیے جب ادھر اُدھر رابطے کیے گئے تو معاملہ بھٹو صاحب تک جا پہنچا۔ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ ان دونوں میں سے جو زیادہ کالے رنگ کا ہے اسے نکال دو۔

ان ''اصلاحات'' کی اصل حقیقت بتانے کے لیے کئی اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں اور ان سب کی مخفی حقیقت یہی ہے کہ جہاں کئی نااہل اور بدعنوان افسر برطرف ہوئے وہاں بہت سے دیانتدار اور اہلیت والے افسران بھی نکال دیے گئے، جس سے یہ نئی رسم پڑی کہ ''اصلاحات'' کی آڑ میں بے کردار بااثر لوگ باکردار اور بے بس ملازموں کو دبوچنے کے قابل ہو گئے اور ان کی برطرفی، ذلت اور خواری سے اپنا زور اور اس زور کا شر مزید پھیلانے لگے۔

یہ رسم نئی تھی، مگر روایت پرانی تھی۔ قصے کہانیوں کی اساطیری روایت کی طرح کہ بدی کے دیوتاؤں کو اپنی مضبوطی کے لیے کنواری لڑکیوں کی قربانی کی ضرورت ہوتی تھی۔

ایوب، یحییٰ اور بھٹو اس نئی رسم کے مشترکہ موجد تھے اور بعد میں آنے والے تمام حاکم انھی کی پیروی میں اپنی من مانی چلاتے رہے اور آئین اور قانون کے رکھوالے ہونے کے باوجود انھیں خود ہی کچلتے رہے۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے بدی کے دیوتا مزید کنواریاں مانگتے رہے۔ اس طرح ایک نیا کاذب مذہب پھیلتا گیا، جس میں اہلیت، قابلیت اور دیانت والے لوگ ایسے گناہگار قرار دیے گئے جنھیں یہ مذہب واجب القتل ٹھہراتا تھا اور قتل کرنے کا حق ہر بد دیانت اور بدعنوان طالع آزما کو دیتا تھا۔ اس مذہب میں افراد کے ساتھ اقدار بھی قتل ہونے لگیں۔ چنانچہ راست قدم افراد اور راست روی کی اقدار کا قتلِ عام آج بھی جاری ہے ؏

خشتِ اوّل گر نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ترجمہ: اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی لگاتا ہے تو دیوار آسمان تک بھی ٹیڑھی ہی جائے گی۔

اقدار کی اس خلا میں اب کشتگانِ مصلحت کی فہرستیں ریڈیو پر سنانے کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ ہر راست باز خود بخود ان گڑھوں میں گر جاتا ہے، جو نئے ماحول میں جا بجا کھدے ہوئے ہیں۔ اس کی مثالیں قدرے مختلف قسم کی ہیں لیکن چند ایک کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

پہلی مثال خواجہ محمد احمد صمدانی (ریٹائرڈ جسٹس صمدانی) کی ہے جو ۱۹۵۴ء میں سول سروس (CSP) میں شامل ہوئے۔ پھر پرانے مروجہ قانون کے تحت ۱۹۶۱ء میں وہ اپنا راستہ بدل کر انتظامیہ سے عدلیہ میں چلے گئے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ پنجاب ہائی کورٹ کے جج تھے۔ جب جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو پہلے تو ۵ رجولائی کو برطرف کیا۔ پھر ۳ رستمبر کو انھیں نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ بھٹو کی درخواستِ ضمانت جسٹس صمدانی کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے درخواست منظور کرتے ہوئے ۱۳ رستمبر کو انھیں ضمانت پر رہا کر دیا۔ بھٹو کو تو چار روز بعد ۱۷ رستمبر کو ایک مارشل لا آرڈر کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیا گیا لیکن ساتھ ہی ۲۲ رستمبر کو مارشل لا کے تحت عدلیہ کی آزادی پر بھی ہاتھ ڈال دیا گیا۔ چنانچہ ۲۳ رستمبر کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو فارغ کر دیا گیا اور نئے چیف جسٹس تعینات کر دیے گئے۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد جسٹس صمدانی کو جج کے فرائض سے تبدیل کر کے مرکزی حکومت میں سیکریٹری قانون لگا دیا گیا۔ وہاں کی ایک رُوداد ان کی آپ بیتی[8] میں یوں درج ہے:

> دوسرے دن سیکریٹریٹ میں صدر صاحب نے تمام وزرا اور سیکریٹریز کی ایک میٹنگ بلائی ہے۔ اس میٹنگ میں ضیاء الحق نے سیکریٹریز کی نسبت سے کچھ نہایت ہی نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ کوئی سینئر سیکریٹری اس کا جواب دے گا۔ لیکن کسی نے زبان کھولنے کی زحمت نہ کی۔ سو بالآخر مجھے ہی جواب دینا پڑا۔ ویسے تو جواب خاصا لمبا چوڑا تھا جو مجھے اب یاد بھی نہیں۔ البتہ وہ سارے الفاظ میں نے جرنیلوں کے حوالے سے لوٹا دیے جو ضیاء الحق نے سیکریٹریز کے حوالے سے استعمال کیے تھے۔ جب میں خاموش ہوا تو کچھ دیر سناٹا رہا۔ پھر ضیاء الحق نے میٹنگ کے بعد مجھ سے اکیلے میں ملنے کی خواہش کی اور میٹنگ دوبارہ شروع ہو گئی۔ جب میٹنگ ختم ہوئی تو چائے تھی، چائے کے دوران بعض سینئر افسروں نے مجھے اس بات کی ترغیب دینے کی کوشش کی کہ میں معافی مانگ لوں۔ میں نے ان حضرات سے معذرت کی اس لیے کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جب تنہائی میں میری میٹنگ ضیاء الحق سے ہوئی تو انھوں نے بھی چاہا کہ میں معافی مانگ لوں اور معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ میری تجویز یہ تھی کہ میٹنگ دوبارہ بلوائی جائے (جو اس لیے ممکن تھا کہ تمام وزرا اور افسران ابھی وہیں موجود تھے) پہلے ضیاء الحق اپنے کہے کی معافی مانگے، بعد میں میں بھی اپنے کہے کی معافی مانگوں۔ اس پر ضیاء الحق صاحب راضی نہیں تھے۔ چنانچہ میں بھی معافی مانگنے یا اپنے الفاظ واپس

لینے پر آمادہ نہ ہوا اور معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ یہ واقعہ یکم اپریل ۱۹۸۰ء کا ہے۔

یکم جولائی ۱۹۸۰ء کو میں واپس اپنے ہائی کورٹ میں آ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اپنے گھر آ گیا ہوں لیکن یہ احساس زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں فوجی حکومت نے اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کے لیے ایک نیا حلف ایجاد کیا لیکن اس کا متن شائع نہیں کیا۔ البتہ یہ ضرور کہا گیا کہ جو یہ نیا حلف نہیں اُٹھائے گا یا جس کو یہ نیا حلف نہیں دیا جائے گا وہ جج کے عہدے سے برطرف سمجھا جائے گا۔ حلف برداری کی تاریخ ۲۴ / مارچ مقرر ہوئی۔ اس دن صبح عدالت ہی میں سب جج اکٹھے ہوئے اور رجسٹرار سے کہا کہ گورنر ہاؤس سے حلف کا متن منگوائے۔ کچھ دیر بعد رجسٹرار نے آ کر رپورٹ دی کہ گورنر نے متن بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب حلف پڑھا جائے گا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ بعض ججوں نے گورنر ہاؤس جانے ہی سے انکار کر دیا۔ میری یہ رائے تھی کہ حلف کا متن جانے بغیر حلف اُٹھانے سے انکار کرنا مناسب نہیں، ہو سکتا ہے کہ حلف میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہو۔ اگر ہوئی بھی اور وقت کے دباؤ کے تحت قابلِ اعتراض حلف اُٹھانا بھی پڑے تو فوراً بعد استعفیٰ بھی دیا جا سکتا ہے۔ (واضح رہے کہ جج کا استعفیٰ فوراً ہی موثر ہو جاتا ہے اس کے قبول نہ کیے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) چنانچہ میں ان ججوں میں شامل ہو گیا جو گورنر ہاؤس گئے تھے۔ وہاں جب تمام جج صاحبان حلف برداری کے لیے بلائے جانے کا انتظار کر رہے تھے اُس وقت کے چیف جسٹس صاحب نے مجھے پیغام بھجوایا کہ آپ حلف لینے کے لیے نہ آئیے۔ ایسا پیغام دو اور جج صاحبان کو بھی پہنچایا گیا۔ میں اس بات سے مطمئن ہو گیا کہ اب حلف نہ لینے کی ذمے داری مجھ پر نہیں رہی۔ ہم تینوں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میں نے گھر پہنچتے ہی جو سرکاری گاڑی میرے پاس تھی وہ ہائی کورٹ کو واپس بھجوا دی۔ دوسرے دن صبح سویرے چیف جسٹس صاحب کا فون آیا کہ وہ گاڑی لے کر میرے پاس آ رہے ہیں۔ جب وہ آئے تو میں نے وجہ پوچھی۔ فرمانے لگے کہ مجھے حلف نہ دینا ایک غلط فہمی کی بنا پر تھا اور ترغیب دے رہے تھے کہ میں دوسرے تیسرے دن ان ججوں کے ساتھ حلف اُٹھا لوں جنھیں لاہور سے باہر ہونے کی وجہ سے حلف نہیں دیا جا سکا تھا۔ میں نے چیف جسٹس سے عرض کیا کہ اب تو میں حلف کا متن پڑھ چکا ہوں جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ وفاداری دستور سے نہیں بلکہ فوجی حکومت سے ہو گی۔ اس لیے میں ایسا حلف اُٹھانے سے قاصر ہوں۔ جب میں نہ مانا تو انھوں نے میری بیوی کے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن میری بیوی نے بھی یہ کہہ کر میرا ساتھ دیا کہ صمدانی صاحب جو فیصلہ بھی کریں میں ان کی حمایت کروں گی۔ ایسے نازک موقع پر ایسی حمایت بہت معنی رکھتی ہے جس کے لیے میں اپنی بیوی کا عمر بھر ممنون رہوں گا۔

اس کے بعد جسٹس صمدانی نے وکالت شروع کی لیکن انھیں نئے ماحول سے تقویت نہ ملی۔ بیوروکریسی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں حُسنِ انتظام (Good governance) کا نشان بھی

باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے زندگی کا ہر شعبہ آلودہ ہونے لگا تھا اور بااصول فرد کی وکالت ایسے نہیں چل سکتی تھی جیسے بگڑے معاشرے سے سمجھوتا کرنے والے کسی بے اصول شخص کی چلتی ہے۔ لہٰذا وہ رزقِ حلال کمانے کی تگ و دو میں ہی فوت ہو گئے اور ان ستاروں میں شامل ہو گئے جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا ع

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

دوسری مثال ریٹائرڈ جنرل تنویر احمد نقوی کی ہے۔ جن کے متعلق امین اللہ چودھری نے اپنی کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے[۹] کہ ۱۹۹۷ء میں[۱] ان کا رحیم یار خاں ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے جھگڑا ہو گیا۔ کیونکہ اس نے زرعی اراضی کی مشکوک خرید و فروخت میں اپنی آنکھیں بند کر کے نقوی صاحب کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پہ انھوں نے دھمکی دی کہ ایسے تمام ڈپٹی کمشنروں کو سیدھا کرنے کی ضرورت ہے جو کسی کی مدد نہیں کر سکتے۔

۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف اقتدار میں آئے تو جنرل نقوی کی سربراہی میں ایک نیا محکمہ" قائم کر دیا گیا جو ریاست کے تمام اداروں کی ''تعمیرِ نو'' کر سکے۔ (فوج کے علاوہ) نئی تعمیر دراصل اسی گلشن کے بندوبست کی بھونڈی نقل تھی جس کے پہلے بیج جنرل ایوب خان نے بوئے تھے کہ بنیادی جمہوریت کی آڑ میں عوامی سطح پر ایسا گروہ ترتیب دیا جائے جس کی وفاداریاں نت نئی مراعات سے خریدی جاتی رہیں اور ان کے اقتدار کو ایسا دوام مل سکے کہ ؎

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس
(غالب)

لیکن صدر ایوب کے پرانے بندوبست کا رنگِ دیگر یہ تھا کہ اب اس میں جنرل نقوی کا اپنا ایجنڈا بھی شامل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۴ / اگست ۲۰۰۱ء کو نئی ''اصلاحات'' میں ڈپٹی کمشنر کا عہدہ بالکل ہی ختم کر دیا گیا اور اس کے کچھ فرائض عدلیہ کو اور کچھ فرائض پولیس کو منتقل کر دیے گئے۔ اس طرح ضلعی انتظامیہ کی نگران انتظامیہ اور کمشنر کے عہدے کو بھی ختم کر دیا گیا۔ اب ضلع کے سربراہ کو ''ناظم'' کا نام دیا گیا جسے عوام چار برس کے لیے الیکشن کے ذریعے چنتے تھے۔

۲۰۰۱ء میں ناظمین کا الیکشن ہو چکا تو صورتِ حال یہ بن گئی کہ ہر ضلع کے ناظم کا انتخاب کسی نہ کسی سیاسی یا مذہبی پارٹی کی سرپرستی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ چنانچہ، یہ عہدہ ایک غیر جانبدار انتظامی عہدہ نہ رہا، بلکہ سیاسی پارٹیوں کا جانبدار اور مشکور نمائندہ بن گیا۔ اس سے انتظامی کھچڑی یہ پکی کہ وہ

کسی ضلع میں ایک پارٹی کا نمائندہ ہوتا اور کسی ضلع میں دوسری تیسری اور چوتھی پارٹی کا نمائندہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناظمین خالص انتظامی فیصلے معروضی انداز میں کرنے سے کترانے لگے اور اس کی بجائے اپنی پشت پناہی کرنے والی سیاسی پارٹی کی مقامی مضبوطی کے لیے فیصلے کرنے لگے۔

اس رویّے کی قلعی خاص طور پر ہنگامی حالات میں کھل جاتی۔ آزاد کشمیر اور خیبر پختونخوا میں اکتوبر ۲۰۰۵ء کا تباہ کن زلزلہ ہو یا کراچی کے فرقہ وارانہ فسادات میں ساٹھ لوگ مارے جائیں یا ۱۴ رفروری ۲۰۰۶ء کو ڈنمارک میں گستاخانہ کارٹون کے خلاف احتجاج میں بے قابو ہجوم لاہور کو تباہ و برباد کر دے۔ ناظمین کو نہ تو اس سے کوئی سروکار تھا اور نہ ہی وہ کہیں نظر آتے تھے کہ حالات کو سنبھال سکیں۔ چنانچہ ۲۹ ردسمبر ۲۰۰۷ء کو پولیس نے وکلا اور نیوز میڈیا والوں کے پُرامن جلوس کو منتشر کرنے کے لیے وحشیانہ تشدد کیا اور سپریم کورٹ کے آس پاس اور اندر باہر کو آنسو گیس سے ڈھانپ دیا لیکن ناظم کہیں نظر نہ آئے۔ اسی طرح ۲۸ ردسمبر ۲۰۰۹ء کو کراچی میں محرم کے جلوس پر بم پھینکے جانے کے بعد شہر میں وسیع پیمانے پر لوٹ مار ہوتی رہی، مگر کہیں بھی ضلعی انتظامیہ یا ناظم حالات کو سدھارتے ہوئے نظر نہ آئے۔[۱۲] اُس زمانے میں یہ قصہ بہت مشہور ہوا کہ کوئٹہ میں ایک جلوس سے مذاکرات کا مرحلہ درپیش آیا تو اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ناظم ان کا سامنا کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس لیے موقع کی نزاکت کو سنبھالنے کے لیے پی ڈبلیو ڈی (PWD) کے ایک ایگزیکٹو انجینئر (XEN) کو مذاکرات کے لیے استعمال کیا گیا، جو خوش قسمتی سے کامیاب بھی ہو گئے۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے جنرل نقوی کی اصلاحات کے نقائص اپنے منہ سے بولنے لگے اور ہر جگہ ماضی کے ڈپٹی کمشنر اور مجسٹریٹوں کی کمی محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۵ء کے بعد ضلعی ناظم کے انتخاب کے لیے کوئی الیکشن نہ ہو سکے۔ ۲۰۰۷ء میں جنرل مشرف کے زوال اور اخراج کے بعد ان کا اصلاحات والا سسٹم بھی دھیرے دھیرے ٹوٹنے لگا اور بالآخر یکے بعد دیگرے تمام صوبوں میں ضلعی انتظامیہ کا پرانا سسٹم بحال ہونے لگا اور مجسٹریٹ، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر دوبارہ فعال ہو گئے۔

تیسری مثال علاء الدین صاحب کی ہے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ سول سروس کے بہترین افسروں میں شمار ہوتے تھے۔ جنرل ضیا نے ۱۹۷۷ء میں جب تیسرا مارشل لا نافذ کیا تو وہ مرکزی حکومت میں انڈسٹری ڈویژن کے سیکریٹری تھے۔ مارشل لا کے نفاذ کے چند ہی روز بعد کوئی سرمایہ کاران کے پاس مشورے کے لیے آیا کہ وہ کس شعبے میں سرمایہ کاری کرے تو انھوں نے جنرل ضیا کے مسلسل اعلان کا حوالہ دیا کہ ۹۰ دن بعد الیکشن کرا دیے جائیں گے۔ اس لیے وہ بدلتے ہوئے

حالات کا خود ہی جائزہ لیتے رہیں اور نئی سرمایہ کاری کے بارے میں خود ہی اپنا میدان چن لیں۔

محاورہ ہے ''تل کی اوٹ پہاڑ''... جنرل ضیا کا ۹۰ دن والا اعلان بھی بدنیتی کا ایک تل تھا۔ جو مارشل لا کے اعلان کے ساتھ ہی قوم کی آنکھ کی پتلی پر رکھ دیا گیا تھا، اس لیے اب قوم جنرل ضیا کا کوئی بھی روپ دیکھنے اور پہچاننے کے قابل نہ تھی۔

پہلا روپ وہ تھا جو زبانِ خلق پر کئی کہانیوں کی شکل میں رہتا تھا کہ بہ حیثیت سپہ سالار وہ وزیراعظم بھٹو کی بارگاہ میں اپنی وفاداری جتانے کے لیے کیا کیا جتن کرتے تھے۔ دوسرا روپ ایک مصلح کا بھیس تھا کہ ۹۰ دنوں بعد الیکشن کرا دیے جائیں گے اور تیسرا روپ منافقت کا وہ پیکر تھا جو نوّے دن بعد اگلے دس برس تک وطن کے مینار پر یلغار کرتا رہا۔ اس یلغار میں بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ کھلی من مانیوں کے لیے پوری جابرانہ قوت سے ہراسانی پھیلائی گئی۔ لوگوں کے ہجوم کے سامنے مخالفوں پر کوڑے برسائے جاتے تو ساتھ ساتھ لاؤڈ اسپیکر پر قومی ترانے لگائے جاتے اور شامیانوں تلے بیٹھے ہوئے مدعوئین ہر کوڑے کی داد دیتے جاتے۔ ۱۹۷۱ء والے سابقہ مشرقی پاکستان کی طرح اب باقی ماندہ پاکستان میں بھی افراد لاپتا ہونے کی رسم پڑ گئی۔ جس گمشدہ اور دھتکارے ہوئے مولوی کو لیاقت علی خان نے ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کے ذریعے دوبارہ برآمد کیا تھا اور بھٹو نے اسے قوم کے کندھے پر بٹھایا تھا، اب جنرل ضیا نے اسے قوم کے سر پر سوار کرا دیا۔ جس سے اقبال کا ''دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد'' والا مصرع حقیقی فرقہ واریت کا روپ دھارنے لگ گیا۔ پرانی بیوروکریسی تو ۱۹۷۳ء میں ہی مرحوم ہو چکی تھی لیکن اس کے نئے اور مختلف ورثا سے بھی پچھلی حکومتوں والا زنا بالجبر جاری رہا۔ چنانچہ جس جشنِ عام میں مخالفوں کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے تھے وہیں ایک ریٹائرڈ آفیسر اور سابقہ ڈپٹی کمشنر کو چبوترے پر چڑھا کر اس کا منھ کالا کیا گیا۔ مزید برآں بھٹو نے بیوروکریسی میں جیالوں کے بغلی داخلے (Lateral Entry) کے لیے جو نظام بنایا تھا وہ ختم کر دیا گیا اور اس کی بجائے بیوروکریسی کے تمام پھاٹک فوجیوں کے بغلی داخلے کے لیے پوری طرح کھول دیے گئے۔ نئے بندوبست میں نہ صرف فوجیوں کے بغلی داخلے کا کوٹا بڑھا دیا گیا بلکہ ہر قابلِ ذکر سویلین عہدے اور ادارے پر حاضر سروس فوجی تعینات ہونے لگے، جو کچھ عرصہ سویلین اختیارات کا جھولا جھولتے رہتے۔ پھر فوج میں واپس چلے جاتے۔ جھولنے کے دوران حُسنِ انتظام کی جگہ ''میرے انتظام'' کی سنگین زمین میں کھبو کر اسے خدائی حکم قرار دیتے رہے لیکن ؎

سنگ تو سا گر رہے گا سنگ ہی
پوجے جانے سے خدا ہوتا نہیں (محمد ندیم ساگر)

چنانچہ جنرل ضیاء خدائی نمائندے نہ بن سکے۔ صرف منافقانہ سنگ باری کرنے والے "مردِ مومن" ہی کہلا سکے۔ وہ بڑی بے رحمی سے قوم کو اپنے اقتدار کی پوجا پر مجبور کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اصل خدا نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔

اس منافقانہ سنگ باری کی زد میں علاء الدین بھی آ گئے۔ میں نہ صرف اس کا عینی شاہد تھا۔ بلکہ بارشِ سنگ کی شدت سے بچنے کی کوشش میں اپنی مرضی کے خلاف کسی محفوظ اوٹ میں پناہ لینے پر بھی مجبور ہو گیا جس کے احوال درجِ ذیل ہیں۔

میں اُن دنوں مرکزی حکومت میں جوائنٹ سیکریٹری (Joint Secretary) تھا اور پاکستان کے لیے بیرونی قرضوں پر گفت وشنید اور معاہدوں کے لیے کبھی واشنگٹن میں عالمی بینک (World Bank) اور کبھی منیلا (Manila) میں ایشین ڈیویلپمنٹ بینک (Asian Development Bank) جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کسی متنازع اور کٹھن قرضے کے لیے مجھے منیلا میں بڑے مشکل مذاکرات کرنے پڑے اور جب تمام مراحل کامیابی سے طے ہو گئے تو بینک کی طرف سے مجھے عارضاً (On Deputation) بینک میں ملازمت کی پیشکش کی گئی[13] لیکن تھوڑی بات چیت کے بعد میں نے معذرت کر لی، کیونکہ ان کی مراعات میری توقعات سے کم تھیں۔ واپس آیا تو کچھ ہفتوں کے بعد انھوں نے تھوڑے اضافے کے ساتھ اپنی پیشکش تحریری طور پر بھجوا دی۔ تو میں نے دوبارہ انکار کرتے ہوئے اپنا تحریری جواب تیار کر لیا لیکن ابھی ڈاک کے سپرد نہیں کیا تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق سول سیکریٹریٹ تشریف لا رہے ہیں، جہاں وہ تمام سینئر افسران سے خطاب کریں گے۔

پلاننگ کمیشن کے آڈیٹوریم میں ڈیڑھ دو سو افسران بیٹھے تھے۔ کافی انتظار کے بعد صدرِ پاکستان فوجی وردی میں آئے اور سب کو گھورتے ہوئے اسٹیج پر بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ہی باوردی کرنل صدیق سالک بھی بیٹھ گئے۔

یہ ۱۹۷۹ء کا دوسرا نصف حصہ تھا۔ مارشل لا دو برس گزار چکا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو پھانسی پا چکے تھے۔ کوڑوں کے تسلسل اور شدت سے فوجی اقتدار کی گرفت اب بند تالے کی طرح مضبوط ہو چکی تھی اور صدرِ مملکت کی خاموش بدن بولی (body language) اس گرفت کی پوری گواہی دے رہی تھی۔ سہمی ہوئی فضا میں خطاب شروع ہوا۔ تو لب و لہجے میں رعونت تھی اور ہر فقرے کے ہر لفظ میں حاکمیت کی دھمک تھی۔ خطاب کا لب لباب یہ تھا کہ ہم اس ملک کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ لوگ تعاون نہیں کر رہے۔ بلکہ ہمارے مشن کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں پہلے آپ کو ٹھیک

کرنا ہوگا۔ بیخ کنی کی مثال یہ دی گئی کہ کسی نے ایک افسر سے سرمایہ کاری کے لیے رہنمائی چاہی تو اُنھوں نے صحیح مشورہ دینے کی بجائے انتظار کرنے کو کہا۔ یہ موجودہ حکومت سے کھلا عدم تعاون ہے۔ صدرِ مملکت نے نہ تو افسر کا نام بتایا نہ ہی بتایا کہ یہ واقعہ کب کا ہے لیکن سب لوگ سمجھ گئے کہ یہ مشورہ سیکریٹری انڈسٹریز سے ہی کیا جا سکتا ہے (جو اس وقت سامعین میں موجود تھے) اور یہ واقعہ مارشل لا کے پہلے ۹۰ دنوں میں ہوا ہوگا۔ جب پوری قوم الیکشن کی تاریخ کا انتظار کر رہی تھی... اس مثال کے بعد باقی خطاب ایک مسلسل تنبیہ، فہمائش اور دھمکی تھی کہ اب بیوروکریسی کے عدم تعاون کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔

میٹنگ ختم ہو گئی، مگر تمام حاضرین پر فردِ جرم عائد ہو چکی تھی۔ جس کے بعد کسی بھی افسر کو کسی بھی وقت کوئی بھی سزا دی جا سکتی تھی۔ بداعتمادی اور عدمِ تحفظ کے بوجھ تلے چلتا چلتا میں کمرے میں پہنچا تو یہ سوچ اُبھری کہ اس کرسی کی بقا کو بھٹو نے ہردم فنا کے خطرے سے دوچار کیا تھا لیکن اب تو اس فنا کا محاصرہ زیادہ مضبوط اور گھیرا مزید تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اعلیٰ کارکردگی والی ملازمت کے آخری حصے میں علاء الدین جیسے راست قدم افسر کا گریبان کھینچا گیا ہے تو نہ معلوم میرا کل اور پرسوں مجھے کیا دکھا سکتا ہے۔ جب ملازمت میں پندرہ برس کا سفر باقی ہے۔

دفتر کا وقت ختم ہو گیا تو یہ سوچ بھی میرے ساتھ ہی گھر آ گئی... رات بھر میرے ذہن کے ہر کونے کھدرے میں ناچتی رہی... اگلی صبح اسی کے ہمراہ دفتر پہنچا تو گزشتہ روز انکار والا جو خط مکمل کیا تھا اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور ایشین ڈیویلپمنٹ بینک کو بذریعہ ٹیلکس[14] (telex) اطلاع کر دی کہ مجھے ان کی پیشکش قبول ہے۔

مشیت فیصلے تو ہم سے ہی کرواتی ہے مگر ان فیصلوں کی سمت کا تعین خود کرتی ہے۔ کل اگر جنرل ضیاء الحق کا اچانک خطاب نہ ہوتا تو انکار کا یہ خط کل ہی ڈاک کے حوالے ہو چکا ہوتا لیکن آج اس کی سمت بالکل ہی اُلٹی ہو گئی۔

دفتری کارروائی میں کچھ عرصہ لگا اور پھر میں منیلا منتقل ہو گیا لیکن آنے جانے والوں سے علاء الدین صاحب کے متعلق خبریں ملتی رہیں۔ انھیں انڈسٹریز ڈویژن کے سیکریٹری جیسی اہم پوسٹ سے ہٹا دیا گیا اور ایک بالکل نئے حقیر سے دفتر کا انچارج بنا دیا گیا۔ جو زکوٰۃ فاؤنڈیشن کے نام سے مولویوں کو خوش کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور وزارتِ زکوٰۃ کا موہوم سا دم چھلہ تھا۔ اس کا جملہ اسٹاف ایک ڈپٹی سیکرٹری، دو سیکشن آفیسر اور چند کلرکوں پر مشتمل تھا[19] اور اس کا کام صرف اتنا تھا کہ زکوٰۃ پر پلنے والے اداروں کو چند مخصوص اخراجات (جن پر مولویوں کی تشریح کے مطابق زکوٰۃ خرچ

کرنا ممنوع تھا) کے لیے قومی بجٹ میں سے صرف پانچ لاکھ روپے کی گرانٹ دے سکے۔ مرکزی حکومت میں باقاعدہ تعیناتی کی بجائے یہ کھڈا لائن کی پناہ گاہ شمار ہوتی تھی، جہاں بعد میں بھی ہمیشہ ایسے ہی افسران تعینات ہوتے رہے، جن سے حکومتیں ناراض ہو جاتیں اور انھیں دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بنانے پر تُل جاتیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ علاء الدین بالآخر اس عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

عرصے بعد میرے اور علاء الدین صاحب کے ایک مشترکہ دوست نے بتایا کہ عمر بھر انتہائی دیانتدار افسر رہنے کے بعد وہ ریٹائر ہوئے، تو اس زمانے کی محدود سی پنشن کی وجہ سے مالی تنگ دستی کا شکار رہے، جس کی وجہ سے بڑھاپے اور بیماری میں اپنے علاج معالجے میں بھی کافی مشکلات پیش آتی رہیں اور صرف موت ہی انھیں چھٹکارا دلا سکی۔

میں نے تو یہاں صرف تین مثالیں پیش کی ہیں لیکن اس قسم کے واقعات کا بے شمار افسروں کو سامنا کرنا پڑا، جو نہ تو تحریر میں آئے نہ لوگوں کی تحسین میں اُبھرے۔ پاکستان کے سنہری زمانے کے ان راست قدم اور راست کردار افسران کو ''اصلاحات'' لانے والی حکومتوں نے کج رو قرار دے دیا اور انھیں ''اصلاحات'' کے کھودے ہوئے گڑھوں میں دھکیل دیا۔ انگریزی میں ایسے افراد کے لیے unsung heroes کا محاورہ مشہور ہے لیکن ہماری ''اصلاحات'' کہتی ہیں۔

فقیہِ شہر بولا بادشاہ سے
بڑا سنگین مجرم ہے یہ آقا
اسے مصلوب کرنا ہی پڑے گا
کہ اس کی سوچ ہم سے مختلف ہے

سوچ کا یہ اختلاف دراصل افسروں کے ذہن کی وجہ سے نہیں تھا، کیونکہ حُسنِ انتظام کا فروغ تبھی ممکن ہے، جب حاکموں اور اہلکاروں کی سوچ ایک ہی ہو اور عوام دوست ہو۔ جس طرح قائداعظم کے مختصر دورِ حکومت میں تھا، لیکن پاکستان میں جب حاکموں کی نیت میں یہ فتور آنے لگا کہ ان کے ذاتی اور گروہی مفادات کو قوم و ملک کے مفادات پر ترجیح ملنی چاہیے تو یہ ہم آہنگی مطلق العنانی کی ان اُمنگوں اور چھلانگوں سے ختم ہونے لگی جو آئینی، قانونی اور اخلاقی حدود کو پار کرتی رہتی تھی۔ حاکموں کی یہ من مانیاں تب سے اب تک افسروں کو سولی پر چڑھاتی رہیں اور جو بچتے رہے وہ صرف اس وجہ سے بچے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو خود ہی معطل اور کند کر دیا تھا، تاکہ وہ کہیں بھی سوچ سے اختلاف والے کلہاڑے کی چوٹ نہ کھا سکیں۔ گزرتے ماہ و سال کے ساتھ صلاحیتوں کی یہ

خودکشی اتنی بڑھ گئی کہ نومبر ۲۰۱۴ء میں میاں نواز شریف وزیراعظم پاکستان نے اعتراف کیا کہ حکومت کے پاس ایسے افسروں کی انتہائی کمی ہے جن میں امورِ مملکت چلانے کی اہلیت ہو[۱۶]... ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا... لیکن ان کی پشیمانی بھی اس نااہلی کی ذمے داری بیوروکریسی پر ڈال رہی تھی اور وہ لمحہ بھر کے لیے بھی یہ سوچنے کو تیار نہ تھے کہ گزشتہ نصف صدی میں ان ہی کے ایوانِ اقتدار سے بار بار گرنے والی ''اصلاحات'' کی بجلیوں نے ساری بیوروکریسی بھسم کر دی تھی ؏

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا (غالب)

نہ ہی وزیراعظم اپنے مطلق العنانی والے غیر آئینی اطوار بدلنے کو تیار تھے۔ اس لیے کچھ عرصے بعد اسلام آباد ہائی کورٹ کو یہ فیصلہ دینا پڑا کہ حکومت نے اعلیٰ عہدوں پر جو ۴۰۰ ترقیاں دی ہیں وہ خلافِ قانون ہیں اور قواعد وضوابط کا مذاق اُڑاتی ہیں۔[۱۷] فاضل عدالت نے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ اعلیٰ افسروں کی ترقی کے فارمولے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ اپنے من پسندوں کو نوازا جا سکے۔

عدالت کا یہ فیصلہ ماضی کے اسی ایک جملے کی گونج تھا جو اکیاون برس پہلے پاکستان کے باوردی وزیر دفاع جنرل ایوب خان نے لندن کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر لکھا تھا کہ ''سرکاری ملازمین کے طرزِ عمل تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ انھیں فوری طور پر سزا بھی دی جا سکے اور انعام سے بھی نوازا جا سکے۔''[۱۸] یہ جملہ نظم ونسق کے بنیادی تصور پر پہلا پتھر تھا۔ جو بعد کی مسلسل سنگ باری سے بالآخر تہس نہس ہو چکا تھا۔

یہ جملہ لکھے جانے کے باسٹھ برس بعد اکتوبر ۲۰۱۶ء میں چیف جسٹس آف پاکستان کے ریمارکس یہ تھے کہ پاکستان میں اب بادشاہت ہے جمہوریت نہیں ہے۔

قدرت کا اٹل قانون ہے کہ ؏

از مکافاتِ عمل غافل مشو

(اپنے اعمال کے نتائج سے غفلت نہ برتو)

تینوں کے سائے میں گزرے ہوئے ساڑھے تیرہ برسوں میں ریاست کی ہیئت، حدود، حقوق اور حقائق کے ساتھ جو ریاکاری برتی گئی اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کے حق میں منافقت کے جو بیج بوئے جاتے رہے اور تب سے اب تک میرٹ کو فنا کر کے ان کی جو منافقانہ آبیاری ہوتی رہی اس نے قدرت کے دوسرے اٹل قانون کو بیدار کر دیا کہ ؏

گندم از گندم بروئید جو ز جو

(گندم سے گندم پیدا ہوتی ہے اور جو سے جو پیدا ہوتا ہے)۔

ان دو قوانین کی وجہ سے ان بیجوں اور ان کی آبیاری سے جو فصل پیدا ہوئی وہ انتہائی کڑوی اور کانٹے دار تھی اور زقوم[۱۹] کی یاد دلاتی تھی۔

ایشین ڈویلپمنٹ بینک میں چند برسوں کی ملازمت کے بعد استعفیٰ دے کر جب میں وطن کی سرکاری ملازمت میں واپس آیا تو یہ فصل جوان ہو کر لہلہا رہی تھی اور کسی آکاس بیل کی طرح وطن کے مینار کے تمام در و دیوار کو ڈھانپ چکی تھی۔ اُس وقت کچھ عرصہ میاں نواز شریف کی حکومت چلی اور کچھ عرصہ محترمہ بے نظیر کی حکومت چلی۔

میں نے دیکھا کہ وطن کے مینار کی پانچویں منزل کی بلندی بظاہر تو قائم تھی۔ بام و در کی سجاوٹ بھی موجود تھی اور اندر بزم آرائیاں بھی تھیں۔ مگر پوری زندگی کا رنگ کچھ ایسا تھا کہ ؎

بُوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (غالب)

آئین اور قانون کی نگہبان سول (civil) اور فوجی بیوروکریسی بھی براجمان تھی لیکن آئین کا گھنٹا ٹوٹے یا قانون کی آنکھ پھوٹے تو نگہبانوں کا نہ تو ابرو اُٹھتا نہ آنکھ کھلتی، نہ اُنگلی ہلتی اور نہ ہی قلم حرکت میں آتا۔ افراد کے فکر و نظر کا یہ ضعف اب اداروں پر بھی طاری ہونے لگا تھا، جن کے نام تو اب بھی بہت اونچے تھے، مگر پکوان بہت پھیکے ہو چکے تھے۔ کھوکھلے سے سرکاری محکمے بڑھتے بڑھتے اب ایسے دیدہ زیب لفافے بن گئے تھے جن کے اندر کا مضمون اکثر اوقات غائب ہوتا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کرپشن اپنے پر پھیلا رہی تھی اور جتنے بھی سرکاری محکمے تھے اتنے ہی پرائیویٹ مافیاز (mafias) قائم ہوتے جا رہے تھے۔ عام شہری اس اُلجھن میں رہتا تھا کہ محکموں اور مافیاز میں سے کون کس کے ماتحت ہے؟ اسی وجہ سے سرکاری ملازمین ناصر کاظمی کی طرح پریشان تھے ؎

جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں... رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں

اس کے برعکس مسلسل ''اصلاحات'' کی بدولت بااثر لوگوں کی من مانیاں پھیلتے پھیلتے لامحدود ہو چکی تھیں، اور ماضی میں انھیں نکیل ڈالنے والے سرکاری افسروں کو اب حکومتیں قتیل شفائی کا یہ شعر سمجھتی تھیں ؎

میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیل
غمِ حیات سے کہہ دو خرید لائے مجھے!

اُن دنوں میں مرکزی حکومت میں ایڈیشنل سیکریٹری تھا۔ جب غمِ حیات اور غمِ دل کا آمنا

سامنا ہو گیا۔ ہمارے متعلقہ وزیر صاحب کی ترجیح یہی رہتی تھی کہ میرے دائرۂ اختیار کے معاملات میں جائز و ناجائز خواہشیں ان کی چلیں اور دستخط میرے چلیں۔ یہ ہر دفعہ یا ہر حالت میں ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے میں نے طویل رُخصت کی درخواست دے دی، تاکہ میری واپسی تک یہ جگہ پُر ہو جائے۔ درخواست تو منظور ہو گئی لیکن اسے گستاخی سمجھا گیا۔ چنانچہ رُخصت سے واپس آتے ہی مجھے افسر بکارِ خاص (OSD) بنا دیا گیا اور جب بالآخر تعیناتی ہوئی تو وہ عرفِ عام میں ''کھڈا لائن'' کے زمرے میں بھی تھی۔

نئے دفتر کا چارج لیا تو اسٹاف سے معلوم ہوا کہ یہ وہی دفتر ہے اور وہی کرسی ہے جہاں علاء الدین صاحب بیٹھتے تھے ؎

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے (حسن عابدی)

تب کی حکومت اُن سے ناراض تھی۔ اب کی حکومت مجھ سے ناراض تھی۔ اسی مماثلت کی وجہ سے بُوئے نفس نے ان کی اندرونی سوچ میرے اندر منتقل کر دی کہ ملازمت کے تیز دھارے میں جانے سے گریز کروں۔ احساسِ زیاں کو گوشۂ عافیت بنا لوں اور ۱۹۹۴ء میں اپنے ریٹائر ہونے کا انتظار کرنے لگ جاؤں۔ اسی طرح یہ عہدہ ان کا بھی آخری چارج تھا اور میرا بھی آخری چارج بن گیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ چند سالہ بیرونِ ملک ملازمت کی دوسری پنشن میرے بڑھاپے کا بہتر سہارا ہو گی۔

یہ صورتِ حال ۱۹۵۸ء کی پرانی یادوں پر دستک دینے لگی۔ جب میری سروس کا آغاز تھا اور انگریز ڈائریکٹر برجیس (Burgess) نے اپنے تربیتی لیکچر میں علاء الدین صاحب کی اعلیٰ کارکردگی کی تعریف کی تھی اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی تھی۔[۲۰] تب وہ ہمارا آغاز دیکھ رہے تھے۔ اب اگر ان کی روح آسمان سے ہم دونوں کا انجام ایک ہی کرسی پر دیکھ رہی ہے تو وہ یقیناً مطمئن ہو گی کہ میں نے ان کی ہدایت پر پورا عمل کیا۔

میرے مینار کی چھٹی منزل پر چھت پڑ گئی... میں ریٹائر ہو گیا... وطن کے مینار میں گورننس (governance) سے رابطے والے کٹھن راستے بند ہو گئے... تب میرے مینار کی ساتویں منزل کا ڈیزائن بدلنے لگا۔ ضابطے سے گھٹے ہوئے کمروں کی بجائے روشن اور ہوادار بارہ دریاں بننے لگیں۔ وطن کے مینار کی ساری ہوائیں میرا تن بدن سہلانے لگیں اور میری نظریں اب اپنے مینار کی بجائے وطن کے مینار پر مرکوز ہو گئیں۔ جس کے ہر در، کھڑکی اور روزن سے اب صرف بااثر افراد ہی نظر

آتے تھے جن کے قدوقامت زندگی سے کہیں بڑے تھے۔

اب وطن کے مینار کی چھتوں، دیواروں اور پرنالوں سے من مانیوں کی بوچھاڑ بڑھتی جا رہی تھی، جو بالآخر ایک منہ زور سونامی کی ویسی ہی یلغار بن گئی جس میں کبھی ماضی کی بیوروکریسی غرق ہو چکی تھی... لیکن اس دفعہ اس میں عدلیہ غوطے کھا رہی تھی۔ کیونکہ چیف جسٹس افتخار چودھری اور عدلیہ جنرل مشرف کے عزائم کی راہ میں ویسی ہی رکاوٹ سمجھی جانے لگی تھی جیسی ماضی کی بیوروکریسی سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے تمام بااثر افراد مل کر اس کا بھی ایسا ہی حشر کرنا چاہتے تھے جیسا ماضی کے افسروں کا ہوا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے ملک بھر کے وکلا اور کچلے ہوئے لوگوں کے جلوس عدلیہ کی ڈھال بن گئے اور بااثر افراد کو بے اثر کر دکھایا۔ میری شرکت اس لیے بھرپور رہی کہ جب ہم ڈوب رہے تھے تو ہمیں بچانے کوئی نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اُس وقت قوم بااثر افراد کے طریقِ واردات سے واقف نہ تھی... لیکن اب ہم سب واقف تھے اور من مانی روکنا چاہتے تھے۔

آج اپنے مینار کی آٹھویں منزل سے میں وطن کے مینار کی سات منزلوں میں جھانک رہا ہوں اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں جو آج کی نئی پاکستانی نسل نے نہ دیکھا، نہ سنا، نہ سمجھا، کہ وطن کے مینار کی تعمیر میں مضمر تمام خرابیاں دراصل ایک ہی بنیادی خرابی کی شاخیں ہیں... یہ بنیادی خرابی بااثر لوگوں کی ''میں'' ہے۔ جو آئین کو ٹھوکریں مارتی ہے۔ قانون کو پامال کرتی ہے اور جمہوریت کو سر بھی اُٹھانے نہیں دیتی۔ ان تمام کی ''میں'' کے مجموعی بوجھ سے وطن کا مینار اتنا ٹیڑھا بینگا بے ڈول اور چپا ہوتا جا رہا ہے کہ دنیا والے اسے ناکام ریاست کہتے ہیں۔ اب تمام بااثر افراد اپنی اونچائی سے چھلانگیں لگا کر بیرونی دنیا میں کود جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ وہ دنیا والوں کی بات تو سن سکتے ہیں، جو وطن کے مینار کو ناکام ریاست کہتے ہیں لیکن اپنے مینار میں بلھے شاہ کی پکار نہیں سن سکتے جو تین صدیاں پیشتر ایسی ہی بدامنی کو ایسے ہی دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

مکے گیاں گل ناہیں مکدی بھانویں سو سو جمعے پڑھ آئیے
گنگا نہایاں گل ناہیں مکدی بھانویں سو سو غوطے کھائیے
بلھے شاہ گل تاہیوں مکدی جدوں ''میں'' نوں دلوں مکائیے

لیکن یہ ''میں'' کیسے مٹ سکتی ہے۔ جب تک بااثر افراد ختم نہ ہوں۔ وردی والوں کی گھر واپسی کے بعد خالی بیرکیں (barracks) دوبارہ آباد نہ ہوں۔ سرکاری ملازم آزاد نہ ہوں اور قوم کا ہر شخص اُسی انداز میں اپنے اپنے مقام پر لوٹ جائے جو انداز قائداعظم نے اپنے تیرہ ماہ کے دورِ حکومت میں بتایا تھا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے کے سارے مسلم رہنما ''وہ اور تم'' والے لوگ تھے جو دوسروں کے حقوق کے لیے لڑتے تھے اس لیے انھوں نے وطن کا مینار کھڑا کر دیا۔ لیکن قائداعظم کے بعد والے سارے پاکستانی رہنما صرف ''میں'' والے لوگ تھے جن کی انا کے بوجھ سے اب یہ مینار ڈانواں ڈول ہے اور قوم کی بقا خطرے میں ہے۔

یہ رپورتاژ میرے مینار سے ہماری بے خبر نئی نسل کے لیے ایک دعوتِ نظارہ ہے، جہاں سے وہ وطن کے مینار کی ساری منازل میں جھانک سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ وطن کے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا۔ یہ جان کر ہی وہ بالکل نئی اور خالص جمہوری سیاسی پارٹیاں بنا کر اُن بااثر افراد کو بے دخل کر سکتے ہیں جنھوں نے اس مینار کا توازن بگاڑ کر اسے ٹیڑھا ''چبا'' اور جھکا ہوا بنا دیا۔ پھر وہ وطن کے مینار کی اگلی منازل کی تعمیر اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا توازن درست کر سکتے ہیں۔

اس نئی تعمیر کے لیے ''عوامی میں'' کی یلغار سے بااثر افراد کی ''خصوصی میں'' کو چت گرانا ہو گا۔ اس جدوجہد کے لیے اُن تمام رویّوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو خاک سے اٹھا کر پھر جوڑنا ہو گا، جو رویّے سرسیّد، اقبال، علّامہ مشرقی اور جناح نے قوم کو سکھائے تھے، لیکن ان کے بعد میں آنے والے لیڈروں کی ''میں'' نے جان بوجھ کر توڑ دیے تھے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
(اقبال)

حواشی

۱۔ ص: ۱۹۹۔
۲۔ کرسٹوفر اینڈرسن سے ملاقات کی روداد، ص: ۲۱ سے ۲۵ تک۔
۳۔ کام کرنے کی قوت اور ہمت۔
۴۔ سیّد منیر حسین، Surviving the Wreck، پہلا ایڈیشن (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)۔
۵۔ ص: ۲۷۶۔
۶۔ امین اللہ چودھری، *Political Administrators* (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ء) ص: ۹۲۔
۷۔ *The Mirage of Power*، ص: ۱۰۷۔
۸۔ آپ بیتی کا عنوان: جائزہ، مصنف: خواجہ محمد احمد صمدانی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء ایڈیشن)۔ صفحات ۷۷ تا ۸۰۔

۹۔ صفحات ۹۱، ۹۲ اور ۱۲۰ تا ۱۲۸۔

۱۰۔ جنرل مشرف کے مارشل لاء سے دو برس پہلے۔

۱۱۔ (N.R.B-National Reconstruction Bureau)

۱۲۔ اس ضمن میں میرا مضمون بہ عنوان "Where were the Nazims" ملاحظہ کریں، جو کراچی کے ڈان *(Dawn)* اخبار میں ۲۵ ر اکتوبر ۲۰۰۵ء کو شائع ہوا تھا۔

۱۳۔ ورلڈ بینک کی طرح یہ بینک بھی امریکہ، یورپ اور ایشیا کے کئی ممالک کی حکومتوں نے قائم کیا تھا اور ان کے اسٹاف کا کچھ حصہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا تھا جو ممبر حکومتوں سے چند برس کے لیے عاریتاً مستعار لیے جاتے تھے۔

۱۴۔ ان دنوں کی نئی ایجاد جس کی وجہ سے ٹیلی گرام کا خاتمہ ہو گیا لیکن یہ ایجاد مزید نئی ایجادوں کی وجہ سے جلد ہی ختم ہو گئی۔

۱۵۔ جنرل مشرف کے دور میں اس دفتر کو ہر لحاظ سے فالتو قرار دے کر پاکستان بیت المال آفس میں ضم کر دیا گیا۔

۱۶۔ دی نیوز، ۶ ر نومبر ۲۰۱۴ء

۱۷۔ دی نیوز، ۲۸ ر جولائی ۲۰۱۵ء

۱۸۔ جنرل محمد ایوب خان، *Friends not Masters*، ص: ۲۱۳۔

۱۹۔ جہنم کے وسط میں اُگنے والا درخت جس کا انتہائی وحشت ناک پھل ہوگا۔

۲۰۔ ص: ۲۲۴۔